سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

جنوری 2018

نگران اعلیٰ

معراج رسول

مرگِ ناگہاں نمبر

سال نو مبارک

چاند گرہن: ایک جواں سال شاعرہ کی دردناک موت کا احوال

جاسوسہ: وہ پختون دوشیزہ جسے تاج برطانیہ نے بڑا اعزاز عطا کیا

مرگِ فنکار: جوانی میں موت کے ہاتھوں شکست کھانے والے اداکاروں کا

ان کے علاوہ بھی ناگہانی موت کا شکار ہو جانے والے ادیبوں اور فنکاروں کا زندگی

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

07 — سرگزشت
شاعرہ
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

08 — گفت وشنید
شہر خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

16 — شخصیت
دانشور
ڈاکٹر ساجد امجد
اس دور میں اس کے برابر کا کوئی دانشور نہیں تھا

37 — خراج تحسین
مرگِ درویش
تنویر ریاض
اس نے عاقبت بچانے کی خاطر دولت ٹھکرادی

43 — خواہش ناکام
ناکام گلوکار
شاہد لطیف
وہ گلوکار بننے کی چاہ میں ٹی وی اسٹیشن آیا تھا

48 — تحریر خاص
چاند گرہن
زویا اعجاز
معروف شاعرہ اس نے کسی کو چاہا مگر پا نہ سکی

79 — عزم و حوصلہ
جاسوسہ
عبداللہ احمد حسن
پختون برادری کی زندہ مثال تھی وہ

94 — معلومات
جواں مرگ
منظر امام
ان اہم قلمکاروں کا تذکرہ موت جنہیں کھا گئی

115 — تذکرہ خاص
خودکش
وسیم بن اشرف
لفظوں کا جادوگر زندگی کی سحر سے مات کھا گیا

123 — حادثاتی قتل
قاتل باؤنسر
کبیر عباسی
حادثہ ایسے ہی ایک دم رونما ہوتا ہے

131 — حیرت انگیز
ارسطوئے دوراں
یوسف وسیم
وہ زندگی کی حقیقت و بے ثباتی کو پہچان گیا تھا

139 — داستان غم
مرگِ گل
راحت وفا راجپوت
اس اداکارہ کی داستان، غم جس کا ہم رکاب تھا

142 — جنگ عظیم
معصوم
شیراز خان
وہ مرنے کے بعد عالمی شہرت کی حامل ٹھہری

145 — فلم نگری
مرگِ فنکار
انور فرہاد
فلم کے ان فنکاروں کا تذکرہ جنہیں موت کھا گئی

157 — سفر کہانی
شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جابونی کا شہکار ایک الگ انداز کی داستان

175 — فخر پاکستان
ننھی کلی
زریں قمر
اس کی علمیت نے ایک عالم کو حیران کر دیا

185 — تحقیق
زخ ش
زین مہدی
قیام پاکستان سے قبل کی بے مثال شاعرہ کا تذکرہ

199 — روداد
عشق گزیدہ
عدنان انور
اس نے محبت کی مثال قائم کردی

204 — معاشرت
ناسور
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ لہو گرما دینے والی داستان

238 — پہلی سچ بیانی
مرگِ برگ
بشریٰ شوکت
اس سچ بیانی کی کسوٹی سمجھ کر خود کو پہچانیں

255 — دوسری سچ بیانی
بنجارا
نعیم الحسن
وہ لہک لہک کر قبرستان میں نظم پڑھتا تھا

259 — تیسری سچ بیانی
چھوٹی سی جان
عالیہ
اس ننھی سی جان نے بہت کچھ سمجھا دیا

263 — چوتھی سچ بیانی
ذمے دار
عاطر شاہین
ون ویلنگ کرنے والے اسے ضرور پڑھیں

270 — پانچویں سچ بیانی
میری گڑیا
احمد توقیر
وہ بچی ماں باپ کو سبق دے گئی

275 — چھٹی سچ بیانی
خونِ ناحق
مختار حسین ایڈووکیٹ
وہ خود کو قاتل کہہ کر سزا پانے کا متمنی تھا

281 — ساتویں سچ بیانی
رسمِ بے رحم
حماد سکندر عباسی
شادیوں میں جاری و ساری ایک خونی رسم

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ❖ شمارہ 12 ❖ جنوری 2018ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِ سالانہ 900 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن
ڈیفنس کمرشل ایریا، کورنگی روڈ
کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس
ہالی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

سرگزشت کے قارئین!

سرگزشت ایک ماہنامہ ہوتے ہوئے بھی عام سا پرچا نہیں ہے، کیونکہ یہ انفارمیٹو میگزین ہے، معلومات حاصل کرنے کی شائقین کی پہلی پسند۔ اس میں صرف علم و عمل کی باتیں، سچے قصے، سچے واقعات، کام کی باتیں ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے لوگ اسے محفوظ رکھتے ہیں۔ سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ بھی ہمارے پرچے ہیں جو قارئین کا ایک بڑا حلقہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح خواتین میں بھی ہمارا ''پاکیزہ'' مقبولیت کے معراج پر ہے لیکن سرگزشت انفرادیت کا حامل ہے۔ اس لیے مجھے زیادہ عزیز ہے۔ اس کے قارئین میں اہلِ علم زیادہ ہیں۔ اہلِ بصیرت کے تبصرے راہ نما ہوتے ہیں۔ اسی لیے قارئین سرگزشت سے میرا سوال ہے کہ جب کاغذ کی قیمت آسمان پر پہنچ چکی ہے ایسی حالت میں پرانی قیمت پر ایسا شمارہ دینا کیا آسان ہے؟ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ہم سرگزشت کی قیمت میں 10 روپے بڑھانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ نئے سال کا یہ پہلا شمارہ آپ تک پہنچانے کے لیے ادارتی عملے اور مصنفین نے بھرپور محنت کی ہے۔ اس خاص شمارے میں شامل تحریریں آپ کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے ہیں۔ اس بارے میں آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

معراج رسول

شاعرہ

اس کے انتقال کو پچاس سال ہو چکے تھے۔ لوگ اسے بھولتے جا رہے تھے کہ ایک انٹرویو نے اسے پھر سے بحث کا موضوع بنا دیا۔ یہ انٹرویو دیا تھا چالیس میل، لندن سے دور ایک قصبہ ویسٹ سوسک ویتھنگ کے 94 سالہ ابراہیم گلستان ایک ایرانی دانشور نے۔ اس نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ سب چونک گئے تھے ورنہ تو وہ اگر زندہ تھی تو صرف اپنی نظموں میں۔ اپنی شاعری میں۔ وہ ایران کی ایک ایسی آواز تھی جسے لوگ پسند بھی کرتے تھے اور اس سے نفرت بھی کرتے تھے۔ اس کی شاعری سے محبت وہ لوگ کرتے تھے جو حقیقت آشنا تھے۔ سمجھتے تھے کہ عورت کا بھی دل ہے۔ وہ بھی اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکتی ہے۔ ایران میں پہلی بار کسی نے نسائی انداز کی شاعری شروع کی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسی شاعری بعد کے دنوں میں اردو کی شاعرہ پروین شاکر نے کی تھی یعنی محبوب کو مرد کے صیغہ سے اٹھا کر عورت کے لہجے میں سامنے لائی۔ عورت کے احساسات کو زبان دی۔ اس نے کرنل محمد باغیر فرخزاد اور طوران وزیری کے گھر 1935ء میں جنم لیا تھا۔ وہ سات بھائی بہنوں میں تیسری تھی۔ اس نے درجہ نہم تک اسکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر اسی دوران اسے ایک نئے شوق نے گھیر لیا۔ اسے مصوری میں دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے مصوری اور سینا پرونا سیکھنے کے لیے ایک گرلز اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس کی ذہنی استعداد خاصی بہتر تھی۔ اس کی پینٹنگ لوگ پسند کرنے لگے تھے۔ ابھی وہ سولہ سال کی تھی کہ اس کی زندگی میں پرویز شاپور آ گیا۔ وہ گھر والوں کی پسند تھا۔ اس کے ساتھ شادی کر کے وہ خوش تھی لیکن مستقبل کا حال کسے پتا؟ وہ اسکول بھی جا رہی تھی اور مصوری کے کمال بھی دکھا رہی تھی کہ اس کے شوہر نے اہواز چلنے کی ٹھان لی۔ پرویز ایک نامور مزاح نگار تھا۔ اس کے قلم کی جادوگری سے سب واقف تھے۔ اس کے مضامین ایران بھر میں پسند کیے جاتے تھے۔ اہواز آنے کے ایک سال بعد وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس نے بیٹے کا نام کیارش شاپور رکھا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا کہ اس کے اور پرویز کے درمیان ایک کھائی سی بننے لگی اور پھر یہ دوری طلاق پر منتج ہوئی۔ شوہر نے قانونی سہارا لے کر بچے کو ماں سے چھین لیا۔ اس لیے بھی کہ اس دور میں ایران مردوں کی حاکمیت کو تسلیم کرتا تھا۔ 1954 میں طلاق کا داغ پیشانی پر لگائے وہ ٹوٹے دل کے ساتھ تہران واپس آ گئی اور اس نے شاعری میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ 1955ء میں اس کا پہلا مجموعہ ''دی کیپٹیو'' کے عنوان سے مارکیٹ میں آیا۔ اس پہلے مجموعے نے ہی اسے شہرت دے دی۔ ہر نقاد کی زبان پر اسی کا نام تھا۔ اس لیے کہ اس نے روایتی شاعری کو مسترد کرتے ہوئے نسائی لب و لہجے میں شاعری شروع کی تھی۔ 1958ء میں وہ نو ماہ یورپ میں گزار کر آئی اور نوکری کی تلاش میں جٹ گئی۔ اسی دوران اس کی ملاقات ابراہیم گلستان سے ہوئی جو ایک فلم ساز تھا۔ اس نے اس کی حوصلہ افزائی کی تو اس کے دو نئے مجموعے مارکیٹ میں آئے ''دی وال'' اور ''ریبیلیون'' ان دو مجموعوں کو بھی خوب پذیرائی ملی پھر اس نے ایران میں پہلے کوڑھ پر ایک فلم ''دی ہاؤس از بلیک'' بنائی۔ 1962ء میں بنی اس فلم کو خاصی پذیرائی ملی۔ 1964ء میں اس کا ایک اور مجموعہ آیا ''دی انادر برتھ'' اس کی شاعری کچھ حلقوں میں پسند کی جاتی تھی تو کچھ حلقوں میں اسے سخت ناپسند کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران 13 فروری 1967ء کو وہ دفتر جا رہی تھی کہ راستے میں ایک اسکول بس آ گئی۔ اسے بچانے میں وہ ناکام رہی اور حادثہ اتنا بھیانک ہوا کہ وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ختم ہو گئی۔ اس کی موت کے دوسرے دن اس کی مشہور نظم ''لیٹ اس بلیو ان دی کولڈ سیزن'' شائع ہوئی جو فارسی شاعری کی ایک مقبول نظم کہلاتی ہے لیکن اس کی موت کے بعد جب ایران میں اسلام پسندوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس کی شاعری پر پابندی لگا دی گئی۔ بیس سال کی عمر میں حادثاتی طور پر مرنے والی اس شاعرہ کو فارسی شاعری میں بہت اہمیت حاصل ہے اور اسے لوگ فرغ فرخزاد کے نام سے جانتے ہیں جس کی موت کے پچاس سال بعد اس کے ایک پرانے محبوب ابراہیم گلستان نے ایک بڑے اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے جب یہ کہا کہ میں فرغ فرخزاد سے محبت کرتا تھا اور اس کی موت کے سبب ایران کو چھوڑ دیا تو ایک نئی بحث شروع ہو گئی۔

☆☆☆

شہرِ خیال

مدیر اعلیٰ

☆ ناصر حسین رند کا خلوص نامہ بہاولپور سے۔ ”پورے ایک سال بعد حاضری کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس پورے سال میں جن ساتھیوں سے اُمید تھی۔ انہوں نے یاد نہ کیا اور ان ساتھیوں نے یاد کیا جن کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ انور عباس شاہ، فروری۔ امیر حمزہ اشرف، اگست۔ قیصر خان، ستمبر۔ ندیم افضل، نومبر۔ ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جس دن سے مرگِ ناگہاں نمبر کا اعلان ہوا اس دن سے دل مچل رہا ہے کہ سرگزشت میں حاضر ہوا جائے لیکن مصروفیات آڑے آتی رہیں۔ اس دفعہ سالانہ رپورٹ تو غالباً منشی محمد عزیز مئے پیش کریں گے لیکن ہم بھی تھوڑا پُراسرار اور مرگِ ناگہاں نمبر کی مناسبت سے کچھ عرض کریں گے۔ تو عرض ہے جو عین جوانی میں رخصت ہو گئے ان میں ہمارے شہرِ خیال کے چند ساتھی بھی تھے جن کو شاید کافی سارے قارئین نے بھلا بھی دیا ہو لیکن ہمیں تو اپنے پرانے ساتھی آج بھی یاد ہیں جن میں ثمینہ شاہد عین جوانی 17 جولائی 2002ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں اور ہمارے دوسرے ساتھی خالد حسین چیمہ جو پنڈی بھٹیاں سے اکثر خط لاجواب لکھا کرتے تھے ان کو بھی رخصت ہوئے زمانہ ہوا جو شہرِ خیال میں چھائے رہتے تھے۔ شاہد جہانگیر شاہد، وہ آیا دیکھا ختم کیا اور رخصت ہو گیا۔ مختصر مدت لکھا لیکن خوب لکھا۔ یکم جولائی 2016ء کو رخصت ہو گئے۔ سعید احمد چاند جن کے ہر خط کے آخری الفاظ یوں ہوتے تھے۔ شہرِ خیال میں جن کے تبصرے پسند آئے ان کے نام یہ ہیں جیسے ناصر حسین رند وغیرہ وغیرہ۔ چاند صاحب مرحوم ستمبر 2016ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اور چند ایسے ہیں جن کی کوئی خبر بھی نہیں۔ کسی زمانے میں وہ بھی کیا خوب لکھا کرتے تھے جیسے ملتان سے علی حسنین بھٹی، بیمر اتبسم، یونس بلوچ، خالدہ کبیر! نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں۔ اور چند یہ ہیں شروع سے لے کر آج تک سرگزشت سے ساتھ نبھاتے آ رہے ہیں۔ اعجاز حسین سٹھار، آفتاب احمد نصیر، تنویر عباس بابر، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، بشریٰ افضل، رانا شاہد، عبدالجبار ردی انصاری، وحید ریاست بھٹی، سہیل احمد عباسی اور ہم خود ناصر حسین رند۔ اور انشاء اللہ ہمارا ساتھ سرگزشت سے آخری سانسوں تک قائم رہے گا۔ پُراسرار لکھنے والوں پر یہ سال بھاری رہا۔ ایم اے راحت، علیم الحق حقی، صغیر احمد صدیقی وغیرہ بھی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جن کا پُراسرار لکھنے والا خلا کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ کاشف زبیر تو عین جوانی میں رخصت ہو گئے۔ محی الدین نواب جیسے عظیم رائٹر بھی رخصت ہو گئے۔ سرگزشت میں جب بھی لکھا، چھا گئے کہ لکھاری مختار آزاد بھی قلم کی دنیا چھوڑ کر مصداقِ فانی دنیا سے منہ موڑ کر حقیقی دنیا میں چلے گئے۔ پچھلے سال نومبر 2016ء کا پُراسرار تحریروں پر تبصرہ شائع نہ ہو سکا اس لیے مختصر سا جائزہ حاضرِ خدمت ہے تاکہ پُراسرار مواد کے شیدائی کے لیے ریکارڈ پر آ جائے۔ ”پُراسرار خط اور مذاق“ مذاق نے خوفناک صورتِ حال اختیار کر لی، ”خواب“ خوابوں کے اسرار مئی 2016ء۔ ”وقت کی جیت“ ایک ایسا واقعہ جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ابن کثیر ”کالا علم“ اور ”جڑواں دھند بھری رات“ نے اسے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ جولائی 2016۔ ”مسافر“ ایک ایسی سچی کہانی جس پر روسینگ، سسپنس اور ہارر موویز اور ڈراما بنایا جا سکتا ہے۔ کیا کمال کہانی ہے۔ ”مہلت“ ایک عجیب و غریب خواب کی روداد۔ ”ہم زندہ ہیں“ وہ کردار جو آج بھی زندہ ہیں۔ عمر عیار، ٹارزن، نصیر الدین الہ دین، شیخ چلی وغیرہ ستمبر 2016ء۔ ”ولیپٹ کے بچے“ محو حیرت کر دینے والے واقعات اکتوبر 2016ء۔ ”بولتے مجسمے“ افریقا کی پُراسرار سرزمین سے ایک واقعہ۔ ”تصویر“ 2016 نومبر جسے سال کی سب سے بہترین پُراسرار تحریر کہا جائے تو غلط نہ ہو گا اگر اس کہانی کا نام پُراسرار تصویریں ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ بہت ہی زبردست تحریر تھی 2016ء کی۔ 2017ء کی پُراسرار تحریریں اور کہانیاں۔ ”جانور بچے“ حیرت انگیز واقعات پر ایک مختصر سی تحریر جنوری 2017ء۔ ”سری ادب کی ملکہ“ اگاتھا کرسٹی پر ایک مختصر تحریر۔ ”پالش والے بابا“ ایک عجیب غریب شخص کی روداد۔ مارچ 2017ء۔ ”خواب“ خوابوں کی حقیقت کیا ہے۔ منظر امام کی مختصر تحریر۔ اپریل 2017ء۔ ”گورکن“ ایک عجیب خصلت گورکن کی آپ بیتی۔ ”اچھوت“ ایک ایسی خوفناک

بیماری جس نے اپنے دور میں لوگوں کو دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مئی 2017ء۔ زبردست کہانی۔ ”گم شدہ“ محکمہ جنگلات کے ایک افسر کو پیش آنے والے خوفناک واقعات، جنگل کہانی۔ جون 2017ء۔ ”نفسیات دان“ تاریخ کے سب سے بڑے نفسیات دان سگمنڈ فرائیڈ کی داستانِ حیات جون 2017ء۔ ”اندھی بستی“ سندھ کے ایک عجیب و غریب گاؤں کا تذکرہ جو اسرار کی دھند میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ شاندار تحریر۔ اگست 2017ء۔ ”چرکی“ افریقا کے ایک پُراسرار قبیلے کا تذکرہ خاص اکتوبر 2017ء۔ 2017ء کی خاصے کی چیزیں تھیں ان میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی کی سرگزشت، ہماری مدتوں کی خواہش آپ نے پوری کر دی۔ بہت ہی اعلیٰ تحریر تھی۔ جنوری 2017ء اور دوسری ”عشق کامل“ حضرت اویس قرنی کی لاجواب تحریر جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہو گی۔ اور اسی مہینے ”ہوائے حجاز“ نسیم حجازی پر کمال تحریر تھی۔ جولائی 2017ء۔ رانا محمد شاہد ہمارے شہرِ خیال کے ساتھی ”شہروں کے نام“ پر ایک لاجواب تحریر لائے۔ اپریل 2017ء میں جو اعلیٰ تحریر تھی۔ دسمبر 2017ء کی آخری تحریر ”عمر خیام“ پر ماہر ریاضی جو اپنا اثر قائم نہ رکھ سکی۔ جیسے کہ آفسر آذر (مرحوم) اپنی تحریر ”خیام“ عمر خیام پر ایک لاجواب لازوال داستان عمر خیام کا جس میں پورا احاطہ کیا گیا تھا۔ کیا کمال ساحرانہ سرگزشت تھی جس کا اثر آج تک ہمارے دل و دماغ پر طاری ہے جس میں خیام کے ساتھ حسن بن صباح، نظام الملک طوسی کا ذکر خاص بھی تھا ایک پُراسرار تحریر جو مدتوں بعد لکھی جاتی ہے۔ اکتوبر 1999ء میں شائع ہوئی تھی۔ جناب محترم معراج رسول سرگزشت میں ہر شمارے میں ایک پُراسرار کہانی کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں۔ نہ جانے کیوں اسے بند کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری ریکوئسٹ ہے۔“

☆ نصیر اللہ خان داؤد خیل میانوالی سے مرسل ہیں۔ ”ماہنامہ سرگزشت اکتوبر 2017ء کا شمارہ پڑھا، نہایت ہی دلچسپ اور مزے دار تھا۔ سرگزشتہ عمدہ اور مفید معلومات مہیا کرتا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر ساجد امجد کا مضمون کافی پُرمغز اور معلومات افزا ہوتا ہے اور ضیاء تسنیم بلگرامی صاحبہ بھی کافی عمدہ تحریر لکھتی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ رسالے میں خاص طور پر بنگال کے بارے میں جو بھی چھپتا ہے اتنا اچھا ہوتا ہے۔ خاص طور پر بنگالی فلمی دنیا اور لوگوں کے بارے میں۔ براہِ مہربانی بنگالی جو بھی پاکستانی تھے خاص طور پر فنکاروں کے بارے میں زیادہ چھاپا کریں کیونکہ وہ لوگ ہم سے زیادہ محبِ وطن پاکستانی تھے ان اداکاروں، فلم سازوں، ہدایت کاروں کے بارے میں انور فرہاد سے التماس ہے کہ لکھیں۔ ان میں سلو چنا، رونا لیلیٰ، مستفیض الرحمٰن، سرور بارہ بنکوی، شہناز بیگم، فردوسی بیگم، ریحانہ، ہارون، انور حسین، مصلح الدین، کریم شہاب الدین، عالم گیر، محمد افراہیم کے علاوہ اسلم لاٹر، روحانی بانو، احمد رشدی، مہدی حسن، مسعود رانا، سہیل رانا، بیگم رعنا لیاقت علی، نجمہ نیازی، ناہید نیازی اور بہت سے دوسرے ان پر بھی لکھیں۔ فہرست لمبی ہونے کی وجہ سے ابھی بہت سے نام رہ گئے۔ سرگزشت کا خاص شمارہ مرگِ ناگہاں نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے جو کہ ناقابلِ فراموش ہو گا۔ سلسلے وار سفر نامہ ”شمشال سے ٹورنٹو“ کافی خوب صورت اور روانی سے کافی تیز جا رہا ہے۔ اس کو جاری رہنا چاہیے۔ حسن رزاقی بھی کافی عمدہ سفر نامہ تحریر فرماتے ہیں۔ ان کی ایک سچ بیانی جو کہ بنگال کے فوجی کی تھی کافی اچھی اور پیاری تھی۔ انور فرہاد صاحب کافی اچھا تحریر فرماتے ہیں جیسے کہ آفاقی انکل لکھا کرتے تھے۔“

☆ مرزا طاہر الدین بیگ کی خوش کن آمد میر پور خاص سے۔ ”بہت عرصے کے بعد سرگزشت ”شہرِ خیال“ میں لکھ رہا ہوں۔ میری غیر حاضری کو سدرہ بانو ناگوری نے کچھ عرصہ پہلے سرگزشت کے شہرِ خیال میں محسوس کیا یاد کیا۔ بے حد شکریہ۔ میری دعا ہے کہ سدرہ بانو ناگوری سدا خوش و خرم رہیں اور شہرِ خیال میں اسی طرح اپنے خوب صورت خیالات کو بکھیرتی رہیں اللہ سدا نور کی برسات کرے، (آمین)۔ شہرِ خیال میں خوب صورت خیالات کی تحریر پڑھنے کو ملی۔ ”ماہر ریاضی“ معلوماتی تحریر اور بہت عرصہ بعد شکاریات پر این کونگ کا آدم خور پڑھنے کو ملی، بہت شکریہ۔ آپ بیتیوں میں بریسلٹ، عشق گزیدہ اور نیا سکھراں اچھی تحریریں تھیں (آپ کی کمی ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔ آپ آتے رہیں، مدیر)۔“

☆ نزابت افشال کا مہورہ فتح جنگ اٹک سے خلوص نامہ۔ ”یک صحی سرگزشت اس بار فیض احمد فیض کے بارے میں تھی۔ فیض جتنے عظیم شاعر تھے اتنے ہی عظیم انسان تھے۔ ”نسخہ ہائے وفا“ کی شکل میں ان کی شاعری تا قیامت خراجِ تحسین حاصل کرتی رہے گی۔ اداریہ ایک تلخ حقیقت کو عیاں کر رہا تھا۔ ”ماہر ریاضی“ عمر خیام پر زبردست تحریر تھی۔ سرزمین ایران کے سعدی کی گلستان اور بوستان ہمیشہ پسندیدہ رہیں گی۔ فردوسی کا شاہنامہ اور حافظ شیرازی کا دیوان ارباب علم و تحقیق کی توجہ جذب کرتے رہیں گے۔ اسی طرح رباعیاتِ خیام کی مقبولیت سے انکار ممکن نہیں۔ خیام کی رندی و سرمستی اس کی رباعیات کے آبگینوں سے چھلکتی رہے گی۔ ادب کا قطب بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ مشفق خواجہ پر کلیل صدیقی کی محنت داد کی مستحق ہے۔ ”اعتراف“ عزیز میرٹھی کے قلم سے نکلی ہوئی زبردست تحریر تھی لیکن صفحہ نمبر 96 پر یہ مشہور شعر ”مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے“ آغا حشر کاشمیری سے منسوب تھا جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ شعر اصل میں یوں ہے ”اے صنم، وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے“ یہ شعر ہے محمد رضا خان برق لکھنوی کا (دیوان محمد رضا خان برق لکھنوی صفحہ نمبر 326)۔ آغا حشر کاشمیری نے اپنے کسی ڈرامے میں موقع کی مناسبت سے شعر ہٰذا کا مصرعہ اوّل بدل کر شامل کیا تھا یوں آج تک غلطی سے یہ شعر آغا حشر کاشمیری سے منسوب چلا آ رہا ہے۔ اس کی وضاحت ذرہ

حیدرآبادی نے ستمبر 2015ء کے سرگزشت میں کی تھی۔ شاید عزیز میرٹھی صاحب نے ذرہ حیدرآبادی کا وہ مضمون نہ پڑھا ہو۔ (تضمیں شدہ شعر زبان زدِ عام ہوگیا کیونکہ ایک مشہور فلم کمپنی نے اسے مونوگرام بنایا تھا) ''شمشال سے ٹورنٹو'' ہمیشہ کی طرح زبردست رہا۔ ندیم اقبال نے آخر کار ہمتِ عاشقانہ سے کام لے کر نسرین کا دستِ حنائی چوم ہی لیا۔ دیکھئے اب آگے کیا ہوگا۔ ''الفاظ بنے ہتھیار'' سلمیٰ اعوان بھرپور تحریر کے ساتھ حاضر تھیں۔ ''ناسور'' میں نعمان کو حیرت انگیز طور پر کامیابیاں ملیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگیا۔ ''عشق گزیدہ'' میں رخشی کے صبر اور اس کی وفا کو سلام کہ اس نے اک ادھورے مرد کے ساتھ ساری زندگی گزار دی۔ ''شارٹ کٹ'' ہمارے معاشرے کا عکس تھی اور آج نفسانفسی کے دور میں دولت کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بھی تھی۔ ''فیکا'' ایک سبق آموز کہانی تھی فیکا کتنا عظیم آدمی تھا۔ کاش وہ نشے کا عادی نہ ہوتا۔ ''بڑا آدمی'' زبردست اور کچھ کر گزرنے پر اکسانے والی تحریر تھی۔ امجد کی جدوجہد بلاشبہ خراجِ تحسین کے لائق ہے۔ ''نیا حکمران'' واہ کیا شاندار کہانی تھی بالکل پاکستانی سیاست کا عکس، ہمارے ملک میں بھی حکمران طبقہ یہی کچھ کر رہا ہے۔ منشی فضل وین ویلڈن! ''شریف'' اور ''بریسلٹ'' بھی حاصلِ مطالعہ تھیں۔ ''کرن سے مہتاب'' اور ''آئینہ'' بھی بہت شاندار کہانیاں تھیں۔ آفتاب نصیر اشرفی شہرِ خیال میں صدارت پر تھے۔ منشی محمد عزیز، ذیشان ریاض، سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین ستھار، قیصر خان، رضا احمد اعوان، سیف اللہ اور ندیم اقبال اپنے اپنے انداز میں حاضر تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اور بشریٰ افضل میری یہ دونوں بہنیں عرصہ دراز سے غیر حاضر ہیں۔''

☆ سید امتیاز حسین بخاری کی سرگودھا سے آمد۔ ''طویل انتظار کے بعد ماہ دسمبر کا سرگزشت 26 نومبر کو ملا۔ جب کہ اس سے پہلے ہر ماہ کی 22 تاریخ کو مل جایا کرتا تھا نہ جانے اس بار تاخیر کی وجہ کیا ہے؟ (حیرت ہے کہ وہاں اتنی دیر میں کیوں پہنچا)۔ سرگزشت ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے آپ کا فکر انگیز بصیرت افروز اداریہ پڑھا۔ پاکستان میں ہر محکمے میں میرٹ کو نظر انداز کیا جارہا ہے کس کس کا ذکر کیا جائے لاکھوں طلباء و طالبات ہاتھوں میں ڈگریاں لیے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں مگر کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ یک قسمی پر شاعر رومان فیض احمد فیض، بہت سی بے بہا معلومات حاصل ہوئیں۔ شہرِ خیال میں داخل ہوتے تو آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی مسند صدارت پر فائز تھے۔ ڈھیروں مبارک باد، خوب تبصرہ تھا۔ سب دوستوں کے تبصرے پڑھے جو گلے شکووں سے بھرے ہوئے تھے۔ ''انوکھی شادیاں'' زبردست تحریر تھی جس نے معلومات میں اضافہ کیا۔ اِدھر اُدھر سے خبریں جوڑ کر تحریر کی شکل نہیں دی جاسکتی، لکھنا ایک مشکل اور کٹھن فن ہے جب کہ پڑھنا آسان ہے یہ تو ہم جیسے لکھاری ہی جانتے ہیں۔ وسیم بن اشرف کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ شہرِ خیال کے دوستوں سے بصد ادب گزارش ہے کہ ثبت تنقید کریں۔ منفی تنقید سے اجتناب کریں۔ ''ماہر ریاضی'' ضیاء تسنیم بلگرامی کی زبردست معلوماتی تحریر تھی۔ ''اوب کا قطب'' شکیل صدیقی نے مشفق خواجہ کی مفصل اور جامع انداز میں حالاتِ زندگی بیان فرمائی۔ ''حیلکس'' انور فرہاد کی معلوماتی تحریر تھی۔ یہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ایک قلمی مصنف گم نامی اور گوشہ نشینی کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ''اعتراف'' عزیز میرٹھی کی خود نوشت پڑھ کر دکھی ہوگیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ندیم اقبال نے اس بار زبردست تحریر سے اپنے انداز بیان کو موثر بنایا ہے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ لی۔ ندیم اقبال ایک محبِ الوطن، شفیق باپ، ذمہ دار شوہر، باکردار انسان اصول پرست لکھاری ہیں۔ نسرین ایک ایرانی نژاد عورت ہے اور ایک بیٹے کی ماں ہے۔ پردیس میں ہر پردیسی محبت کا طلب گار رہتا ہے اپنے ہم ذوق سے مل کر مسرور ہوتا ہے اور بزم آرائی کرتا ہے۔ ''عشق گزیدہ'' زویا اعجاز کی زبردست روحانی تحریر تھی۔ دشمنوں نے دھوکا دے کر عجیب و غریب انتقام لیا۔ جوڈاکٹری جیسے مقدس پیشے سے بعید تھا۔ ''عشق گزیدہ'' اوّل نمبر کہانی۔ ''فیکا'' طارق عزیز خان متاثر کن تھی۔ ایسے واقعات تو ہمارے معاشرے میں ہوتے رہتے ہیں۔ ''بڑا آدمی'' زاہد شاہ کی دوسری بڑی زبردست سحر کن حیران کن کہانی تھی۔ پڑھ کر بہت ہی زیادہ لطف آیا۔''

☆ ابو احمد نارتھ ناظم آباد کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو اور آپ کی اس سوچ کو جو آپ نے ستمبر کے ابتدائیہ یا مختصر سے اداریے میں تحریر فرمائے ہیں وہ ایک مفصل مضمون تقریر تحریر یا وعظ سے بھی فزوں تر ہے۔ آپ کو ایسے خیالات کے اظہار پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ تحریر عام ہو اور ہم قائداعظم کے اقوال پر اور قرآن پاک پر عمل پیرا ہو کر اس ملک عزیز کو امن و امان کا گہوارہ بنا دیں۔ تفرقہ بازی ختم کردیں۔ اسی طرح یہ ملک جنت نظیر بن سکتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر آپ کو ایسی عمدہ اور مختصر تحریر پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

☆ ڈاکٹر آر ایم ای کا ریاض سعودی عرب سے مشورہ۔ ''انجمن خیال و آلا راماشاء اللہ آپ کی ادارت میں خوب روشن ہے۔ دانش ور محققین دانش اور حکمت کا بر ملا اور بخوبی اظہار کر رہے ہیں۔ یوں تو گمان ہے کہ دانشور اور ادبی بقراط اپنی آراء سے سرگزشت کی تحاریر سے مستفید کریں گے لیکن میں اخلاقی، انسانی اور دینی بنیاد پر ''خوش بخت'' پر اپنے احساسات اور وضاحت پیش کروں گا۔ حیرت ہے عہد حاضر میں جب کہ علم و ادب، دینی معلومات اور انسانی اقدار میں فروغ کے باوجود لوگ بے بنیاد اور فرسودہ روایات و عقائد کی تقلید میں مگن ہیں۔ خوش بخت کی بے بسی، مظلومیت اور انسانی و اخلاقی مدد کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس نیک فعل اور عمل کی اتنی پسندیدگی کا شرف بخشا

کہ ابرار کے رزق میں وسعت پیدا کی۔ ''واللہ خیر الرازقین'' لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بھول جاتے ہیں کہ اللہ علیم البصیر ہے۔ نبی کریمؐ نے اسی مناسبت سے اصحابہ کرامؓ کو بتایا کہ بنی اسرائیل کی ایک فاحشہ عورت جب کسی مخصوص جشن نشاط کی محفل سے تھکی ہاری اور نڈھال اپنے گھر واپس لوٹی تو اس نے گھر سے تھوڑی دور پانی کے ذخیرے کے نزدیک ایک کتے کو پیاس سے نڈھال پایا۔ اس کا گھر کچھ دور تھا۔ آس پاس کتے کی پیاس بجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں تو اس نے اپنا قیمتی جبہ اتار کر اس کو پانی میں ڈبو کر اور نچوڑ نچوڑ کر کتے کی پیاس بجھائی اور اللہ تعالیٰ کو اس کا فعل اتنا پسند آیا کہ اس نے اس عورت کی مغفرت کردی اور اس کو جنت عطا کرنے کی بشارت دے دی۔ ان حقائق کو واضح کرنے کی اہمیت اور ضرورت یوں اہم ہے کہ ابرار اخلاقی، انسانی اور دینی کم علمی کی وجہ سے معاشرتی، سماجی، انسانی اور دینی اقدار اور قوانین کی بے حرمتی اور خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ عورت جو سماج، معاشرے اور دین کا اہم جز اور وجود ہے۔ اس کو مالٹے اور آم کی طرح چوس کر پھینک دیتے ہیں۔ اگر ابرار کی والدہ وغیرہ کے ساتھ ایسا حشر ہوتا تو؟''

☆ امیر حمزہ اشرف کی کوٹ رب نواز ملتان سے آمد۔ ''چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر سے حاضر خدمت ہوں۔ سرگزشت 24 نومبر کو وہاڑی چوک ملتان سے حاصل کیا۔ سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے ''معبرِ خیال'' میں گئے جو کسی دلچسپ اور معلوماتی مضمون سے کم نہیں ہے۔ آفتاب احمد نصیر کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ کئی دوستو کی کمی شدت سے محسوس ہوئی اس کے علاوہ ناصر حسین رند، عمرانی جونانی اور احسان بحر بھی کافی مہینوں سے غائب ہیں۔ ناقابل فراموش سچ بیانی ''عشق گزیدہ'' پڑھی۔ رخشی اور علی حسن کے گرد گھومتی یہ عشق کی داستان بہت انوکھی، دلچسپ اور پیاری لگی تحریر کے ایک ایک لفظ میں کچھ ایسا سحر تھا جس کی لپیٹ میں، میں خود کو ابھی تک محسوس کر رہا ہوں۔ ''آئینہ'' پڑھی۔ رسول اکرم حضرت محمدؐ نے فرمایا۔ ''عورت پوری کی پوری ''عورہ'' یعنی چھپانے کے لائق ہے۔'' الیاس تو خیر ایک شکی ذہن کا آدمی تھا لیکن عام حالات میں بھی میرے خیال میں کوئی شوہر یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی غیر مردوں سے ہنس ہنس کر بات کرے۔ نواز کے کردار سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔ ''بڑا آدمی'' انسان چاہے کتنی ہی کامیابیاں حاصل کرلے لیکن اسے اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ ''کرن سے مہتاب'' میں کرن کو اس کے والدین مل گئے اور اس کا پورا خاندان مسلمان ہوگیا۔ کہانی سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اچھے اخلاق، تعلقات اور محبت سے پھیلا ہے نا کہ تلوار کے زور پر۔ ''بریسلٹ'' بھی سبق آموز کہانی تھی۔''

☆ م انور نے باری چم ہوتی مروان سے لکھا ہے۔ ''کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے۔ اس دفعہ سسپنس اور سرگزشت جڑواں بھائیوں کے مثل ایک ہی تاریخ پر آگئے واللہ مزہ آیا۔ شہرِ خیال میں داخل ہوتے وقت اپنی کم مائیگی اور ذہن نارسا کی گومگو کیفیت طاری ہونا اضطراری ہی کہلائی جاسکتی ہے۔ سرگزشت کے سب گوشے اچھے اور خاصے نتھرے ہوئے ہیں۔ لکھنے والوں میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والے محترمہ زویا اعجاز، سلمیٰ اعوان، ندیم اقبال، انور فرہاد اور ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ہی گردانے جاسکتے ہیں۔ سدرہ بانو ناگوری، رانا محمد شاہد، نزابت افشال، منشی عزیز مئے، آفتاب احمد، نصیر اشرفی اور اعجاز حسین ستھار نے شہرِ خیال کو شاد و آباد رکھا ہے اللہ ان صاحبان کو سدا خوش و خرم اور اس طرح لکھنے کی استطاعت دیتے رہے۔ حبیب اشرف سرقہ بے اختیار (Parachronism) کے لیے معافی کے مستحق ہیں۔ اکثر لفظ صرف سرف لکھ دیتے ہیں سرف اور صرف کیا ایک ہی معنی رکھتے ہیں (جی نہیں، یہ دو لفظ الگ معنی رکھتے ہیں۔ سرف فضول خرچی کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن صرف خرچ کرنا کے معنی میں آتا ہے۔ صرف ایک علم جو کلمہ کی تقسیم کو تعطیل اور گردان کے لیے ہے۔ توبہ اور حیلہ کے لیے بھی صرف استعمال ہوتا ہے)۔ مضمون کتابیں میں محترمہ کشمالہ حسن نے ہرمن ہیز کا نام نمایاں لکھا نہیں مضمون بہت مختصر تھا۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا مکتوب کراچی سے۔ ''سال 2017ء بھی رخصت ہوا اس سال کا آغاز تو یاد نہیں کہ کس طرح ہوا تھا مگر اختتام دھرنے، مرنے اور لڑنے پر ہو رہا ہے۔ وطنِ عزیز کی صورتِ حال انتہائی ابتر ہے، خود کو عاشقِ رسول کہنے والوں میں رسول کا کوئی اصول دکھائی نہیں دیتا۔ ہم امریکا، بھارت اور اسرائیل کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں مگر موجودہ حالات پر غور کریں تو ہمیں اپنے آپ سے بڑا اپنا دشمن کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ہم نے جتنا نقصان خود کو پہنچایا ہے اتنا تو دشمن ممالک مل کر بھی نہیں پہنچا سکتے۔ دل غمزدہ بھی ہے، اداس بھی ہے۔ کچھ پانے کی خوشی اور بہت کچھ کھونے کا غم سمیٹے اس سال کو الوداع کہتے ہوئے اور نئے سال کی آمد پر نئی امیدیں لیے یہ دعا کرتے ہیں کہ آنے والا یہ سال تمام عالمِ اسلام کے لیے مبارک ثابت ہو۔ کشمیر، شام اور روہنگیا مسلمانوں کو امان ملے، شہر کراچی اور پورے ملک میں امن و امان ہو جائے۔ شہرِ خیال کے ساتھیوں کو بھی نیا سال مبارک ہو۔ آفتاب احمد نصیر کا تبصرہ عمدہ رہا۔ حبیب اشرف نے شہرِ خیال میں آکر اپنی غلطی تسلیم کرلی، یہ اچھی بات ہے لیکن پلیز اس بات کا خیال رکھیے کہ کہانی لکھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ سچ کہوں تو مجھے تو آپ کی کہانی بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ ہمارے تبصرہ نگار بھائی نزابت افشال دوسروں کے شعروں کی تصحیح کرتے کرتے خود بھی اچھے خاصے شاعر بن گئے ہیں۔ ندیم اقبال صاحب، وعلیکم السلام، آپ بھلے ہی پروفیشنل رائٹر نہیں ہیں لیکن اتنے خوب صورت سفرنامے لکھ کر آپ نے بڑے بڑے رائٹرز کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ وسیم بن اشرف نے مختلف ملکوں کے عجیب و غریب رسم و رواج کو بیان کیا، میرے خیال میں تو ان رسموں

کو حماقت یا بے وقوفی کہنا زیادہ بہتر رہتا۔ ''پرائی ساس'' پڑھ کر لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ کاشف زبیر کی یہ انتہائی لاجواب تحریر پڑھ کر تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کہ جو حال بے چاری مشرقی ساسوں کا ہے وہی مغرب کی ساسوں کا بھی ہے۔ بڑی بی نے ٹھیک کہا کہ ''ساسوں کے بارے میں بہوؤں کے آفاقی خیالات کبھی نہیں بدلیں گے۔'' عزیز میر ٹھی کا ''اعتراف'' آنکھوں کو نم کر گیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں نسرین اور بہار دونوں ہی جوبن پر تھے۔ نسرین کے آنسو، مسکراہٹیں اور اداسیوں نے ندیم بھائی کو گھیرے رکھا تو ندیم بھائی بھی اپنے کردار کی معراج پر نظر آئے۔ اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ شہباز کو بھی کوئی جاننے والا مل ہی گیا ورنہ اتنی مدت سے بے چارے اکیلے اور تنہا تنہا تھے ان کو سرجی کے سوا کوئی لفٹ ہی نہیں کراتا تھا۔ ''ناسور'' کی یہ قسط کچھ خاص نہیں تھی۔ نعمان جب ہوٹل کی طرف جا رہا تھا تو اس نے سدو بھائی کو تو اپنے پیچھے بٹھا لیا لیکن کالیا کو رکشا کروا دیا۔ عجیب سی بات نہیں ہے یہ؟ تین مرد بیٹھ سکتے ہیں بائیک پر ایک ساتھ پھر جب نعمان مزدوروں سے مار کھا کر آیا تو استاد بھابھا کے اڈے پر کسی نے اس کی ابتر حالت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، اتنے گھونسے اور ٹھوکریں کھانے کے بعد آدمی زخمی تو ہوتا ہی ہے نا ڈاکٹر صاحب، نعمان کو ان ناخوشگوار حالات کا شکار ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا ہے اور وہ مار دھاڑ ہو یا عقل و ذہانت کا لیا جیسے مجرم سے بھی آگے نکلنے کو تیار، ایسا کیوں ڈاکٹر صاحب۔ پلیز اسے نعمان بنا کر پیش کریں ہالی ووڈ کی فلموں کا ایکشن ہیرو بننے پر مجبور مت کریں۔ زویا اعجاز تو جب بھی آتی ہیں اواس کر جاتی ہیں، حسن اور رخشی کا عشق اور ایسا انوکھا عشق کہ محبوب کا احترام بھی ہو، عقیدت بھی ہو پر خار راستے بھی ہوں لوگوں کی چھلنی کر دینے والی نگاہیں بھی ہوں اور آخر میں عشق کی محبوب کو کڑی سزا بھی ہو، غم جدائی بھی شوق رسوائی بھی ہو۔ کیا عجب محبت ہے اور کیسا غضب کا عشق ہے۔ ''پرسلٹ'' میں ایک جملہ کہ ''جو چیز ان نیچرل ہو اس میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی ہے'' یہ صرف ایک جملہ نہیں تھا ایک نصیحت تھی، ہر باپ کو اپنی اولاد کو یہ نصیحت ضرور کرنی چاہیے۔ ''شارٹ کٹ'' سید محمود حسن صاحب، آپ یہ تحریر لکھنے کی بجائے اس حوالے سے کوئی آرٹیکل یا فیچر لکھ کر کسی اخبار میں بھیج دیتے۔ ایسے کئی اخبار ہیں جس میں نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے ایسے مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ ''کلاچی سے کراچی'' دلچسپ تھی اور ''الفاظ بنے ہتھیار'' بھی اچھی رہی۔''

☆ حنیف ادیب کا پیام لاہور سے۔ ''آج اکیس تاریخ ہے اور نئے سرگزشت کا انتظار ہے۔ یہاں لاہور میں سرگزشت چوبیس پچیس تاریخ کو ملتا ہے۔ ابھی پرچا نہیں آیا۔ بہرحال آئندہ شمارہ ماہ جنوری کے لیے ایک تحریر بھیج رہا ہوں ''سوچ کے زاویے'' یہ ایک ایسی تحریر ہے جس سے قارئین کی معلومات میں ایک مفید اضافہ ہوگا۔ یہ تعمیر شخصیت کے سلسلے کی ایک ایسی کڑی ہے جو ہر ایک کو دعوت فکر دیتی ہے (تحریر دلچسپ ہے لیکن سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے اسے کسی میگزین یا اخبار میں بھیج دیں)۔ ''غالبیات'' کو آپ نے اقتباسات کی شکل میں شائع کیا، شکریہ۔ یہ آپ کی نوازش ہے کہ اس ناچیز کے ٹوٹے پھوٹے حروف کو اپنے ماہنامہ میں جگہ دی اور میرے مراسلے بھی شائع کر دیے۔ ''شہر خیال'' کے صفحات پر اکثر دوستوں کے مراسلے نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ دو ایک نے مجھے یاد کیا اور میرے تبصروں کی تعریف بھی کی ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

☆ اعجاز حسین ستھار کی خوشخبری نور پور تھل سے۔ ''پرچا اپنی تمام خوبیوں اور خوب صورتی کے ساتھ جلوہ افروز ہوا ہے۔ خطوط کی محفل پوری سج دھج کے ساتھ موجود ہے۔ دوست اپنے مشوروں، تبصروں کے ساتھ چہک رہے ہیں۔ زندگی میں ایسی معروفیات بور ہونے دیتی ہیں نہ بیمار اور مایوس۔ میں بھی بڑی دلچسپی اور وارفتگی سے تمام مضامین اور کہانیوں کو ایک نظر دیکھتا گیا یہاں تک کہ ''این گونگ کا آدم خور'' نے توجہ کھینچ لی۔ شکار کی یہ کہانی سابقہ روایات سے ہٹ کر لکھی گئی ہے جس سے تحریر کی جاذبیت میں اضافہ ہوا۔ روز میری کی بے وقت اور دردناک موت نے دل مغموم کر دیا۔ خطروں کی خبر دینے والی خود کس آسانی سے موت کی آغوش میں چلی گئی۔ وہ غیر معمولی ذہانت رکھنے والی نوعمر لڑکی تھی لیکن اپنے حصہ کی خوشیاں حاصل نہ کر سکی جس کا افسوس رہے گا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' ندیم اقبال پوری جزویات کے ساتھ لکھ رہے ہیں، اب اس ٹولی میں دوستوں کے ساتھ نسرین کا سیاپا بھی شامل ہو گیا ہے جس کا انجام جدائی کے سوا کیا ہونا ہے لیکن جذبات نگری اور منظر کشی عروج پر ہونے کی وجہ سے قارئین کی دل کی دھڑکنیں بڑھ چکی ہیں۔ شاید کوئی غیر متوقع انجام یا موڑ واقعات میں جان ڈال دے لیکن مجھے ایسا حقیقت میں ہوتا نظر نہیں آ رہا لیکن خوش فہمی پر کوئی پابندی نہیں، بس آگے دیکھیے کیا پڑھنے کو ملتا ہے۔ ''ناسور'' میں نعمان کی شخصیت کئی محاذوں پر برسرپیکار ہے لیکن اس کا جسم تھکتا ہے نہ ذہن بوجھل ہوتا ہے۔ ایک ایسی توقع ہی جنوں سے رکھی جا سکتی ہے۔ ہمارا ذہن اور سوچیں دھماکوں کی زد پر ہیں۔ ہر کردار بوجھل بن چکا ہے اور کرداروں کی بہتات ہوتی جا رہی ہیں، یوں الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ بھٹی صاحب ذرا ہلکے انداز میں چلیں، پیار محبت کی میٹھی باتیں، سرگوشیاں اور اشاروں سے کام چلائیں، سازشی عناصر کو دور دور رکھیں اٹھان قابل داد ہے لیکن جب ہر کردار کے ہاتھ میں ڈانگ اور ہتھوڑا ہوگا تو قارئین الجھن کا شکار ہو جائیں گے۔ نئے کردار وقفے وقفے سے شامل کریں تو خوب صورتی اور مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ پہلی سچ بیانی ''عشق گزیدہ'' انفرادی آغاز و اختتام کی کہانی ہے۔ واقعی معاشرتی روایات سے بغاوت ایسا زخم دے جاتی ہے کہ کتنی بڑی قربانی دینے کے باوجود بھی مداوا نہیں ہوتا جیسے بندوق کی نال سے نکلی

گولی، زبان سے نکلے الفاظ اور پلوں کے نیچے سے بہنے والا پانی واپس نہیں آ سکتا۔ رخشی کے بھائی خاندان میں عزت گنوانے کا زخم نہ سہہ سکے اور درندے بن گئے حالانکہ وہ بہن سے قطع تعلق کر لیتے تو یہ محرومی بھی رخشی کے لیے کم نہ تھی لیکن وہ کمال کے منصوبہ ساز تھے۔ وکٹن کو من مرضی کی چوٹ لگا کر بھی اپنے ہاتھ صاف بچا گئے پھر حسن کے پاس اتنی طاقت تھی نہ قبیلہ ساتھ تھا وگرنہ وہ بھی زندگی کی آخری جنگ لڑ کر انہیں ناقابل تلافی جانی اور مالی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ بس اپنی امن پسند طبیعت کی وجہ سے محبت کا پیغام پہنچاتے ہوئے بے سکون رہا اور آخر جینے کا سہارا بھی چھن گیا۔ میں سمجھتا ہوں یہاں ہر دو فریقین کے لیے سبق موجود ہے۔ ہر کوئی وقت، حالات اور اپنے وسائل کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہے۔ ''شارٹ کٹ'' میں سارا الزام فراڈی کمپنیوں پر رکھ دیا گیا ہے لیکن کچھ عمل دخل ہماری حماقتوں، جلد بازی اور لالچ کا ہوتا ہے۔ کشتی پر سوار ہونے سے پہلے اس کی کارکردگی اور ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ جب دریا کے عین بیچ کشتی ڈولنے لگے تو پھر شور، فریاد اور واویلا مچانا بے کار ہے۔ یہاں بھی دونوں جوانوں نے بغیر سوچے سمجھے پتنی جوائن کر لی۔ وہاں کوئی دفتری ماحول تک نہ تھا۔ ان کا نقصان تو واپس نہیں ہو سکتا لیکن دوسرے ضرور دامن بچا سکتے ہیں۔ ''فیکا'' میں انسانی نفسیات، عادات اور مشاغل کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے بلکہ پورے ماحول کی خوبصورت انداز سے منظر کشی کی گئی ہے۔ کردار کی کمزوریاں اپنی جگہ لیکن فیکا ایک عہد تھا ہر محفل اور تقریب میں نگینہ کی طرح فٹ تھا۔ بچوں، بڑوں کو رجھانا اور تفریح فراہم کرنا جس میں لالچ کا کوئی عنصر شامل نہ ہوتا تھا یہ اس کی اضافی خوبی تھی۔ ایسی معلوماتی اور چسکے دار کہانی لکھنے پر طارق عزیز خان مبارک باد قبول کریں۔ ''بڑا آدمی'' میں تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے لیکن محنت کی افادیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ جہاں تک ہما کے رویہ کی بات ہے وہ حقیقت پسند لڑکی تھی اگر اپنا مستقبل کا ارادہ شروع میں ظاہر کر دیتی تو دوسرے فریق کے لیے زندگی بے مقصد بن جاتی وہ کوئی مقام حاصل نہ کر پاتا، اس لیے مناسب موقع پر دل کی بات کہی لیکن اس میں منافقت شامل نہ تھی۔ بہرحال یہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔ ''نیا حکمراں'' کا انجام غیر متوقع ہے ایسا آئیڈیا ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ شاید ہمارے کرتوت اتنے شرمناک اور بھیانک ہیں کہ اسی سلوک کے مستحق ہیں۔ ''شریف'' جیسا شریف، بے ضرر اور در گزر کرنے والا معاشرے اور خاندان میں ان فٹ رہتا ہے۔ جہاں تک ہما کے رویہ کی بات ہے وہ حقیقت پسند لڑکی تھی اگر اپنا مستقبل کا ارادہ شروع میں ظاہر کر دیتی تو دوسرے فریق کے لیے زندگی بے مقصد بن جاتی وہ کوئی مقام حاصل نہ کر پاتا، اس لیے مناسب موقع پر دل کی بات کہی لیکن اس میں منافقت شامل نہ تھی۔ بہرحال یہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔ ''نیا حکمراں'' کا انجام غیر متوقع ہے ایسا آئیڈیا ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ شاید ہمارے کرتوت اتنے شرمناک اور بھیانک ہیں کہ اسی سلوک کے مستحق ہیں۔ ''شریف'' جیسا شریف، بے ضرر اور در گزر کرنے والا معاشرے اور خاندان میں ان فٹ رہتا ہے، کسی معاملے میں اسے اہمیت نہیں دی جاتی وہ خود بھی کوئی بھاری ذمہ داری لینے سے ہچکچاتا ہے بلکہ اپنا حق مانگنے کا سلیقہ نہیں رکھتا اسی دیر کر دینے کی عادت کی وجہ سے نقصان میں رہتا ہے، یہاں بھی اگر عامر سحر پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیتا تو وہ کسی وقت پھسل سکتا تھا۔ اگر حالات اور خوش قسمتی شریف کا ساتھ نہ دیتے تو خاموشی، شرافت اور راز پر پردہ ڈالنے کی نیکی بھی کسی کام نہ آتی اور سحر اپنی خوش اخلاقی کا ایسا سحر طاری کرتی کہ میٹھی چھری کھا کر بھی طوطے کی طرح اپنے آبائی ٹھکانے کی طرف اڑ جاتی۔ ''پرسلٹ'' دراصل کئی ہزار وولٹ کا جھٹکا ہے جو اشرف صاحب کو لگا اور تمام کمسکے پرزے اپنی جگہ پر آ گئے ہیں۔ وہ جس نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھے اور بے پر کی چھوڑتے رہتے تھے بس ایک چوٹ نے سارا معاملہ سدھار دیا۔ ایسی کئی دوسری کمزوریاں ہم سب رکھتے ہیں۔ خود پھنسنے سے پہلے دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کر کے سکون سے سو سکتے ہیں وگرنہ رسوائی، شرمندگی اور جیل یاترا کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ ''کرن سے آفتاب'' انسانی رویوں، منہ بولے رشتوں اور مذہب، رنگ و نسل اور ذات پات اور نیچ کی نفی کرنے والی دلگداز اور آنکھیں نم کر دینے والی کہانی ہے۔ جب دل میں احترام ہو تو منافقت اور نفرت ایسی عبرت ناک شکست سے دوچار ہوتی ہیں کہ منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملتی تب بھائی چارہ جیت کی خوشی میں بھنگڑا ڈالتا ہے۔ دعا ہے اللہ سب کے ایسے نصیب کرے کہ آنکھوں کو اشکبار ہونے کا موقع نہ ملے، آمین۔ اب سب دوستوں کو بڑی بے چینی سے ''مرگِ ناگہاں نمبر'' کا انتظار ہے۔ نئے سال کی آمد کے ساتھ یہ پٹاری بھی کھل جائے گی لیکن تب تک تجسس ہماری خبر لیتا رہے گا۔''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے۔ ''اردو کے معروف شاعر فیض احمد فیض کے والد کے بعد ان پر بھی یک طرفی دلچسپ رہی۔ معراج رسول کا اداریہ ہمارا معاشرتی نوحہ ہے۔ انہوں نے جو مختصر کہانی لکھی ہے یہی اس ملک کا بڑا المیہ ہے کہ بغیر سفارش اور رشوت کے آپ کا کام نہیں ہوتا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ جب بھی مختلف اسامیوں کے لیے درخواست بھیجی جاتی ہے تو کوشش کی جاتی ہے کہ کسی ایم این اے، ایم پی اے یا بااثر شخص کی سفارش ڈھونڈی جائے۔ دوسری صورت میں ملازمت کے لیے درخواست دینے کا کوئی فائدہ نہیں اس سوچ کے ساتھ ہم میرٹ کا صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ''شہر خیال'' میں آفتاب احمد نصیر کرسی صدارت پر تھے۔ تبصرہ اچھا لگا۔ نشی محمد عزیز کا خط بھی اچھا تھا۔ ان کے سالانہ تجزیے کا انتظار ہے۔ عباعمر انصاری! ہم بھی سرگزشت خرید کر ہی پڑھتے ہیں۔ قیصر خان! شوبز چھوڑنے والے اکثر اداکاروں کے بڑھاپے کے ایام کسمپرسی میں ہی گزرتے ہیں۔ نیلی کے بارے میں انور فرہاد کو مضمون لکھنا چاہیے۔ نزاہت افشال بھی اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کر رہے تھے۔ نزہت افتخار، موموا قبال، عباعمر انصاری، نجمہ ملک، نوشین ملک اور ڈاکٹر آفاق حسین سید اچھا اضافہ ہیں۔ سلمٰی جبیں کا کینیڈا سے خط پڑھ کر اچھا لگا کہ سرگزشت بیرون ملک بھی اتنا مقبول ہے۔ وحید ریاست بھٹی، بشریٰ افضل

گزشتہ شمارے (دسمبر 17) کے یک طرفی ''شاعرِ رومان'' میں فیض احمد فیض کی تاریخ پیدائش کمپیوٹر کی غلطی سے الٹ گئی۔ 13 کی بجائے 31 فروری ہو گئی۔ ہم اس سہو پر قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

اور روبینہ نفیس انصاری نظر نہیں آرہے۔ اللہ سب کو آسانیاں عطا فرمائے (آمین)۔ ہم تو عمر خیام کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ ایک بڑے ریاضی دان اور سائنس دان تھے۔ گویا شاعری میں بھی ان کا بڑا مقام تھا۔ ضیاء تسنیم بلگرامی نے ان کے بارے میں بڑی دلچسپ معلومات فراہم کیں۔ نئے سال کی مناسبت سے وسیم بن اشرف کی تحریر ''میٹی نیو ایئر'' دلچسپ رہی۔ نئے سال کی آمد پر لوگ کیسی عجیب و غریب رسومات ادا کرتے ہیں۔ پڑھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ تعجب بھی ہوا کہ جدید دور میں بھی توہم پرستی عام ہے جب کہ ہمارا دین تو یہی بتاتا ہے کہ نئے سال پر آپ اپنا جائزہ لیں کہ گزشتہ سال کیا غلطیاں کیں کہ جن کو نہ کر کے آئندہ سال کو بہتر بنایا جاسکے کیونکہ گزرے وقت سے سبق حاصل نہ کرنے والے سے زیادہ بے وقوف شخص کوئی نہیں ہوتا۔ محمد اقبال مانڈویا نے ''کلاچی تا کراچی'' پاکستان کے سب سے بڑے شہر پر دستاویز نما معلوماتی تحریر لکھی۔ شکیل صدیقی نے بڑے ہی دلچسپ انداز میں ادب کے سرخیل مشفق خواجہ کی سرگزشت لکھی۔ پڑھ کر دلچسپی بڑھی کہ وہ شہرت کے طلب گار نہیں تھے حالانکہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ شہرت ہر ادیب و شاعر کی اوّلین ترجیح ہوتی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ بڑے لوگوں کے مقصد بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے گھر کے گیارہ کمروں میں سے 10 میں کتابیں رہتی تھیں۔ کتاب سے اس سے بڑی محبت کیا ہوگی۔ شکیل صدیقی نے مضمون کے آخر میں ایک کتاب ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' از ڈاکٹر طاہر مسعود کا حوالہ دیا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ یہ وہی ڈاکٹر طاہر مسعود ہیں جو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اس سے پہلے بچوں کے ایک معروف رسالے ''آنکھ مچولی'' کے بھی ایڈیٹر تھے۔ ''کتابیں'' کشمالہ حسن کا دنیا کی مشہور اور اہم کتابوں پر مختصر مضمون تھا۔ کتابوں کے بارے میں تھوڑا تفصیل سے بتایا جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔ جب تک جنوری کا شمارہ آئے گا، والدہ محترمہ کو اللہ تعالیٰ کے پاس گئے تین سال ہو جائیں گے۔ اس موقع پر قدرت اللہ شہاب کی شاہکار تحریر ''ماں جی'' کے آخری جملے یاد آرہے ہیں۔ ''ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ماں جی کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔'' آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے۔''

☆ لیجیے جناب بغیر کسی تمہید کے ماہنامہ سرگزشت کا سالانہ تجزیہ برائے سال 2017ء بقلم منشی عزیز مئے لڈن وہاڑی ملاحظہ فرمایئے۔ ''سال بھر کے بارہ شمارے کل تین ہزار پانچ سو چار صفحات پر مشتمل تھے جن میں سے ایک سو ستاون صفحات اشتہارات کے لیے مختص رہے گویا صرف 4.48 فیصد صفحات پر اشتہار تھے۔ ''مشہر خیال'' کے کل چھیانوے صفحات پر دو سو تینتیس خطوط شائع ہوئے، جن میں سے ایک سو پچانوے خطوط حضرات کے اور صرف اڑتیس خطوط خواتین کے تحریر کردہ تھے۔ احوال میں خواتین کا حصہ صرف 16.30 فیصد رہا۔ لیٹ کمرز میں سے ایک سو انیس حضرات اور تیس خواتین شامل ہیں گویا 13-20 فیصد نمائندگی خواتین نے کی۔ ''بیت بازی'' کے تحت کل چار سو اکیس اشعار شائع ہوئے جن میں سے دو سو چھیانوے میل چواس اور ایک سو پچیس فی میل چوائس تھی یہاں خواتین کی نمائندگی 2969 رہی۔ ''یک سخنی'' داستان کے تحت مسعود حسن رضوی، جیلانی بانو، ماہرا فغانی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، امیر خسرو، شیخ سعدی، فانی بدایونی، یاس یگانہ چنگیزی، ہاجرہ مسرور، سلطان محمد خان اور فیض احمد فیض پر مختصر مگر مفصل حالات بیان کیے گئے۔ سلسلے وار میں جنوری 2017 میں ''سراب'' اختتام پذیر ہوئی جب کہ فروری سے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ''ناسور'' میں مگن ہیں۔ سچ بیانیاں کے تحت سال کے بارہ شمارے میں ایک سو آٹھ سچ بیانیاں شائع ہوئیں جن کو لکھنے والوں میں انہتر حضرات اور انتالیس خواتین شامل ہیں۔ ''شخصیت'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر ساجد امجد نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی، حمید اختر، اسماعیل میرٹھی، علی سردار جعفری، صالحہ عابد حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، سگمنڈ فرائیڈ اور حیدر دہلوی پر بھرپور مضامین لکھے۔ دسمبر کا مضمون ماہر ریاضی ضیاء تسنیم بلگرامی صاحبہ کا ہے اس کے علاوہ محترمہ ضیاء تسنیم بلگرامی صاحبہ کے تین مضمون شائع ہوئے جو کہ ابن الہیثم، متنبی اور علامہ ابن جوزی پر لکھے گئے تھے۔ اب ہم کہانیوں اور مضامین کی طرف چلتے ہیں کہ کس لکھاری کے کتنے مضامین یا تحریریں سال 2017ء میں سرگزشت کی زینت بنیں۔ اس تفصیل میں سچ بیانیاں، سلسلے وار ناول ناسور اور سر ندیم اقبال کا سفر نامہ شامل نہیں ہیں ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ دیگر کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ سب سے پہلے حضرات لکھاری جن کی صرف ایک ہی تحریر سرگزشت کا حصہ بنی۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ رئیس خالد (جنوری)، علیم شاہد (مارچ)، عبداللہ احمد حسن (مارچ)، امجد رئیس (اپریل)، رانا محمد شاہد (اپریل)، سلیم فرخی (اپریل)، ابراہیم جمالی (مئی)، محمد شیراز (مئی)، شکور پٹھان (جون)، مختار آزاد (جون)، تنویر ریاض (جولائی)، شفقت محمود (جولائی)، خالد محمود (جولائی)، غلام حسین میمن (اگست)، خالد قیوم (ستمبر)، سید احتشام (نومبر)، محمد اقبال مانڈویا (دسمبر)، عزیز میرٹھی (دسمبر) اور خالد قریشی (دسمبر) کا نام شامل ہے۔ جن حضرات کی فی کس دو تحریریں سرگزشت میں شائع ہوئیں ان کے نام یہ ہیں۔ قاسم رضا (فروری، مئی)، اعتزیز، زریاب وصلی (اپریل، ستمبر)، شیراز خان (مئی، نومبر)، زین مہدی (جون، ستمبر)، سعید احمد سلطان (جون، اکتوبر)، افتخار بجاز (ستمبر، اکتوبر)، شاہد لطیف کی تین تحریریں جولائی، اگست اور اکتوبر میں شائع ہوئیں۔ وسیم بن اشرف کے بھی تین مضمون سرگزشت کا حصہ بنے (سچ بیانیاں میں ان کی تحریر کردہ دو سچ بیانیاں علیحدہ ہیں)۔ طارق عزیز خان کے چار مضامین فروری، جون، ستمبر اور دسمبر میں شائع ہوئے

اور دسمبر ہی میں ان کی ایک سچ بیانی بھی شائع ہوئی۔ منظر امام صاحب کے پانچ مضامین جنوری، اپریل، مئی اور اگست میں شائع ہوئے۔ ایک سچ بیانی ان کے علاوہ تھی۔ شکیل اور یس کے بھی چار مضامین جنوری، مئی، جون اور اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئے۔ کاشف زبیر مرحوم کے چھ مضامین مارچ، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے سرگزشت کی زینت بنے۔ شکیل صدیقی کے سات مضامین جنوری، اپریل، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے سرگزشت کا حصہ بنے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے آٹھ مضامین جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، اگست اور نومبر میں شائع ہوئے اور مرد لکھاریوں میں بزرگ لکھاری انور فرہاد نے قلم نگری کے تحت مسلسل باقاعدگی سے حاضری لگوائی۔ آپ کے بارہ مضامین سرگزشت میں شائع ہوئے۔ خواتین لکھاریوں میں سے جن خواتین نے ایک تحریر کے ساتھ لکھاریوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوایا ان کے نام یہ ہیں۔ راحیلہ کاشف (جنوری)، دانیہ صدیقی (اگست) اور عائشہ انور (اگست)۔ ثناء ثاقب کی دو تحریریں مئی اور اگست کے شماروں کا حصہ بنیں جب کہ کشمالہ حسن کی بھی دو ہی تحریریں اگست اور دسمبر کے شماروں میں شائع ہوئیں۔ فرزانہ نگہت کی تین تحریریں مارچ، اگست اور نومبر کے شمارے میں شائع ہوئیں۔ سلمیٰ اعوان کے پانچ مضامین مارچ، جولائی، ستمبر، اکتوبر اور دسمبر کے شماروں میں شائع ہوئے جب کہ تین سچ بیانیاں علیحدہ سے شائع ہوئیں۔ صائمہ اقبال کی چھ تحریریں جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی اور جون کے شماروں میں شائع ہوئیں۔ خواتین لکھاریوں میں زویا ایجاز بازی لے گئیں۔ کل کی تبصرہ نگار آج کی بہترین لکھاری کے روپ میں ہمارے سامنے آئی ہیں جنہیں پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ زویا جی کے آٹھ مضامین جنوری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی اور نومبر کے شماروں میں شائع ہوئے۔ جب کہ تین سچ بیانیاں ان کے علاوہ تھیں۔ لیجیے جناب اب ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں شہر خیال کی جانب مگر ذرا دھیمے دھیمے۔ سال 2017ء میں جن حضرات نے صرف ایک ہی بار کی حاضری کو کافی سمجھا اور ان کا صرف فی کس ایک خط شائع ہوا، ان کے نام یہ ہیں۔ سید محمود حسن، مور شاہد حسین، غلام مرتضیٰ، عبداللہ شجاع سندھی، خالد شیخ، احسان سحر، پروفیسر راشد احمد غوری، منظر علی خان، عبدالرحمٰن، اختر عباس شاہ، احسن راٹھور، آفتاب احمد خان، اختر ہمایوں اختر، ملک ثاقب شادنولی، عمران بلا، آغا نیاز مگسی، احمد خان توحیدی، ذیشان شیخ، محمد سلیم قیصر، محمد انور، نصر اللہ خان، محمد عارف، شفقنز عباس مرزا، وحید ریاست بھٹی، ڈاکٹر غفور شکیل، شاہد نقوی، شاہد اقبال شاہد، ایاز راہی، ظفر اقبال ظفر، صفدر معاویہ، عبدالحکیم ثمر، فضل رؤف مروت، امجد علی سید، انور سلطان، ندیم افضل، طاہر مجاہد، نذیر احمد راجپوت، خالد محمود، ذیشان ریاض، حسیب اشرف، انور علی بھٹو، اکبر پاشا، ڈاکٹر آفاق حسین سید اور ایم عثمان کے نام شامل ہیں۔ سلیم ارشد، عبدالحمید جانی، کلیم اللہ ایڈووکیٹ، محمد عامر آرٹسٹ، حکیم سید محمد رضا، غلام سبحانی، وہاب احمد، محمد احمد رضا انصاری اور ظہیر تبسم کے فی کس دو خطوط شائع ہوئے۔ محمد عمران خان، ایم اے حفیظ، محمد ابراہیم، سید امتیاز حسین بخاری، سید مسرت حسین رضوی کے تین تین خطوط شہر خیال کا حصہ بنے۔ ندیم اقبال صاحب نے چار مرتبہ شہر خیال کی رونق میں اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ مرحوم سعید احمد چانڈ کے بھی چار خطوط شائع ہوئے۔ اویس شیخ، امیر حمزہ اشرف، قیصر عباس خان، ڈاکٹر حنیف ادیب، انجم فاروق ساحلی، منشی محمد عزیز مئے راقم الحروف کے فی کس پانچ خطوط شائع ہوئے۔ فقیر غلام حسین ضیاء، انور عباس شاہ، عبدالجبار روی انصاری، رضا احمد خان اعوان کے فی کس سات خطوط شہر خیال میں شائع ہوئے۔ اعجاز حسین ستھار، نزابت افشال، سیف اللہ اور رانا محمد شاہد فی کس دس خطوط کے ساتھ شہر خیال میں دوسری پوزیشن پر رہے اور پہلی پوزیشن حاصل کی ہے ہمارے مقبول دہر دلعزیز تبصرہ نگار آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب نے۔ آپ کے گیارہ خطوط شہر خیال کی زینت بنے اور صرف اپریل میں آپ کسی وجہ سے حاضری لگوانے سے قاصر رہے۔ اب ذرا خواتین کی کارکردگی پر ایک نظر ڈالیے۔ تحریم تلوکر، نجمی رحمٰن، رضوانہ قریشی، ضلالین زارا، پری زرو جہاں، بشریٰ افضل، مقدس جہاں، جینا، سحرش سحر، نادیہ عنبر لودھی، موموا قبال، عباعمر انصاری، نجمہ ملک، نوشین ملک اور سلمیٰ جبیں نے صرف ایک بار ہی شہر خیال میں حاضری لگوائی۔ روبینہ نفیس انصاری اور راحت وفا راجپوت نے دو بار یہ غلطی کی حالانکہ ایسی غلطی تو بار بار کیے جانے پر بھی قابل معافی ہوتی ہے۔ آنا اور آتے ہی چھا جانا کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ نزہت افتخار بھی ایک ایسا ہی نام ہے جو کہ شہر خیال میں دو بار تشریف لائیں اور مدیر اعلیٰ کو ان کا انداز تحریر اور مختصر و مفصل تبصرہ بہت پسند آیا۔ نزہت جی مبارک باد کی مستحق ہیں۔ عریشہ کے چار خطوط شائع ہوئے اور ٹاپ پر رہیں۔ ہماری گڑیا بہن سدرہ بانو ناگوری، ان کے دس خطوط شائع ہوئے۔ سدرہ بانو مبارک باد قبول فرمائیں۔ اب ہم مستقل تبصرہ نگاروں کی کارکردگی پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ آفتاب احمد نصیر اشرفی، اعجاز حسین ستھار، رانا محمد شاہد، نزابت افشال، سیف اللہ مستقل مزاجی سے لگے رہے۔ انور عباس شاہ، عبدالجبار روی انصاری، رضا احمد خان اعوان، فقیر غلام حسین ضیاء، اویس شیخ، امیر حمزہ اشرف، ڈاکٹر حنیف ادیب، انجم فاروق ساحلی اور منشی محمد عزیز مئے گاہے بگاہے حاضری لگواتے رہے۔''

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

اختر شاہ عارف، جہلم۔ اُم منابل، ایبٹ آباد۔ شوکت رحمٰن خٹک، پشاور۔ عاقب اشعر، ایبٹ آباد۔

Pakistanipoint
دانشور
Waqar
ڈاکٹر ساجد امجد
Azeem

اک تماشا بن گئے ہم بھیڑ میں باہر سے ہم
اس لیے بہتر ہوا خود ہٹ گئے منظر سے ہم

وہ اس دور کی ایسی شخصیت تھا کہ لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اس کے نظریے، اس کے کُلیے کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ کُلیے جو آج بھی درسی کتب کی زینت ہیں، جن کے بغیر علم الحساب ادھورا ہے لیکن جب جہل کی آندھی اٹھی تو سب کچھ راکھ کی طرح بکھر گیا۔ وہ بھوکا پیاسا ایک مندر میں چھپا رہا اور فاقوں نے اس سے اس کی زندگی چھین

ماضی پر رقم دانشور کا عبرت بھرا قصہ

یونان کے ایک جزیرے ''ساسوس'' کی مختصر سی آبادی کے سروں پر رات اتر آئی تھی۔ یہ جزیرہ ابھی کچھ دن پہلے قحط کی جان لیوا مصیبت سے باہر آیا تھا اس لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ چراغوں کی روشنی چراغوں ہی میں بند کردی جائے۔ پوری بستی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف ایک گھر ایسا تھا جس کی ایک کھڑکی سے روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ یہ ''ساسوس'' کے مشہور تاجر منسارکس کی دکان تھی جس کی کچھ دن پہلے شادی ہوئی تھی۔

یہ نوبیاہتا جوڑا اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ روشنی ان کے ساتھ جاگ رہی تھی۔

''فتیاس!'' منسارکس نے اپنی بیوی سے سرگوشی کی۔

''میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی خوب صورت بیوی

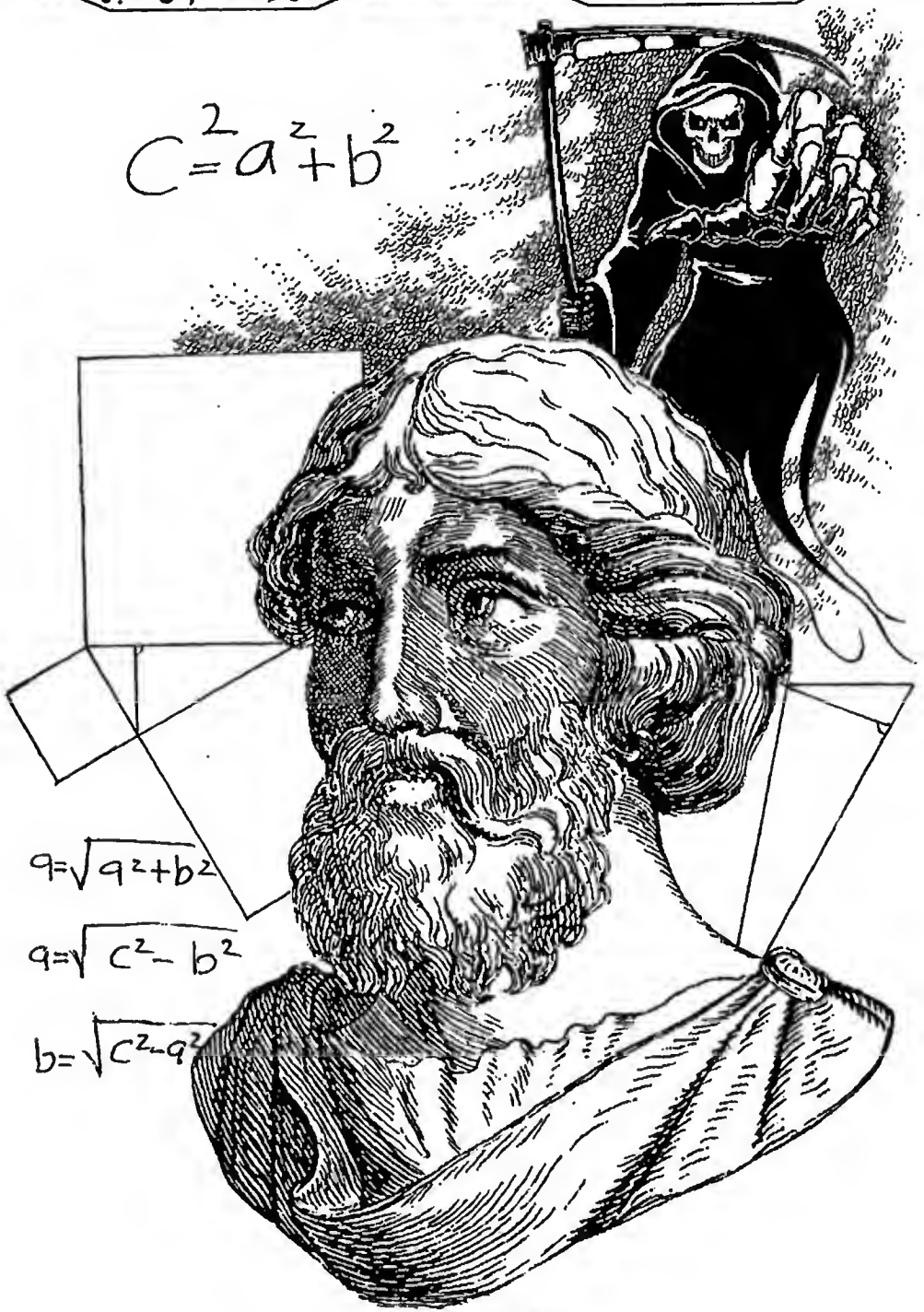

ملی ہے۔"

"یہ کہہ کر آپ اپنی اہمیت کیوں کم کرتے ہیں۔ آپ نے تو ساموس والوں پر وہ احسان کیا ہے جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتے۔ آپ کا یہ احسان کہانیوں کی طرح یاد رکھا جائے گا۔"

"تم کس احسان کی بات کر رہی ہو۔ کیا یہ احسان ہے کہ میں نے تم سے شادی کر لی؟"

"فتیاس، میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"وہ دن یاد کیجیے جب آپ ساموس میں نئے آئے تھے۔"

"مجھے وہ دن خوب یاد ہیں۔ میں اپنے وطن "ٹائر" سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اپنی دولت اور تجارتی سامان لے کر ساموس چلا آیا تھا۔"

"اگر یہ یاد ہے تو یہ بھی یاد ہوگا کہ جب تم یہاں آئے تھے تو تمہیں کسی نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ میرے والد تو آپ سے نفرت کرتے تھے۔"

"یہ تو کوئی ایسی تکلیف دہ بات نہیں۔ نئے آنے والے کا استقبال اسی طرح ہوتا ہے تمہارے والد نے تو مجھے یہاں سے نکالنے کا پورا بندوبست کر ہی لیا تھا۔"

"پھر ہم لوگ قحط سے دوچار ہو گئے تھے۔"

"کتنے تکلیف دہ دن تھے وہ بھی۔" منسارکس نے کہا۔

"اس قحط کے دوران سب کی زبان پر یہی تھا کہ جو اجنبی یہاں آیا تھا قحط سے گھبرا کر بھاگ گیا بلکہ یہ تک مشہور ہو گیا تھا کہ یہ قحط تمہاری نحوست کی وجہ سے آیا ہے۔ پھر ایک دن شور مچ گیا کہ وہ اجنبی یعنی تم اپنے وطن ٹائر گئے تھے اور وہاں سے مکئی کا اناج لے کر واپس آ گئے ہو اور ساموس والوں میں بانٹ رہے ہو۔ اسی دن میں نے بھی آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ میں اسی احسان کی بات کر رہی ہوں۔"

"ساموس والوں کا احسان بھی کچھ کم نہیں کہ انہوں نے اس کے بدلے میں مجھے ساموس کی شہریت دے دی اور پھر تم بھی مجھے مل گئیں۔" یہ کہتے ہوئے منسارکس، فتیاس کے اور قریب ہو گیا۔

"شہریت تو آسانی سے مل گئی لیکن میں اتنی آسانی سے نہیں ملی ہوں۔" فتیاس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔ تمہارے والد نے تو اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ کسی قیمت پر شادی کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو تمہاری ضد کام آ گئی۔"

"جی نہیں میں نے کوئی ضد نہیں کی تھی۔"

"سننے میں تو یہی آیا تھا کہ تم نے اپنے باپ کو مجبور کیا تھا۔"

"مجبور تو نہیں کیا تھا، صرف اتنا کہا تھا کہ تم اچھے آدمی ہو۔ تم نے قحط کے دنوں میں ہماری مدد کی ہے۔"

"اسی کو تو مجبور کرنا کہتے ہیں۔"

"چلو میں نے ہی مجبور کیا تھا اور اب مجھے فخر ہے کہ میں نے غلطی نہیں کی تھی۔ آپ خوب صورت بھی ہیں اور نیک بھی۔" فتیاس نے شوہر کے نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا تم واقعی مجھے اتنا اچھا آدمی سمجھتی ہو؟"

"کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟"

"اچھا اگر میں کچھ دنوں کے لیے تم سے دور ہو جاؤں؟"

"اب میں آپ سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی اور پھر ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے میں ایک تاجر ہوں۔"

"یہ کون سی نئی بات آپ نے مجھے بتائی۔"

"مجھے تجارت کے لیے ملک شام کی طرف جانا ہے۔ نہ جانے کب واپسی ہو۔"

"آپ یہ سفر کیوں کر رہے ہیں۔"

"اس لیے کہ یہ سفر میرے لیے منافع بخش ثابت ہوگا۔"

"تجارت میں نقصان بھی تو ہوتا ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ فائدہ ہوگا۔"

"ہم اتنی دولت کما کر کیا کریں گے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میرے پاس رہیں۔"

"شاید اس کے بعد نہ جاؤں لیکن ابھی تو جانا ہوگا۔"

"آپ چلے جائیں، میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

"دیکھو یہ مت کرنا۔"

اس سے پہلے کہ وہ کروٹ بدل کر سو جاتی منسارکس نے ہاتھ بڑھا کر چراغ بجھا دیا۔ اس وقت وہ فتیاس میں الجھا ہوا تھا لیکن اس کا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا کہ وہ فتیاس کے انکار کو کس طرح اقرار میں تبدیل کرے۔

فتیاس کے مسلسل انکار نے منسارکس کو بھی وہم میں ڈال دیا تھا۔ ہو سکتا ہے شام کا سفر اس کے حق میں نیک ثابت نہ ہو۔ تو کیا میں یہ سفر منسوخ کر دوں؟ بے پناہ منافع کو نظر انداز کر دوں۔ نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔ فتیاس خوب صورت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی خاطر میں اپنا مستقبل تاریک کر لوں۔

فتیاس بھی انہی مراحل سے گزر رہی تھی۔ وہ بھی کوئی

ایسی ترکیب سوچ رہی تھی کہ جس پر عمل کر کے وہ اپنے شوہر کو شام کے سفر پر جانے سے روک سکے یا کم از کم کسی یقین دہانی کے بعد وہ اسے سفر پر جانے کی اجازت دے۔

دونوں کے ذہن ایک ہی سمت میں سفر کر رہے تھے لیکن منسارکس کا ذہن اس سے پہلے منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ اسے یاد آیا کہ ایک مرتبہ اس کی ماں اور اس کے باپ کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو گیا تھا۔ پھر دونوں کے درمیان یہ طے ہوا کہ "ڈیلفی" کے مندر جایا جائے اور وہاں کی پجارن کے سامنے مسئلہ رکھا جائے۔ غیبی آواز جو فیصلہ سنا دے اس پر عمل کیا جائے۔

منسارکس آج اسی منزل پر کھڑا تھا۔ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس اختلاف کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بھی سوچ لیا کہ وہ فتیاس کو لے کر ڈیلفی کے مندر جائے گا۔ اس کی یہ ہمت اس لیے ہوئی کہ فتیاس نے اسے پہلے ہی دن بتا دیا تھا کہ وہ اپالو دیوتا کی پجارن ہے اور ڈیلفی کے مندر میں اپالو دیوتا کی پوجا بھی کی جاتی تھی۔

یہ مندر ایتھنز کے مضافات میں پریتی کی پہاڑی کی ڈھلوان پر واقع تھا۔

یونانی بہت سے دیوتاؤں کو مانتے تھے۔ ان دیوتاؤں میں زیوس ان کا معبود اعلیٰ تھا۔ یہ مندر اسی دیوتا سے منسوب تھا۔

یونانی دیومالا میں اس مندر کا ذکر بہت اہم تھا۔ دیوتا زیوس نے اسی جگہ اپنی دھرتی ماں کے مرکز "ناف" کو دریافت کیا تھا۔

زیوس نے دو عقاب اڑائے۔ ایک عقاب مشرق کو اڑ گیا اور دوسرا مغرب کو۔ دونوں عقاب زمین کا چکر کاٹ کر جس جگہ پر دوبارہ ایک دوسرے سے ملے تو زیوس دیوتا نے اس جگہ کو دھرتی ماں کا مرکز یعنی دھرتی ماں کی "ناف" کہا۔ اسی مقام پر یہ مندر قائم کر دیا گیا۔

اس مندر کے دروازے پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ "اپنے آپ کو پہچانو۔" اس مندر میں ایک کاہنہ تھی۔ دور دور کے علاقوں سے لوگ اس کاہنہ سے اپنی حاجات کے لیے فال لینے آتے تھے۔ اس کاہنہ کے بارے میں مشہور تھا کہ زیوس کی جانب سے اس پر الہام ہوتا ہے اور وہ وجد کی حالت میں بالکل سچ سچ بتا دیتی ہے۔ اس لیے لوگ خاص کاموں اور اپنی بیماریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسی سے رجوع کرتے تھے۔ منسارکس بھی اس سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اس سے پہلے ضروری تھا کہ وہ فتیاس سے رجوع کرے۔

ایک ایسی ہی رات تھی۔ منسارکس کے گھر میں چراغ دیر تک جل رہا تھا۔ فتیاس اور وہ قریب قریب لیٹے ہوئے تھے۔ منسارکس نے بات آگے بڑھانے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا۔

"فتیاس! میں نے سنا تھا تم اپالو دیوتا کی پجارن ہو۔"

"ہاں تو کیا غلط سنا تھا۔"

"میں نے شادی سے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ جب تم میرے گھر آؤ گی میں تمہیں ڈیلفی کے مندر لے کر جاؤں گا تاکہ تم اپالو دیوتا پر نذرانے چڑھا سکو۔"

"یہ تو آپ سے بہت بڑی کوتاہی ہو گئی۔ آپ کو اپنی منت پوری کرنی چاہیے تھی۔ ہماری شادی کو ایک سال ہونے کو آیا اور آپ ابھی تک مجھے ڈیلفی کے مندر لے کر نہیں گئے۔"

"اب بھی کون سا وقت چلا گیا۔ ہم جلد ہی ڈیلفی کے مندر جائیں گے۔ وہاں جا کر غیبی آواز سے میں یہ بھی پوچھ لوں گا کہ مجھے تجارت کی غرض سے شام کا سفر کرنا چاہیے یا نہیں۔"

"آپ ابھی تک شام کا ارمان دل میں لیے جیتے ہیں۔"

"ضروری ہے کہ میں اپنے مستقبل کے لیے دولت جمع کروں۔"

"دیوتاؤں کو اگر یہی منظور ہوا تو پھر یونہی سہی۔"

بیوی کو یہ مشورہ دیتے ہی منسارکس نے ڈیلفی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اتفاق سے سالانہ تہوار کے دن بھی قریب تھے۔

اس نے تیاری کی اور ایتھنز پہنچ گیا۔ فتیاس کسی فرماں بردار بچے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ ایتھنز میں سالانہ تہوار کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کے بت بنائے جا رہے تھے۔ ایک جگہ کچھ بوڑھے بیٹھے پانسے ڈال رہے تھے۔ کچھ نوجوان بدن پر تیل کی مالش کر کے گھڑ دوڑ کے میدان کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ایک میدان میں دھات کا طشت گھما کر پھینکنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ یہی نہیں اور بھی کئی طرح کے کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ پورے یونان سے کھلاڑی آ آ کر ایتھنز میں جمع

ہورہے تھے۔ بس ایک آدھ دن ہی میں ان سب کھلاڑیوں کو پریتی پہاڑی کی ڈھلوان کی طرف دھرتی ماں کی ناف پر موجود میدان میں جمع ہونا تھا۔

منسارکس نے چند روز اپنی بیوی کے ہمراہ ایتھنز میں گزارے اور پھر ایک جلوس میں شامل ہوکر پریتی پہاڑی کی طرف چل دیا جہاں ڈیلفی کا مندر واقع تھا۔

وہ اس جلوس کے ساتھ ڈیلفی کے مندر میں پہنچا تو وہاں زائرین اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ مندر کے کاہن کو مخصوص بھینٹ دینے کے بعد اسے کئی دن انتظار کرنا پڑا۔

جب منسارکس نے مندر کی کاہنہ سے پوچھا کہ وہ ملک شام کے سفر کو تجارت کے لیے جانا چاہتا ہے تو کاہنہ نے غیبی آواز کی مدد سے اسے خوش خبری سنائی کہ اسے ضرور جانا چاہیے۔ اس سفر سے بہت فائدہ اٹھائے گا۔

یہ خوش خبری سننے کے بعد اس نے بیوی کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، کہو اب کیا کہتی ہو۔ اب تو دیوتاؤں نے بھی اجازت دے دی ہے۔ اب تم کیسے روک سکو گی۔ فتیاس نے بھی سر جھکا دیا جیسے کہہ رہی ہو اب میں تمہیں روکنے والی کون ہوتی ہوں۔

خوب صورت تاجر اور اس کی حسین بیوی اس خوش خبری کو سننے کے بعد پلٹنے ہی والے تھے کہ اس غیبی آواز نے اس جوڑے کو ایک مرتبہ پھر مخاطب کیا۔ ''اے تاجر، غور سے سن! عنقریب تیری بیوی ایک خوب صورت بچے کو جنم دے گی۔ وہ بچہ خوب صورتی کے ساتھ عقل و دانش سے بھی مزین ہوگا۔ اس کی عقل اور فہم سے انسانیت کو عظیم ترین فوائد حاصل ہوں گے۔''

فتیاس نے یہ خوش خبری سنتے ہی شرم سے گردن جھکا لی۔ منسارکس نے کچھ اور پوچھنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ غیبی آواز نے اسے روک دیا۔ ''ہمیں جو کہنا تھا کہہ دیا۔ بس اب تم جاؤ۔''

دونوں میاں بیوی پہاڑی کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے لگے۔

''تم نے سنا، غیبی آواز نے کیا کہا۔''

''میں نے تو بس یہ سنا کہ میں ایک دیوتا جیسے بیٹے کی ماں بنوں گی۔''

''اور یہ نہیں سنا کہ مجھے تجارت کی غرض سے ملک شام جانا چاہیے۔''

''دونوں باتوں میں بڑا تضاد ہے۔ تم مجھ سے دور چلے گئے تو میں ماں کیسے بنوں گی۔ دوسری پیش گوئی کیسے پوری ہوگی۔''

''میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جارہا ہوں۔''

''ہاں یہ بھی ہے۔''

اس وقت تک حمل کے کوئی آثار نہیں تھے اس لیے فتیاس کو انتظار کے سوا کچھ نہیں کرنا تھا۔

منسارکس کو غیبی اشارے کے مطابق شام کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ یہ سفر ایسا تھا کہ واپسی تک سال دو سال کا عرصہ لگ سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے آنے والے بچے کے لیے اپنے واپس آنے تک کا انتظار کرنا تھا۔ وہ سفر کی تیاری کررہا تھا لیکن سامان کی بعض اقسام کو جمع کرنے میں چھ ماہ سے زائد کا عرصہ لگ گیا۔ اس دوران اس کی بیوی امید سے ہوگئی۔

فتیاس کو یقین تھا کہ یہ خبر سننے کے بعد اس کا شوہر ملک شام جانے کا ارادہ ملتوی کردے گا لیکن وہ تمام تیاریاں مکمل کرچکا تھا۔ اب ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اپنا ارادہ ملتوی کرے۔ اس نے فتیاس کو اس کے باپ کے گھر بھیجا اور خود مال و اسباب اور نوکروں چاکروں کے ہمراہ ملک شام روانہ ہوگیا۔

☆.....☆

جزیرہ ساموس اس وقت استقبالی نعروں سے گونج اٹھا جب منسارکس نامی تاجر ملک شام سے واپس لوٹا، سامان اور دولت سے لدے ہوئے جہاز ابھی راستے میں تھے کہ اس نے ساحل پر قدم رکھا۔ وہ پورے تین سال بعد اپنے وطن واپس لوٹ رہا تھا۔

فتیاس اپنے بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ اس کے باپ کی سواری گھر کے باہر آکر رکی۔ غلام نے دروازہ کھولا۔ فتیاس بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ اس کے باپ نے گھر میں قدم رکھا اور خلاف معمول فتیاس کے کمرے کی طرف بڑھا۔

''تم نے کچھ سنا؟''

''کس بارے میں۔''

''جزیرے پر شور مچا ہوا ہے کہ منسارکس واپس آگیا ہے۔''

''اس کے آنے کی مجھے صرف اس لیے خوشی ہوگی کہ وہ میرے بچے کا باپ ہے ورنہ اس بے وفا کی مجھے پروا نہیں۔''

''میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ اس سے شادی مت کرو مگر تم کہاں ماننے والی تھیں۔ اب خود ہی اسے بے وفا کہہ رہی ہو۔''

''تو اور کیا کہوں۔ وہ تو یہاں سے جانے کے بعد مجھے بھول ہی گیا تھا۔ پورے تین سال بعد لوٹا ہے۔ میری تو میری اسے تو اپنے بیٹے کی یاد بھی نہیں آئی۔''

''بس کچھ دیر میں یہاں پہنچنے ہی والا ہوگا۔''

''پہنچے دو۔ مجھے کیا۔''

''خبردار! اس سے بے رخی کا برتاؤ مت کرنا۔ سنا ہے بہت دولت لے کر آیا ہے۔ اس وقت بھی وہ وزیراعظم کے پاس بیٹھا ہے۔ ایتھنز کے سرکاری حلقوں میں بھی اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔''

''دیکھو وہ گھر تک کب آتا ہے۔'' فتیاس نے کہا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆.....☆

منسارکس کو خوشی ہو رہی تھی کہ اس کے آنے کی خبر اس کے گھر تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ وہ اچانک پہنچ کر فتیاس کو حیران کردے گا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں ایک بچہ دروازے پر آیا۔ اس نے ایک چھوٹی تیر کمانی ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ بچہ اتنا خوب صورت تھا کہ منسارکس سانس لینا بھول گیا۔ بچے نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اندر کی طرف بھاگ گیا۔ منسارکس کو کسی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ فتیاس کے باپ کا گھر تھا۔ اس کی بیوی کے باپ کا گھر جہاں وہ شام کو جاتے وقت بیوی کو چھوڑ گیا تھا۔ وہ بلا جھجک گھر میں داخل ہوگیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر فتیاس پر پڑی۔ وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آرہی تھی۔ وہ بچہ جو دروازہ کھولنے آیا تھا اس کے برابر کھڑا تھا۔

''فتیاس، مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟''

''اتنے دن بعد آئے ہو کہ میں کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں۔''

''یہی پوچھ لو کہ اتنے دن بعد کیوں آیا ہوں۔''

''دولت کی چمک دمک نے یہ کب سوچنے دیا ہوگا کہ گھر سے نکلے کتنے دن ہوگئے ہیں۔''

''کوئی اور وجہ بھی تو ہوسکتی ہے۔ آؤ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

کمال یہ ہوا کہ ان باتوں میں وہ اس بچے کو بالکل ہی بھول گیا جو تیر کمانی لیے دروازے پر آیا تھا۔ وہ بچہ بھی ایسا غائب ہوا تھا کہ پھر نظر ہی نہ آیا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ پوچھتا۔ فتیاس کا باپ بھی منسارکس سے ایسا ناراض ہوا تھا کہ کمرے سے نکلا ہی نہیں۔

منسارکس نے اپنے اوپر گزرنے والی بپتا مختصراً اپنی بیوی کے گوش گزار کی۔

تم سمجھ رہی ہو میں تمہاری طرف سے غافل ہوگیا تھا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں بحری قزاقوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ کئی ماہ ان کی قید میں رہا۔ میں اپنی زندگی اور مال و متاع کی طرف سے مایوس ہوگیا تھا۔ میں نے گڑگڑا کر اپالو دیوتا سے مدد مانگی۔ پھر ایک روز اپالو دیوتا مجھے خواب میں نظر آئے اور مجھے خوش خبری سنائی کہ تم رہا کردیے جاؤ گے۔ تمہارا مال و اسباب بھی بخیریت شام پہنچ جائے گا اور تمہیں خوب منافع ہوگا۔

اس کے بعد واقعی ایسا ہوا کہ قزاقوں کو مجھ پر رحم آگیا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے چھوڑ دیا بلکہ میرے سامان تجارت پر بھی قبضہ نہیں کیا۔ میں بہ حفاظت ملک شام پہنچ گیا۔ یہاں بھی عجیب ماجرا ہوا۔ میرا مال بھاری منافع سے فروخت ہوا۔ بس یہ صورت حال تھی کہ میرا بہت سارا وقت ضائع ہوگیا اور میں تمہاری طرف سے غافل بھی ہوگیا۔

یہ سن کر فتیاس کو افسوس بھی ہوا اور یہ پچھتاوا بھی کہ جس شخص سے اپالو دیوتا خوش ہیں اور اس کے خواب میں آتے ہیں میں اس کی طرف سے بدگمان ہوئی۔

''میں بھی کتنی بری ہوں۔ اپالو دیوتا آپ سے اتنے خوش ہیں اور میں آپ کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔'' وہ بھاگتی ہوئی گئی اور اس بچے کو بلا کر لے آئی جو تیر کمان لے کر دروازے پر آیا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ بچہ کون ہے۔''

''میں تمہاری باتوں میں ایسا مشغول ہوا کہ اسے بھول ہی گیا۔''

''یہ آپ کا بیٹا ہے جو آپ کے جانے کے بعد پیدا ہوا تھا اور اب اتنا بڑا ہوگیا اس سے اندازہ لگائیے کہ آپ کتنے عرصے بعد آئے ہیں۔''

منسارکس آگے بڑھا اور بچے کو بے تحاشا چومنے لگا۔

''اس کا نام کیا رکھا۔'' منسارکس نے پوچھا۔

''آپ تو سب کچھ بھول گئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جب ہم ڈیلفی کے مندر گئے تھے تو غیبی آواز نے اس بچے کی خوش خبری ہمیں سنائی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اس بچے کا نام فیثاغورس رکھنا جس کے معنی سچ بولنے والا ہے۔''

''ہاں یاد آیا۔ یہی نام بتایا گیا تھا۔ تم نے اچھا کیا کہ یہ نام رکھا۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ ہماری ناموری کا باعث بنے گا۔ اس کے کارناموں کی وجہ سے ہمارا نام بھی روشن ہوگا۔''

''اب ہم پر لازم ہے کہ ایک مرتبہ پھر ڈیلفی کے مندر جائیں اور دیوتا پر قربانی چڑھائیں۔''

''ہاں ضرور جائیں گے۔''

کچھ دیر بعد کسی خیال کے تحت منسارکس نے اپنی بیوی کو پھر مخاطب کیا۔

''تم نے کچھ محسوس کیا؟''

''کس بارے میں؟''

''تم نے فیثاغورس کو غور سے دیکھا؟''

''روز ہی دیکھتی ہوں۔''

''اس کی شکل اپالو دیوتا کے مجسمے سے کتنی ملتی ہے۔''

''ارے ہاں، میں سوچتی تھی اس کی شکل کس سے ملتی ہے۔ ڈیلفی کے مندر میں اپالو دیوتا کا جو مجسمہ ہم نے دیکھا تھا اس کی شکل بالکل ویسی ہے۔''

''مجھے یقین ہے اپالو دیوتا اس پر ہمیشہ مہربان رہیں گے۔''

''یہ اپالو کا منظورِ نظر ہوگا۔'' فتیاس نے کہا۔

شام ہوئی تو جزیرے کے تمام معزز افراد منسارکس سے ملنے آئے۔ وہ رات گئے تک ان لوگوں کے ساتھ مکان کے مردانہ حصے میں بیٹھا رہا۔ مہمان رخصت ہوئے تو وہ بیوی کے پاس چلا آیا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''ہم اپنے بیٹے کو کیا بنانا چاہیں گے؟''

''اس کے ہاتھ میں تیر کمان دیکھ کر آپ کو اندازہ نہیں ہوا؟''

''اس لیے تو پوچھ رہا ہوں۔''

''ظاہر ہے وہ سپاہی بنے گا۔ یونان میں سورماؤں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''

''یونان میں تو دانش وروں کی بھی بہت قدر ہے۔ شاعروں کو بھی بہت سراہا جاتا ہے۔ ہومر کو کیوں بھول جاتی ہو۔ سائنس دانوں اور حساب دانوں کی بھی لوگ دیوتاؤں کی طرح پوجا کرتے ہیں۔ ہم اپنے بیٹے کو بہت بڑا عالم بنائیں گے۔''

''آپ کا بیٹا ہے جو مرضی آئے بنائیں۔''

''میں اسے کل ہی موسیقی کے استاد کے پاس لے جاؤں گا۔''

''آپ اسے اسکول میں داخل کیوں نہیں کراتے۔''

''اسکول میں وہ بچے جاتے ہیں جن کے باپ غریب ہوتے ہیں۔ کلاس میں بہت سے لڑکے ہوتے ہیں۔ یہ پوری توجہ سے نہیں سیکھ سکے گا۔''

''آپ کا بیٹا ہے آپ جس طرح چاہیں اس کی تربیت کریں۔''

منسارکس اسے ایک استاد کے پاس لے گیا۔ اس خوب صورت اور معصوم لڑکے پر استاد کو بھی پیار آیا۔ بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا اور اسے موسیقی سکھانے پر آمادہ ہوگیا۔

یہ اس جزیرے کا سب سے بڑا موسیقی داں تھا۔ منسارکس نے اسے اپنی خوش نصیبی سمجھی کہ اتنے بڑے استاد نے اس کے بیٹے کو قبول کرلیا۔

فیثاغورس نہایت باقاعدگی سے اس استاد کے پاس جانے لگا۔

اس زمانے میں بچوں کی ابتدائی تعلیم ورزش اور جمناسٹک سے شروع کی جاتی تھی اور اس کے بعد اسے موسیقی سکھانے کے لیے بٹھایا جاتا تھا لیکن فیثاغورس ابھی چھوٹا تھا اس لیے اسے پہلے موسیقی سکھانے کے لیے بٹھایا گیا لیکن کچھ ہی دن بعد استاد کے مشورے سے اسے جمنازیم بھیج دیا گیا جہاں کشتی کے مقابلے ہوتے اور لڑکے ورزش کرتے۔

اس کا بچپن ورزش اور موسیقی کے سائے میں گزرنے لگا۔ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو اسے ایک سوفسطائی استاد کے حوالے کردیا گیا۔ سوفسطائی کرائے کے استاد ہوا کرتے تھے جو امیر لوگوں کے بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ سوفسطائی علم الکلام کے ماہر ہوا کرتے تھے اور معاوضہ لے کر امراء کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ سوفسطائی یونان اور اس کے جزائر میں عام پائے جاتے تھے۔

یونان کا قاعدہ یہ بھی تھا کہ اکثر یونانی مختلف علوم کی

تعلیم حاصل کرنے کے لیے مشرقی ممالک کا سفر کیا کرتے تھے۔ اس کے باپ نے بھی سوچا کہ وہ اسے یونان سے باہر لے کر جائے اور اس پر علوم کے دروازے کھول دے۔ اس وقت تک اس نے بربط اور مختلف ساز بجانا سیکھ لیا تھا اور ایک مقامی شاعر سے ہومر کی شاعری کو پڑھ لیا تھا۔ اس کا باپ اسے شام لے کر آیا اور یہاں ایک عالم پیری کلیڈس کا شاگرد بنا دیا۔

اب وہ ملک شام میں تھا اور استاد کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا باپ اسے ایک معقول رقم بھیجتا رہا اور اس کی زندگی آرام سے گزرتی رہی۔

پیری کلیڈس سے پہلے فیثاغورس ایک بوڑھے عالم ہر موڈاماس کی شاگردی کر چکا تھا اس لیے اسے پیری کلیڈس کے اسباق سیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

پیری کلیڈس کی صحبت میں رہ کر اس نے نوجوانی ہی میں یونانی اور باربیرین مذاہب کے اسرار کو جان لیا۔

اس نے باپ کے نام خط لکھا کہ وہ پیری کلیڈس سے جو کچھ سیکھ سکتا تھا اس نے سیکھ لیا اب اس کے لیے کیا حکم ہے۔ اسے وہ کہاں لے جانا چاہتا ہے۔

اس خط کے جواب میں وہ خود چلا آیا۔ اس نے فیثاغورس کی تعلیم کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور بالآخر پیری کلیڈس سے مشورہ کیا۔ اس بوڑھے نے فیثاغورس کی ریاضی اور فلکیات میں دلچسپی دیکھتے ہوئے سائنس داں تھالیس کا نام پیش کر دیا۔

”آپ کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک سائنس داں ملیطس میں موجود ہے۔ فیثاغورس کو اس کے سپرد کر دینا چاہیے۔“

اس زمانے میں یونانی سلطنت ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی اور اس علاقے کا ایک شہر ملیطس تجارتی منڈی ہونے کے باعث خاصی شہرت رکھتا تھا۔ تھالیس کا آبائی گھر اسی شہر میں واقع تھا۔

☆.....☆

تھالیس کا باپ ایک دولت مند شخص تھا اور اس زمانے کے بہت سے امراء کی طرح اس کا پیشہ سوداگری تھا۔ یہی سوداگری اسے مصر لے گئی جو اس زمانے میں علم و دانش کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں اس نے مصری اساتذہ کی شاگردی کی۔ ان اساتذہ کا اثر تھا کہ اس نے سوداگری کے آبائی پیشے کو چھوڑ کر علمی تحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور پھر اسی مشغلے میں اپنی ساری زندگی بسر کر دی۔

تھالیس نے اگرچہ مصری اساتذہ سے سائنس، فلسفے اور ریاضی کے سبق لیے تھے لیکن اس نے کسی کی تقلید نہیں کی۔ ایک سچے محقق کی طرح اس کے اپنے خیالات تھے جو اس کے ذاتی مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ تھے۔

مظاہر فطرت میں سے سورج گرہن اور چاند گرہن کو انسان نے ہمیشہ حیرت سے دیکھا ہے۔ یونان کے لوگ بھی دن کو تاریکی میں بدلتے ہوئے دیکھ کر سخت پریشان ہوا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ دیوتاؤں کی کارستانی تھی۔ وہ اس آفت کو ٹالنے کے لیے قربانیاں دیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو نہ تو اس کا سبب معلوم تھا نہ صحیح تاریخ کا علم تھا کہ سورج گرہن یا چاند گرہن کب ہوگا۔ تھالیس نے سورج گرہن اور چاند گرہن کی اصل وجہ بیان کی مگر اس کی رائے کا لوگوں نے مذاق اڑایا۔ پھر ایک واقعے نے اسے یونانیوں کی نظروں میں عظیم فلسفی بنا دیا۔ فیثاغورس بھی اس واقعے سے تھالیس کا قائل ہو گیا اور اس کے پاس جانے کے لیے رضامند ہو گیا۔

یونان کی دو قوموں لیڈینز اور میڈیز کی برسوں پرانی دشمنی آگ کی طرح بھڑک رہی تھی۔ صرف طبل جنگ بجنے کی دیر تھی۔ بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب دونوں قومیں ایک دوسرے کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ خون کا دریا بہنے کو تھا کہ پہاڑی کی اوٹ سے سورج کی روشنی میں ایک شخص کا سایہ نمودار ہوا جس کے ہاتھ میں لہراتا ہوا سفید جھنڈا تھا۔

یہ تھالیس تھا۔

اس شخص نے بلند آواز سے کڑک کر اعلان کیا۔

”تم میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ میرا نام تھالیس ملطی ہے۔ میں تم میں سے ہی ہوں اور اسی زمین کا باشندہ ہوں جس پر آج تم خون کی ندیاں بہا رہے ہو مگر ایک بات غور سے سن لو۔ آسمانی دیوتا تمہاری اس جنگ سے سخت ناراض ہیں اور تم دونوں قوموں پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہونے والا ہے اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو ابھی چند لمحوں میں آسمانی دیوتاؤں کا فیصلہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ سورج دیوتا جو تمہارے کھیت کھلیانوں کو ہرا بھرا رکھتا ہے جس کا نور تمہاری سلامتی کی علامت ہے محض تمہاری اس دشمنی کی بدولت یہی سورج دیوتا آج ظلمت کے اندھیروں میں اپنا منہ چھپا لے گا۔“

یہی ہوا۔

جب سورج آسمان کے وسط میں پہنچا اور پھر ایک مہیب سائے کی لپیٹ میں آ کر تاریک ہوتا چلا گیا تو دونوں لشکروں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج اندھیرے میں لپٹ گیا۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ دونوں قومیں دیکھ رہی تھیں کہ تھالیس نے سچ کہا۔ دیوتاؤں کا قہر نازل ہو گیا ہے۔ دونوں قوموں نے اندھیرے کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ وہ زمین پر گرے ہوئے تھے اور دیوتاؤں سے معافی کے طلب گار تھے۔ انہوں نے صلح جوئی پر چلنے کا عہد کیا تاکہ دیوتاؤں کی خوشنودی ان کو دوبارہ مل سکے۔

دراصل تھالیس نے حساب لگا کر سورج گرہن کی صحیح تاریخ کا تعین کر لیا تھا۔ یہ پیش گوئی دراصل دیوی دیوتاؤں کی ناراضی کی مرہون منت نہ تھی بلکہ مکمل طور پر سائنسی طریق کار سے اخذ شدہ نتائج کا حاصل تھی۔

اس زمانے کے لوگوں کے نزدیک سورج روشنی کا ایک بڑا تھال تھا جس کا سائز وہ اتنا ہی سمجھتے تھے جتنا وہ ظاہری آنکھوں کو نظر آتا ہے۔ تھالیس نے پہلے پہل یہ انکشاف کیا کہ وہ لاکھوں میل چوڑا ہے۔ تھالیس جس کے پاس جدید آلات نہیں تھے سورج کے قطر کو لاکھوں میل قرار دینا اس کی ہیئت دانی کا شاہکار ہے۔

مصر میں تھالیس نے جیومیٹری کا علم حاصل کیا تھا جس میں اہل مصر خاص دستِ نگاہ رکھتے تھے۔ اس کی ایک حقیقی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں مصری امراء کی بڑی بڑی زمینیں دریائے نیل کے کنارے تھیں جب نیل میں طغیانی آتی تھی اور اس کے بعد دریا کی گزرگاہ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہو جاتی تو ان زمینوں کے بعض حصے جو دریا برد ہو چکے تھے دوبارہ خشکی کا حصہ بن جاتے تھے اس لیے ہر سال ان زمینوں کے رقبوں کی پیمائش کرنی پڑتی تھی۔ اس عملی ضرورت کے باعث ان کے ہاں جیومیٹری کی بنیاد پڑی۔

جیومیٹری کا یہی علم تھالیس نے مصریوں سے حاصل کیا اور پھر اپنے دماغ کی جدت سے اس کو اثباتی جیومیٹری میں ڈھال دیا۔

مصر کے وہ فلک بوس مینار جو اہرام مصر کہلاتے تھے اور آج تک سیاحوں کی منزل مقصود ہیں تھالیس کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ تھالیس نے سائے کی مدد سے ان میں سے ہر ایک کی بلندی ناپی۔

اس کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ اس نے انسانی تاریخ میں پہلی بار کائنات کے وجود اور اس کی ماہیت کے بارے میں صرف اور صرف سائنسی بنیاد پر کوئی نظریہ قائم کیا۔ اس سے قبل تخلیق کائنات کے بارے میں انسانی سوچ، دیوی دیوتاؤں اور دیو مالائی قصوں سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ آسمان سورج چاند ستاروں اور کائنات کے ہر نظارے کے پیچھے کسی دیوی دیوتا کا ہاتھ یا کسی دیوی کا چہرہ نمایاں تھا، تھالیس سے پہلے کسی انسان نے اس سے ہٹ کر یہ سوال نہیں اٹھایا تھا کہ یہ سارے اجرام فلکی آخر کس مادے کے بنے ہیں، کیسے اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ تھالیس نے پہلی مرتبہ انسانی آنکھ کے سامنے سے دیوی

سالون کے حملے کے بعد فیثاغورسیوں کا تار و پود بکھر گیا۔ جتنے فیثاغورس اس وقت کروٹونا میں موجود تھے۔ سب بھاگ گئے بلکہ دوسرے شہروں کے فیثاغورسی بھی چھپتے پھر رہے تھے۔

فیثاغورس نے مرنے سے پہلے اپنے دو شاگردوں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ یہ دونوں فیثاغورس کے سربراہ بن گئے اور سٹیاس نائی شاگرد نے فیثاغورس کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں خاص کردار ادا کیا اور اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔

جب اوسٹیاس بہت بوڑھا ہو گیا تو اس نے فیثاغورسی اسکول کی سربراہی فیثاغورس کے بیٹے کے حوالے کر دی۔

اس کے دور میں کروٹونا جنگوں میں مبتلا ہو گیا اور کروٹونا کو دشمنوں نے پورے طور پر لوٹ لیا۔ اس جنگ کے بعد فیثاغورس کا ایک اور شاگرد سربراہ بنا۔

دوسرے شہروں سے آئے ہوئے اجنبی فیثاغورسی جو زندہ تھے انہوں نے اسکول کا انتظام سنبھال لیا لیکن رفتہ رفتہ فیثاغورسیوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور پھر صرف فیثاغورس کے نظریات رہ گئے۔ یہ نظریات بھی وقت کی آندھی میں اڑ گئے۔

فیثاغورسی فلسفہ ایک ایسی زبان میں تحریر کیا گیا تھا جو رفتہ رفتہ نابود ہو گیا۔

فیثاغورس کا فلسفہ مر گیا لیکن اس کا نام اس کے دریافت کردہ مسئلے کے باعث جیومیٹری کی ہر کتاب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

دیوتاؤں کا پردہ نوچ کر پھینک دیا اور آیندہ کی ترقی کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے پہلا قدم اٹھا دیا ہے اب انسان حقیقت کی تلاش میں منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جائے گا۔

اس نے سورج کے خط استوا سے دوری کے مرحلے ریکارڈ کر لیے اور جب سورج خط استوا کے اوپر ہوتا تو اس کے مرحلے بھی ریکارڈ کر لیے اور ان دونوں مشاہدات کی بناء پر اس نے کہا تھا زمین گول ہے اس سائنسی دریافت نے سائنس کی بنیادیں مضبوط کر دی تھیں۔

اس نے قطبی ستارے کے حوالے سے شاندار دریافتیں کی تھیں جس کی وجہ سے جہاز رانوں کو بحری سفر کرنے میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئیں۔

جب تھالیس نے سورج گرہن کی پیش گوئی کی تھی تو وہ درست ثابت ہوئی۔ اس وقت تک کوئی بھی یونانی فلاسفر نہ جانتا تھا کہ سورج گرہن کیسے ہوتا ہے۔

☆.....☆

تھالیس کے تمام کارنامے فیثا غورس کے سامنے تھے لہٰذا جب اس کے استاد پیری کلیڈس نے مشورہ دیا کہ اسے تھالیس کے پاس جانا چاہیے تو وہ فوراً رضا مند ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے ہی اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ اس کے کارناموں کی شہرت اس تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا شمار تھالیس کے مخالفین میں نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اس کے نظریات سے متفق تھا۔

فیثا غورس کا باپ اسے لے کر تھالیس کی خدمت میں پہنچ گیا۔ فیثا غورس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال تھی جب کہ تھالیس کی عمر نوّے سال ہو چکی تھی۔ یہ عمر ایسی نہیں تھی کہ ہر ایرے غیرے کو شاگرد بنا کر اپنا وقت خراب کرتا لہٰذا اس نے فیثا غورس کو دیکھ کر بہت برا منہ بنایا اور صاف انکار کر دیا۔

''صاحب زادے کہیں اور جاؤ۔ میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''

فیثا غورس بھی ضد کا پکا اور علم کا شائق تھا۔ اس صاف انکار کے باوجود اکیڈمی کی عمارت کے ایک گوشے میں پڑا رہا۔ گاہے بگاہے تھالیس سے ملنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ تھالیس کا شاگرد ''اناکسی مینڈر'' تھالیس کا معاون ہے اور تھالیس کے فلسفے پر لیکچر دیتا ہے۔ ایک رات وہ اس سے ملنے چلا گیا۔ یہاں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا کہ اناکسی مینڈر نے اسے زیادہ منہ لگانا مناسب نہ سمجھا لیکن فیثا غورس نے اسے شیشے میں اتار لیا اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اس کی ملاقات تھالیس سے کرا دے گا اور اسے قائل کر لے گا کہ وہ اپنی صحبت کے کچھ لمحات اس نوجوان کو دے دے۔

اسی اناکسی مینڈر کی سفارش پر وہ تھالیس کی نظروں میں آ گیا۔ تھالیس نے فیثا غورس کی ریاضی اور فلکیات میں دلچسپی دیکھتے ہوئے اس کی خوب حوصلہ افزائی کی۔

تھالیس نے فیثا غورس کے ساتھ فلسفے اور سائنس پر جو گفتگو کی اس سے فیثا غورس کو بہت نیا علم حاصل ہوا اور اس کے نظریات یکسر تبدیل ہو کر رہ گئے۔

اس کے علاوہ وہ اناکسی مینڈر کے لیکچروں میں بھی شامل ہوتا رہا۔ ان لیکچروں سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔

اناکسی مینڈر جیومیٹری اور علم کائنات میں دلچسپی رکھتا تھا۔ فیثا غورس اس کے نظریات سے بے حد متاثر ہوا۔

☆.....☆

اناکسی مینڈر تھالیس کا شاگرد تھا لیکن اس نے استاد سے بھی آگے کا سفر طے کیا۔ اس نے مشرق سے سیکھے ہوئے سائنسی علم و فن کی مزید ترقی کی اور اس سے یونانیوں کو روشناس کیا۔

تھالیس کی شاگردی میں ستاروں کی گردش سے اناکسی مینڈر کو معلوم ہو گیا تھا کہ آسمان کے سارے ستارے قطبی ستارے کے گرد گھومتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی صرف دو وجوہات ہو سکتی ہیں کہ یا تو تمام ستارے بلکہ پورا آسمان قطبی ستارے کے گرد گھوم رہا ہے یا زمین کا یہ حصہ گولائی میں کرے کے مانند ہے۔ اناکسی دوسری بات سے متفق ہوا لہٰذا اس نے پوری زمین کا نقشہ مرتب کیا اور اس نقشے کی تیاری میں یہ ثابت کیا کہ زمین ایک گول سلنڈر کی شکل کی ہے۔ اس نے آسمان کو ایک کرے کی شکل میں ظاہر کیا۔

یہ بھی آسمان کی شکل و صورت کا پہلا تصور تھا۔ اس سے پہلے آسمان کو ایک سفید چھت کے مانند خیال کیا جاتا تھا جس پر ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ اناکسی نے اسے کرے کی شکل میں ظاہر کیا۔ اس کی یہ دریافت اتنی اہم تھی کہ آج تک علم فلکیات کی پوری عمارت اسی نظریے پر کھڑی ہوئی ہے۔

اناکسی مینڈر نے کائنات میں دیوتاؤں کے کردار کو

ختم کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے فلکیات، حیاتیات جغرافیہ اور جیومیٹری کے حوالے سے اپنے نظریات کو انقلابی انداز میں پیش کیا جو کہ اس سے قبل کسی فلسفی یا سائنس داں نے پیش نہیں کیا تھا۔

اناکسی مینڈر بحیرہ روم کے مشرقی کنارے کی ریاست آیونیاں میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنا زیادہ تر وقت ملیٹس میں گزارا۔ وہ ملیٹس میں ہی 546 ق م میں فوت ہوا۔ وہ تھالیس کا شاگرد تھا اس لیے اس کے فلسفے پر تھالیس کے اثرات غالب ہیں۔

☆.....☆

ساموس شہر پر قبضہ کرنے والے ڈکٹیٹر ''پولی کریٹس'' اور فیثا غورس کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ ڈکٹیٹر اس کے تعلیمی مشاغل میں کبھی حارج نہیں ہوا تھا لیکن اب ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ وقت آ گیا ہے کیونکہ اس کی جانب سے ایک خط فیثا غورس کو موصول ہوا تھا۔ اس خط میں اسے ساموس طلب کیا گیا تھا۔ اس خط سے فیثا غورس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ غالباً یہ ڈکٹیٹر اسے ملیٹس سے بلا کر اپنے دربار میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے اس خط کو کوئی اہمیت نہیں دی اور چپ ہو کر بیٹھا رہا لیکن چند دنوں بعد تقاضے کا ایک خط اور موصول ہوا۔ اب اسے اپنی گرفتاری صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس نے گھبرا کر تھالیس سے رابطہ کیا اور دونوں خط اس کے سامنے رکھ دیے۔

''استاد مکرم! آپ بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''بات تو پریشانی کی ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''غلطی تمہاری ہے کہ تم نے حکمرانوں سے تعلقات کیوں رکھے۔ علمی میدان کے شستہ سواروں کو سیاست سے کیا کام۔''

''استاد مکرم! آپ مجھے یہ بتائیں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''اس خط کے جواب میں تم فوراً ساموس پہنچ جاؤ۔''

''آپ بھی مجھے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔''

''ہاں!'' تھالیس نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ غلط ہو۔ اسے تم سے کوئی اور کام ہو۔''

''اگر اس نے مجھے ملازمت میں رکھنا چاہا۔''

''اگر تمہیں یہ ملازمت منظور نہ ہو تو کسی بہانے وہاں سے فرار ہو کر مصر پہنچ جانا۔ میں تم سے خود یہ کہنے والا تھا کہ تمہیں مزید علوم حاصل کرنے کے لیے مصر جانا چاہیے۔''

''میں بہانا کیا کروں گا۔''

''اس سے کہنا کہ تم مجھ سے ملنے ملیٹس آؤ گے اور پھر واپس آ کر ملازمت اختیار کر لو گے۔ تم فلیٹس آنے کی بجائے مصر چلے جانا۔''

''اس طرح تو وہ آپ سے باز پرس کرے گا۔ وہ یقیناً یہ سمجھے گا کہ آپ نے مجھے فرار کرا دیا۔''

''تم میری فکر مت کرو اور جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ میں مرنے کے قریب ہوں۔ وہ مجھ پر سختی نہیں کر سکے گا اگر تمہیں بچاتے ہوئے میری جان بھی چلی گئی تو مجھے یہ اطمینان ہو گا کہ میں اپنے بعد فیثا غورس کو چھوڑے جا رہا ہوں جو میرے نظریات کو زندہ رکھے گا لیکن یہ اسی وقت ہو گا جب تم مصر پہنچ جاؤ گے اور خود کو سیاست سے دور رکھو گے۔''

فیثا غورس نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور ساموس پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس کے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔

''جانتے ہو، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔''

''مجھے تو علمی مصروفیات میں اپنا ہی ہوش نہیں بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں کہ مجھے کیوں بلایا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔''

''میں بعض باتوں میں صرف تم پر اعتماد کر سکتا ہوں۔''

''آپ کی مہربانی ہے۔''

''میں تمہارے ہاتھوں ایک تعارفی خط مصری بادشاہ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ بس اس کے بعد تمہارا کام ختم۔''

فیثا غورس کی تو جیسے مراد پوری ہو گئی۔ وہ مصر جانے اور نئے نئے علوم سیکھنے کا خواہش مند تھا۔ یہ موقع اسے خود بخود مل رہا تھا۔ اس نے فوراً اقرار کر لیا۔

فیثا غورس نے چاندی کے تین جام خصوصی طور پر بنوائے تاکہ وہ یہ جام مصر کے حاکم اور پجاریوں کو تحفے میں دے کر ان سے اچھے تعلقات استوار کر سکے اور مصر جانے کے لیے جہاز میں سوار ہو گیا۔

اسے معلوم تھا کہ مصر جا کر اسے کیا کرنا ہے۔ وہ مصری مندروں کو دیکھنا چاہتا تھا اور ان مندروں کے پجاریوں کے ساتھ کئی موضوعات پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے استاد تھالیس نے بھی مصری درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بھی اپنا سینہ ان علوم سے بھر لینا چاہتا تھا جو موقع اسے ملا تھا وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے مصر پہنچتے ہی کئی پجاریوں اور کاہن اساتذہ

سے مصری مذہب کے اسرار جاننے کی درخواست کی لیکن اس کی ہر درخواست کو رد کر دیا گیا۔ اسے مندروں تک میں جانے کی اجازت نہ مل سکی۔

جب اس نے ہر دروازہ کھٹکھٹا کر دیکھ لیا اور اس کا شعلہ شوق سرد نہ ہوا تو کاہنوں کو اس پر رحم آ گیا۔ کاہنوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں اس کی علمی جستجو کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ سب سے پہلے فیثاغورس مخصوص رسوم و عبادات سیکھے گا اس کے بعد ہی وہ مصری علوم کے راز جان سکے گا اور اسے مندروں میں جانے کی اجازت دی جائے گی۔

اس اجلاس کے بعد ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس میں فیثاغورس کو بھی طلب کیا گیا تاکہ اسے فیصلے سے آگاہ کیا جا سکے۔ اسے بتایا گیا۔ ”تم ایک منفرد اور غیر معمولی انسان والی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرو۔“

”اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

”تمہیں چالیس دن کا روزہ رکھنا ہوگا۔ اس کے بعد چالیس دن تک ایک مخصوص حالت میں بیٹھ کر سانس روکنے کی مشق کروائی جائے گی۔“

”میں آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں کیونکہ سربستہ راز جاننا ہی میرا مشن ہے۔“

فیثاغورس ان دونوں مشقوں کے بعد کاہنوں کے سامنے آیا تو اس نے اعتراف کیا۔ ”میں فیثاغورس نہیں ہوں بلکہ ایک بدلا ہوا انسان ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرا نیا جنم ہوا ہو۔ اس تربیت نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ میں غلط تھا اور آپ لوگ ٹھیک کہتے تھے۔“

”ہم علم میں دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ علم کو اپنی ذات پر عملی طور پر طاری کرنے کے قائل ہیں۔“ کاہنوں نے کہا۔

اس کے بعد اسے مصری علوم کے راز جاننے کے لیے ایک مندر میں لے جایا گیا۔ اس مندر کے مہا پجاری نے پہلے فیثاغورس سے وہ تمام رسوم ادا کروائیں جو مندر کے اندر جانے کے لیے ضروری تھیں۔ اس کے بعد اسے مندر میں لے جایا گیا۔

اس پر مندروں کے دروازے اور کاہنوں سے ملاقات کی راہیں کھل گئی تھیں۔ اس نے ان رازوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے مصری زبان سیکھ لی۔ جلد ہی اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ مصری لہجے ہی میں بات کرتا تھا اور اپنی گفتگو میں امثال استعمال کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ مصری رنگ میں ڈوب گیا۔ ان ہی کی طرح لباس پہننے لگا۔ وہ سفید ریشم کا جبہ پہنتا تھا اور اس کے نیچے پاجامہ پہنتا تھا جب کہ یونانی لوگ جبہ کے نیچے پاجامہ نہیں پہنتے تھے۔ وہ عبادات و رسوم ہی میں مصریوں کی پیروی کرنے لگا۔

اس نے مصر سے ریاضی جیومیٹری اور فلکیاتی سائنس کو سیکھا اور ان کی رسوم کو اپنایا۔

وہ ابھی مصری علوم کے موتیوں کو اپنے گلے کا ہار بنا ہی رہا تھا کہ ”کومبیس دوم“ شاہ ایران نے مصر پر حملہ کر دیا۔ ساموس کے ڈکٹیٹر پولی کریٹس نے مصر سے اپنا اتحاد ختم کر لیا اور شاہ ایران سے اتحاد کر لیا اور اپنے چالیس جہاز شاہ ایران کی مدد کے لیے مصر کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بھیج دیے۔

مصر میں جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر شخص گھبرایا ہوا تھا۔ مندروں میں دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ فیثاغورس بھی جو اب پورا مصری بن چکا تھا ان عبادات میں شریک ہو رہا تھا۔ ان کے بقول دیوتاؤں کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دعائیں قبول نہیں ہوئیں۔ شاہ ایران اور یونان کی متحدہ فوجیں مصر پہنچ گئیں۔ دریائے نیل کے ڈیلٹا میں گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ مصریوں کو اب بھی اُمید تھی کہ دیوتا ضرور مدد کریں گے لیکن سخت خونریزی کے بعد شاہ ایران نے مصر کے دو بڑے شہروں ہیلی پولس اور ممفس پر قبضہ کر لیا۔ مصر کا وقار بالکل ختم ہو گیا۔

فاتحین نے بہت سے لوگوں کو جنگی قیدی بنا لیا۔

فیثاغورس بھی ان دنوں مصر میں تھا۔ وہ بھی گرفتار ہو گیا۔ ان جنگی قیدیوں کو بابل لے جایا جانے لگا تو فیثاغورس بھی ان کے ساتھ تھا البتہ اسے یہ اعزاز دیا گیا کہ اسے ایک رتھ پر سوار کر کے جنگی قیدی کے طور پر لے جایا گیا۔ یہ اعزاز شاید اسے اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ یونانی تھا، مصری نہیں۔

فیثاغورس کو اس گرفتاری پر ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ ہنسی خوشی ان کے ساتھ بابل گیا۔ دراصل وہ خود بھی بابل کے پُراسرار مندروں اور دیوتاؤں کی پوجا کی رسوم دیکھنا چاہتا تھا اور اب یہ موقع اسے خود بخود مل رہا تھا۔

بابل کی تہذیب اس کا تمدن یہاں کے علوم و فنون عمارات دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں اور فیثاغورس اب بابل میں تھا۔

بابل کا ہر شہر ایک مضبوط فصیل کے اندر تھا اور ہر شہر کے درمیان میں ایک سات منزلہ مینارہ تھا جس میں مقامی

دیوتا کا مندر تھا۔ اس مینار پر بیٹھ کر کاہن اور پجاری ستاروں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس طرح انہوں نے علم فلکیات میں بہت دسترس حاصل کر لی تھی۔ کاہن اور پجاری اپنے فلکیاتی تجربات سے حاصل شدہ علوم کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ علم ریاضی میں بھی یہ لوگ مہارت رکھتے تھے۔

فیثاغورس بابل کے مختلف شہروں میں گیا اور یہ علوم سیکھے۔ ان پجاریوں تک پہنچنے اور انہیں یہ علوم سکھانے پر آمادہ کرنے میں اسے کن مشکلات سے گزرنا پڑا ہوگا اس کا صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے جب کہ یہ مصری پجاری ان علوم کو پوشیدہ رکھتے تھے۔

فیثاغورس نے بابل میں پانچ سال گزارے اور تزکیہ نفس، موسیقی، فلکیات اور ریاضی کی سائنس کو سیکھا۔

اس وقت تک بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ ساموس کے حکمراں اور شاہ ایران نے خوشی کر لی تھی۔ نئے شاہ ایران دارایوس نے ساموس کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ ان حالات میں فیثاغورس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ساموس لوٹ جائے۔ وہ ساموس آیا تو اس کی ظاہری شخصیت میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ اس کا لباس اور مزاج مصری اور بابلی ہو چکا تھا۔ اس نے سفید ریشم کا جبہ پہنا ہوا تھا جس کے نیچے پاجامہ تھا جب کہ ساموس کے لوگ جبہ کے نیچے پاجامہ نہیں پہنتے تھے۔ اس کے سر پر سونے کا کلاہ تھا۔ ایسا وہ خود کو نمایاں کرنے کے لیے کیا کرتا تھا۔

اس نے کچھ دن ساموس میں گزارے اور پھر جزیرہ کریٹ جانے کا فیصلہ کر لیا جہاں ایک ایسی مذہبی جماعت رہتی تھی جس نے اس علاقے کو پُراسرار حقیقت کا نام دے رکھا تھا۔ یہ جماعت مارگوس نامی پجاری کی سربراہی میں رہتی تھی۔ ان لوگوں کے پاس کچھ ایسے مذہبی راز تھے، جنہیں فیثاغورس جاننے کا خواہش مند تھا۔ وہ جب مصر میں تھا تو وہاں کے مندروں کے مقدس ترین مقامات تک گیا تھا۔ اس طرح اس نے ان کے دیوتاؤں کے مقدس رازوں کو جان لیا تھا۔ یہ مقدس راز ریاضی، علم فلکیات اور رسوم پر مشتمل تھے۔

اب وہ جزیرہ کریٹ میں تھا۔

جزیرہ کریٹ میں وہ مارگوس کے پجاریوں سے بھی ملا۔ دریا کے کنارے قیام کیا اور کریٹ کے رواج کے مطابق ان پجاریوں کی طرح بھیڑ کی کالی اون کا لبادہ پہنا۔ زیوس دیوتا کی قربانی بھی دی اور دوسری رسوم ادا کیں۔

اسی سفر میں اس پر ہندوستان کے بارے میں کچھ انکشافات ہوئے اور اس نے ہندوستان جانے کا ارادہ کر لیا۔

اس نے جزیرہ کریٹ میں 27 دن گزارے۔ واپس آنے کے بعد اس نے ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھا اور ایک دن چپکے سے ساموس سے نکل گیا۔

ان دنوں بابل اور مصر کے تجارتی جہاز ہندوستان تک جاتے تھے اور پھر تجارتی سامان سے لدے پھندے مصری بندرگاہوں تک آتے تھے۔ فیثاغورس بھی کسی ایسے ہی جہاز کے ذریعے ہندوستان گیا ہوگا۔ اس وقت ہڑپہ اور موہن جو ڈرو کی عظیم تہذیبیں اپنے عروج پر تھیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ریاضی، ٹرگنومیٹری، ہندسہ اور فلکیات میں بہت سی دریافتیں کی گئیں۔ ہندو برہمنوں نے بہت سے علوم میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ان علوم میں ہیئت، ریاضی، طب اور ستاروں کا علم شامل تھا۔ ہندوستانیوں نے علم نجوم اور ہیئت بابلی لوگوں سے سیکھا تھا اور ان علوم کو بہت زیادہ ترقی دی تھی۔

فیثاغورس جب ہندوستان پہنچا ہڑپائی تہذیب اپنے عروج پر تھی۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات اپنے روحانی فلسفے کی وجہ سے ہندوستان میں مقبول ہو رہی تھیں۔ فیثاغورس ہندوستانی میدانی علاقوں (پنجاب) تک گیا۔ اس نے ہندو براہمنوں اور ریاضی دانوں سے ملاقاتیں کیں۔ علمائے ریاضی سے بہت کچھ سیکھا۔ اسی گیان دھیان کا نتیجہ تھا کہ اس نے کہا۔ ”ہم سب انسان اس دنیا میں اجنبی مسافر کی طرح ہیں اور ہمارا جسم ہماری روح کا قید خانہ ہے۔ فلسفیانہ سوچ بچار سے اپنی روح کو مادی جسم کے قید خانے سے رہائی دلائی جا سکتی ہے۔ روح کو مادی دنیا سے آزاد کروانا ہی فلسفے کا اصل منصب ہے اور انسانی زندگی کا حقیقی مقصد ہے۔“

ہندوستان میں رہ کر وہ عقیدۂ تناسخ سے بھی متاثر ہوا۔

”دنیا میں ہم جو کچھ اچھا یا برا کرتے ہیں اسی مناسبت سے مرنے کے بعد ہمیں ایک نیا جسم ملتا ہے۔ مرنے کے بعد اس کی روح پودوں یا حیوانوں کے جسم میں ظاہر ہوتی ہے۔“

جس شخص نے گھٹیا درجے کا علم حاصل کیا ہوگا اس کی روح جہنم میں عذاب جھیلے گی اور یہ عذاب جسم کو نہیں روح کو ہوگا۔

اس کے یہ خیالات یقیناً ہندوؤں کے عقیدۂ اواگون سے مستعار ہیں۔ عقیدہ اواگون کے مطابق گھٹیا اعمال کا شخص دوبارہ بلی کتے یا کسی دوسرے گھٹیا جاندار کی شکل میں پیدا ہوگا جب کہ اچھے اعمال کا شخص اعلیٰ شخصیت میں پیدا ہوگا۔

مصر، بابل اور ہندوستان کی سیاحت کے بعد جب وہ اپنے وطن ساموس لوٹ کر آیا تو اس کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی اور علم و مذہب کے اتنے اسرار اس کے سینے میں اتر گئے تھے کہ اسے ایسے شاگردوں کی ضرورت پڑ گئی تھی جو اس سے ان علوم کو سیکھیں اور دنیا میں پھیلائیں یا کم از کم ایک ایسا حلقہ قائم ہو جہاں وہ ایسے لوگ بنائے جو اس کے خیالات کی حفاظت کریں لہٰذا اس نے ساموس میں وانش وروں کا ایک حلقہ بنایا جس کو یسی سرکل کا نام دیا۔

فیثاغورس نے یہ حلقہ اس لیے بنایا تھا کہ لوگ یہاں بیٹھ کر نیکی، عدل اور دیگر معاملات پر سوال اٹھا کر بحث کیا کریں تاکہ ان میں نیکی اور انصاف کی اچھی خصلتیں پیدا ہوں۔

اس نے شہر سے دور پہاڑیوں کے اندر ایک غار میں اپنے لیے ایک مخصوص جگہ بنا لی تھی۔ یہاں وہ اپنے مخصوص لوگوں کو اپنے فلسفے کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ جب کوئی نہ ہوتا تو اکیلے میں ریاضی کے مسائل پر غور کیا کرتا۔

اس کے لیکچروں کی دھوم آہستہ آہستہ دور دور تک پھیل گئی۔ یونان سے باہر کے لوگ بھی اس کے لیکچر سننے آتے تھے۔ ایک روز اس کے یسی سرکل میں ایک نوجوان خوب صورت لڑکی اپنے باپ کے ہمراہ اس کا لیکچر سننے آئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اٹلی کے شہر کروٹونا سے آئی ہے۔

یہ اس کی خوب صورتی تھی یا کچھ اور کہ اسے دیکھتے ہی فیثاغورس کچھ دیر کے لیے اپنی تقریر بھول گیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے حلقے میں بہت سی عورتیں تھیں وہ کبھی کسی عورت سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔

آنے والی لڑکی کا نام تھیانو اور اس کے باپ کا نام برونٹینس تھا۔

اسے دیکھ کر تھیانو بھی کچھ کم متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس کے سامنے لمبے قد اور رعب دار شخصیت کا حامل آدمی کھڑا تھا۔ اس کی آواز بھاری بھرکم تھی۔ اس نے شاندار لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کا سراپا ایسا دلکش تھا کہ پہلی نظر میں وہ کوئی دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ تھیانو نے اپنے باپ سے سرگوشی کی تھی کہ یہ تو کوئی دیوتا ہے جو آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے۔

تھیانو کے باپ نے اس کی تردید نہیں کی بلکہ اس میں اور اضافہ یہ کر دیا۔ ”اس کی باتیں بھی دیوتاؤں سے کم نہیں۔“

فیثاغورس کا جی چاہتا تھا کہ وہ لڑکی یہیں بیٹھی رہی۔ اس نے جان بوجھ کر لیکچر کو طول دینا شروع کر دیا لیکن کب تک؟ اب یہ کہہ کر لیکچر ختم کر دیا کہ اب میں تھک گیا ہوں۔ اس موضوع پر میں کل پھر تقریر کروں گا جو لوگ آج موجود ہیں کل ضرور آئیں ورنہ اس لیکچر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کل کوئی نہ آئے صرف یہ لڑکی آئے لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس نے لیکچر ختم کیا اور سیدھا ان نو وارد مہمانوں کے پاس پہنچ گیا۔ تھیانو کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ جائے گا۔ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

”میرا نام برونٹینس ہے۔“ تھیانو کے باپ نے اپنا تعارف کرایا۔ ”اور یہ میری بیٹی تھیانو ہے، ہم لوگ اٹلی کے شہر کروٹونا سے آپ کی باتیں سننے آئے ہیں۔“

”کروٹونا کا ماحول میرے فلسفے کے لیے کیسا ہے؟“ فیثاغورس نے پوچھا۔

”کروٹونا کے لوگ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ وہاں آپ کے نظریات پھیل رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کروٹونا کے لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ نے علم کے حصول کے لیے جو سفر کیے ہیں اٹلی میں اس کے بہت چرچے ہیں۔ وہاں کے لوگ آپ کو دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں۔ آپ کی یہی شہرت ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔“

”کیا آپ کل بھی یہیں ہوں گے؟“

”کل کیا ہم کئی دن کے لیے آئے ہیں۔“

”آپ میرے آبائی گھر میں ٹھہر سکتے ہیں۔“

”نہیں، یہ زحمت نہ کیجیے۔ ہمارا قیام ایک دوست کے گھر ہے۔“

”جیسی آپ کی مرضی لیکن کل کا لیکچر سننے ضرور آیئے گا۔“

”ہمیں آپ کل اسی جگہ بیٹھا دیکھیے گا۔“

دونوں مہمان رخصت ہو گئے۔ وہ دیر تک دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے تھیانو کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی چمک دیکھ لی تھی۔ اسے بہت سے لوگ پسند کرتے تھے لیکن یہ چمک کچھ اور کہہ رہی تھی۔

دوسرے دن فیثاغورس کا لیکچر شروع ہوا تو تھیانو موجود تھی۔ اس کا باپ بھی اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ آج

فیثاغورس پر تھیانو کا ایک اور روپ ظاہر ہوا۔ اس نے لیکچر ختم ہونے کے بعد ریاضی سے متعلق چند ایسے سوالات پوچھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ریاضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہے۔

وہ برابری سے اس کے لیکچر سننے آ رہی تھی اور پھر ایک روز اس کی دلچسپی نے عملی صورت اختیار کر لی۔ اس کے باپ نے فیثاغورس کو اعتماد میں لیا۔

”آپ کا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ تھیانو کے باپ نے پوچھا۔

”یہ ہر انسان کے لیے ضروری ہے کیونکہ اس سے ذہن کی پراگندگی دور ہوتی ہے اور انسان نیکی کی طرف بڑھتا ہے۔“

”آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟“

”میں ابھی تک کہیں ٹک کر بیٹھا ہی نہیں ہوں۔“

”اب تو آپ اپنی سیاحت ختم کر چکے۔“

”ہاں اب کچھ سوچنا ہوگا۔“

”میری بیٹی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”اسے سمجھائیں۔ میری اور اس کی عمر میں بہت فرق ہے۔“

”میں سمجھا چکا۔ وہ بضد ہے۔“

”کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں اکیلے میں اسے سمجھاؤں۔“

”کیوں نہیں۔“

فیثاغورس اسے غار کے ایک ایسے حصے میں لے گیا جہاں اس کی باتیں کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ تھیانو نے اپنی پسند ظاہر کی۔

”تم جانتی ہو میری اور تمہاری عمروں میں کتنا فرق ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ اطمینان رکھو میں کبھی طعنہ نہیں دوں گی۔“

”تم مجھ سے کیوں شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”میں تمہاری وانش اپنے نام کرنا چاہتی ہوں۔ تاریخ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔“

”میرے ساتھ شادی کرنے کے خطرات تمہیں معلوم ہیں؟“

”زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میرے لیے آپ کے پاس وقت نہیں ہوگا۔“

”مجھ سے پہلے کے فلاسفروں نے جب اپنے نظریات کو عام لوگوں تک پہنچایا تو ان فلاسفروں کو یا تو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے یا پھر اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔“

”اگر آپ نے ملک چھوڑا تو میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ ویسے اٹلی کے دروازے آپ پر کھلے ہیں۔“

ایسی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور بالآخر اس نے تھیانو سے شادی کر لی۔

اس شادی نے مخالفین کو بھڑکا دیا۔ اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جانے لگے۔ اس کے حلقے میں چونکہ عورتیں بھی آتی تھیں اس لیے فیثاغورس کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کیا جانے لگا کہ وہ ان عورتوں کے ساتھ غیر اخلاقی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔ مثال میں تھیانو کا نام پیش کیا جاتا تھا کہ اس نے اپنی ایک عقیدت مند کو جھانسا دے کر شادی کر لی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ شادی محض دکھاوا ہے۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ عیاشی کر رہا ہے۔ باقی عورتیں بھی اس کی داشتائیں ہیں۔

ساموس کا منتظم سیمانس، فیثاغورس کا طریقہ تعلیم پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اس عظیم فلاسفر اور ریاضی دان سے جاہلانہ انداز سے پیش آتا تھا۔ اس کی نظروں میں فیثاغورس عام آدمی سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے مخالفین نے جب اس کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا تو وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ مل گیا اور اس پر بدکردار ہونے کا الزام لگانے لگا۔

ساموس کی فضا ایسی ہو گئی کہ فیثاغورس کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ تھیانو بھی اس صورت حال سے بہت پریشان تھی۔ ان دونوں نے بہت سوچ سمجھ کر بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ وہ ساموس چھوڑ کر اٹلی کے شہر کروٹونا چلے جائیں جہاں تھیانو کا میکہ تھا۔ اس نے اپنے پروگرام سے اپنے والد کو آگاہ کر دیا۔ اس کے والد نے کروٹونا والوں کو یہ خوش خبری پہنچا دی۔ کروٹونا والوں کے لیے یہ خبر کسی اچنبھے سے کم نہیں تھی۔ اتنا عظیم فلسفی ان کے شہر میں قیام کے لیے آ رہا تھا۔ استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پورے شہر کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب فیثاغورس اور تھیانو نے کروٹونا میں قدم رکھا۔ ان کے ساتھ فیثاغورس کے پیروکاروں کے بیوی بچے بھی تھے۔

اٹلی پہنچنے پر اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ حکومتی سطح پر بھی اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اب وہ آزاد تھا اور اپنی مرضی سے اپنی تعلیمات کے فروغ کے لیے کام کر سکتا تھا۔

اسے اور اس کے پیروکاروں کو جو اس کے ساتھ آئے تھے ایک بہت بڑی عمارت آڈیٹوریم میں ٹھہرایا گیا۔ اس کے ٹھہرنے کے بعد اس عمارت کو لوگ "عظیم یونانی" کہنے لگے۔

کروٹونا اپنے اولمپک ایتھلیٹوں، جنگجوؤں، طبیبوں، حکیموں، داناؤں اور ہیرا دیوی کے مندروں کی بدولت بہت شہرت رکھتا تھا۔

یہ سب سہولتیں فیثاغورس کے سامنے تھیں۔

تھکن اتارتے ہی وہ اپنے محبوب مشغلے سیاحت کی طرف متوجہ ہوا۔ سب سے پہلے اس نے اٹلی اور سسلی کی قریبی ریاستوں کا دورہ کیا۔ وہ جس ریاست میں بھی گیا اس نے شہریوں سے خطاب کیا۔

اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ایک ریاست دوسری ریاست کو غلام بنانے کی کوشش میں ہے اور ایک دوسرے پر ظلم کرتی ہے۔ اس نے اسی کو موضوع بنایا اور آزادی کے فلسفے کو بیان کر کے آزادی سے محبت کرنا سکھایا۔

اس نے ان شہری ریاستوں کے محاسبوں کے ذریعے ان شہری ریاستوں میں آزادی کو ممکن بنایا۔ ان کے شہریوں سے کہا کہ ایک دوسرے کی قربت میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کی آزادی کو بحال رکھا جائے۔

کروٹونا کے شہری بھی اپنی آزادی کے حوالے سے اندرونی اور بیرونی طور پر پریشان تھے۔ اس نے کروٹونا میں قوانین کو بحال کیا کیونکہ قوانین نہ ہونے کی وجہ ہی سے انتشار تھا۔

اس کی کوششوں سے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے کروٹونا دوسرے شہروں کے مقابلے میں مثالی شہر بن گیا۔

چند ہی دنوں میں اس کی شہرت پورے اٹلی میں پھیل گئی۔ لوگ اس کی تقریریں سننے کے لیے امڈے پڑتے تھے۔ ان میں نوجوان، بوڑھے، مرد، خواتین سب ہی شامل تھے۔

اب وہ کروٹونا کے لوگوں کے لیے صحیح معنوں میں دیوتا کا کردار ادا کر رہا تھا۔ لوگ اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔

اس نے اپنے وطن ساموس کی طرح یہاں بھی اپنے خیالات کی ترویج کے لیے اکیڈمی بنائی اور شاگرد بنائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر کوئی اس کا شاگرد بن سکتا تھا۔ وہ ہر آنے والے طالب علم کو فوراً ہی داخل نہیں کرتا تھا بلکہ اس طالب علم کا پورا امتحان لیا جاتا تھا جو اس امتحان میں کامیاب ہوتا صرف اسی کو شاگردی کا شرف ملتا تھا۔ ویسے سب کو آزادی تھی جو چاہے اس کا درس سننے کے لیے آسکتا تھا۔

اس اکیڈمی میں داخلے کے لیے طلبہ کی پوری چھان بین کی جاتی تھی۔ طالب علم سے پوچھا جاتا تھا کہ اس کے اپنے والدین سے تعلقات کیسے ہیں۔ اس کی گفتگو سنی جاتی تھی۔ اس کی خواہشات کے بارے میں پوچھا جاتا تھا اس کے دوستوں کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی ہنسی کا بھی جائزہ لیا جاتا تھا۔ اس کی نفسیات کو پرکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد بھی اس کی کامیابی یقینی نہیں تھی۔ اسے داخلہ تو مل جاتا تھا لیکن تین سال تک اسے نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ تین سال تک اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے کے بعد اسے طالب علم کا درجہ دیا جاتا تھا اور فیثاغورس کے پاس بھیجا جاتا۔

کامیاب طالب علم اس کی سوسائٹی کے خاص ممبران میں شامل کر دیے اور وہ فلسفہ، سائنس اور ریاضی پر تحقیق کرتے۔ اس میں ان کے مشیران کی مدد کرتے۔

ان طلبہ کا روزانہ کا معمول بھی طے شدہ تھا جس پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ یہ طلبہ صبح سویرے جاگ جاتے اور سیر کو نکل جاتے۔ اس کے بعد مندر میں آکر مراقبہ کرتے۔ اس کے بعد آڈیٹوریم چلے آتے۔ ایک وقفے کے بعد ہر ایک اپنی پسند کی ورزش کرتا۔ دوپہر کے وقت سب لوگ شہد اور روٹی کھاتے تھے یہ ان کا دوپہر کا کھانا تھا۔ شام کے وقت یہ لوگ پھر سیر کو نکل جاتے۔ ان کو ہدایت تھی کہ اس سیر کے دوران بھی ..... وہ علوم وفنون پر بحث کرتے رہیں۔ سیر سے واپس آنے کے بعد غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھوتے۔ رات کے کھانے کے لیے مشترکہ دستر خوان پر آجاتے۔

اس کے بعد سب لوگ سونے کے لیے بستر پر چلے جاتے۔

اس کی اکیڈمی نے ریاضی کے حوالے سے عظیم کارنامے انجام دیے۔

فیثاغورس ریاضی کے اصولوں میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے اعداد کا تصور دیا۔ اس کے علاوہ مثلث زاویوں پر زبردست کام کیا۔ اس کی زیر نگرانی ہی اس کے نظریے کے مطابق ریاضی اور جیومیٹری کی تحقیق ہوئی۔

فیثاغورس نے ریاضی کے اصولوں کو موسیقی میں بھی استعمال کیا۔ اس کے علاوہ فلکیات میں بھی اس نے اعداد کے حوالے سے تحقیق کی۔

فیثاغورس نے اعداد کی خصوصیات کا گہرا مشاہدہ کیا اور اعداد کی خصوصیات کو بیان کیا جو آج بھی مقبول ہیں۔ اس نے جفت اور طاق اعداد کا نظریہ پیش کیا اور اسے ثابت کیا۔

ریاضی داں آج بھی فیثاغورس کی جیومیٹری تھیورم کو جزوی طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس کو فیثاغورس تھیورم کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت میں فطرت بھی بنیادی طور پر ریاضی کے اصولوں کے مطابق ہی کام کرتی ہے۔

فیثاغورس نے عدل اور سیاست کے حوالے سے کچھ اصول وضع کیے تھے۔ اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ ناانصافی کیا ہے اور اس کی وجوہات کیا ہیں۔ اگر ہم ناانصافی کی وجوہات کو سمجھ لیں تو انصاف کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی روح کے اندر انصاف اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مجموعی طور پر تمام افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور ہر کسی کو برابر سمجھیں۔ وہ اپنے پیروکاروں کو ہدایت کرتا تھا کہ معاشرے میں انصاف کے لیے انسانوں میں ایسا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے کہ وہ انسان تو انسان جانور پر بھی کسی طرح کا ظلم نہ کریں۔

وسائل کی کمی بھی انسانوں کو انصاف سے دور کر دیتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے افراد کو بنیادی ضروریات کی فراہمی آزادانہ ہو۔ روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ناانصافی کا نتیجہ تعیشات اور لاقانونیت ہوتا ہے۔ قانون سازی کے ذریعے انصاف کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

اس کی دینیات کی بنیاد اس پر تھی کہ خدا کی موجودگی کو تسلیم کیا جائے اور خدا کی موجودگی کو فطرت میں تلاش کیا جائے۔

وہ اخلاقی نتائج حاصل کرنے کے لیے اپنے پیروکاروں کو اعتدال اور ضبطِ نفس کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اعتدال کے لیے زائد خواہشات کو ختم کر دینا چاہیے۔ ضبطِ نفس سے عقل بڑھتی ہے اور انسانی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

فیثاغورس تعلیم کے مطابق اس کے پیروکار عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے۔

نقطہ فلسفہ کی اصطلاح بھی فیثاغورس نے وضع کی تھی۔ اس کے معنی ہیں عالم سے محبت کرنا وہ چونکہ علم اور حصولِ علم پر بہت زور دیتا تھا اس لیے اس نے نقطہ فلسفہ اختراع کیا۔ یہ اصطلاح اتنی مقبول ہوئی کہ پھر ہر فلسفی نے اسی اصطلاح کو استعمال کیا۔

فیثاغورس نے موسیقی سے علاج کا طریقہ بھی دریافت کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم موسیقی کے ردھم، گیتوں اور منتروں سے پورے جوش اور ولولے سے اپنے جسم اور روح میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ کار کو اس نے اپنے دوستوں اور شاگردوں پر آزمایا اور کئی مریضوں کا علاج بھی کیا۔ اس نے کئی جسمانی بیماریوں کے لیے نغمے تیار کیے ہوئے تھے۔ وہ ان نغموں کو بربط پر گا کر بیمار کا علاج کر دیتا تھا۔ ان نغموں سے دوسروں کے غم بھلا دیتا تھا، غصے کو ختم کر دیتا تھا اور لالچ اور حسد کی بیماری کو ختم کر دیتا تھا۔

فیثاغورس نے فلکیات میں بہت اہم دریافتیں کی تھیں۔ اس نے دریافت کرلیا تھا کہ زمین ایک کرے کی مانند ہے۔ وہ پہلا سائنس داں تھا جس نے دریافت کرلیا تھا کہ وینس جو کہ شام کا ستارہ ہے یہی صبح کا ستارہ ہے۔

جدید سائنس کی دریافتیں اس کے نظریات کی مرہونِ منت ہیں۔

☆.....☆

اس کی سوسائٹی دو دائروں میں تقسیم تھی۔ ایک اندرونی دائرہ تھا اور دوسرا بیرونی دائرہ۔ اندرونی دائرے کے لوگ فیثاغورس سے براہ راست تعلیم حاصل کرتے تھے اور اس کے مخصوص نظریات کو خفیہ رکھنے کے پابند تھے۔ یہ لوگ ہمیشہ سوسائٹی کے اندر رہتے تھے، اپنے گھروں میں نہیں۔ ان کے پاس اپنا کوئی ذاتی سامان یا جائداد نہیں ہوتی تھی۔ ان کے لیے گوشت کھانا منع تھا صرف سبزیوں پر گزارہ تھا۔

ان لوگوں کو فیثاغورس، خود تعلیم دیا کرتا تھا اور انہیں بتاتا تھا یا سکھاتا تھا کہ فطرت ریاضی کے اصولوں کے مطابق ہے۔ فلسفے سے روحانی بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ سوسائٹی کے رازوں کو پوشیدہ رکھا جائے۔

اس نیم مذہبی سوسائٹی میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی۔ دونوں کو برابر کا درجہ حاصل تھا۔

اس سوسائٹی میں اس کی بیوی تھیانو اور بیٹی بھی لیکچر دیا کرتی تھیں۔

فیثاغورس مراقبے اور ریاضی کے تجربات کے لیے ایک غار میں چلا جاتا تھا اور وہاں کئی کئی دن تک رہتا تھا۔ اس کے ساتھ صرف اندرونی دائرے کے لوگ جایا کرتے تھے جب کہ دوسرے لوگوں کو غار میں جانے کی اجازت

نہیں تھی۔ غار میں دی جانے والی تعلیم کو خفیہ رکھا جاتا تھا۔

اس سوسائٹی کا ایک بیرونی دائرہ تھا۔ اس دائرے کے لوگ اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ صرف دن کے وقت اکیڈمی میں آتے تھے۔ دراصل یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو زیرِ تربیت ہوتے تھے۔ جب ان لوگوں کی تربیت مکمل ہو جاتی تھی اور ایک خاص امتحان پاس کر لیتے تھے تو انہیں اندرونی دائرے میں شامل کرلیا جاتا تھا۔

☆.....☆

فیثاغورسیوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ فیثاغورس سے تربیت پانے اور اس کے نظریات پر کاربند ہونے والے افراد اٹلی سے لے کر یونان تک پھیل چکے تھے۔ اس کی جماعت ایک نیم مذہبی جماعت تھی جس پر گوتم بدھ کے اثرات تھے۔ اس نے اپنے نظریات کو خفیہ رکھنے میں بھی عافیت سمجھی تھی۔ اس کے تربیت یافتہ افراد جو فیثاغورس کہلاتے تھے۔ مخصوص علاقوں کے ذریعے ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ آپس میں نہایت بھائی چارہ تھا اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے چنانچہ تاریخ میں یہ واقعہ ملتا ہے۔

ایک فیثاغورس اپنے وطن سے دور کسی سرائے میں اقامت گزیں تھا جہاں وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کے پاس جتنی رقم تھی وہ علاج اور خوراک پر خرچ ہوگئی۔ سرائے کا مالک ہمدرد اور نرم دل تھا۔ وہ اس شخص کی حقیقت جانے بغیر محض انسانیت کے ناتے اس کا علاج کرواتا رہا لیکن اس کی حالت بگڑتی گئی۔ جب اسے اپنے بچنے کی اُمید نہ رہی تو اس نے کاغذ اور قلم منگوایا اور اپنا حال لکھ کر فیثاغورسیوں کا مخصوص نشان اس کاغذ پر ثبت کر دیا۔ اس نے سرائے کے مالک سے کہا کہ اس کاغذ کو شہر کے دروازے پر لٹکا دیا جائے۔ اگلے ہی روز اس بیمار شخص کا انتقال ہوگیا۔

کئی روز بعد ایک فیثاغورس کا اس طرف سے گزر ہوا۔ اس نے وہ کاغذ پڑھا اور جب اس کی نظر فیثاغورسیوں کے مخصوص نشان پر پڑی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ تحریر اس کے کسی فیثاغورس بھائی کی ہے۔ وہ فوراً سرائے کے مالک کے پاس آیا۔ اس نے جو اخراجات اس بیمار شخص پر کیے تھے وہ ادا کیے اور کچھ رقم بطور انعام بھی اسے ادا کی۔

فیثاغورس کے یہ مخصوص علامتی نشان جن سے اس کے شاگرد ایک دوسرے کو پہچان لیتے تھے چند فقرے تھے جن کے اور ظاہر معنوں کے علاوہ بعض ایسے معنی پوشیدہ ہوتے تھے جن کو فیثاغورسیوں کے سوا کوئی اور نہ سمجھ سکتا تھا۔

فیثاغورس کے حلقہ تلمذی نظم وضبط بہت سخت تھا جس سے اس کے تمام شاگردوں کو گزرنا پڑتا تھا۔ فیثاغورس نے اپنے عقیدت مندوں میں برادرانہ تعلقات اس حد تک استوار کر دیے تھے کہ وہ اپنی ساری دولت برادری کے مشترکہ فنڈ میں شامل کر دیتے تھے اور پھر اس مشترکہ فنڈ سے تمام اراکین اپنی ضرورت پوری کرتے تھے۔ اس مشترکہ خزانے کا اہتمام چند منتخب افراد کرتے تھے۔ یہ لوگ اس مشترکہ فنڈ کو تجارت میں بھی لگاتے تھے جس کے نفع سے فنڈ بڑھتا رہتا تھا اور کچھ عرصہ بعد دگنا تگنا ہو جاتا تھا۔

اگر کوئی شخص برادری سے نکلنا چاہتا تھا تو اس کی رقم اس کو واپس کر دی جاتی تھی مگر ساتھ ہی درسگاہ کے قریب اس کی ایک فرضی قبر بنا دی جاتی تھی گویا اراکین کے نزدیک اس کی موت واقع ہوگئی۔

فیثاغورس کے فلسفے میں عورت کا بہت احترام تھا۔ وہ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس کے حلقے میں عورتیں بھی برابر شریک ہوتی تھیں جن میں سے بعض علمیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچ گئی تھیں۔ انہی میں اس کی اپنی بیوی بھی تھی۔

وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ دنیا کو پہلی مرتبہ بتا رہا تھا کہ زمین گول ہے اور ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔ دوسری جانب اس کے مذہبی خیالات پر درش پا رہے تھے۔ اس کے عقیدت مندوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ دوسری جانب ملکی حکمران اور مذہبی رہنما اس کے مخالف ہوتے جاتے تھے۔ اس مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ حکمرانوں کو اپنا اقتدار خطرے میں پڑتا نظر آرہا تھا۔ اس کا نتیجہ ایک ہی نکل سکتا تھا اور نکلا یعنی مخالفوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ بڑی بڑی طاقتیں اسے راستے سے ہٹانے کے لیے کمربستہ ہوئیں۔

جب اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ وہ سورج سے روشنی لیتا ہے اور پھر اسے زمین کی طرف منعکس کر دیتا ہے تو مذہبی رہنما اس کے بالکل ہی مخالف ہوگئے اور سیاسی قوتوں کے ساتھ ان کا اتحاد ہو گیا۔

دوسری جانب اٹلی کے عام لوگ فیثاغورس کے ساتھیوں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کو دوسرے شہروں میں بلا کر انتظامی امور کے مشورے لیتے

تھے۔ان کے علم کے چرچے تھے۔

اس گرم بازاری نے ان کے حاسد اور دشمن بھی پیدا کردیے تھے۔

انہی دنوں سالون نامی ایک کروٹن باشندہ سامنے آیا۔ یہ شخص نہایت دولت مند تھا اور اس کا شمار کروٹن کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انتہائی ظالم تھا۔ نہایت متکبر بھی۔ اس نے سوچا اگر وہ فیثاغورس کی سوسائٹی میں شامل ہوجائے تو اس کی طاقت میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔ یہی سوچ کر وہ فیثاغورس کے پاس گیا۔

''آپ جانتے ہیں میں آپ کے پاس کیوں آیا ہوں۔''

''تمہارے دل کی بات میں کیسے جان سکتا ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں تمہاری سوسائٹی مزید طاقت ور ہو جائے اور تمہاری عزت میں مزید اضافہ ہو۔''

''کیا تم سمجھتے ہو فیثاغورسیوں کی قدر و منزلت میں کوئی کمی ہے؟''

''ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہے۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں نہایت اعلیٰ نسل کا ہوں۔ دولت مند ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے اپنی سوسائٹی میں داخل کرلو تاکہ تمہاری سوسائٹی میں چار چاند لگ جائیں۔''

فیثاغورس انسانی رویوں کے بارے میں خوب سمجھتا تھا۔ وہ سالون کی ظالمانہ اور متکبرانہ فطرت کو سمجھ گیا اور صاف انکار کردیا۔

''میں تمہیں خوب سمجھ گیا ہوں تم جیسے لوگ میری سوسائٹی میں داخل نہیں ہوسکتے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔''

اپنی یہ توہین وہ برداشت نہ کرسکا اور دھمکیوں پر اتر آیا۔

''اس انکار کا مطلب سمجھتے ہو۔ میں تمہاری سوسائٹی کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔''

وہاں سے آنے کے بعد اس نے اپنے دوستوں کو اکٹھا کیا۔ اس کے دوست بھی اس کے جیسے غنڈے اور بدمعاش تھے۔ ایسے تمام لوگ اس کے ساتھ مل گئے جو فیثاغورس سے حسد رکھتے تھے اور اس کے خلاف پروپیگنڈا مہم شروع کردی۔ اس کے سائنسی نظریات کی غلط تاویلیں کر کے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کردیا۔ لوگوں کے کانوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ دیوتاؤں کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اخلاقی حالت کو نہایت پست کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

''غضب تو یہ ہے کہ وہ عورتوں کو مردوں کے برابر سمجھتا ہے۔ اس کے حلقے میں جو عورتیں ہیں وہ انہیں گمراہ کرتا ہے اور گناہ پر مجبور کرتا ہے۔''

اٹلی کے متعدد حلقے اس کے خلاف ہوگئے۔ سالون ان سب کی رہنمائی کررہا تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ فیثاغورس اور اس کے بہت سے ساتھی اس کے ایک شاگرد 'ملو' پہلوان کے گھر میں جمع ہیں (ان کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی)۔ یہ موقع اچھا تھا۔ سالون نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور 'ملو' پہلوان کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور گھر کو آگ لگا دی۔ جو بچ کر نکلا اسے پتھر برسا کر ہلاک کردیا۔ باقی لوگ گھر ہی میں جل کر راکھ ہوگئے۔ فیثاغورس بھی وہاں موجود تھا لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی موت کسی اور حادثے کے نتیجے میں لکھی ہوئی تھی۔

اس حادثے کے بعد لاشوں کو دیکھا بھالا گیا تو فیثاغورس کی لاش کہیں نہیں تھی۔ عقیدت مندوں نے اسے فیثاغورس کی روحانی طاقت قرار دیا جب کہ سالون نے یہ کہہ کر صبر کرلیا کہ لاش کی شناخت نہ ہوسکی۔

فیثاغورس کروٹن سے بھاگا اور میسبو پوٹیمیا پہنچ گیا۔ یہاں فیثاغورس اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بہت غلط پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ فیثاغورس اور اس کے ساتھی عیاش لوگ ہیں۔ اس کی سوسائٹی میں عورتیں بھی لیکچر دیتی اور سنتی ہیں۔ یہاں اس کے خلاف احتجاج ہونے لگا۔ یہ احتجاج اتنا بڑھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ ایک دن جب وہ بازار سے گزر رہا تھا لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ جان بچا کر بھاگا ہجوم نے اس کا پیچھا کیا۔

وہ بھاگ کر ایک ویران مندر میں گھس گیا۔ وہ مندر میں تھا اور باہر ہجوم۔ ہجوم اندر نہیں آسکتا تھا۔ کیونکہ اس مندر میں کسی پر ظلم کرنا دیوتا کے غصے کو آواز دینا تھا۔ اس لیے لوگ مندر کے گرد گھیرا بنا کر بیٹھ گئے۔

محاصرے کی وجہ سے وہ باہر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس مندر میں چالیس دن تک محصور رہا اور وہاں بھوک کی تاب نہ لاتے ہوئے مرگیا۔ ایک قابل انسان کو نا گہانی موت نے اپنے جبڑے میں بھینچ لیا۔

ماخذات

فیثاغورس، حیات فلسفہ اور نظریات.....ملک اشفاق
نامور مسلم سائنس داں.....حمید عسکری

مرگِ درویش

تنویر ریاض

اس نے دنیاوی لالچ کو، شہرت و دولت کو ٹھوکروں میں اڑا دیا۔ اس وقت جب وہ عالمی شہرت یافتہ گلوکار تھا اس نے عاقبت سنوارنے کی خاطر سب کچھ ٹھکرا دیا اور دین کے راستے کو اپنا لیا۔ وہ فطرتاً اتنا معصوم تھا کہ کب کیا کہنا چاہیے۔ اس کا بھی خیال نہ رکھتا، جو بات زبان پر آئی کہہ دیا۔ اس کے اس معصومانہ انداز پر کئی دشمن بھی پیدا ہوئے مگر وہ اللہ کی راہ پر چلتا رہا۔ اسے موت آئی بھی تو تبلیغ دین کرتے ہوئے۔

ایک معصوم سے انسان کی روداد

دل دل پاکستان جان جان پاکستان۔ یہ نغمہ 19 اگست 1987ء کی شام پی ٹی وی سے نشر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک بلکہ پاکستان سے باہر بھی اس کی بازگشت سنائی دی۔ ویسے تو ہر قومی دن پر ریڈیو اور ٹی وی سے یادگار ملی نغمے نشر کیے جاتے ہیں لیکن اس نغمے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ جس نے ٹی وی کے لاکھوں ناظرین کو سحر زدہ کردیا۔ اس کی پیشکش کا انداز بھی بالکل انوکھا اور منفرد تھا جس میں چار نوجوان لڑکے قمیص پتلون میں ملبوس مغربی

سازوں پر پوپ میوزک کے انداز میں ملی نغمہ سنا رہے تھے۔ نغمہ ختم ہوا تو اسکرین پر وائٹل سائنز کا نام جگمگا رہا تھا جس میں جنید جمشید (گلوکار)، روحیل حیات (کی بورڈ)، شہزاد حسن (گٹارسٹ) اور نصرت حسن (گٹارسٹ) شامل تھے۔ اس نغمہ کو شعیب منصور نے لکھا اور وہی اس کے پروڈیوسر تھے۔ یہ گانا بے حد مقبول ہوا، اور نقادوں نے بھی اس کی تعریف کی لیکن سب سے زیادہ خوشی جنید جمشید کے اہل خانہ کو ہوئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا یہ ہونہار سپوت ایک ہی جست میں ملک گیر شہرت حاصل کرلے گا۔ اس کے والد نے تو کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا لیکن اکلوتی بہن اور دونوں بھائی خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ 23 سالہ نوجوان راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جائے گا۔ وہ اسے ایک ابھرتے ہوئے گلوکار کے روپ میں دیکھ رہے تھے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر قدرت اس خوش شکل اور خوش گلو نوجوان سے کیا کام لینے والی ہے۔

جنید جمشید 3 ستمبر 1964ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اس کے والد جمشید اکبر پاکستان ایئر فورس میں گروپ کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ بھی فائٹر پائلٹ بننے کے لیے پاکستان ایئر فورس میں جانا چاہ رہا تھا لیکن نظر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ پھر اس نے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں داخلہ لے لیا جہاں سے اس نے 1990ء میں میکینکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی۔

زمانہ طالب علمی میں ہی اس عینس اینڈ بولٹس نامی کالج بینڈ میں شمولیت اختیار کرلی اور کچھ عرصہ بعد وائٹل سائنز میں چلا گیا۔ یہ بینڈ پشاور یونیورسٹی کے دو طالب علموں روحیل حیات اور شہزاد حسن نے راولپنڈی میں قائم کیا تھا۔ 1983ء میں اس بینڈ نے مقامی یونیورسٹی کیمپس میں راک میوزک میں پرفارم کرنا شروع کیا جس میں مختلف غیر معروف گلوکار حصہ لیتے تھے۔

1986ء میں نصرت حسین نے بھی بطور گٹارسٹ اس بینڈ میں شمولیت اختیار کرلی۔ اب انہیں ایک گلوکار کی تلاش تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے شہر میں ہونے والے کنسرٹ میں جانا شروع کردیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک بار پھر جنید جمشید سے 1987ء میں ملاقات کی جب وہ ان کے ہمراہ میرٹ ہوٹل اسلام آباد میں پرفارم کررہا تھا۔ اس سے پہلے وہ 1983ء میں جنید کو پشاور یونیورسٹی اور اسلام آباد یونیورسٹی کیمپس میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے دیکھ چکے تھے تب سے ہی حیات اسے اپنے بینڈ میں مرکزی گلوکار کے طور پر شامل کرنا چاہ رہا تھا لیکن یہ اس لیے ممکن نہ ہوسکا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد جنید پشاور سے چلا گیا۔

1987ء میں جنید نے انجینئرنگ یونیورسٹی کے راک بینڈ نٹس اینڈ بولٹس میں مرکزی گلوکار کے طور پر شمولیت اختیار کرلی۔ روحیل حیات اور نصرت حسین نئے ٹیلنٹ کی تلاش میں راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل گئے۔ جہاں انہوں نے جمشید کو پرفارم کرتے دیکھا اور انہیں لگا کہ ان کی تلاش ختم ہوگئی ہے۔ نصرت نے حیات کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”تم جس لڑکے کو پسند کرتے ہو، وہ منظرِ عام پر آگیا ہے۔ ہمیں اس سے ملنا چاہیے۔“

”کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم کسی دوسرے بینڈ کے گلوکار کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔“ نصرت نے کہا۔ ”کیونکہ وہ کالج کے بینڈ میں پرفارم کررہا ہے اور یہ لوگ پروفیشنل نہیں ہیں۔“

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد حیات نے اس سے ملنے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس کے لیے اسے کافی دیر انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ شورات تین بجے تک جاری رہا۔ لوگ کسی طرح اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے جو کہ اسلام آباد میں ایک نئی اور انوکھی بات تھی جہاں عام طور پر دس بجے تقریبات ختم ہو جاتی تھیں۔ حیات تو ویسے ہی جنید جمشید کی آواز کا گرویدہ تھا۔ اس کی پذیرائی دیکھ کر اور فریفتہ ہوگیا اور فوراً ہی اس کی خدمات لیڈ سنگر کے طور پر حاصل کرلی گئیں۔ اس وقت تک جنید نے موسیقی کو محض شوق کی حد تک اپنایا تھا اور اس نے کسی بھی مرحلے پر اسے پروفیشن بنانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس نے حیات سے کہا کہ اس بینڈ میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے اسے اپنے والدین سے اجازت لینا ہوگی۔ اس کے بعد ہی وہ کوئی فیصلہ کرسکے گا۔ اس کے گھر والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب جنید اپنے اصل پروفیشن میں جائے گا تو اس کا یہ شوق ثانوی حیثیت اختیار کرلے گا۔

1985ء کے وسط میں مغرب سے متاثرہ راک

میوزک عوام کی توجہ حاصل کرنے لگا اور پورے ملک میں اس حوالے سے کنسرٹ منعقد ہونے لگے۔ اس وقت پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی جو اپنے ہر آمرانہ اقدام کو اسلامائزیشن کے پردے میں قوم پر مسلط کررہا تھا۔ اس دور میں جینز پہننا یا راک میوزک کی بات کرنا حکومت وقت کی ناپسندیدگی کا سبب بن سکتا تھا۔ اس کے باوجود کئی گروپ منظرِ عام پر آئے اور انہوں نے عوام کی توجہ حاصل کی اور اسے پسند کیا جانے لگا۔

وائٹل سائنز نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنا شروع کردیا اور دھیرے دھیرے راک میوزک میں اپنا مقام بنانے لگے۔ اسلام آباد میں ہونے والے ایک لائیو کنسرٹ میں یہ گروپ پی ٹی وی کی پروڈیوسر رعنا کنول کی نظروں میں آیا اور انہوں نے اس گروپ کو ایک میوزک ویڈیو بنانے کے لیے کہا۔ یہ بینڈ اسلام آباد چلا گیا اور انہوں نے چہرہ کے نام سے اس کی تیاری شروع کردی۔ اس بارے میں حیات کا کہنا ہے۔ ”ہم نے ان کے لیے چہرہ کے نام سے گانا تخلیق کیا۔ یہ پہلا گانا تھا جو ہم نے لکھا اور یہ ہمارے پہلے البم کا بھی حصہ ہے۔“

انہی دنوں اس بینڈ نے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر شعیب منصور کی توجہ حاصل کرلی، اس وقت تک ان کا ایک گانا ”دو پل کا جیون“ ریلیز ہو چکا تھا۔ شعیب نے انہیں ایک مقامی کنسرٹ میں دیکھا اور دوسرے ہی دن ان سے رابطہ کر کے ایک ملی نغمہ گانے کی فرمائش کی جسے یوم آزادی پر پورے ملک سے نشر کیا جائے۔ اس نغمہ کو شعیب منصور نے لکھا اور اس کی دھن حیات نے بنائی تھی اس کی ویڈیو 14 اگست 1987ء کو پی ٹی وی کے تمام مراکز سے دکھائی گئی۔ اس ویڈیو کی ہدایات بھی شعیب منصور نے دی تھیں اور اس میں وائٹل سائنز کو مری کی خوب صورت پہاڑیوں میں گاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

اس نغمہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وائٹل سائنز کا نام موسیقی کے افق پر چھا گیا۔ اس زبردست کامیابی اور شعیب منصور کی حوصلہ افزائی نے روحیل اور شہزاد کو اپنی پہلی البم لانے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا۔ اس وقت نصرت حسین بینڈ چھوڑ چکا تھا اور اس کی جگہ سلمان احمد نے لے لی تھی۔ اس کے باوجود جنید جمشید اس بارے میں سنجیدہ نہیں تھا۔ اس بارے میں اس نے پی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

”اس نغمہ کی کامیابی کے باوجود میں نے موسیقی کو پروفیشن بنانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ میرا ارادہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان ایئر فورس میں انجینئرنگ کے شعبے سے وابستہ ہونے کا تھا۔ میں نے موسیقی کو محض مشغلہ کے طور پر اپنایا تھا۔“

تاہم روحیل حیات اور شہزاد حسین نے اسے آمادہ کرلیا کہ وہ کم از کم پہلی البم کی تیاری تک ان کے ساتھ رہے۔ چنانچہ اس البم کی تیاری کے لیے یہ تینوں دوست کراچی آگئے۔ اس البم کی ریکارڈنگ ای ایم آئی اسٹوڈیوز میں ہوئی لیکن نغمہ نگاری اور دھنیں ترتیب دینے کا زیادہ تر کام سلمان احمد کی قیام گاہ پر ہوا۔ جہاں یہ تینوں دوست ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس البم میں پروین شاکر کی نظم ”چہرہ“ کے عنوان سے شامل کی گئی۔ بقیہ نغمات شعیب منصور کے تحریر کردہ تھے۔ ان کی موسیقی جنید اور راحیل نے ترتیب دی تھی۔ اس البم میں ول ول پاکستان سمیت کل بارہ گانے تھے۔ جسے روحیل حیات نے پروڈیوس کیا جو اس کی پہلی میوزک پروڈکشن تھی۔ اب روحیل کا شمار پاکستان کے نامی گرامی میوزک پروڈیوسرز میں ہوتا ہے۔ اس نے 2007ء میں شعیب منصور کی فلم ”خدا کے لیے“ کی موسیقی ترتیب دی اور 2008ء سے ٹی وی میوزک شو کوک اسٹوڈیو کررہا ہے۔

وائٹل سائنز ون یکم مارچ 1989ء کو ریلیز ہوئی اور اس نے مقبولیت کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر شعیب منصور نے ایک ٹی وی ڈرامے ”وھندلے راستے“ کی ہدایات دیں جس میں اس بینڈ کی سچی کہانی بیان کی گئی تھی۔ اس ڈرامے میں بینڈ کے تمام اراکین نے اداکاری کی۔ دیگر فنکاروں میں ایس اے رحمٰن، نیئر کمال اور تابندہ شیخ شامل تھیں جب کہ اسے حسینہ معین نے تحریر کیا تھا۔

دسمبر 1990ء میں سلمان احمد نے وائٹل سائنز سے علیحدگی اختیار کرلی اور جنون کے نام سے اپنا بینڈ بنالیا۔ اس کی جگہ رضوان اسحٰق کو لیڈ گٹارسٹ کے طور پر بینڈ میں شامل کرلیا گیا۔ 1990ء میں جنید جمشید نے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سول کنٹریکٹر کے طور پر پاکستان ایئر فورس میں کام شروع کردیا لیکن کچھ عرصہ بعد ہی یہ ملازمت چھوڑ کر پوری طرح موسیقی پر توجہ دینے لگا۔

1991ء میں اس بینڈ کا دوسرا البم وائٹل سائنز 2 کے عنوان سے ریلیز ہوا۔ اس کی کامیابی کے بعد بینڈ نے امریکا کا دورہ کیا اور کئی کنسرٹ کیے۔ اس کے بعد وائٹل سائنز کے دو

البم ''اعتبار'' اور ''ہم تم'' کے نام سے ریلیز ہوئے۔ اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے بینڈ کا اکٹھا رہنا ناممکن ہوگیا۔ 1998ء میں جنید جمشید نے بینڈ سے علیحدگی اختیار کرلی اور انفرادی سنگر کے طور پر اپنا کیریئر شروع کردیا۔ شہزاد حسن امریکا چلا گیا اور روحیل نے اپنی ریکارڈنگ کمپنی قائم کرلی۔

جنید جمشید نے اپنی پہلی سولو البم جنید آف وائٹل سائنز کے نام سے 1994ء میں ریلیز کی لیکن بعد میں اس کا نام بدل کر تمہارا اور میرا نام کردیا گیا۔ وائٹل سائنز سے علیحدگی کے بعد جنید نے 1999ء اپنی دوسری سولو البم اس راہ پر ریلیز کی جسے 1999ء میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والے البم کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس البم کے کئی گانے بے حد مقبول ہوئے جنہیں جنید جمشید نے خود لکھا تھا۔ بہت زیادہ پسند کیے جانے والے گانوں میں اس راہ پر، تو نہ آئے گی، آنکھوں کو آنکھوں نے اور اوصنم شامل تھے۔

2000ء میں جنید نے اپنی تیسری البم وابیسٹ آف جنید جمشید کے نام سے ریلیز کی جس میں اس کے پرانے گانوں کو ری مکس کی شکل میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کی پسندیدگی کا تناسب ملا جلا رہا۔ اس کا چوتھا اور آخری سولو البم ول کی بات 2001ء میں ریلیز ہوا جو بہت زیادہ کامیاب رہا اور اس نے عوام کی توجہ حاصل کرلی۔

2003ء میں بی بی سی ورلڈ سروس نے موسٹ پاپولر سانگس کا انتخاب کرنے کے لیے ووٹنگ کروائی۔ اس کے لیے دنیا بھر سے سات ہزار گانوں کا چناؤ کیا گیا۔ بی بی سی کے مطابق 155 ملکوں کے عوام نے اس ووٹنگ میں حصہ لیا۔ نتیجے کے مطابق وس چوٹی کے گانوں میں ول ول پاکستان تیسرے نمبر پر تھا۔

وائٹل سائنز کے خاتمے پر میڈیا میں قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں کہ شاید اب جنید بھی موسیقی کو خیر باد کہہ دے گا لیکن یہ افواہیں دم توڑ گئیں جب جنید نے اپنی سولو البمز ریلیز کرنا شروع کیں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کے لائیو کنسرٹ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس وقت وہ شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا اور اسے کئی اداروں کی جانب سے پرکشش آفرز ہو رہی تھیں پھر اچانک ہی وہ منظر سے غائب ہوگیا۔ اس کے آخری دو البم مارکیٹ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکے اور نہ ہی نقادوں کی جانب سے ان پر مثبت تبصرے کیے گئے۔ اس کے قریبی ساتھی اس تبدیلی کو محسوس کررہے تھے پھر سننے میں آیا کہ اس نے موسیقی سے دوری اختیار کرلی ہے اور قریبی مسجد میں پانچ وقت کی نماز باجماعت باقاعدگی سے ادا کررہا ہے۔ 2004ء میں اس نے اعلان کیا کہ اس نے اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کردی ہے۔ گزر اوقات کے لیے اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر گارمنٹ اسٹور کھولا جس کا برانڈ JJ بے حد مقبول ہوا۔

اس کے دوستوں اور پرستاروں کے لیے یہ ایک دھماکا خیز خبر تھی اور بہت سے لوگ اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ایک مقبول گلوکار جس کے دنیا بھر میں لاکھوں چاہنے والے ہوں وہ دولت، شہرت اور مقبولیت کو ٹھکرا کر دین کا راستہ اختیار کرسکتا ہے۔ اس بارے میں اس کے انتہائی قریبی دوست ٹی وی پروڈیوسر شعیب منصور نے ایک میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

''ایک روز میں نے اخبار میں اپنے دوست جنید جمشید کا انٹرویو دیکھا جس میں اس نے موسیقی چھوڑنے کا اعلان کیا تھا کیونکہ اسے اس کے حرام ہونے کا یقین ہوگیا تھا۔ میں یہ خبر پڑھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے ایک سچے دوست کی طرح سولہ سال تک اس کا ساتھ دیا اور اس کی پروفیشنل لائف کو آگے بڑھانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا لیکن اس نے اتنا اہم فیصلہ کرتے ہوئے مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ قدرت اس سے کوئی بڑا کام لینا چاہ رہی ہے۔''

جنید جمشید میں یہ تبدیلی کس طرح آئی۔ اس کا احوال انہی کی زبانی سنیے۔ ''اکتوبر 1997ء میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ تین روزہ تبلیغی اجتماع میں گیا۔ وہ میری زندگی کا یادگار لمحہ تھا جب میں نے محسوس کیا کہ اب تک زندگی بہت غلط انداز میں گزاری اور اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ زندگی صرف گانے اور اچھلنے کودنے کا نام نہیں ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ زندگی اسلام کے مطابق نہیں ہے تاہم مجھے کسی نتیجے پر پہنچنے میں چھ سال لگ گئے۔ میرے لیے موسیقی چھوڑ دینے کا فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ موسیقی میرا شوق، کیریئر اور روزی تھی۔ لیکن مجھے اپنے اللہ کو بھی راضی کرنا تھا۔''

پوپ میوزک سے کنارہ کشی اختیار کرنا کیوں ضروری ہو گیا تھا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے جنید جمشید نے کہا۔ ''اسلام میں موسیقی کی اجازت نہیں ہے۔ بالخصوص آج کل اسے جس انداز میں پیش کیا جارہا ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے۔ میں ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔''

جنید جمشید نے اعتراف کیا کہ وہ موسیقی چھوڑنے کے بعد اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر کاروبار شروع کیا گو کہ اس کا ذہن کاروباری نہیں تھا اور نہ ہی اس کے خاندان میں کسی نے کپڑے کا کاروبار کیا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کاروبار ترقی کرگیا اور آج اس کا شمار پاکستان کے معروف گارمنٹ اسٹورز میں ہوتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سب اللہ کا کرم ہے اور اس کی رحمتوں کا شمار ممکن نہیں۔

اپنی گزشتہ زندگی سے موازنہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میرا گانا سننے لوگ بڑے شوق سے آتے تھے۔ بہت شہرت اور دولت کمائی لیکن موسیقی چھوڑنے کے بعد بھی اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جب سے میں نے اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا شروع کیا ہے تب بھی ہزاروں لوگ مجھے سننے آتے ہیں۔ میرا اپنا کاروبار ہے جس کی بدولت آرام دہ زندگی گزار رہا ہوں جہاں تک شہرت کا تعلق ہے تو پہلے میں ایک گلوکار کے طور پر پہچانا جاتا تھا اب لوگوں کے دلوں میں میری عزت ہے۔''

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ یہ تبدیلی بہت سے لوگوں کے لیے حیران کن تھی۔ اس بارے میں جنید کا کہنا تھا۔ ''اس اعلان کے بعد لوگوں کا ردِعمل بڑا شدید تھا۔ وہ صرف میری ظاہری شخصیت کو پسند کرتے تھے لیکن انہیں میری اندرونی کیفیت کا علم نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے میں لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب ہوسکا کہ اب تک جو کچھ کرتا رہا، وہ ٹھیک نہیں تھا۔''

''تاہم اس بات کی خوشی ہے کہ فیملی نے مکمل طور پر میری حمایت کی۔ خصوصاً میری بیوی نے اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا کیونکہ اس سے پہلے میں جس پروفیشن میں تھا اور جس طرز کی زندگی گزار رہا تھا اس کے پیش نظر اخبار والے میرے بارے میں مختلف افواہیں پھیلاتے رہتے تھے اور اکثر میرا تعلق کسی عورت سے جوڑ دیتے تھے۔ اس لیے میری بیوی کے لیے یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔''

2004ء کے بعد جنید جمشید نے اپنے آپ کو پوری طرح اسلام کے لیے وقف کردیا۔ وہ باقاعدگی سے تبلیغی اجتماعات میں شرکت کرنے لگے اور انہوں نے ٹیلی ویژن پروگراموں میں بھی اسلامی موضوعات پر گفتگو میں حصہ لینا شروع کردیا۔ وہ عالم دین نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی دینی درسگاہ سے تعلیم حاصل کی تھی لیکن تبلیغی اجتماعات میں شرکت اور دین کے مطالعے نے انہیں مذہبی موضوعات پر گفتگو کرنے کے قابل بنادیا۔

نازیہ حسن کو شہرت اسٹیج نے دی تھی۔ وہ جس پروگرام میں جاتی دھوم مچادیتی۔ اسٹیج کی دنیا میں اس نے ایک مقام بنالیا تھا۔ اس نے ساتھ دینے کے لیے اپنے بھائی زوہیب حسن کو چنا تھا۔ یہ ایک عجیب بات تھی جس نے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ پاکستانی معاشرے میں اس جوڑی کو ناپسند کیا جانے لگا کیونکہ گیت، غزل میں محبوب کو یاد کیا جاتا ہے۔ پرفارمنس کے دوران بہن بھائی کو محبوب کہہ کر گانے پیش کرتی اور بھائی اسے محبوبہ۔ گانے کسی بھی زبان کے ہوں اس کا مرکزی نکتہ رومانی ہوتا ہے۔ یہی بات لوگوں کو پسند نہیں آرہی تھی لیکن ان دونوں کی آواز اتنی اچھی تھی کہ لوگ برا کہہ کر بھی اس کے گانے سنتے۔ اس کا ایک گانا ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے'' جب انڈین مووی ''قربانی'' میں شامل ہوا تو وہ صف اوّل کی گلوکارہ بن گئی۔ ابھی وہ شہرت کی بلندی پر تھی کہ اس نے افریقا کے ایک پاکستانی نژاد تاجر سے شادی کرلی۔ ابھی وہ ایک بچے کی ماں بنی تھی کہ اسے ..... کینسر ہوگیا اور وہ صرف 35 سال کی عمر میں موت سے ہمکنار ہوگئی۔

انہوں نے اپنی آواز کے بہتر استعمال کے لیے نعت خوانی شروع کردی۔ ان کی نعتوں کا پہلا البم ''جلوۂ جاناں'' کے عنوان سے 2005ء میں منظر عام پر آیا جس میں بارہ نعتیں تھیں۔ ان میں ''محمد کا روضہ قریب آرہا ہے'' بے حد مقبول ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ہر سال ان کا ایک نعتیہ البم ریلیز ہوتا رہا۔ 2013ء تک ان کے نو البم منظر عام پر آچکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں نعت گوئی کتنی پسند تھی۔

جنید جمشید کو اپنی زندگی میں ایک افسوسناک تنازعہ کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں عورتوں کی فطرت کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا حوالہ دے دیا جس پر مذہبی حلقے ناراض ہوگئے اور جنید جمشید کے خلاف تند و تیز بیانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس پر جنید کو معافی مانگنا پڑی تب جا کر یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

اگر جنید جمشید اپنے آپ کو تبلیغ دین اور نعت خوانی تک محدود رکھتے تو بہتر تھا لیکن انہوں نے عالم دین اور اسکالر نہ ہوتے ہوئے بھی مذہبی موضوعات پر گفتگو شروع کردی جس کا

خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا۔ انہوں نے خود اعتراف کیا کہ کم علمی کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔

راقم کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ مذہبی موضوعات پر گفتگو کرنے کا حق صرف مستند علمائے دین اور مذہبی اسکالرز کو ہے لیکن ٹی وی چینلز محض اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے نامور شخصیات کو مذہبی پروگراموں بالخصوص رمضان نشریات میں مدعو کر لیتے ہیں جن کا علم محدود ہے جس کے باعث ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔

جنید جمشید نے بھی رمضان ٹرانسمیشن میں وسیم بادامی کے ساتھ شریک میزبان کے طور پر حصہ لیا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو نعت خوانی اور پروگراموں کے آخر میں دعا تک محدود رکھا البتہ درمیان میں وہ وسیم بادامی کی مدد کے لیے شرکاء سے لکھے ہوئے سوالات پوچھ لیا کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی موجودگی سے ہی پروگرام میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ ان کا میٹھا لہجہ، دل نشین مسکراہٹ اور خوب صورت انداز گفتگو دیکھنے والوں کے دل میں اتر جاتا تھا۔

وہ سچے عاشق رسولؐ تھے۔ انہوں نے نعت خوانی اور دین کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا اور اس کی خاطر وہ بیشتر وقت سفر میں رہتے۔ آخری بار وہ تبلیغی مشن پر چترال گئے جہاں انہوں نے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ 7 دسمبر 2016ء کو وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ اسلام آباد آ رہے تھے کہ حویلیاں کے نزدیک ان کا جہاز تباہ ہو گیا۔ بدقسمت طیارے میں عملے کے پانچ افراد کے علاوہ 98 مسافر سوار تھے جن میں کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔

ان کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دنیا بھر میں ان کے لاکھوں مداحوں نے اس خبر کو بڑے حوصلے سے سنا۔ ان کے دل غم سے بوجھل اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہر زبان پر ان کے لیے مغفرت کی دعا تھی۔ انہوں نے جس مقصد کے لیے اپنی زندگی وقف کی اسی کی خاطر جان دے دی۔

جنید جمشید کی نماز جنازہ کراچی کے اے کے ڈی گراؤنڈ میں مولانا طارق جمیل نے پڑھائی جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی نامور شخصیات بھی نماز جنازہ میں موجود تھیں۔ ان کے انتقال پر تعزیتی پیغامات کا تانتا بندھ گیا۔

بولی ووڈ سپر اسٹار عامر خان نے کہا۔ ”مجھے ان کی ناگہانی موت کا سن کر بے حد صدمہ ہوا۔ میری ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ والدہ کے ساتھ عمرہ ادا کرنے گیا تھا۔ وہ انتہائی شریف النفس اور مذہبی انسان تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔“

معروف اداکار رشی کپور نے بھی ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے اہل خانہ سے تعزیت کی۔

لیجنڈ کرکٹر اور موجودہ چیف سلیکٹر انضمام الحق کا کہنا تھا۔ ”جنید میرا دوست تھا اور مجھے اس کے انتقال پر گہرا صدمہ ہوا۔ اللہ نے اسے دنیا میں عزت دی اور میری دعا ہے کہ آخرت میں بھی اس کے درجات بلند ہوں۔“

رمیز راجا نے کہا۔ ”میری دعائیں جنید کی فیملی کے ساتھ ہیں۔ اس کی آواز اور یادیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔“

جنید جمشید نے پسماندگان میں بیوہ عائشہ جنید، تین بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑے ہیں۔ ان کے ایک بیٹے کی شادی ہو چکی ہے جب کہ دوسری بیوی نیہا جنید ان کے ساتھ ہی اس حادثے میں جاں بحق ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی جنید جمشید کا 52 سالہ سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔ ان کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ 1987ء سے 2004ء تک وہ ایک گلوکار کے روپ میں اپنے پرستاروں کے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ شہرت، دولت اور مقبولیت ان کے گھر کی لونڈی تھیں جوان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ وہ نعت خواں، مبلغ دین اور برانڈ ایمبیسڈر کے روپ میں سامنے آئے۔ انہوں نے اپنی نعت خوانی اور دلکش انداز بیان سے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ دین کی خاطر انہوں نے گلیمر لائف سے منہ موڑا، پھر بھی دنیا ان کے پیچھے بھاگتی رہی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنے کا نتیجہ تھا کہ پروفیشنل لائف چھوڑنے کے بعد بھی انہیں معاشی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اللہ نے ان کے کاروبار میں اتنی برکت دی کہ جگہ جگہ ان کے اسٹور کی شاخیں کھل گئیں۔

جنید جمشید اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ، ان کی دلنشین باتیں اور نعتیہ کلام ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں تازہ رہے گا۔ وہ کم عمری میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس مرگ ناگہانی کا صدمہ ہمیشہ رہے گا لیکن اس مختصر زندگی میں بھی انہوں نے یادوں کے ایسے چراغ روشن کیے جن کی روشنی ہمارے دلوں کو ہمیشہ منور کرتی رہے گی۔

ناکام گلوکار

شاھد لطیف

وہ گلوکار بننے کی خواہش میں ایک ایک سے سفارش کرا رہا تھا لیکن کامیابی کوسوں دور رہی تب اس کے ایک ہمدرد نے اسے ایک ایسا مشورہ دیا کہ اس پر عمل کرتے ہی وہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔

ایک ناکام گلوکار کی کامیابیوں کی فہرست

جامعہ کراچی کا میرا اہم شعبہ اور ہم جماعت، سہیل اختر علوی الفلاح ”بی“ روڈ میں رہتا تھا۔ میں وہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ اُن کے پڑوس میں ایک لڑکا شاہد بشیر تھا جو نیا نیا ڈاؤ میڈیکل کالج میں آیا تھا۔ اس سے بھی دوستانہ ہو گیا۔ میں خود بھی اُس زمانے میں نیا نیا پاکستان ٹیلی ویژن کے شعبہ پروگرام سے منسلک ہوا تھا۔ ایک روز شاہد بشیر کے ہاں بیٹھا تھا وہیں اُس کے ہم جماعت ایتھلیٹ اسرار قاضی سے ملاقات ہوئی۔ جب اس نے سنا کہ میں ٹی وی میں ہوں تو اس نے

کہا۔ ”میرے بڑے بھائی کو گانے کا شوق ہے آپ ایک بار ان کو سُن لیں۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جب لوگ سنتے کہ میں پی ٹی وی میں ہوں تو فوراً کسی نہ کسی کی سفارش کر دیتے کہ میرا وہ عزیز اداکاری کا شوقین ہے۔ اسے کسی ڈرامے میں کام دلا دیں یا کسی کو گانا گوا دیں۔ اسرار قاضی کی بات بھی آئی گئی ہوگئی۔

وقت گزرتا رہا اور 1982ء آ گیا۔ اس دوران اسرار نے پچاسوں بار کہا کہ میرے بھائی کو ایک بار سن لیں اگر اس کی آواز پسند آئے تو چانس چلا دیں لیکن زندگی کے اتنے جھمیلے ہیں، کہاں یاد رہتا ہے کہ کسی اور کے لیے وقت نکالا جائے مگر قسمت نے اگر زور لگانا ہو تو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس روز جب میں شاہد بشیر کے ہاں گیا تو وہاں اسرار کے ہمراہ ایک لڑکے کو بیٹھا دیکھا جو ایک نظر میں بھارتی اداکار ابھیشیک بچن سے مشابہ لگا۔

”یہ میرے بڑے بھائی اظہار ہیں“۔ اسرار نے خوش ہوتے ہوئے تعارف کروایا۔

وہ میرا ہی ہم عمر تھا۔ رسمی دعا سلام کے بعد میں نے کہا۔ ”اچھا آپ وہی ہیں جن کی آواز بہت اچھی ہے؟“

”جی بس ایسی ہی آواز ہے۔ کہیے تو کچھ سناؤں؟“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں، کیوں نہیں سنائیں۔“ میں نے حوصلہ دیا۔

اس نے ایک مشہور گیت سنایا۔ گلوکار میں تین چیزیں دیکھی جاتی ہیں آواز، سُر اور تال..... اظہار قاضی تینوں میں کمزور نکلا۔ آواز سے زیادہ اُس کی شکل و صورت اور قد و قامت متاثر کُن تھی۔ میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا اُسے مشورہ دیا۔

”ارے بھئی اِس گلوکاری کے چکر میں نہ پڑو! جتنا وقت سُر جمانے اور پکا کرنے میں لگے گا اُس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ ماڈلنگ میں آ جاؤ اور پھر اگر قسمت نے یاوری کی تو اداکاری بھی..... دیکھو آج کل تو ہر خاص و عام ماڈلنگ کی دنیا میں آ رہا ہے۔ مرزا خورشید مسعود اور موسیٰ رضا سے بھی خاکسار کی اچھی دعا سلام ہے جو ماڈلنگ اور فوٹو شوٹ میں ایک نام رکھتے اور صفِ اوّل کے فوٹو گرافر شمار ہوتے ہیں۔ تمہاری شباہت اداکار ابھیشیک بچن جیسی اور ڈیل ڈول مناسب ہے“۔

”اداکاری؟“ اظہار نے مسکرا کے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں! اداکار ندیم بھی تو گلوکار بننے چلے تھے اور کہاں پہنچ گئے! آج کل فاطمہ ثریا بجیا اپنے ٹی وی سیریل ’انا‘ میں نئے چہروں کی تلاش میں ہیں۔ کہو تو اُن سے ملواؤں؟“

”لیکن میں تو موسیقی کے پروگرام میں حصہ لینا چاہتا ہوں!“ اظہار نے جواب دیا۔

”میں موسیقار نہیں لیکن اُن میں اُٹھتا بیٹھتا ہوں۔ تمہیں سُر جما کر گانے میں کافی مشق کرنا پڑے گی تب کہیں جا کر ریڈیو ٹی وی پر گا سکو گے۔ اِس سے آسان کیا یہ نہیں کہ ماڈلنگ میں آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

دراصل ’انا‘ سیریل کی ریکارڈنگ نشر ہونے کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ میرا اس سیریل سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بجیا، ”جگت“ بجیا تھیں، ہر ایک کے ساتھ ایسا رویہ تھا گویا وہی سب سے عزیز ہے۔ یہ کمتر بھی اُن میں شامل تھا۔ میں اظہار کو اُن سے ملوا سکتا تھا اور ممکن ہے کوئی چھوٹا موٹا کردار بھی مل جاتا۔

”دیکھو اظہار! اگر تم سنجیدہ ہو تو ابھی چلو!“

مجھے ایک پروگرام کی ریکارڈنگ کے لیے جانا تھا۔ میں نے مختصراً اسے تاکید کی کہ تم ابھی بجیا کے گھر چلے جاؤ اور لباس میں ضرور پائجامہ کرتہ پہن کر جانا تاکہ ابھیشیک بچن سے اور زیادہ مشابہت ہو۔ ساتھ ہی اسے بجیا کے گھر کا پتا سمجھا دیا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور لوگوں نے دیکھا کہ ’انا‘ سیریل میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ’انا‘ کی ریکارڈنگ اور نشر ہونے کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری تھا۔ ایسے میں اظہار قاضی کی ’انا‘ میں اداکاری کی شروعات بہت دلچسپ ہیں۔ چونکہ اظہار میرے حوالے سے بجیا سے ملا تو بعد میں ایک دفعہ بجیا نے خود مجھے اظہار کے انتخاب کا قصہ سنایا۔ ہوا یوں کہ جب وہ اُن کے ہاں پہنچا تو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بجیا نے لوگوں کی چہ میگوئیاں سنیں کہ فلاں لڑکا کس قدر ابھیشیک بچن سے مشابہ ہے۔ اظہار فطری طور پر خاموش طبع لڑکا تھا۔ وہ اِن آراء کے باوجود خاموشی سے بیٹھا رہا۔ آخر بجیا نے اسے اشارے سے بلایا، اس نے قریب جا کر مختصراً میرا حوالہ دیا اور ادب سے بیٹھ گیا۔ بجیا کی تمام سیریلز میں ہمیشہ لچک رہی ہے۔ انہوں نے فوراً ایک بندے سے کہا کہ وہ جو ایک خاموش کردار ہے وہ اس بچے کو دے دو۔ یوں اظہار کی اسکرین پر پہلی آمد میں کوئی مکالمہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس

نے اِس مختصر سے کام کو بھی بہت دلجمعی سے کیا۔ ابتدا میں اُس کی شہرت کی وجہ ابیتابھ سے مشابہت تھی۔ جب پورے ملک میں اس کا چرچا ہوا تو بعد میں وہی خاموش کردار، مرکزی کردار میں ڈھل گیا۔ اس ڈرامے کے بعد اظہار کی شہرت کا سلسلہ اور بڑھ گیا۔

ابیتابھ بچن سے مشابہت اپنی جگہ لیکن اظہار نے اپنے حصے کا کام بہت توجہ اور محنت سے کیا اور اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ اتفاق سے اُس نے کبھی میرے کسی ڈرامے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

کچھ وقت تیزی سے گزرا اظہار شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا۔ اسی خوشی میں اسرار نے مجھے ہوٹل میں دعوت دی۔ وہاں کافی عرصے بعد اظہار سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس کی سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ برقرار تھا۔ مزاج اور گفتگو کے ساتھ سادہ پن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس ملاقات میں اس نے مجھے بتایا۔ ”شباب کیرانوی کے بیٹے نذر شباب فلم ’روبی‘ بنا رہے ہیں۔ اس میں ہیرو کا کردار جاوید شیخ کو ادا کرنا تھا مگر کسی وجہ سے وہ نہیں آ رہا لہٰذا تقسیم کار ادارے، ایور ریڈی فلمز کے ستیش آنند نے مجھے یہ کردار ادا کرنے کی پیشکش کی ہے۔ سوچتا ہوں جاؤں یا نہیں!“

صاف لگ رہا تھا کہ اظہار شش و پنج میں ہے۔ ایک طرف اسٹیبلشڈ کی مناسب اور اچھی نوکری اور دوسری طرف لاہور کی پیشکش اور فلمی دنیا میں خوابوں کی تعبیر کے مواقع۔ وہ مجھ سے رائے لے رہا تھا۔

”اظہار! فلم اور ٹی وی کی دنیا عارضی ہے۔ یہ جس طرح کسی کو اوپر اُٹھاتے ہیں اُسی طرح نیچے پٹخ بھی دیتے ہیں۔ بھئی فیصلہ تو تم نے کرنا ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ اپنی پکی نوکری نہ چھوڑو۔“

بہرحال وہ آخری فیصلہ کرنے کا حق رکھتا تھا۔ جلد ہی اس کے بارے میں اطلاع آ گئی کہ وہ لاہور منتقل ہو گیا ہے۔ ’روبی‘ ایک کامیاب فلم رہی جس کا سہرا ستیش آنند اور نذر شباب کے ساتھ ساتھ خود اظہار قاضی کو بھی جاتا ہے۔

عموماً نئے آنے والوں کو ابتدائی مواقع اسی طرح ملتے ہیں کہ کسی منجھے ہوئے اداکار نے کوئی کردار ادا کرنا تھا، یا کسی گلوکار نے کوئی گانا ریکارڈ کروانا تھا لیکن..... بعض وجوہات کی بنا پر نہ آ سکا اور یوں اُس کے نہ آنے سے، نئے آنے والے آرٹسٹ کو موقع مل گیا۔ یہی کچھ اظہار کے ساتھ بھی ہوا۔ فلمساز و ہدایتکار جان محمد، جاوید شیخ کی غیر ذمہ داریوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنی فلم ’بینکاک کے چور‘ میں جاوید شیخ کو ہٹا کر اظہار کو رکھ لیا۔ اپنی تیسری ہی فلم میں اظہار نے اُس وقت کی صفِ اوّل کی اداکارہ شبنم کے ساتھ اداکاری کی جس میں جوان سے بوڑھے کا غیر معمولی اور مشکل کردار نبھایا۔

گو کہ اُس نے زیادہ تر اُردو فلموں میں کام کیا لیکن وہ اردو پنجابی ڈبل ورژن فلموں میں بھی نظر آیا۔ ایک پشتو فلم ’دھنگھرو دا کلاشنکوف‘ بھی کی جس کی ہیروئن سلمیٰ آغا تھی۔ یہاں اوپر تلے اس کی فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ آگے چل کر اسے 1991 میں فلم ”بخت آور“ اور 1996 میں فلم ”سخی بادشاہ“ پر نگار ایوارڈ ملے۔ 1990 میں فلم ’چراغ بالی‘ پر عیشل ایوارڈ۔ اس کے علاوہ گریجویٹ ایوارڈ اور بولان ایوارڈ حاصل کیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اظہار نے ابتداء میں بھارتی اداکار ابیتابھ بچن کی مشابہت سے مشہوری پائی لیکن اس نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ مکالموں کی ادائیگی، چال ڈھال اور چہرے کے تاثرات میں کبھی ابیتابھ کی نقل نہ ہو اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔

غمِ روزگار نے ہم سب کو الگ الگ کر دیا۔ رابطے ختم ہو گئے۔ میں خود ملک سے باہر چلا گیا۔ ہر کوئی اپنی اپنی دنیا میں مصروف تھا۔ قاضی برادران، اسرار اور اظہار دونوں سے رابطہ کروانے والا ڈاکٹر شاہد بشیر پہلے ایران، پھر اس کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکا چلا گیا۔ اسرار پہلے بھی رابطہ کرنے کا چور تھا۔ ڈاکٹر شاہد بشیر ایک دو خط لکھنے کے بعد تھک گیا۔ اس طرح ہم سب کا آپس میں رابطہ ختم ہو گیا۔ اظہار سے میرا کوئی ایسا دوستانہ بھی نہیں تھا کہ مستقل کوئی بات چیت ہوتی۔ میرے کراچی میں قیام تک وہ جب بھی یہاں آتا مجھ سے ضرور رابطہ کرتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شہرت اور پیسا آنے کے باوجود اُس کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ وہ ایک مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ فلمی دنیا کی چکاچوند نے اسے متاثر نہیں کیا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ رہا۔ مجھے اظہار کی کامیابیوں کی خبریں اخبارات اور ٹیلی وژن سے ملتی رہیں۔

کولمبو، سری لنکا، ہانگ کانگ وغیرہ میں کامیڈی ایکشن فلموں کا آغاز اداکار و ہدایتکار شمیم آرا صاحبہ نے 80 کی دہائی میں کیا۔ اُن کی ایسی تقریباً سب ہی فلموں نے بہت اچھا کاروبار کیا۔ اِس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے جان محمد

صاحب نے بھی یہی فارمولا استعمال کیا۔ سری لنکا، تھائی لینڈ اور فلپائن میں بننے والی فلمیں کم لاگت میں مکمل ہو جاتی تھیں اور اس طرح فلمسازی میں لگنے والا سرمایا بہت کم وقت میں منافع کے ساتھ واپس آجاتا تھا۔ مجھے ایک مرتبہ اظہار کے بھائی اسرار نے بتلایا کہ لاہور منتقل ہونے کے فوراً بعد 1986 میں فلم 'بینکاک کے چور' کی عکسبندی کے دوران ہدایت کار اور فلمساز جان محمد صاحب اور اظہار کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہوگئی۔ ایک فارمولا طے ہوگیا۔ اس طرح ان دونوں نے مل کر کئی فلموں میں مالی اشتراک کیا۔ اس مشترکہ فلمسازی میں کئی ایک کامیاب فلمیں بنائی گئیں جیسے 'نیلا کی بجلیاں'، 'روپ کی رانی'، 'چوروں کا بادشاہ' وغیرہ۔ یہاں ایک دلچسپ سوال ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ پاکستانی اداکار اکثر فلموں کی ملتی جلتی کہانیوں، کرداروں کی یکسانیت کا رونا روتے رہتے ہیں لیکن اس کو کیا کہیے کہ جب وہ خود فلمساز بنتے ہیں تب وہ اس کام کو کیوں نہیں روکتے؟ روکنا تو بہت دور کی بات ہے، خود بھی یہی کرنے لگتے ہیں۔ اظہار قاضی اور جان محمد کی فلموں کے نام (اور موضوع بھی) خود یکسانیت کا شکار ہیں، جیسے یہ فلمیں بینکاک کے چور، چوروں کا بادشاہ، روپ کی رانی، نیلا کے جانباز، نیلا کی بجلیاں، ناگن سپیرا، سانپنی، ناچے ناگن، عالمی جاسوس، انٹرنیشنل گوریلے، کالا راج، کالے ناگ وغیرہ۔ ان دونوں کی تقریباً تمام فلمیں ہی کامیاب ہوئیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک فارمولا فلم۔ بنانے والے بھی خوش اور فلم بین بھی خوش۔ اب آپ معیار کو کیا کہیں؟ تمام تر وسائل آپ کے کنٹرول میں تھے، آپ چاہتے تو معیاری فلم بنا سکتے تھے لیکن.....

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اظہار کو گلوکاری کا شوق تھا لہٰذا اُس نے اپنی فلمسازی میں تیار ہونے والی چند فلموں میں پلے بیک سنگنگ بھی کی۔ اب وہ کیسے کی گئی ہوگی؟ اگر یہ تجربہ ذرا سا بھی حوصلہ افزا ہوتا تو "غیر گلوکار، گلوکار" non singer-singer کی حیثیت سے اظہار کا کوئی ایک فلمی گیت تو مقبول ہوتا؟ اسی پر بس نہیں، وہ جو کہاوت ہے کہ شوق کا کوئی مول نہیں۔ اس نے اپنی آواز میں غیر فلمی گیتوں کا آڈیو البم بھی ریلیز کیا۔ اظہار کو افسوس ہی رہا کہ عوام نے یہ البم پسند نہیں کیا۔

1982 سے ٹی وی، اور 1986 سے فلم کا شروع ہونے والا یہ سلسلہ 2005 تک چلا پھر اظہار قاضی نے اداکاری ترک کر کے اپنی پوری توجہ پراپرٹی کے کاروبار کی طرف کر دی۔ اداکاری سے سبکدوشی سے پہلے اظہار قاضی کا آخری کام ٹی وی سیریل 'پانی پہ نام' ہے جو پی ٹی وی سے نشر ہوا۔ حسن پرفان کو لکس اسٹائل ایوارڈ کے لیے 2004 بہترین اداکار کے لیے نامزد کیا گیا۔

2002 میں جان محمد کے انتقال کے بعد اظہار کا فلمسازی کا کام جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔ اُن دونوں کی شاید ہی کوئی فلم ناکام ہوئی ہوگی۔ یہ لوگ لاہور میں فلم بناتے ہی نہیں تھے کہ بڑے چھوٹے اداکاروں اور دیگر ہنرمندوں کے نخرے اُٹھاتے پھریں۔ یہ تو دوسرے ممالک میں فٹافٹ اور سستا کام کرنے کے عادی تھے۔ لاہور کے نگار خانوں کا کام اور کام کی رفتار اظہار کے سامنے تھی۔ فلمی دنیا میں اپنی موجودگی قائم رکھنے کے لیے کوئی اور "جان محمد" لاہور تو کیا کراچی میں بھی دور دور نہیں تھا۔ جان محمد کے چلے جانے کے بعد وہ تنِ تنہا فلمسازی کا خطرناک "جوا" کھیلنے کو تیار نہیں تھا۔ انڈسٹری میں پہلے ہی اظہار پر جان محمد گروپ کی چھاپ لگ چکی تھی۔ اب دوسروں کے کھل کر کھیل کھیلنے کی باری تھی۔

ہمارے مشہور فنکار جب اپنی مقبولیت کا عرصہ گزار چکے ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہوئے فلمی دنیا سے واپس ہوتے ہیں کہ "اب لاہور کی فلمی صنعت کی صورتِ حال مخدوش اور فلموں کا معیار پست ہو کر رہ گیا ہے۔ فلمی دنیا کی منفی سیاست دیکھتے ہوئے وہ اداکاری چھوڑ رہے ہیں"۔ مجھے اس بات سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ "ہمارا" معیار تو ایک زمانے سے اب تک نہیں بدلا۔ ہاں! کبھی ایک آدھ 'غیر فارمولا' فلم بن بھی گئی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے! پیسے کی برسات تلے جب یہ فنکار مقبولیت کی عروج پر تھے کیا اُس وقت یہ اُن کا فرض نہیں تھا کہ وہ کم از ایک "معیاری" فلم بنانے میں کوئی حصہ ہی ڈالتے؟

اظہار قاضی کی وفات کے بعد اخبارات میں ان کے لیے بھی یہی لکھا گیا کہ لاہور فلم انڈسٹری میں خندہ صورتِ حال، فلموں کے پست ہوتے معیار اور فلمی دنیا کی منفی سیاست دیکھتے ہوئے یہ اداکاری سے کنارہ کر کے کراچی آگئے اور اپنی تمام تر توجہ پراپرٹی کے کاروبار میں مرکوز کر لی۔ میں اس بات سے بھرپور اختلاف کرتا ہوں۔ اظہار ایک معقول شخص تھا۔ وہ کبھی خیالی دنیا میں نہیں رہا۔ اس قسم کی مایوسانہ بات اُس نے کبھی نہیں کی۔ البتہ زمینی حقائق کی روشنی میں جب اُس نے کراچی آنے کا فیصلہ کیا تو یہ باتیں پھیلائی گئیں۔

یہ درست ہے کہ 90 کی دہائی میں ہماری فلمی صنعت

زوال پذیر رہی۔ کئی فنکاروں نے فلم کے گرتے ہوئے معیار کا شکوہ کرتے ہوئے اس سے کنارہ کر لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا تو ہمیشہ ہی زیادہ زور فارمولا فلموں پر رہا۔ ہمارے فلمساز کہنہ مشق فنکاروں کو سامنے رکھ کر کردار تخلیق نہیں کرتے۔ اسی لیے ایک خاص وقت کے بعد جبکہ ایک فنکار کی صلاحیتوں میں نکھار آچکا ہوتا ہے وہ "مخصوص" فارمولا کرداروں میں فٹ نہیں ہو پاتا اور فلمساز اسے نظر انداز کر کے نئے جوان چہروں کو اہمیت دینے لگتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور شاید جاری ہی رہے جب تک اس شعبے میں نئے ہنرمند انوکھے آئیڈیا لے کر نہیں آتے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اظہار کی شاید ہی کوئی فلم ناکام رہی ہو۔ جان محمد صاحب کے ساتھ مشترکہ فلمسازی کی فلموں میں وہ ہیرو آتا ہی تھا لیکن دوسرے فلمساز بھی اُس کو اپنی فلموں میں ہیرو کا کردار دیتے رہے۔ یہاں بھی اُس کی قسمت نے یاوری کی اور وہ فلمیں کامیاب رہیں۔ پنجابی فلموں میں اظہار قاضی کی سلطان راہی کے ساتھ کامیاب جوڑی رہی جیسے 'عبداللہ دی گریٹ'، 'ارادہ'، 'گجر بادشاہ'، 'لاہوری بادشاہ'، 'مہیجر وگروپ' وغیرہ۔

اظہار کوئی بہت زیادہ گھلنے ملنے والا شخص نہیں تھا اسی لیے فلمی دنیا میں اسکینڈلوں سے محفوظ رہا جب کہ اُس نے شبنم سے لے کر اداکارہ ثناء تک تقریباً 24 اداکاراؤں کے ساتھ کام کیا۔ مزے کی بات یہ کہ فلم بینوں نے اظہار کیساتھ ان سب کی جوڑی کو پسند بھی کیا۔

شاید بعض پڑھنے والوں کے لیے یہ نئی بات ہو کہ ٹیلی ویژن میں اداکاری کرنا اظہار کے والد کو سخت ناپسند تھا۔ وہ اُس سے ناراض بھی ہو گئے تھے۔ لمبے عرصے تک وہ اظہار سے نہیں ملے۔ اظہار کی مخلصانہ کوششوں اور فرماں برداری کی وجہ سے اُنہوں نے ملنا شروع کر دیا لیکن پھر وہ اپنے والد کے گھر نہیں رہے۔ نامور اداکار بننے کے بعد بھی اظہار قاضی نے اپنے والد کا بھرم رکھا۔ وہ کبھی بھی کسی بھی فلمی یا دیگر عوامی تقریبات، تقسیمِ اسناد و ایوارڈ وغیرہ میں اپنی فیملی کو لے کر نہیں گئے اور نہ کسی اخبار یا رسالے میں اُن کی فیملی کی کوئی تصویر شائع ہوئی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اظہار کے اسرار قاضی سے کوئی رابطہ ہو جائے تو میں اُس سے اظہار کی خانگی زندگی کے متعلق کچھ سوالات پوچھ سکوں لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

23 دسمبر 2007 کو جب خبر ملی کہ اظہار قاضی کا انتقال ہو گیا تو..... اُس کا ٹی وی میں گلوکاری کرنے کا شوق اور مجھے گیت سنانا..... یاد آگیا۔ صرف 52 سال کی عمر میں؟ میں حیران رہ گیا۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی عزیزہ کی مہندی کے فنکشن میں نغمہ سرا تھا کہ اچانک گاتے گاتے رُک گیا ساتھ ہی اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا مگر راستے میں ہی اجل نے آلیا۔ انا للہ..... اظہار قاضی اپنی عمر کا بہترین حصہ فلمی صنعت کو دے کر عزت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

قارئین متوجہ ہوں

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کوئین روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

چاند گرہن

زویا اعجاز

جس طرح خواب میرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

اس کا یہ ایک ایسا شعر ہے جو اس کی زندگی کا عکاس ہے۔ اس نے کئی خواب اپنی آنکھوں میں سجائے اور ہر خواب ریزہ ریزہ ہوا..... پھر بھی وہ ٹوٹ کے بکھر نہ پائی۔ ہونٹوں پہ قفل لگائے سفرِ حیات مکمل کرتی رہی۔ زخموں کی ٹیس کو الفاظ کا پیرہن دیتی رہی اور اشعار مقبولیت کی معراج پاتے رہے۔

اس شاعرہ کا زندگی نامہ جس نے شاعری کو نیا آہنگ دیا

آسمان تاریک تھا۔

شب کی سیاہی نے کائنات میں موجود ہر ذی نفس کو نیند کے ہنڈولے میں سوار کرنے کے بعد دنیا و مافیہا سے بے خبر کر رکھا تھا۔ سناٹے، خاموشی اور سردی کے علاوہ اگر کسی اور عنصر کی موجودگی ظاہر ہوتی تھی تو وہ بارش کی آواز تھی۔ دھرتی کی پیاس بجھانے کے لیے چھاجوں چھاج برستا مینہ ایک دلفریب موسیقی کی سی جلترنگ پیدا کر رہا تھا۔

کراچی کے 'لیڈی ڈفرن اسپتال' کے اس کمرے کی

کھڑکی غالباً عملہ کی کسی لحاظی بھول کی بدولت نیم وا رہ گئی تھی لیکن یہ غلطی اس باوقار، کم گو، شفیق چہرے اور دلکش نقوش کی حامل خاتون کے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوئی۔ وہ نقاہت سے نڈھال تھی لیکن درد و اذیت سے اپنے لب کچلتی مکمل طور پر بارش کی صدا میں مگن تھی۔

''کیا بات ہے؟ اس اندھیرے میں کسے تلاش رہی ہو؟'' ایک مانوس محبت بھری آواز نے اسے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

''اپنے مقدر کا ستارہ۔'' اس نے شوہر کو عقیدت و محبت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''صبح صادق اب دور نہیں۔''

''جی ہاں!! میرے مقدر کا نجم، میرے وجود کا حصہ بھی اب طلوع ہونے والا ہے۔'' اس کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔

''پریشان مت ہو افضل النساء! پروردگار اپنا کرم فرمائے گا۔'' شاکر نے اسے دلاسہ دیا۔

''مجھے بھی اپنے رب کی رحمت پر کوئی شبہ نہیں۔ بس آپ کو ایک مکمل خاندان کا تحفہ عنایت کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے درد سے بوجھل لہجے میں کہا اور پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''نسرین رو تو نہیں رہی تھی؟''

''وہ بالکل بھلی چنگی ہے۔ اسے نانا کے سپرد کر آیا ہوں۔ وہ ان کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔''

افضل النساء کی طبیعت اب مزید خراب ہونے لگی تھی۔ شاکر صاحب نے ڈاکٹر کی ہدایات کے بموجب فوراً انہیں مطلع کیا۔ لیڈی ڈاکٹر مسز غلام حسین نے فوری طور پر نرس کے ہمراہ اسے لیبر روم میں منتقل کر دیا۔

شاکر صاحب بے چینی سے کاریڈور میں ٹہلتے زیرلب دعاؤں میں مشغول ہو گئے۔ انہیں اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سنسناتی کیفیت میں جانے کتنا وقت بیت گیا۔ قریبی مسجد سے مؤذن کی صدا بلند ہوئی اور اسی پل ایک باریک، دلکش آواز نے روتے ہوئے دنیا کے قفس میں اپنی آمد کا نقارہ بجا دیا۔

چند لمحوں بعد ڈاکٹر کے متبسم چہرے کی جھلک نے اس کی بے چینی میں واضح کمی کر دی۔

''مبارک ہو زیدی صاحب! پروردگار نے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔''

''الٰہی! تیرا صد ہا شکر ہے۔'' اضطراب اور واہمے فوری تحلیل ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر نرس نے صاف ستھرے کمبل میں ملبوس بچی شاکر زیدی کو تھما دی۔ بچی کی گلابی مائل شہابی رنگت، روشن کشادہ پیشانی، ملکوتی حسن، لمبی خوبصورت خمدار پلکیں، سیاہ بال اور گلابی ہونٹ دیکھ کر شاکر مبہوت ہو گئے۔ آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

پروین شاکر کی اسکول میں پسندیدہ ٹیچر مس آمنہ تھیں۔ وہ اکثر ان کے ساتھ تصویریں کھنچواتی تھیں۔ اسے کھلونوں اور گڑیوں سے کھیلنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر گھر کے باہر کے مشغلوں کو پسند کرتی تھی۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ دونوں بہنیں درختوں پر چڑھتیں، پھل توڑتیں انہیں بارش میں باہر کھیلنا بہت پسند تھا لیکن جب گھر میں رہنا پڑتا تو ذہنی آزمائش کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ اس کا پڑھنے کا شوق دیکھ کر پروین کے والد اکثر اسے پیغمبروں کی کہانیاں لا کر دیتے یا مذہبی موضوعات کی کتابیں لاتے۔ اس کی والدہ بہت عبادت گزار خاتون تھیں جس کا اثر پروین پر بھی تھا۔

1966ء میں پروین نے میٹرک بہترین نمبروں سے پاس کیا اور سرسید گرلز کالج میں انٹر میں ایڈمیشن لیا اور مختلف تحریری مقابلوں میں شرکت کر کے انعام لیتی رہی۔ پھر کالج میں چھ ستمبر کی تقریب کا انعقاد ہونے لگا تو کالج کی استاد محترمہ احسان عظیم صاحبہ نے اسے اپنے پاس بلایا۔

''پروین میں چاہتی ہوں کہ تم چھ ستمبر کے حوالے سے کوئی نظم لکھو۔''

''لیکن میں تو مختلف لکھتی ہوں۔'' (اس کا اشارہ نثر کی طرف تھا)۔

''تم نظم بھی لکھ سکتی ہو۔'' انہوں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''میں کوشش کروں گی۔'' پروین نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کوشش نہیں، تمہیں لکھنا ہے پروین۔'' انہوں نے پیار سے کہا اور پروین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اس نے اپنی پہلی نظم شہدائے چھ ستمبر پر لکھی اور اسے بہت پسند کیا گیا۔

مرسلہ: زرین قمر۔ کراچی

"چشم بدور!!" اس نے بیٹی کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کی اور اسے بانہوں میں لیے افضل النساء کے پاس چلا گیا۔

"افضل!! ذرا دیکھو تو سہی! ہماری بیٹی کا حسن تو حوروں کو بھی شرما دے۔"

افضل کی آنکھوں میں نمی چھلک اٹھی۔

"ارے!! کیا ہوا پگلی؟ یہ آنسو کاہے کو بھلا؟"

"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں، میں آپ کو بیٹے کا تحفہ دے کر خاندان کی تکمیل نہ کر سکی۔"

"بیٹا ہو یا بیٹی! کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ اولاد تو پروردگار کا ایسا تحفہ ہے کہ شکرانے کے لیے ساری زندگی بھی کم ہے۔"

"مجھے اس بات سے کب انکار ہے؟ میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ بابل کا آنگن خالی کر دیتی ہیں۔ نام و نسل تو بیٹا ہی آگے بڑھاتا ہے۔"

"تم دیکھ لینا افضل النساء! میری بیٹی بیٹے سے بڑھ کر تابعدار اور مثالی ہوگی۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب دنیا ہمیں اسی کے حوالے سے جانے گی۔ شاکر صاحب نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے بچی اسے تھما دی۔"

بیٹی کو بانہوں میں لیتے ہی افضل النساء بھی مسحور ہوگئی۔

"ماشاء اللہ! اس کی آنکھوں میں تو ستارے دمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں اس کا نام پروین رکھوں گی، ستاروں کی حسین کہکشاں۔"

"بس تو پھر طے ہوا، ہماری بچی آج سے پروین کے نام سے جانی جائے گی۔ پروردگار اسے ستاروں سے بھی زیادہ چمک و ضوفشانی عطا فرمائیں۔" شاکر زیدی کا لہجہ محبت سے چور تھا۔

"آمین!" افضل نے زیر لب کہا اور بیٹی کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔

☆.....☆

افضل النسا اور شاکر حسین زیدی ایک مثالی جوڑا تھا۔ شادی سے قبل افضل اپنے والدین کے ہمراہ بھارتی ریاست پٹنہ میں مقیم تھیں۔ سات سال کی عمر میں ہی یتیمی کی دھوپ نے جھلسا دیا تو سائبان کی قدر و قیمت ایک ناقابل فراموش درس بن کر زندگی پر محیط ہوگیا۔ عہد بلوغت میں قدم رکھتے ہی افضل النساء کے والدین کے ایک فرسٹ کزن نے اپنے بیٹے شاکر کے لیے بہت چاؤ اور ارمان سے ان کا ہاتھ طلب کر لیا۔ انکار کی گنجائش ہی نہ تھی۔

1949 میں عقد نکاح میں بندھنے کے بعد وہ کراچی کی رضویہ کالونی میں رہائش پذیر ہوگئے۔ ذہنی ہم آہنگی روز اوّل ہی سے باکمال تھی اس لیے ازدواجی زندگی کی مشکلات اور ناہمواریوں پر قابو پانے میں ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی۔ اس خوشحال زندگی میں محض ایک تشنگی تھی کہ افضل کی صحت مختلف مسائل کا شکار رہتی تھی مگر اس کے باوجود وہ صبر و تحمل اور شکر گزاری کا پیکر تھیں۔

ان کی شخصی خوبیوں کی بدولت گھرانا ارضی جنت تھا۔ مذہب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اپنے مسلک کے اصول و ضوابط و تعلیمات پر عمل کر کے گھریلو ماحول حتی الامکان بہت سادہ، منظم اور پُرسکون بنائے رکھنے میں کامیاب تھے۔

پروین اپنے والدین کی ایسی اولاد تھی جسے بے حد منتوں، مرادوں اور وظائف کے بعد حاصل کیا گیا۔ پہلوٹھی کی اولاد نرین نے دو برس قبل سولہ مارچ 1952 کو انہیں والدین کے عظیم ترین رتبہ پر فائز کیا۔ مسرت بے بہا تھی لیکن یہ خوشی اپنے جلو میں ایک گرہن زدہ مایوسی بھی سمیٹ لائی تھی۔ افضل النساء جسمانی اعتبار سے کمزور اور کچھ اندرونی پیچیدگیوں کا شکار ہوگئیں۔ نسرین کی پیدائش کے بعد ڈاکٹرز نے کسی گلٹی کے بغیر مطلع کر دیا تھا کہ وہ صرف ایک بچے کی مزید پیدائش کی متحمل ہو سکتی ہیں۔

افضل نے اپنی صحت مند اولاد کے حصول کے لیے بے تحاشا دعائیں اور وظائف کیے۔ نفلی روزے رکھے۔ ان کا بیشتر وقت قرآنی آیات کے ورد اور وظائف میں گذرتا اور بالآخر دو سال بعد ماہ صفر کی مبارک ساعت میں 24 نومبر 1952 بروز سوموار قدرت نے انہیں ایک حسین ننھی گڑیا سے نوازا۔

نسرین بانو کے لیے پروین جیتی جاگتی گڑیا جیسی تھی۔ وہ فطری طور پر ایک کمزور جسامت اور علالت کا شکار رہنے والی تھی لیکن ننھی پروین کا کوئی بھی کام اسے تھکاتا نہ اکتاتا۔ وہ گھنٹوں اس کے روئی جیسے نرم و ملائم ہاتھ تھامے اپنے رخساروں پر پھیرتی تو کبھی فرط محبت سے اسے چٹاچٹ بوسے دیتی۔ پروین کے لیے اس کے دل میں مامتا سے زیادہ نہ سہی لیکن اس سے کم جذبات بھی نہ تھے۔ وہ اپنے سبھی کھلونے اس کے سامنے لا کر رکھ دیتی۔ بہن کے صبیح چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے وہ اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتی۔

گھریلو ماحول بہت خوشگوار تھا۔ افضل النساء بھی اپنی

مقامی ٹی وی چینل پر ایک شاعرہ کا انٹرویو نشر ہو رہا تھا۔ مشہور وکیل اور ہر دلعزیز ٹی وی اینکر نعیم بخاری انٹرویو لے رہے تھے۔ شاعرہ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ اس کی گھنی، لمبی سیاہ پلکیں اس کی کشادہ پُرکشش آنکھوں پر بار بار جھک جاتی تھیں۔ وہ بہت ہی اطمینان اور سکون کے ساتھ سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔ ذہانت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ خود تو خوب صورت تھی ہی پر اس کا کلام اس سے بھی زیادہ خوب صورت اور رول میں اتر جانے والا تھا۔ وہ خوابناک لہجے میں اپنی غزل سنا رہی تھی۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔

کوبہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

"واہ، واہ بہت خوب۔" نعیم بخاری نے کلام ختم ہوتے ہی تعریف کی اور اگلا سوال کر دیا۔

"ہر انسان کی زندگی میں مختلف واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو یاد رہ گیا ہو؟"

"واقعات تو بہت ہیں۔" شاعرہ نے نپے تلے لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے کوئی ایسا واقعہ جس کا تعلق آپ کی شاعری سے ہو؟"

جسمانی حالت سے قطع نظر اس کے آگے پیچھے پھرتی۔ قدرت نے اسے جس گراں قدر ذمہ داری سے نوازا تھا وہ اس سے عہدہ برآ ہونے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا چاہتی تھی۔ بچوں کی بہترین تربیت ایک کٹھن مرحلہ تھی جس کے لیے عملی کاوشیں درکار تھیں۔ افضل نے انہیں بچپن ہی سے خودداری، سچائی، باہمی محبت، صلہ رحمی اور صوم و صلوٰۃ کا درس دیا۔ وہ اپنے گلشن کے ان پھولوں کو بہترین اقدار کی مہک عطا کرنا چاہتی تھی اور اس کی لگن سے عیاں تھا کہ کامیابی اسی کا مقدر ٹھہرے گی۔

گھریلو ماحول میں ادب، تعلیم اور کتابوں سے محبت بھی نمایاں تھی۔ افضل اپنے ایک عزیز بزرگ عسکری صاحب سے بہت قریب تھیں۔ بچیاں انہیں "نانا" کہہ کر پکارتیں۔ عسکری صاحب ایک باذوق اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ پیشہ کے اعتبار سے تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے لیکن کتابوں اور شاعری سے لگاؤ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ شاعری پر طبع آزمائی بھی کرتے۔ ادبی مجالس میں آمد و رفت انہیں بہت بھاتی تھی۔ دونوں بچیوں سے انہیں کسی سگے رشتے جیسی ہی محبت تھی۔ اس لیے وہ حتی المقدور ان کی تربیت کے خطوط میں رنگ سازی کرنے لگے۔ وہ غیر محسوس طور پر انہیں ماضی کی درخشندہ روایات، فکر اقبال سے روشناس کرواتے ذہنی مضبوطی کا آغاز کر دیا۔

پروین کی فطرت میں بہت اضطراب اور بے چینی تھی۔ بارش سے اسے گویا عشق تھا۔ جب بھی آسمان سے میگھا برستی وہ گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی اور بعد ازاں کسی دروازے یا چارپائی کا سہارا لیے صحن میں پہنچ جاتی۔ پانی کی بوچھاڑ میں بھیگ کر اس پر سرشاری سی طاری ہونے لگتی۔ اس کی بھاگ دوڑ، تجسس فطرت اور اشتیاق پسندی اہلخانہ کو بہت محظوظ کرتی۔ وہ شرارت و سنجیدگی کا ایک انوکھا ملاپ تھی۔ اس کی رگوں میں خون پارے کی طرح مچلتا اس لیے جلد ہی وہ اپنے اہل و عیال کے لیے پروین سے 'پارہ' بن گئی۔

☆.....☆

وقت دبے قدموں بیتتا رہا۔

پروین اب تین سال کی ہو چکی تھی۔ اس کی فطرت کے رنگ دھیرے دھیرے نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ ذہانت میں اپنی مثال آپ تھی۔ عسکری اور شاکر زیدی کی خصوصی محنت نے اسے کم عمری میں ہی علم و ادب کی جانب راغب کر دیا تھا۔ اس کا آئی کیو لیول دیکھتے ہوئے عسکری صاحب نے اسے اسکول میں داخل کروانے کی تجویز پیش کر دی۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن پارہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔" افضل قدرے متذبذب تھیں۔

"میں یہ منطق تسلیم نہیں کرتا، پارہ ایک خاص بچی ہے۔ قدرتی طور پر ذہانت سے مالا مال ہے۔ ذہین بچوں میں تجسس کا روگ ہوتا ہے۔ ان کے اردگرد کسی مثبت سرگرمی کی باڑ نصب نہ کی جائے تو وہ منفی قوتوں کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ اسے اتنی سی عمر میں ہی سبھی کلمے، کئی ایک سورتیں حفظ ہو چکی ہیں۔ اسکول داخلہ میں تاخیر اب کسی صورت مناسب

''جی ہاں! ایسے کئی واقعات ہیں جنہیں میں اکثر یاد کرتی ہوں اور اسے میں اپنے کلام کی سچی پذیرائی سمجھتی ہوں۔ ان دنوں میری پوسٹنگ کراچی میں تھی، مجھے فیصل آباد ڈسٹرکٹ جیل سے ایک خط موصول ہوا جو ایک ایسے قیدی نے مجھے لکھا تھا جسے موت کی سزا ہو چکی تھی، اس نے صدر محترم سے رحم کی اپیل بھی کی تھی لیکن اس کی یہ اپیل مسترد ہو چکی تھی اس نے مجھے اپنے خط میں لکھا کہ میں مرنے سے پہلے آپ کی کتاب پڑھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ اس قیدی کی آخری خواہش تھی؟'' نعیم بخاری نے پوچھا۔

''جی ہاں! میں عام طور پر کسی خط کا جواب نہیں دیتی لیکن میں نے اس کے خط کا جواب دیا اور میں نے لکھا کہ مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کون ہیں اور آپ کو کس جرم میں سزا ہوئی ہے لیکن چونکہ مرنے سے پہلے آپ کی خواہش ہے تو میں آپ کو کتاب بھیج رہی ہوں۔ کتاب بھیجنے کے بعد میں نے اس کو فون بھی کیا یہ جاننے کے لیے کہ اسے کتاب پہنچ گئی۔''

''کتاب اس تک پہنچ گئی تھی؟'' نعیم بخاری نے پوچھا۔

''جی ہاں، اسے کتاب بھیج کر مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ جو شخص میرے لیے اجنبی تھا وہ مرنے سے پہلے میری کتاب پڑھنا چاہتا تھا یہ اس کی آخری خواہش تھی اور میرے لیے میرے کلام کی بہترین پذیرائی۔''

مرسلہ: زرین قمر۔ کراچی

نہیں۔'' انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

پارہ کو نسرین ہی کے اسکول 'اسلامیہ ہائی اسکول رضویہ کالونی' میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ ایک انگلش میڈیم اسکول تھا۔ تعلیمی نظام اور اساتذہ بہترین تھے۔ پارہ بڑی بہن کی معیت میں اس انوکھے اور نئے جہان کی تسخیر کے لیے بہت خوشی سے جایا کرتی تھی۔ اپنی خداداد ذہانت' خوبصورتی' تابعداری اور تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت وہ سبھی اساتذہ کی منظورِ نظر بن گئی۔ اسکول جانا اور لگن سے پڑھائی کرنا اب پارو کی اوّلین ترجیح تھی۔ یہ اس کی ذہانت ہی تھی جس کے باعث وہ ہر جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کرنے لگی۔ جماعت سوئم کے بعد اسے اسکول انتظامیہ نے ڈبل پروموشن دے کر پنجم جماعت میں منتقل کر دیا۔ اپنی اہلیت و ہنر سے بے نیاز پارہ محض اسی بات سے بہت خوش تھی کہ اب وہ اپنی بہترین دوست اور ماں جیسی بہن نسرین کے ساتھ مزید وقت بتائے گی۔

یہی بے نیازی مستقبل میں اس کے مزاج کا جزو لاینفک بننے والی تھی۔

☆.....☆

عمر کا وہ دور پارہ کے لیے خوشیاں' ولولے اور امنگیں سمیٹے ہوئے تھا۔ وہ زندگی کے ہر لمحے سے خوشی کشید کرنا جانتی تھی۔ پارو اپنے ہم عمر بچوں سے بہت منفرد تھی۔ اسے کھلونوں کا شوق تھا نہ ہی گڑیوں کی شادی بیاہ رچانے میں کوئی دلچسپی۔ اس بات پر اکثر نسرین اس سے مصنوعی خفگی کا اظہار بھی کیا کرتی تھی۔

''تم بہت گندی بچی ہو پارو! میں اب تم سے نہیں کھیلوں گی۔''

''لیکن کیوں؟ میں نے کیا غلط کیا ہے؟'' وہ منہ بسورتی۔

''تم میرے دیئے ہوئے کھلونوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔ کل گڑیا کی شادی میں بھی تم نے کوئی حصہ نہیں لیا۔''

''مجھے ان بے جان اشیاء میں بالکل مزہ نہیں آتا۔''

''تو پھر کس بات میں مزہ آتا ہے؟''

''میرا دل چاہتا ہے ہر وقت کتابیں پڑھتی رہا کروں۔ کتابوں کی دنیا مجھے اپنے سنگ پنکھ لگائے نت نئے جہانوں کی سیر کے لیے لے جاتی ہے۔ مجھے منفرد باتیں سکھاتی ہے اور میں سب کچھ فراموش کر دیتی ہوں۔'' اس نے معصومیت سے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا تو نسرین کا دل پسیج گیا۔

پھر دھیرے دھیرے نسرین نے بھی پارہ کے مشاغل اپنا لیے۔ کتب بینی میں نسرین کا دل کم ہی لگتا تھا تاہم وہ بیرونی سرگرمیوں اور کھیل کود میں اس کی فعال ساتھی بن گئی۔ دونوں بہنیں درختوں پر چڑھ کر امرود توڑتیں' گیند سے کھیلتیں' کیڑی کاڑا اور بارش کے دوران ہاپو ناپو کھیلنا انہیں بے حد بھاتا۔ جب افضل النساء کی جانب سے ان سرگرمیوں پر بندش بڑھ جاتی تو باول ناخواستہ گھر میں قیام کرتیں لیکن یہ کھیل بھی ذہنی و تخلیقی سرگرمیوں پر ہی مشتمل

ہوتے تھے۔

پارہ نے اپنی زندگی میں ہر رشتہ اور معاملہ کا ایک مروجہ مقام بنا لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کی غیر نصابی سرگرمیاں کبھی بھی نصابی معاملات پر اثر انداز نہ ہوئیں۔ پرائمری جماعت میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہیں 'اسلامیہ ہائی اسکول' کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہ دن پارہ کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔ بچپن کی یادوں' اساتذہ کی محبت و شفقت اور اسکول کی عمارت سے جدائی کا تصور اسے ہلکان کر رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت کسی سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کیا معاملہ ہے میری بچی؟ آپ اتنی افسردہ کیوں ہیں؟'' ایک معلمہ نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

''میں اس درسگاہ اور آپ سب کو بہت یاد کروں گی۔ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔''

''ایسا نہیں سوچتے بیٹا! ہم بھی آپ جیسی ذہین اور قابل بچی کے جانے سے بے حد ملول ہیں۔ لیکن یہ تو دستورِ دنیا ہے۔ یہ ادارہ محض پرائمری جماعت تک ہی تو ہے۔ آپ نے ابھی بہت سی منازل طے کرنی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اگلے اسکول میں مزید محنت سے ہمارے ادارہ کا نام روشن کریں گی۔''

''جی! اللہ نے چاہا تو میں ایسا ہی کروں گی۔'' اس کی خوبصورت آنکھوں میں عزم اور ولولہ کے آنسو موتی بن کر چمک رہے تھے۔

اسلامیہ ہائی اسکول کے بعد انہیں چورنگی میں واقع ''وی رائزنگ سن اسکول'' میں داخل کروا دیا گیا لیکن ڈیڑھ سال بعد چند وجوہات کی بناء پر مالکان نے یہ ادارہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قدرت پارہ کے لیے بہتر سے بہترین مواقع فراہم کر رہی تھی۔ انہیں 'رضویہ گرلز سیکنڈری اسکول' میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ درسگاہ ان کے گھر سے دس گز کے فاصلہ پر واقع تھی جس کی روحِ رواں ایک نامور' مخلص اور پُرعزم خاتون تھیں۔ زاہدہ تقی نامی یہ خاتون نامور ماہر تعلیم' دانشور' ادیب اور نقاد' پروفیسر کرار حسین' کی بڑی بہن تھیں۔ زاہدہ تقی کو دورِ حاضر کے تقاضوں سے مکمل آگاہی تھی اس لیے اپنی درسگاہ جدید بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اپنے طلبا کو انفرادی توجہ دیا کرتیں۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے انعقاد نے طلبہ کی مخفی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی اور پارہ جیسے بے شمار بچوں کی قوتِ پرواز میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی ذہانت کندن کی طرح چمکنے لگی اور وہ علاقائی سطح پر اسکول کے

پروین کے والدین کی رہائش کراچی میں رضویہ کالونی میں تھی چنانچہ رضویہ کالونی ہی میں واقع ہائی اسکول میں پروین اور نسرین کا ایڈمیشن کروا دیا گیا لیکن ان کی تربیت اسکول جانے سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی ان کے نانا جناب عسکری صاحب جو ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر اور شاعر تھے انہیں کتابوں سے والہانہ عشق تھا اور انہوں نے بچیوں کو بھی اس عشق میں اپنا ساتھی بنا لیا تھا۔ وہ اکثر انہیں معلومات عامہ کی چیزیں بتاتے تھے اور نئے نئے الفاظ سکھاتے تھے۔ دونوں بہنیں ایک ساتھ ہی اسکول بھیج دی گئیں جب ان کا داخلہ ہوا تو نسرین کی عمر پانچ سال اور پروین کی تین سال تھی۔ دونوں میں بے انتہا محبت تھی وہ بالکل دوستوں کی طرح رہتی تھیں۔ آپس میں کھلونے اور کتابیں ایک دوسرے سے شیئر کرتی تھیں۔ گھر خوشبو سے بھرا تھا۔ میر انیس کے مرثیے گھر میں پڑھے، سنے جاتے تھے اسی وجہ سے انہیں کم عمری ہی سے مشکل اشعار کے مطلب سمجھائے جاتے تھے۔ مذہبی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ زندگی کی اچھی اور بری قدروں کا فرق بتایا جاتا۔

☆☆

1977ء میں پروین شاکر ہندو پاک مشاعرے میں شرکت کرنے ہندوستان گئی جہاں اسے خاصی پذیرائی ملی اس کے کلام کی شہرت اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔ 1978ء میں پروین شاکر کو اس کے مجموعہ کلام خوشبو پر آدم جی ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا مجموعہ کلام صدبرگ منظرِ عام پر آیا۔ اس عرصے میں وہ سرسید کالج کی سلور جوبلی کے موقع پر بہترین شاعرہ کا گولڈ میڈل جیت چکی تھی جو اس کی 79-78 کی کارکردگی پر تھا پھر 1983ء میں تیسرا مجموعہ کلام ''خود کلامی'' آیا جس پر اسے اکادمی ادبیات ایوارڈ دیا گیا اور حکومت پاکستان کا صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی بھی اس نے حاصل کیا جو اسے 1991ء میں دیا گیا اس تمام عرصے میں پروین شاکر اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ تعلیمی مصروفیات بھی جاری رکھے رہی اور اس نے درس و تدریس کو خیر باد کہہ کر CSS کا امتحان دیا۔ 1986ء میں وہ ایک بار پھر انڈیا گئی جہاں اسے ظہور نظر ایوارڈ سے نوازا گیا جو اردو نظم پر تھا۔ پھر 1987ء میں اس کی زندگی میں ایک اور تکلیف دہ موڑ آیا اور اس کی شوہر سے علیحدگی ہو گئی اس عرصے میں اس کی شاعری کا رنگ بدل گیا اور اس میں درد کا عنصر نمایاں ہو گیا۔

مرسلہ: زرین قمر۔ کراچی

لیے بے شمار مقابلوں میں سرفراز ہوئی۔

☆.....☆

پارہ کی کتابوں سے محبت اب عشق میں ڈھلنے لگی تھی۔

شاکر حسین زیدی بیٹی کے اس طرز فکر سے بہت خوش تھے۔ وہ اکثر اسے انبیائے کرام کی سیرت و کردار پر مبنی کتب کے تحائف دیتے۔

''جانتی ہو پارہ! ان کتابوں میں ایک خزانہ پوشیدہ ہے؟''

''کیا واقعی بابا جان؟'' اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔

''زندگی میں حکمت' کامیابی اور عظمت کا حصول درکار ہو تو ان سے بہتر کوئی رفیق نہیں۔ یہ کتابیں اللہ پاک کے ان برگزیدہ بندوں کی داستان ہیں جن کا کردار اور عمل رہتی دنیا تک مشعل راہ رہے گا۔''

پارہ کی حسین غلافی آنکھوں میں کئی ایک رنگ لہرانے لگے۔

''آپ ان کا مطالعہ کرو اور پھر مجھے بتایئے گا کہ ان سے کیا سیکھا؟'' شاکر نے کہا۔

پارہ نے فوری طور پر کمر کس لی اور نہایت سنجیدگی سے انبیائے کرام کی سوانح حیات میں کھو گئی۔ اس کا مشاہدہ عمیق تھا۔ ان کتب نے اس کی زندگی کا رخ مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔

''آپ نے بجا فرمایا تھا بابا جان! یہ کتب ایک خزانہ ہیں۔'' اس کا انداز کھویا کھویا تھا۔

''اس خزانے سے کون سے موتی سمیٹے میری بیٹی نے؟'' شاکر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے نبی آخر الزماں ﷺ سے سیکھا کہ سچائی اور ایمانداری بدترین دشمنوں کو بھی گرویدہ بنا لیتی ہے۔ روح اللہؑ نے سچائی کی خاطر کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ حضرت یوسفؑ کی سوانح نے درس دیا کہ تو کل پسندیدہ اور احسن ترین عمل ہے' نتائج خود بخود ہمارے حق میں برآمد ہوتے ہیں۔ نواسۂ رسول ﷺ نے باطل کے سامنے سرنگوں نہ ہونے کی تحریک دی ہے۔''

''سچائی کی راہ بہت کٹھن ہوتی ہے پارہ!! کانٹے بدن کے ساتھ روح کو بھی لہولہان کر دیتے ہیں۔'' شاکر صاحب نے اس کا حوصلہ جانچنا چاہا۔

جی ہاں! راہ حق کبھی بھی آسان نہ ہوگی۔ مخالف اور باطل عناصر قوت پرواز آزمانے کے لیے بادسموم بن جاتی ہیں لیکن بابا جان!! فتح ہمیشہ سچائی ہی کی تو ہوتی ہے اور باطل سرنگوں و رسوا ہوتا ہے۔'' پارہ نے بے خوفی سے کہا۔

مطالعہ کتب جہاں ایک جانب اس کے کردار میں آفاقی خوبیاں پیدا کر رہا تھا وہیں اس کا ذہن تخلیقی صلاحیتوں کے لیے بھی نمو پانے لگا تھا۔ وہ اب مڈل جماعت کی طالبہ تھی۔ اسکول میں اساتذہ کی توجہ اور حوصلہ افزائی اسے مزید متحرک کرتیں۔ اسی دور میں اس نے ایک تخلیقی مضمون لکھا۔ الفاظ کا چناؤ' دلکش اسلوب اور پختہ سوچ دیکھ کر معلمہ انگشت بدنداں تھی۔ انہوں نے پارہ کو طلب کیا اور دبے دبے جوش سے دریافت کیا۔ ''یہ مضمون آپ نے خود تخلیق کیا ہے؟''

''جی ہاں!''

''کسی بڑے سے مدد تو لی ہوگی؟''

''جی نہیں! بس کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ الفاظ و خیالات سیکھ لیے'' اس نے سادگی سے کہا اور پھر ڈرتے ہوئے استفسار کیا:

''کہیں کوئی تشنگی تو نہیں رہ گئی؟''

''ہرگز نہیں!! سچ پوچھو تو میں ابھی تک خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوں۔'' مس آمنہ نے کہا۔ ''اپنا مطالعہ اور قلم کی حرکت یوں ہی جاری رکھنا۔ میں آپ کی تحریر میں مستقبل کی معروف ادیبہ دیکھ رہی ہوں۔ پروین!! یہ لگن اور محنت آپ کو بہت بلندی پر لے جائے گی۔'' انہوں نے فراخدلی سے اسے سراہا۔

پارہ کے عارض اس تعریف پر گلنار ہو گئے اور اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

☆.....☆

مس آمنہ کے علاوہ پارہ میں تخلیقی جرثوموں کی جھلک عسکری صاحب بھی بہت پہلے ہی بھانپ چکے تھے۔

اس کا بچپن' مشاغل' حرکات' لڑکوں جیسے کھیل کود اور منفرد عادات انہیں بہت پہلے باور کروا چکے تھے کہ قدرت نے انہیں ایک انمول جوہر عطا کیا ہے۔ کسی بھی نئی جماعت کی نصابی کتب ملتے ہی وہ فوری طور پر نظمیں تلاش کرتی اور انہیں فوری ذہن نشین کر لیتی تھی۔ مختصر الفاظ میں بحر' ردیف اور قافیوں کا پیراہن اوڑھے جذبات کی تال میل تو اسے لڑکپن ہی سے بہت بھاتی تھی۔ پہلے پہل جب افضل النساء اسے مذہبی مجالس میں اپنے ساتھ لے جایا کرتیں تو اس کا جوش اور عقیدت و احترام قابل دید ہوتا تھا۔ مجالس کا مخصوص

ماحول' خواتین ذاکرہ کا انداز بیان' جوش خطابت اسے مسحور کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ افضل اسے سوتا پا کر خاموشی سے روانہ ہو گئیں۔ بیداری پر جب اسے علم ہوا تو رونے دھونے یا ضد کرنے کی بجائے وہ تن تنہا مقام مجلس تک جا پہنچی۔

ایسے چنیدہ واقعات انہیں گہری سوچ میں غرق کر دیتے تاہم وہ مناسب وقت کے منتظر تھے۔ ان کا تجربہ و مشاہدہ باعلم تھا کہ کسی بھی تخلیق کا سرچشمہ خودکار نظام کے تحت پھوٹتا ہے۔ کسی بھی بے جا دباؤ کے تحت یہ چشمہ قبل از وقت سوکھ جاتا ہے۔ ان کی جہاندیدہ نظریں پارہ کو مستقبل میں ایک 'شاعرہ' کے روپ میں دیکھ رہی تھیں۔

عسکری صاحب کا وجدان اس وقت حقیقت میں تبدیل ہوتا نظر آیا جب انہوں نے پارہ کو اپنی ہم عمر بچیوں کے سامنے صحن میں انتہائی جذب کے عالم میں اپنی پسندیدہ ذاکرہ 'بتول ترابی' کے پڑھے گئے نوحے ہو بہو اسی انداز میں دہراتے ہوئے سنا۔ اس روز انہوں نے اپنی سوچ پہلی مرتبہ اس کے والدین کے گوش گذاری۔ ''پارہ کا جذبہ اور مذہبی عقیدت قابل ستائش ہے۔ اتنی سی عمر میں اس کلام میں پنہاں کرب کی تاثیر محسوس کرنا اور حق کی مکمل ادائیگی ایک غیر معمولی امر ہے۔''

''غیر معمولی تو وہ روز اوّل ہی سے ہے۔ لڑکوں جیسے شوق' اعصابی مضبوطی' ذہنی پختگی ہرگز معمولی خصائل نہیں۔'' شاکر زیدی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن جو میں دیکھ رہا ہوں غالباً تم لوگ تاحال اسے محسوس نہیں کر پائے۔'' عسکری صاحب نے تمہید باندھی۔

''میں تو صرف یہی دیکھ رہی ہوں کہ یہ نسرین سے قطعی برعکس ہے۔ میری کوکھ سے جنم لینے والی ان دونوں بچیوں کے مزاج متضاد ہیں۔ پارہ کو گھرداری سیکھنے سے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔'' افضل نے منہ بناتے ہوئے جھٹ سے کہا تو وہ اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر پائے۔

''میری پارہ پیش بہا صلاحیتوں کی مالک ہے۔ میں اس کے وجود میں ایک انقلابی شاعرہ طلوع ہوتے دیکھ رہا ہوں۔''

''شاید آپ درست کہہ رہے ہیں۔ ابھی چند روز پہلے ہی وہ مجھے اپنی نصابی نظمیں سنا رہی تھی اور مجلس سے واپسی کے بعد اسی طرز اور لَے پر مرثیہ پڑھنا تو ایک معمول بن چکا ہے۔''

شاکر صاحب نے پُرخیال انداز میں تصدیق کی۔ ''میں خود بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔''

''لیکن اس کے لیے گھرداری میں طاق ہونا زیادہ ضروری ہے۔'' افضل نے اپنے خدشات بیان کیے۔

''میں تمہاری سوچ سے جزوی طور پر متفق ہوں لیکن ایک بات جان لو! اگر ہم نے کسی بھی بیرونی دباؤ کے ذریعے اس کی تخلیقی صلاحیتیں دبانے کی کوشش کی تو وہ اعصابی شکستگی' ذہنی تناؤ اور مایوسی کا شکار ہو کر اپنی شخصیت و ذات کا اعتماد کھو دے گی۔'' عسکری صاحب نے برملا کہا۔

''ہرگز نہیں!! میں اپنی بیٹی کو ایک مضبوط انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے اسے کسی بھی جنسی تفریق کی زد میں نہیں آنے دوں گا۔'' شاکر صاحب کے لہجے کی مضبوطی جانچ کر عسکری صاحب طمانیت سے مسکرانے لگے۔

اس کے بعد پارہ کی زندگی میں ایک نئی تبدیلی در آئی۔ عسکری صاحب نے اسے شاعری کے بنیادی رموز سکھانے کا آغاز کر دیا۔ عسکری صاحب اور ان کی بیگم کے لیے یہ دونوں بہنیں بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ وہ بے اولاد تھے اس لیے اپنی محبت و شفقت کا محور انہیں بنا رکھا تھا۔ پارہ کی تکنیکی تربیت ہموار انداز میں چلتی رہی۔ شاعری کے لیے پسندیدگی اب جنون میں ڈھلنے لگی تھی۔

ساٹھ کی دہائی میں ریڈیو پاکستان کا دور دورہ تھا اور پارہ کو ریڈیو کی صوتی لہروں پر نشر ہونے والے موسیقی کے پروگرام بہت بھاتے تھے۔ دھیرے دھیرے نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ وہ نصابی کتب میں موجود نظمیں یاد کرنے کے بعد ان کی دھن اور لَے بھی خود ہی مرتب کر لیا کرتی۔ دونوں بہنیں بلوغت کے اس موڑ پر آن پہنچی تھیں جب مستقبل کا نقشہ اور پیشہ وارانہ زندگی کا رجحان واضح ہونے لگتا ہے۔ نسرین نے ہمیشہ ادویات کی تیاری کے سلسلے میں نانا کی معاونت کی تھی لہٰذا طبی میدان کی طرف رجحان ایک فطری امر تھا۔ اور رہی پارہ تو وہ الفاظ' خیالات' جذبات کے تال میل اور موسیقیت کی برکھا میں مکمل طور پر بھیگ چکی تھی۔

وہ ایک خوش رنگ تتلی تھی جس نے ابھی اس کائنات میں محض پھولوں کی نرماہٹ' خوشبو' برکھا رت اور بہار ہی دیکھی تھی۔ جان چھڑکنے والے والدین' شفیق نانا' دوستوں سے بڑھ کر رازداں بڑی بہن' قابلیت و ذہانت کے معترف اساتذہ کی موجودگی میں زندگی سچ مچ بہت حسین تھی۔

☆.....☆

پارہ کا مزاج شوخی و سنجیدگی کا انوکھا سنگم تھا۔

ایک جانب تو یہ عالم کہ اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑتی وہ اسکول میں ڈبل پروموشن حاصل کرنے کے بعد محض چودہ سال کی عمر میں میٹرک کے امتحانات میں کامیاب ہوگئی اور دوسری جانب کا حال بھی ملاحظہ ہو کہ وہ کسی بھی مجلس، خاندانی تقاریب سے واپسی پر اپنے جوتے پہننا بھول جاتی۔

یہ عادت لاشعوری طور پر اس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ اسے افضل النساء یا نسرین کے ٹوکنے پر ہی خیال آتا تھا کہ وہ برہنہ پا ہے۔ نسرین قدرے سمجھدار اور ہر پہلو پر نظر رکھنے کی عادی تھی۔ وہ اکثر اس کی کھنچائی کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتی۔

''پارہ!!! اپنی عادات میں تبدیلی پیدا کرو۔ تم اب ننھی بچی نہیں ہو۔''

''اب میں نے کیا گستاخی کردی؟'' وہ بے نیازی سے پوچھتی۔

''تم کل مجلس سے واپسی پر جوتے پہننا پھر سے بھول گئیں۔ کیا تمہیں سڑک کی سختی، تپش یا چبھن کا ذرا احساس نہیں ہوتا۔'' نسرین حقیقتاً بہت حیران تھی۔

''نہیں ہوتا بھئی! بلکہ جوتے پہن کر مجھے اپنا وجود کسی شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا ہے اور قید خواہ کوئی بھی ہو، میرے لیے سزائے موت سے بھی بدتر ہے۔ میں اسی روش سے بہت پُرسکون ہوں۔''

''معاشرتی رکھ رکھاؤ بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے کہ نہیں؟ اس معاشرے میں رہ کر ہم ایسی زندگی ہرگز نہیں جی سکتے جو اقدار و روایات اور سماجی اصولوں سے متصادم ہو۔''

''میں آپ کی بات جھٹلا نہیں رہی لیکن میرے نزدیک انسان کی شخصی آزادی کسی بھی اصول اور ضابطہ سے زیادہ اہم ہے۔ ہم معاشرہ سے نہیں ہیں بلکہ معاشرہ ہم سے ہے۔ اس لیے ایسی کسی بھی چیز کو ہوا بنانے کی کیا ضرورت ہے جو اپنے وجود اور بقاء کے لیے ہماری محتاج ہے۔''

''اس سوچ کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی جاسکتی پارہ!''

''میں کسی بھی دباؤ کے تحت منافق زندگی بھی بسر نہیں کرسکتی۔ میں جوتے پہننا بھول جاتی ہوں تو اس میں ایسی کیا قباحت ہے کہ معاشرہ اور سماج مجھے ناپسندیدہ قرار دے دیں۔''

''ایسی باغیانہ سوچ ہی تو ناپسندیدہ ہے میری پیاری بہن! سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''مجھے ہرگز پروا نہیں۔ میرے قول و فعل ہمیشہ میری رضامندی کے تابع ہوں گے۔''

''یہ سراسر نادانی ہے۔'' نسرین زچ ہوگئی۔

''نادانی منافقت سے بہرحال افضل ہے۔'' اس نے سادگی و بے نیازی سے جواب دیا تو نسرین نے اسے سمجھانے کا ارادہ فی الوقت مؤخر کردیا۔

☆.....☆

میٹرک کے امتحانات میں کامیابی کے بعد کالج کی پڑھائی کا آغاز ہوگیا۔

کالج کی زندگی کا تصور ہی کسی بھی انسان کے لیے خواب، تجسس، اشتیاق، سنسنی اور آزادی کے خوش کن احساس سے معمور ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا پڑاؤ ہوتا ہے جب انسان بچپن کی حدود سے نکل کر نوجوانی کی سرحد پر قدم رکھ دیتا ہے۔ نئی ذمہ داریاں، ماحول کی تبدیلی، نت نئے دوست اور ایک نیا افق زندگی کو ایک بالکل انوکھی جہت دیتا ہے۔

پارہ بھی بہت شدت سے زندگی کے اس نئے موڑ کی منتظر تھی۔ ایک لگی بندھی معاشرتی طرزِ فکر کے تحت پہلے پہل اس کے دل و دماغ میں بھی ڈاکٹر بننے کی خواہش موجود تھی لیکن اپنی مخصوص وجدانی قوت کے زیرِ اثر اس نے اختتامی لمحات میں اپنا فیصلہ تبدیل کردیا۔ اس کی یہ وجدانی صلاحیت ہمیشہ ہی اہم ترین مواقع پر پوری شدت سے عود آتی اور حواس و شعور پر مکمل غالب آکر ایسے فیصلے کروالیتی جو مستقبل میں اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوا کرتے تھے۔

اہلخانہ اس کے فیصلے سے کافی حیران تھے۔

''سائنسی مضامین کیوں منتخب نہیں کیے پارہ!'' نسرین نے استفسار کیا۔ وہ عسکری صاحب کی طرح ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

''مجھے اس میدان میں خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔''

''مستقبل قریب میں سائنس و ٹیکنالوجی کا دور دورہ ہوگا۔ ایسی صورتِ حال میں تم کیسے بقا حاصل کر پاؤ گی؟'' شاکر صاحب نے فکرمندی سے دریافت کیا۔

''مجھے ان مضامین کی افادیت سے انکار نہیں لیکن ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ میں لٹریچر پڑھنا چاہتی ہوں۔ اس کی گہرائی، وسعت اور افق مجھے بہت بھاتے ہیں۔ میں اس بحر میں غوطہ زن ہونے کی خواہشمند ہوں۔'' وہ خوابناک لہجے میں کہنے لگی۔ ''اردو ادب تو میں نانا سے پڑھ چکی ہوں، اب انگریزی ادب کا جہان تسخیر کرنا ہے۔ صدیوں پر محیط انسانی سوچ، کردار، فطرت، جبلت اور جذبات کی

تیرنگیوں کا تصور ہی مجھے بے خود کرنے لگتا ہے۔''

والدین نے بیٹی کے جنون اور ذہنی رجحان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے من پسند مضامین پڑھنے کی اجازت دے دی اور یوں دونوں بہنیں 'سرسید کالج برائے خواتین' کا حصہ بن گئیں۔ ماضی کی طرح کالج میں بھی بہت جلد اس کی ذہانت اور صلاحیتوں کا ڈنکا بجنے لگا۔

اپنے ذہن میں مچلتے الفاظ و خیالات کو پیراہن عطا کرنے کے لیے کالج میگزین جیسا پلیٹ فارم میسر آیا تو مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ قلم میں روانی، سوچ کی پختگی اور مزاج میں سنجیدگی نے انتظامیہ کو بھی چونکا دیا لیکن اس کا اصل جہان اور محبت تو شاعری تھی۔ اپنی اسی لاشعوری محبت کے زیرِ اثر اس نے بچپن کے عشق 'برسات' کو عنوان بنا کر ایک نظم تخلیق کی۔ اساتذہ اس کی خداداد صلاحیت پر مسرور تھے اور بے حد پُرجوش بھی۔

''آپ نے 'برسات' کے بعد دوبارہ کوئی نظم کیوں نہیں لکھی؟'' کچھ عرصہ بعد ایک شفیق معلمہ عرفانہ عزیز نے اسے طلب کیا۔

''میری توجہ مضامین کی جانب مبذول ہے۔'' اس نے مؤدبانہ کہا۔

''آپ کے مضامین کی گہرائی میں بالکل کوئی دو رائے نہیں تاہم اپنا ہنر کسی ایک ادبی صنف تک محدود کرکے تخلیقی قوتوں کو بے موت نہیں مارنا چاہیے۔ اشعار پر آپ کی گرفت، سوچ کی گہرائی اور الفاظ کا چناؤ بے مثال ہے۔ اسے صفحہ قرطاس پر منتقل کریں۔''

''لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ کیا لکھا جائے؟ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ و خیالات کا سمندر بہنے کے لیے بے تاب ہے لیکن کبھی یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں لکھ سکتی۔'' اس نے اپنی الجھن بیان کی۔

''ایسا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ آپ نے اپنی پہلی نظم کس بنیاد پر لکھی تھی؟''

''مجھے بارش اور برسات بچپن ہی سے بہت پسند ہیں۔ اس لیے اسی عنوان پر طبع آزمائی کی۔''

''اب سوچیں! ایسی کیا چیز ہے جو بارش کے علاوہ آپ کے لہو میں محبت بن کر دوڑتی ہے؟''

''میرا وطن پاکستان، میری امنگوں کا محور۔'' پروین نے جذب کے عالم میں کہا اور پھر عرفانہ عزیز کا متبسم چہرہ دیکھ کر فوری طور پر ان کا بیان کردہ نکتہ سمجھ گئی۔

پروین شاکر کی ایک دوست رفاقت جاوید، پروین کے بارے میں لکھتی ہیں کہ پروین نے 9 سال عبداللہ کالج میں انگلش لٹریچر پڑھایا اس نے کئی اسکالرشپ حاصل کیں اور بیرونِ ملک بھی تعلیم حاصل کی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ دوسری Phd کرلے لیکن یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی پھر شادی کی ناکامی نے اسے بددل کردیا۔ اس کا بیٹا مراد جسے وہ پیار سے گیتو کہتی تھی اس کی زندگی کا مرکز بن گیا۔ وہ مردوں کے زمانے میں تنہا عورت زاد زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرکے اپنے بچے کو پالتی رہی جس نے اس کی حساسیت کو مزید اجاگر کردیا۔ رفاقت جاوید 1988ء میں اس سے نئی دہلی میں ملی۔ رفاقت کے شوہر پاکستان ایمبیسی میں تھے۔ اور پروین نئی دہلی اردو کانفرنس میں شرکت کرنے گئی تھی۔ اس دورے میں وہ ہندوستان کی مشہور شخصیات سے ملی۔ ان میں خوشونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، الیف ایم حسین، کامنہ پرشاد اور بہت سی اہم شخصیات شامل ہیں۔ انہی دنوں وہ ایک نجومی سے ملی جو انڈیا کی مشہور شخصیات میں بہت مقبول تھا۔ اس نے پروین کو بتایا کہ وہ اپنی شاعری کی پانچویں کتاب مکمل نہ کرسکے گی۔ جس پر وہ ان دنوں کام کررہی تھی۔ نجومی نے کہا کہ وہ جوان مرجائے گی، اس کی دونوں باتیں سچ ثابت ہوئیں۔ وہ بیالیس سال کی عمر میں فوت ہوگئی اور اس کی پانچویں کتاب ''کفِ آئینہ'' اس کی موت کے بعد چھپی۔ یہ کتاب 1996ء میں منظرِ عام پر آئی جو رفاقت جاوید نے مرتب کی اس نے اس کتاب کے لیے مواد پروین کی نوٹ بک اور ڈائری سے جمع کیا۔ پروین کو اکثر کہتے سنا گیا کہ وہ بیالیس سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے گی اور اپنی بیالیسویں سالگرہ کے ٹھیک ایک ماہ بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

مرسلہ: زرین قمر۔ کراچی

اپنی اسی جبلی محبت کے زیر اثر اس نے اگلی نظم 'صبح وطن' لکھی جسے بے پناہ پسندیدگی حاصل ہوئی۔ اب اسے اعتماد ہو چلا تھا کہ وہ شاعری کر سکتی ہے۔ اس کا تخلص 'بینا' تھا۔ بہت قلیل عرصہ میں وہ کالج میگزین کا جزو خاص بن گئی۔

1968 میں ایف اے کے امتحان میں کامیابی کے بعد اس نے 'بی۔ اے آنرز' کے لیے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ انگریزی ادب کا ساتھ یہاں بھی برقرار تھا اور اردو مضامین' اشعار پر بھی طبع آزمائی جاری تھی۔ اس کی سادہ و بے نیاز طبیعت' دوستانہ رویئے' اپنی قابلیت و کامیابی پر عاجزانہ انکساری نے اسے یونیورسٹی میں بھی بے پناہ مقبول کروایا۔

وہ ایک ساحرہ تھی جو اپنے اردگرد موجود افراد کو اعتماد' ملکوتی حسن' دھیمے لہجے اور مٹھاس بھرے الفاظ سے سحر زدہ کر دیتی۔ پروین سے ملنے والا ہر شخص بے اختیار اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا لیکن یہ بے تحاشا محبتیں بھی اسے کبھی غرور اور بدد ماغی میں مبتلا نہ کر پائیں۔

☆.....☆

کالج میگزین کے بعد پارہ یونیورسٹی کی ادبی سوسائٹی میں بھی مقبول ہو گئی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کے برتاؤ اور اظہار خیال میں نکھار پیدا ہونے لگا تھا۔ اس کی ہر تخلیق کو پسندیدگی کی سند عطا ہوتی۔ یونیورسٹی سوسائٹی سے منسلک ہونے کے دو سال بعد ہی اسے سالانہ تقریب انعامات پر بہترین شاعرہ کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انتظامیہ کی اس حوصلہ افزائی نے اس کے ارادے مزید مہمیز کیے۔ 1972 میں وہ سیکنڈ ڈویژن میں انگریزی ادب کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور کچھ عرصہ بعد اس نے 'عبداللہ کالج برائے خواتین' میں انڈر گریجویٹس لڑکیوں کو تعلیم دینے کا آغاز کر دیا۔

حسب سابق بحیثیت لیکچرار بھی وہ مقبول ہوئی۔ اس کی مقناطیسی شخصیت' خلوص' شفیق و دوستانہ رویہ نے طالبات کے دل میں گھر کر لیا اور وہ اپنی اس پُر جوش' باوقار' من موہنی لیکچرار کی گرویدہ ہو گئیں۔

شعبہ تدریس سے وابستگی کے بعد بھی پروین کا قلم سے ناتہ برقرار تھا۔ اگلے دو سال میں وہ 'روزنامہ جنگ' میں بعنوان 'گوشہ چشم' کالم لکھتی رہی۔ پروین شاکر قومی سطح پر ایک معتبر باوقار اور سنجیدہ فنکار کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ زندگی بے فکری اور بچپن کے ہنڈولے سے نکل کر ذمہ داریوں کے دور میں داخل ہو چکی تھی لیکن اس نے کبھی کسی ذمہ داری سے گھبرانا سیکھا تھا' نہ ہی خائف ہونا۔ وہ کامل یقین اور خلوص نیت سے بظاہر زندگی کے تقاضے نبھانے میں مصروف تھی مگر اس وقت کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ اس کے وجود میں اضطراب و سرور کی میٹھی میٹھی لہریں سرایت کر چکی تھیں۔ باشعور' سمجھدار' زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ پارہ جانے کب ایک ایسی رہگذر کی مسافر بن گئی جہاں آغاز میں خوش رنگ تتلیاں' مدھر رسیلے نغمے اور بہار کی معطر ہوائیں مشام جان میں سرایت کر جاتی ہیں مگر پھر دھیرے دھیرے یہ خوشنما رستہ خار زار ثابت ہوتا کڑی تپش اور آبلہ پائی کی سوغات عطا کرتے ہوئے بے نام و نشان اور اندھی مسافت بن جاتا ہے۔

یہ وہی مسافت تھی جو اس کائنات میں ہر ذی نفس ایک بار ضرور اختیار کرتا ہے۔ یہ وہی امرت تھا جسے سبھی مرد و زن زندگی میں ایک بار ضرور نوش کرتے ہیں۔ یہ وہی چاند تھا جو ازل سے ادھورا رہنا مقسوم ٹھہرا ہے۔ یہ وہی قاتل جذبہ تھا جسے ہم 'محبت' کے نام سے جانتے ہیں۔

محبت ایک ایسا آفاقی جذبہ ہے جو سب سے زیادہ قابل نفرین بھی قرار پایا ہے۔ قدرت کی جانے یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اس قاتل کے شکار ہونے والے افراد اپنی منزل کا رستہ ہی کھو دیتے ہیں۔ ازل میں جب اس جذبہ کی پیدائش ہوئی تھی تو غالباً اسی وقت یہ امر بھی لوح محفوظ پر رقم ہو گیا تھا کہ جن سے ولی رشتہ استوار ہو گا' ان کے مقدر کبھی باہم نہ مل پائیں گے۔

پارہ بھی اسی ستم ظریفی کی زد میں تھی۔

اس کی زندگی کو نئے مہکتے جذبوں سے روشناس کرنے والا شخص کون تھا؟ ان کی ملاقات کیسے ہوئی؟ یہ قلبی رشتہ کیونکر استوار ہوا؟ یہ حقیقت کبھی آشکار نہ ہو سکی۔ پارہ کی محبت کسی مقدس راز کی طرح اس کے سینے میں ہمیشہ دفن رہی۔ معلوم ہوا تو محض اتنا کہ وہ اہم ترین شخص دوسرے مسلک کا تھا۔ پارہ نے اپنی شخصی آزادی کے باعث والدین کے سامنے اس خواہش کا اظہار بھی کیا۔

''میں نے کبھی اپنی اولاد کو مسلکی تفریق کی زد میں نہیں آنے دیا۔ میں مذہبی تعلیمات کے مطابق شادی بیاہ کے معاملات میں اولاد کی رضامندی اور خواہش جان لینے کا قائل ہوں لیکن انہیں اندھی کھائی میں گرنے کی اجازت بھی تو نہیں دے سکتا۔'' شاکر صاحب نے تحمل سے کہا۔

''میں نے محض ایک خواہش کا اظہار کیا ہے۔ حتمی فیصلہ آپ ہی کریں گے جو مجھے دل و جاں سے منظور ہو گا۔''

''مجھے تمہاری تابعداری پر ہمیشہ فخر رہا ہے لیکن زمینی

حقائق سے بھی تو منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلک کا فرق رشتوں میں زہر ثابت ہوتا ہے۔ خاندان میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جہاں ایسے رشتے قائم ہوئے مگر انجام علیحدگی کی صورت میں سامنے آیا۔''

''آپ مجھے ہمیشہ اپنی رضا میں راضی پائیں گے۔'' پارہ نے سر جھکا کر اپنے بچپن کی نسبت کے لیے اقرار کر لیا۔ لیکن والدین کے ذہن میں کچھ اور معاملات تھے۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ پارہ ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی ہے اس لیے اسے کسی بھی غیر تعلیم یافتہ اور محدود سوچ کے حامل شخص سے بیاہ دینا سراسر زیادتی ہو گی۔ وہ اسے بہترین شریک حیات فراہم کرنے کے خواہشمند تھے لہٰذا بچپن کی نسبت بھی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

وہ خوبصورت تھی' تعلیمی زیور سے آراستہ تھی' با اعتماد اور خود مختار تھی۔ ان کی شہزادیوں جیسی آن بان والی بیٹی کے شایان شان شریک سفر کی حقدار تھی۔ اپنی اس جبلی خواہش کی تگ و دو کی تکمیل کے لیے کوشش کرتے رہے لیکن شاکر زیدی اور افضل النساء ایک آفاقی نکتہ فراموش کر گئے کہ والدین اپنی اولاد کو جہان بھر کی نعمتیں دے سکتے ہیں لیکن اچھی قسمت اور نصیب عطا نہیں کر سکتے۔

ان کی نازوں پلی پارہ بھی اب قسمت کے پھیر کا شکار ہو گئی تھی۔ حسین زندگی ذمہ داریوں کا پڑاؤ عبور کرتی حادثات کے موڑ پر آن پہنچی تھی۔

☆.....☆

پروین کی زندگی تلاطم خیزی کی لپیٹ میں تھی۔

اس کے قلب و ذہن میں اہم مقام رکھنے والے اس شخص نے پروین کی کوئی بھی توجیہہ سننے سے قبل ہی اپنا فیصلہ صادر کر دیا جس کی رو سے ایک مڈل کلاس لیکچرار سے رشتے کو وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ چند ذرائع کے مطابق وہ سول سروس کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا اس لیے کسی بھی اعلیٰ اور بارسوخ گھرانے سے رشتہ استوار ہو سکتا تھا۔ پروین کی حساس طبیعت کے لیے یہ اہانت سوہان روح تھی۔ نازک جذبوں اور خودداری کے لیے یہ امر کسی تازیانے سے کم نہ تھا تو دوسری جانب اس کا مثبت دل و دماغ ایک اور لاوے کی زد میں تھا۔

عورت ازل سے صنف نازک ٹھہرائی گئی ہے لیکن یہ بڑے سے بڑا سانحہ بھی اپنی ذات پر جھیل کر اپنا وجود پرسکون کر لیتی ہے۔ یہی عورت جب کسی سے محبت کرتی ہے تو محبوب

امجد اسلام امجد اردو شاعری کا ایک بڑا نام پروین شاکر کے بارے میں کہتے ہیں میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ اس کی مختصر نظمیں اس کی بہترین نظمیں ہیں اور 70ء کی دہائی سے اب تک اس کا نام پہلے نمبر پر ہے۔ وہ اپنے بیٹے مراد (گیتو) کی پیدائش پر بہت خوش تھی اس نے ایک نظم بھی کہی تھی

ہاں مجھے نہیں پرواہ اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے سب اداس رستوں پر
ایک چاند روشن ہے
تیری مونی صورت

پروین شاکر کو بہت کم عمری میں ایسی شہرت ملی کہ سکہ بند ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں چھپنے لگی اور جب اس کی پہلی کتاب ''خوشبو'' منظر عام پر آئی تو اس وقت اس کی عمر صرف چوبیس برس تھی۔ امجد اسلام امجد کے مطابق اس نے کم عمری میں زندگی کی بہت سی حقیقتوں کو شاعری میں اس مہارت سے بیان کیا کہ بے مثال کر دیا اس کی شاعری میں جو بات ہے سب سے منفرد ہے۔

☆☆

پروین شاکر کی بڑی بہن نسرین اس کے بارے میں بتاتی ہیں کہ 1981ء میں اس نے ورس و تدریس کو خیرباد کہہ دیا اور کسٹمز میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کی گھر کے باہر کی مصروفیات اس کی گھریلو زندگی کو متاثر کر رہی تھیں۔ اس دنیا میں انسان کی قدر نہیں ہے، نہ رشتوں کی قدر ہے نہ جذبات کی، جہاں اس کی ذات کو قبول ہی نہ کیا گیا ہو وہاں تو یہ انجام ہونا ہی تھا۔ پارہ نے کبھی اپنے آپ کو چھپا کر نہیں رکھا۔ اس کی زندگی کی جتنی بھی حقیقتیں تھیں وہ سب اس کے جیون ساتھی کو ساتھی بننے سے پہلے معلوم تھیں۔

وقت سے کوئی شکایت نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے
ہاتھ تو کاٹ دیئے کوزہ گروں کے ہم نے
مجسمے کی وہی اُمید مگر چاک سے ہے

مرسلہ: زرین قمر۔ کراچی

کو اپنی خواب نگری کا بلاشرکت غیرے مالک بنا دیتی ہے۔ اس کی چٹانوں سے بھی زیادہ طاقتور محبت اپنے تمام تر جذبات اور مستقبل کے سبھی لائحہ عمل اسی کی ذات سے مشروط کر دیتی ہے۔ ہاں، وہ بات الگ ہے کہ اس کا یہ غیر متزلزل جذبہ اپنی نسوانیت کی تذلیل اور رکھائی برداشت نہیں کر پاتا اور بے موت مر جاتا ہے۔ محبت، تڑپ، جنون دھیرے دھیرے وقار و خودداری کے زیر اثر خوابیدگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ وقت کسی بھی عورت کے لیے بہت کٹھن ہوتا ہے۔ ذہنی انا اگر زندگی کی نئی راہیں متعین کرنے پر مائل کرتی ہے تو دوسری جانب ان نئی راہوں پر کسی نئے ہمسفر کی ہمراہی کا تصور بھی آسان بہرحال نہیں ہوتا۔ کبھی اپنے جذبات کی خیانت کا احساس پشیمانی میں مبتلا کرتا ہے تو کبھی اپنی بے منزل مسافت کا احساس مضطرب کرنے لگتا ہے۔

پارہ بھی اسی مخصوص کیفیت سے گذرتی بے حد ہلکان ہو رہی تھی۔ والدین کی جانب سے شادی کا فیصلہ قبول کرنے کے باوجود دل و دماغ میں یاسیت، افسردگی اور گھٹن بریا تھی۔ اپنی اس اندرونی شکست و ریخت سے تنہا نبرد آزما ہوتی وہ ڈپریشن کے مرض میں مبتلا ہونے لگی لیکن ستم ظریفی تو یہ تھی کہ ستر کی دہائی میں اس ذہنی کیفیت کو جانچنے یا گہرائی سمجھ پانے کا کوئی بھی پیمانہ متعین ہی نہ تھا۔

اسی ذہنی کشمکش، افسردگی، کم گوئی اور خود احتسابی کے عمل کو جسمانی عارضہ گردانتے ہوئے اسے اسپتال میں بغرض علاج لے جایا گیا۔ مختلف طبی آزمائشوں سے گذرنے کے دوران ان کی ملاقات ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی جو پارہ کی داستانِ حیات میں ایک نیا 'باب' بن گیا۔

ڈاکٹر نصیر ایک خوبرو اور وجیہہ نوجوان تھے۔ شاکر زیدی سے قرابت داری بھی تھی۔ پروین کے علاج کے سلسلے میں ان سے اکثر مشاورت جاری رہتی۔ وہ کنگ ایڈورڈ کالج سے ایم بی بی ایس تھے۔ سنجیدگی، ذہانت اور پُراعتماد شخصیت کی بدولت کسی بھی دل میں گھر کر لیتے۔ پروین کی صحت یابی کے بعد انہوں نے سیدھے سبھاؤ سے رشتہ بھجوا دیا۔ خاندانی تعلق اور شخصی خوبیوں کی بدولت حجت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پروین نے بھی جذباتیت کو خیرباد کہتے ہوئے غیر جانبداری سے اس رشتہ پر غور کیا۔ ڈاکٹر نصیر کا پیشہ مسیحائی تھا اس لیے ان کی دردمند سوچ، حساسیت اور معاملہ فہمی تو گویا یقینی تھی۔ کم گوئی اور باوقار انداز گفتگو بھی ایک اضافی خوبی تھی کیونکہ پارہ کو زندگی میں کبھی، کسی مقام پر غیر سنجیدگی، شوخ روپئے اور لاابالی پن پسند نہیں تھا۔ اس پہ مستزاد نصیر نے مستقبل میں ازدواجی بندھن قائم ہونے کی صورت میں پروین کے قلمی سفر، شعبہ تدریس سے وابستگی، مشاعروں میں شرکت پر کسی قسم کی قدغن نہ لگانے کا عہد کر لیا۔

ان تمام زمینی حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس بہترین رشتہ کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت تھا لہٰذا 1975 میں ایک رسمی منگنی کے بعد اگلے سال وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ زندگی نے یکدم ایک فسوں کن موڑ لے لیا تھا اور کچھ ہی عرصہ بعد پروین کی شاعری کے پہلے مجموعہ کلام نے اردو ادب میں تہلکہ مچا دیا۔

☆.....☆

پروین کی داستانِ حیات اس کی تخلیقات اور کتابوں کے ذکر کے بنا ادھوری ہے۔ یوں تو مختلف ادبی جرائد میں اس کی نظمیں اور غزلیں شائع ہو کر ناقدین سے پسندیدگی کی سند حاصل کر ہی چکی تھیں لیکن پہلے مجموعہ کلام 'خوشبو' کی اشاعت کے بعد تو گویا چراغوں میں روشنی ہی نہ رہی۔ یہ کتاب نوجوان نسل کے دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی۔ کچی عمر کے رومانی جذبات کو باوقار اور عام فہم انداز میں کلاسیکی رنگ دے کر اس طرح الفاظ کے موتیوں میں پرویا گیا کہ ناقدینِ انگشت بدنداں تھے۔ ایک چوبیس سالہ خاتون کے قلم کی اس پختگی اور روانی نے سبھی کو گنگ کر دیا تھا۔

اس شاعری کا موضوع محبت اور نسائیت تھا۔ اظہار محبت میں بے جھجک عورت ایک منفرد امر تھا۔ یہ رویہ اور اسلوب قبل ازیں نایاب تھا۔ اسے مغرب کے جدید رویئے کا پرتو بھی قرار دیا گیا۔

'خوشبو' کی اصل روح محبت، نسائی جذبات کی شدت اور گہرائی تھی۔ پروین کی شاعری کو آغاز میں ہی Romanticism سے متاثر قرار دیا گیا۔ Romanticism اٹھارویں صدی کے اختتام پر انگریزی ادب کی مقبول ترین تحریک تھی جس نے علوم و فنون، ادبیات، موسیقی اور دانشوری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک میں جذبات، انفرادی سوچ و طرز فکر، ماضی کی عظمت، شان و شوکت کے بیان، فطرت کی خوبصورتی کا برملا اظہار نمایاں پہلو تھے اور انگریزی ادب پر دسترس رکھنے والی پروین شاکر بھی لاشعوری طور پر انہی عناصر کے زیر اثر تھی۔

اردو شاعری میں پہلی مرتبہ کسی شاعرہ نے اپنی تخلیقات میں 'لڑکی' کا لفظ استعمال کر کے ایک انقلابی قدم اٹھایا۔ ماضی

میں مردانہ انقلاب سے مغلوب شاعری میں یہ لفظ شاذ ہی استعمال ہوتا تھا اور محبوب کے لیے بھی ہمیشہ 'مذکر' صیغہ برتا جاتا۔ پروین نے واحد متکلم، ضمیر غائب اور نسائی صیغہ متعارف کروایا۔ یہ انداز تخاطب نثر میں موجود تھا لیکن شاعری نے اس چاشنی سے لطف نہیں اٹھایا تھا۔

'خوشبو' کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ قلیل عرصے میں اس کے بارہ ایڈیشن شائع ہو گئے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہر عمر اور ہر طبقہ فکر کے لوگ بے اختیار کہنے پر مجبور ہو گئے؛

''یہ تو میرے دل میں پوشیدہ راز تھا۔ میں نے بھی تو ہو بہو یہی محسوس کیا تھا۔ پروین نے اسے کیونکر لکھ دیا؟''

اس کتاب میں عورت کے دلی جذبات انتہائی دلکش پیرائے میں بیان کیے گئے۔ زباں بندی کے قفل ہزارہا پہروں اور مصلحتوں میں جکڑی عورت اگر کسی کی چاہت میں گرفتار ہو جائے تو اپنے جذبات عیاں ہونے سے بہت خوفزدہ رہتی ہے۔ دن کا اجالا ہو یا شب کی تاریکی، وہ اپنی آنکھوں، چال اور چہرے کی بغاوت سے خائف ہو کر بے اختیار ایک ہی 'احتیاط' پر مجبور ہو جاتی ہے۔

سوتے میں بھی
چہرے کو آنچل سے چھپائے رہتی ہوں
ڈر لگتا ہے
پلکوں کی ہلکی سی لرزش
ہونٹوں کی موہوم سی جنبش
گالوں پر رہ رہ کر اترنے والی دھنک
لہو میں چاند چاتی اس ننھی سی خوشی کا نام نہ لے لے
نیند میں آئی ہوئی مسکان
کسی سے دل کی بات نہ کہہ دے

'خوشبو' میں بیان کردہ جذبات آفاقی تھے۔ یہ ایسے محسوسات تھے جنہیں صنف نازک اپنے ہمسفر سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔ اسے ایک واہمہ بتلا ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کے جذبات کی یہ شدت مقابل کو مغرور نہ کر دے۔ وہ حتی الامکان ان جذبات کو پس پشت ڈالے رکھتی ہے، مگر اپنی تنہا سوچوں یا کسی خاص موقع پر وہ بلا ارادہ کوئی ایسا فعل سرزد کر دیتی ہے جو حال دل بیان کر دیتا ہے کہ مقابل کی ذات سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے اپنی ذات و خواہشات بالکل بھی نہیں۔

پرل کانچرل پنک
ریولان کا ہیڈ لوشن
الزبتھ آرڈن کا بلش آن بھی،
میڈورا میں پھر نیل پالش کا کوئی نیا شیڈ آیا؟
مرے اس بنفشی دوپٹے سے ملتی ہوئی
رائل میں لپ اسٹک ملے گی؟
ہاں، وہ ٹیولپ کا شیمپو بھی دیجیے گا
یاد آیا
کچھ روز پہلے جو ٹیوز رلیا تھا، وہ بالکل ہی بے کار نکلا
دوسرا دیجیے گا!
ذرا مل بنا دیجیے
ارے! وہ جو کونے میں سینٹ رکھا ہوا ہے
دکھائیں ذرا
اسے ٹیسٹ کر کے تو دیکھوں
(خدایا! خدایا
یہ خوشبو تو اس کی پسندیدہ خوشبو ہی ہے
سدا اس کے ملبوس سے پھوٹتی تھی!)
ذرا اس کی قیمت بتا دیں!
اس قدر!!
اچھا، یوں کیجیے
باقی چیزیں کبھی اور لے جاؤں گی
آج تو صرف اس سینٹ کو پیک کر دیجیے!

اس کی غزلیات مختلف تشبیہات اور استعاروں سے گندھی تھیں۔ 'خوشبو' (بے رخی اور ہرجائی پن) 'ہوا' (ہرجائی کے پوشیدہ معاملات) 'تتلی' (صنف نازک) 'بادل' (رومیو) 'بارش' (محبت) 'آندھی' (مشکلات) جیسے عام فہم اور مانوس الفاظ ہر دل میں گھر کرتے گئے۔ پروین کے بقول محبت جب نفس پر قابو پا لیتی ہے تو وجدان میں بدل جاتی ہے اور خوبصورتی و نزاکت کی انتہا پر خوشبو میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

'خوشبو' کو ملنے والی شہرت، احترام، جنون کسی بھی ادیب کا خواب ہوتا ہے۔ اس کی شاعری زبان زد عام ہو گئی تھی۔ ہر نظم، قطعہ اور شعر مقبولیت کی انتہا پر پہنچ گیا۔ اس ناموری پر اترانا کوئی بھی ادیب اپنا حق سمجھتا ہے لیکن پروین اس اترا ہٹ، مخصوص ادیبانہ رکھ رکھاؤ اور تکبر سے کوسوں دور تھی۔ وہ قارئین کی محبت، ناقدین کی ستائش اور ہم عصر ادیبوں کی مدح سرائی انعام خداوندی سمجھ کر قبول کر رہی تھی۔

پروین شاکر کی منفرد سوچ اور نازک احساسات کو یہ لو خوشبو کی مانند پھیل گئے اور شہرت خواہ کوئی بھی ہو، قیمت بھی ضرور وصول کرتی ہے۔

☆.....☆

گل و خار کا سنگم مبنی بر حقیقت رہا ہے۔ پروین کو جہاں ایک جانب محبت و ستائش مل رہی تھی وہیں دوسری سمت سے حسد و کینہ کی باد سموم بھی اپنی اڑان بھر چکی تھیں۔ اس کی بدقسمتی یہی تھی کہ وہ جس معاشرے کی باسی تھی وہاں مرد و خواتین کو یکساں حقوق دینے کے لیے آواز اٹھانے والے اور روشن خیالی کے علمبردار کسی بھی ایسی صنف نازک کی برتری برداشت بھی نہیں کرتے جو اپنی قابلیت، ہنر اور اہلیت کو منوانے میں کامیاب ہوجائے۔ حیلے بہانوں سے اس پر تنقید برائے تنقید کرنے کے بعد بھی پچھاڑنے میں کامیاب نہ ہوسکیں تو ذاتیات پر رکیک حملے کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

مردوں کے معاشرہ میں زبان بندی پر مجبور، روایات اور مصلحتوں کی بیڑیوں میں جکڑی عورت اگر بزبان شاعری اپنی صنف کے دل کا احوال بیان کرے تو اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو ادب کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے پارہ کے ساتھ کیا۔ اس کی شہرت، مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کی صلاحیت ناقابل برداشت تھی۔ جب سر توڑ کوشش کے باوجود تکنیکی، فنی اور ادبی لحاظ سے اس کے کلام میں کوئی سقم نہ نکل سکا تو ذاتیات پر حملے کی منصوبہ بندی کر لی گئی اور اسی ضمن میں سب سے پہلے اس کے کردار پر نشتر زنی کی گئی۔ افواہوں، طعن و تشنیع اور ہرزہ سرائی کا ایسا بازار گرم ہوا کہ شاکر زیدی اپنی عزیز از جان اولاد کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات میں دل و دماغ میں پنپنے والے خدشات زبان پر لے آئے۔

''پارہ!! شاعری ترک کردو۔''

''لیکن کیوں ابا جان؟'' وہ ششدر رہ گئی۔

''فضاؤں میں زہریلی سرگوشیوں کی گونج ہے۔ ہر فرد نے ہاتھوں میں پتھر تھام رکھے ہیں۔ تمہارا وجود نازک ہے۔ یہ سنگباری سہہ نہ پائے گا۔''

''میں کسی بھی امر سے لاعلم نہیں ہوں ابا جان! حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ کسی انقلاب کو فوری قبول نہیں کرتا۔ صدیوں سے رواں نظام میں ہلچل کے خلاف یکمین ردعمل ضرور دیتے ہیں۔ میں نے عورت کے احساسات اور امنگوں کو گویائی عطا کی ہے۔ وہ عورت جسے حکم زباں بندی تھا، اسے قبول کرنے میں کچھ وقت لگے گا پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''تم صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ نہیں کر پا رہی ہو پارہ!! وہ تمہاری شاعری اور کلام کو انقلاب نہیں سمجھ رہے بلکہ تمہاری ذاتی زندگی، معاشقانہ جذبات اور ناکامیوں کا احوال کہہ رہے ہیں۔ میرے بچے! یہ معاشرہ کا دہرا معیار ہے۔ جب کوئی شاعر فطری جذبات و احساسات کا اظہار کرے گا تو اس پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جائیں گے لیکن اگر ایک شاعرہ اپنی صنف کے فطری و جبلی جذبوں کو الفاظ کا پیراہن دے گی تو اسے ماضی میں ذاتی کمزوریوں اور ناکامیوں سے منسوب کردیا جائے گا میں یہ کیونکر برداشت کروں کہ میری پارہ محفلوں میں منفی انداز میں موضوع گفتگو بن جائے، تم اب اکیلی نہیں ہو۔ ازدواجی بندھن میں منسلک ہوچکی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کوئی بھی لمحاتی لغزش تمہارے گھر کو اپنی زد میں لے لے۔''

''آپ کے خدشات اور تفکرات بے جا ہیں، میں عملی زندگی میں داخل ہوچکی ہوں، ماضی دفن ہو چکا ہے۔ میرے لیے اوّل و آخر صرف نصیر ہیں۔ میرے محرم، ہمدم اور مونس۔ میں صرف انسانی نفسیات اور جذبات کو الفاظ کا روپ دیتی ہوں اور رہی بات طنز و تشنیع کی تو ماضی بعید و قریب میں بھی خواتین پر انگلیاں اٹھائی جاتی رہیں لیکن اگر میں نے مخصوص طبقہ کی حکمت عملی کے تحت کی گئی اس تنقید کے جواب میں اپنے قلم سے ناتہ توڑ دیا تو تاعمر اپنے آپ سے نگاہ نہ ملا پاؤں گی۔ میرا ضمیر مطمئن اور نیت مبنی بر خلوص ہے اس لیے رکاوٹوں کی پروا ہے نہ مشکل رہگزر کا خوف۔ سانچ کو آنچ نہیں ہوتی۔ میرے شوہر کا اعتماد میرا ہمراہی ہوگا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' وہ پُرامید تھی۔

وہ فطری طور پر یونہی بے خوف اور راست گو تھی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث 'نسوانی صداؤں' جانے والی خواتین سے ماضی میں ہونے والے برتاؤ سے بھی آگاہ تھی۔ قرۃ العین طاہرہ نے اپنے عہد کی روایات سے انحراف کرتے ہوئے حجاب لینے سے انکار کیا اور آزاد نسواں کی داعی بنتے ہوئے شاعری کی۔ قید، تشدد اور سنگ زنی بھی جب اس کے پایۂ استقلال میں لغزش پیدا نہ کر پائی تو بالآخر جلاوطن کردی گئی۔

گیارہویں صدی میں Walladr نامی ہسپانوی شاعرہ بھی آزادیٔ نسواں کی علمبردار تھی۔ اس کی شاعری بھی متنازعہ قرار دی جاتی رہی۔ خواتین شعراء میں محض وہی معاشرتی عتاب سے محفوظ رہ پائی تھیں جن کا قلم مذہبی اور صوفیانہ کلام کے زیر اثر تھا۔

پروین لاشعوری طور پر ایرانی شاعرہ 'فروغ فرخ زاد' سے بھی بہت متاثر تھی۔ اس کی روح میں بھی انقلاب

سانس لیتا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں شادی کے بعد اس نے اپنے قلم سے ناتہ برقرار رکھا اور نسوانی شاعری جیسے ناقابل معافی امر پر نہایت دلیری سے طبع آزمائی کرنے لگی۔ بیٹے کی پیدائش کے باوجود فروغ زاد کی شادی محض دو سال بعد طلاق کی صورت میں اپنے اختتام تک پہنچی۔ طلاق یافتگی اور شاعری کے ملاپ نے اسے مزید معتوب بنا دیا لیکن اس کے عزم میں بالکل کمی نہ ہوئی۔ تنازعات اور لعن طعن سے نبرد آزما فرخ زاد محض 33 سال کی عمر میں ایک حادثہ کا شکار ہوکر جانبر نہ ہوسکی۔ اس کا عزم اور چٹانی ارادہ پروین کے اس سفر کے لیے ایندھن ثابت ہوا۔

پروین تنقید کرنے والوں کو کبھی خاطر میں نہ لائی۔ زمانہ طالبعلمی ہی سے وہ ایک معروف مصنف ارنسٹ ہیمنگوے کے بیان کردہ فلسفہ سے بہت متاثر تھی۔ ''بنی نوع انسان کے عزم کو کبھی شکست نہیں دی جاسکتی۔''

وہ جانتی تھی کہ بڑھتے قدم اور قلم کی روانی روک لینے کا مقصد ان ہرزہ سرائیوں کی تصدیق ہوگا۔ اس لیے بلاخوف و خطر اپنی متعین کردہ منزل کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

☆.....☆

ہر مشکل کے ساتھ آسانی کا وعدہ ہے۔

پروین کی تلاطم خیز پیشہ وارانہ زندگی میں تنقید و لغو گوئی کا بازار گرم تھا لیکن قومی سطح پر 'خوشبو' بیسٹ سیلر اور شاہکار کا درجہ پاکر 'آدم جی ایوارڈ' کی حقدار ٹھہرائی گئی۔ بلاشبہ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جس نے حاسدین اور سازشی عناصر کی سٹی گم کر دی۔ اس شادمانی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب اسے کائنات کے عظیم ترین رشتہ کے حصول کی نوید ملی۔ اس کے وجود میں ایک نئی زندگی سانس لینے لگی تھی۔ خوشی ناقابل بیان تھی۔

لاشعوری طور پر اس کی ذہنی رو اپنے قرب و جوار سے جزوی طور پر منقطع ہوگئی۔ اس کا ذہن اور قلب اپنے بچے کے تصورات سے مغلوب رہنے لگے۔ اس کیفیت کے زیر اثر وہ محسوس ہی نہ کر پائی کہ اس کے سسرال میں بھی پیشہ وارانہ زندگی کی کامیابی اور قابلیت سے حسد و عناد نے سیندھ لگالی ہے۔ انہی جذبات کے زیر اثر ان کے آشیانے پر شب خون مارا گیا۔ سازش، جھوٹ، بہتان اور بغض کے پے در پے وار کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ زوجین میں خاموشی نے دبے قدموں اپنا بسیرا بنالیا۔

پروین کے لیے یہ صورتِ حال بہت غیر متوقع تھی۔ کسی

پروین شاکر کو اگر اردو کے صاحب اسلوب شاعروں میں شمار کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے اردو شاعری کو ایک نیا لب و لہجہ اور شاعری کو نسائی احساسات سے مالا مال کیا۔ اس کا یہی اسلوب اس کی پہچان بن گیا۔ آج بھی وہ اردو کی مقبول ترین شاعرہ تسلیم کی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اپنی آٹو بایوگرافی کیوں نہیں لکھی تو اس نے جواب دیا: ''میرا خیال ہے کہ میری عکاسی کرنے کے لیے میری شاعری ہی کافی ہے۔'' اور یہ بات سچ بھی ہے۔ پروین کی پوری شاعری اس کے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار ہے۔ جو در و کائنات بن جاتا ہے پروین شاکر نے کہا تھا: ''محبت کا فلسفہ میری شاعری کی بنیاد ہے اور اس کے حوالے سے بھی اس ازلی مثلث یعنی انسان، خدا اور کائنات کو دیکھتی اور سمجھتی ہوں۔''

ایک اور موقع پر پروین نے کہا۔ ''اس عہد کے مناظر سے متصل حقیقت یہ ہے کہ شعر کہنے والی عورت کو معاشرے نے اب آہستہ آہستہ قبول کرلیا ہے تو ظاہر ہے جب آج کی عورت اپنے پورے نسوانی محسوسات کے ساتھ شعر کہے گی تو اس کی زندگی کی سچائیاں ہی تو سامنے آئیں گی اگر اس نے اپنی زندگی میں اک جیتے جاگتے مرد سے محبت کی ہے۔ تو وہ تجربے کو بیان کرے گی۔''

''اگر میری شاعری میں کوئی رکھ رکھاؤ ہے تو وہ میرے اپنے مزاج اور مطالعے کی وجہ سے ہے۔ میں ایسا ماننے والی ہوں کہ کوئی بھی فنکار کسی بھی فن میں تازگی یا ندرت پیدا نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اس فن کے کلاسیکی ورثے سے واقف نہ ہو اور یہ بات صرف واقف ہونے کی نہیں بلکہ اس سرمائے کو اپنے اندر سے اس طرح تحلیل کرلینے کی ہے کہ وہ اس کے اپنے اظہار کے سانچوں میں ڈھل کر باہر آجائے۔''

☆☆☆

کوچہ ادب کے مشہور شاعر، ادیب اور نقاد خواجہ رضی حیدر کا کہنا ہے کہ ''ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اگر وہ رخصت نہ ہوتی تو بہت بڑی شاعرہ ہوتی جہاں وہ ہم سے رخصت ہوئی وہاں بہت بڑی شاعرہ ہوکر رخصت ہوئی اسے وہ مقام حاصل ہوا جو بہت سے شاعروں کو حاصل نہیں ہوا۔ اس نے ایک جرأت مند شاعرہ کی طرح عورت کے تمام جذبات کو برتا اور بہترین شاعری کے طور پر پیش کیا۔''

مرسلہ: زرین قمر۔ کراچی

بھی عورت کی زندگی میں یہ ایسا دور ہوتا ہے جب اسے شوہر کی توجہ اور محبت کی ضرورت ماضی کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پارہ بھی لاشعوری طور پر نصیر سے وقت کی متقاضی تھی۔

"اس بچے کا نام کیا رکھیں گے بھلا؟" ایک روز اس نے سرشاری سے دریافت کیا۔

"یہ باتیں ابھی قبل از وقت ہیں۔" نصیر نے کہا۔

"قبل از وقت کیوں بھئی؟ میں نے تو بہت پہلے سوچ لیا تھا کہ بیٹے کا نام مراد اور بیٹی کی پیدائش پر شفا نام رکھیں گے۔"

"جیسے تم بہتر سمجھو۔"

"آپ اس قدر عدم توجہی کا مظاہرہ کیوں کرنے لگے ہیں؟"

"میں کچھ پیشہ وارانہ مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ اس لیے ان معاملات پر توجہ دینے کا وقت نہیں۔"

پروین کو یہ برتاؤ بہت کھلنے لگا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جذباتیت کا مظاہرہ شوہر کو اپنی جانب متوجہ اور وہ باڈ ڈالنے کی کوشش اس رشتہ میں مزید بگاڑ پیدا کردے گی اور نتیجہ ہرگز مثبت برآمد نہیں ہوگا۔ وہ تحمل اور معاملہ فہمی سے وقت گذرنے کا انتظار کرنے لگی اور بالآخر وہ لمحہ بھی آگیا جب اس نے ایک زندگی جنم دی۔ Seventh Day Adventiest Hospital کراچی میں بیس نومبر 1978 (کچھ رواپات میں 1979 درج ہے) بروز منگل سوا پانچ بجے مراد کی پیدائش نے اس کی ذات کی تکمیل کردی۔ گھٹن زدہ روز و شب میں مراد کا وجود ایک ایسی تحریک تھی جس نے سبھی واہمے اور اندیشے تحلیل کردیئے۔

ہاں مجھے نہیں پروا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
اب اداس رستوں پر
اک چاند روشن ہے
تیری مونی صورت!

☆.....☆

زندگی اسی دھوپ چھاؤں کی کیفیت میں بیت رہی تھی۔

پروین اپنے تمام تر مصائب اور پیشہ وارانہ مشکلات کے باوجود کسی چٹان کی طرح ڈٹی رہی۔ 1979 میں اسے 'سرسید کالج برائے خواتین کراچی' کی سلور جوبلی کی تقریب پر رواں سال کی بہترین شاعرہ کا ایوارڈ دیا گیا۔

ذاتی زندگی میں افسردگی اور یاسیت بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود رشتوں میں در آنے والے فاصلوں کا کرب ختم ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ ایسے میں مراد پر لاشعوری انحصار بہت بڑھ گیا۔ چند ماہ کے مراد کو دیکھتے ہی پروین کے ناتواں جذبات یکدم تقویت اختیار کرلیتے۔ اسے محسوس ہوتا کہ اگر کل عالم بھی اس کے خلاف کھڑا ہوجائے گا تو اس کا بیٹا ایک اٹوٹ سہارا ثابت ہوگا۔

مراد کا وجود پُرتپش دن اور خدشات سے ٹھٹھری راتوں میں فرحت و سکون کا منبع تھا۔ ایک رات ڈاکٹر نصیر کی نائٹ ڈیوٹی کے باعث وہ کمرے میں تنہا تھی۔ مراد کو لوری سنانے سے قبل ہی اس کی زبان سے بے معنی الفاظ سن کر اس کے روم روم میں مسرت کا ایک چشمہ جاری ہوگیا اور پھر گویا یہ ایک معمول بن گیا۔ اس کے یہ مہمل الفاظ پارہ کو مسحور کرتے' دنیا و مافیہا سے بیگانہ کردیتے۔ وہ بے اختیار سی اس کے ننھے شانے پر اپنا سر ٹکا دیتی اور آنکھیں موندے وجد کے عالم میں بلا ارادہ کہہ اٹھتی؛

"میری زندگی ایک جبری گرداب میں کھینچی گئی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اس زندگی نے مجھ سے کس بات کا تاوان وصول کرنے کی ٹھان رکھی ہے، خوابوں کا تاوان، سچائی کی روش ترک نہ کرنے یا اپنی ہستی کا سمان برقرار رکھنے کا تاوان، میرے بچے! میری اس منتشر حیات اور بے ساز و رنگ روز و شب میں واحد تحریک صرف تمہی ہو۔ میری حیات کا ساز، اس ساز پر رواں مدھر گیت تمہارے ہی دم سے ہے۔ تم میرے گیتو ہو، میرے وجود کا حصہ۔" اس نے مراد کی مہمل زبانداز کو دل کی دھڑکنوں میں سموتے ہوئے کہا۔

اس روز سے مراد نے گیتو کا روپ دھار لیا۔

اپنے تمام تر حاسدین' سازشوں اور لغویات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنے عمل اور قلم سے بہترین جواب دیا۔ فروری 1980 میں اس کی شاعری کے ایک اور مجموعہ "صد برگ" نے ایک بار پھر اردو ادب میں ہلچل برپا کردی۔

☆.....☆

تمہیں شاید خبر نہ ہو
بعض محبتیں
اپنے بلڈ گروپ میں
'او نیگٹو' ہوتی ہیں

صد برگ ایک دوشیزہ کی زندگی کا دوسرا موڑ تھا۔ خوشبو میں وہ نازک طبع' چاہت' محبت' الفت کی بارش میں بھیگی نظر آرہی تھی لیکن صد برگ میں اس بارش کے بعد پیدا ہونے والا حبس اور حقائق کی تن من جھلسا دینے والی دھوپ کی تپش ہر قاری کو اپنے وجود پر محسوس ہوتی ہے۔

محبت میں پور پور ڈوبی دوشیزہ دنیاوی گورکھ دھندے اور عملی زندگی میں اس چاہت و محبت کی حقیقت دیکھ کر اپنی نادانی پر قدرے حیران ہوکر سوچتی ہے؛

"کیا محبت اس قدر ناپائیدار جذبہ ہے کہ عملی زندگی کی آزمائشیں اس کے خوشنما رنگ بدنمائی میں تبدیل کردیتی ہیں؟"

اپنی تمام تر محبتیں اور خلوص بے قدری کا شکار ہوتے دیکھ کر نازک جذبوں سے لبریز دل بے اختیار جابر و غاصب سے ایک برملا بات کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے؛

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی تو کہتے ہو!
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہوں
جو پہنا دو مجھ پر سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچے کے ہاتھ میں تھما دو
میری کسی سے جنگ نہیں
سوچتی جاگتی آنکھیں میری
جب چاہے پٹائی لے لو
کوک بھرو اور باتیں سن لو
یا میری گویائی لے لو
مانگ بھرو' سیندور لگاؤ
پیار کرو' آنکھوں میں بساؤ
اور پھر جب دل بھر جائے تو
دل سے اٹھا کر طاق پر رکھ دو
تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی تو کہتے ہو

پیشہ وارانہ زندگی کے مسائل' حیات کے اس نئے موڑ پر پیش کٹھنائیاں' فاصلوں کا کرب' قریبی رشتوں کی سازشیں' جبر و استحصال سہتی وہ لڑکی نت نئے تجربات کی بھٹی میں جل کر ایک تجربہ کار اور باشعور عورت کا روپ دھار لیتی ہے۔ لیکن یہ بات تو طے تھی..... زندگی کے ہر موڑ پر وہ 'لڑکی' اپنے جذبات کا اظہار بغیر لگی لپٹی اور دوٹوک انداز میں ہی کرتی تھی۔ تصنع' مصلحت اور بناوٹ گویا اس کے وجود کی اہانت تھا۔

پروین نے اس کتاب کے پیش لفظ میں نہایت حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "صد برگ تک آتے آتے منظر نامہ تبدیل ہوچکا ہے۔ میری زندگی کا بھی اور اس سرزمین کا بھی جس کے وجود سے میری بقاء ہے۔"

تجربہ' مشاہدہ' عورت کی عمومی نفسیات بیان کرتی یہ کتاب بھی مقبولیت کی ایک نئی مثال ثابت ہوئی۔

☆.....☆

پارہ ایک مضطرب روح تھی۔

اس کے لیے فراغت ایک ایسا مرض تھا جو انسان کی ذہنی و تخلیقی صلاحیتوں کے لیے قاتل ثابت ہوتا ہے۔ شعبہ تدریس سے وابستگی کو اب نو سال بیت چکے تھے۔ گھریلو مصروفیات کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی تعلیمی استعداد میں اضافہ کا فیصلہ کرلیا۔ انگریزی لسانیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے ایک اور بڑا قدم اٹھاتے ہوئے 'سی۔ایس۔ایس' کے امتحانات دیئے۔ ملکی تاریخ میں یہ واقعہ بھی پہلی مرتبہ وقوع پذیر ہوا کہ کسی امیدوار کو امتحانی کمرے میں بیٹھ کر اپنی ہی تخلیق کردہ شاعری پر مبنی سوالات کے جواب لکھنے تھے۔

پروین شاکر کا قلمی نام پینا تھا۔ اس کی زندگی میں کئی اتفاقات ہوئے۔ وہ جب پیدا ہوئی تو پیر کا دن تھا۔ موسم سرد تھا اور علی الصباح تھی اور جب وہ فوت ہوئی تو پیر کا دن تھا۔ موسم سرد تھا اور علی الصباح تھی۔ جس روز اس کا انتقال ہوا اسی روز روزنامہ جنگ میں اس کا جو کالم شائع ہوا اس کی پہلی لائن ان الفاظ سے شروع ہورہی تھی۔ "موت برحق ہے۔" 1994ء میں پروین شاکر کی موت واقع ہوئی اور 1995ء میں پروین شاکر ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کے دو کام ہیں ایک اس کے بیٹے کی دیکھ بھال کرنا اور دوسرے اس کی شاعری کی حفاظت کرنا، اسے محفوظ کرنا۔ اس ٹرسٹ کی طرف سے "عکسِ خوشبو" شاعری پر ایک ایوارڈ ہر سال کسی نوجوان شاعر کو دیا جاتا ہے اور انگلش لٹریچر میں ہر سال فرسٹ آنے والے طالب علم کو گولڈ میڈل دیا جاتا ہے۔

مرسلہ: زرین قمر۔ کراچی

پروین کی ذہانت اور لگن ہی کا اعجاز تھا کہ ان امتحانات میں وہ دوسری پوزیشن (بعض مقامات پر سوئم پوزیشن کا ذکر درج ہے) حاصل کرنے کے بعد 'فارن سروس' کے لیے اہل ٹھہری۔ ٹریننگ کے لیے سول سروس اکیڈمی لاہور میں آمد بھی ایک یادگار تجربہ تھی۔ اکیڈمی میں بھی بہت جلد اس کی ذہانت کا ڈنکا بجنے لگا۔ یہاں ڈیڑھ سو سے زائد طلبہ کو مات دے کر اس نے میرٹ پر تیسری پوزیشن حاصل کرلی۔ اسے بہترین 'پریذیشنر' کے علاوہ طلائی تمغہ کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

یہ وہ دور تھا جب ملک عزیز پر ایک آمر کی حکومت تھی اور اس کی وضع کردہ پالیسی کے مطابق خواتین افسران بیرونِ ملک تقرری کی مجاز نہ تھیں۔ چار و ناچار اس نے کسٹم اور ایکسائز میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ 1983 میں 'نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کسٹم اینڈ ایکسائز' کراچی میں تربیتی دورانیہ مکمل کرنے کے بعد 'کسٹم ہاؤس کراچی' میں 'اسسٹنٹ کلکٹر' کے عہدہ پر تعینات ہوگئی۔

یہ لمحہ پروین کی زندگی میں یونہی نہیں در آیا تھا بلکہ ان تھک محنت' خونِ جگر اور شب و روز محنت کا شاخسانہ تھا۔ قلم سے اٹوٹ بندھن اب بھی برقرار تھا۔ اس کی زندگی 'حسن' مہک' ذمہ داریوں کے مختلف پڑاؤ عبور کرتی اب ایک آزمائشی دور میں داخل ہوگئی تھی۔ کامیابی کی جانب بڑھتا ہر قدم مخالفین اور حاسدین کے لیے کسی تازیانہ سے کم ثابت نہیں ہوتا تھا جس کی بلبلاہٹ ان کی 'لغو گوئی' سے عیاں ہوجایا کرتی۔

پروین کو اس بات کا بھی بہت قلق تھا کہ مردوں کے اس معاشرے میں اس کے ساتھ روا امتیازی سلوک میں بعض خواتین بھی اسی قبیلے کی باسی بن گئیں۔ یہ خواتین بھی حسد و خوف کے ملے جلے جذبات میں مبتلا تھیں۔ پروین کی کامیابیاں' شہرت اور اعزازات تن من میں جلن پیدا کرتے تھے تو اس کی ساحرانہ شخصیت' اولوالعزمی اور بلند پروازی اس خوف میں مبتلا کردیتی کہ خدا جانے اب وہ تخلیق کا کون سا جہان دریافت کرے گی؟

اس مخصوص طبقہ کو پروین نے مزید انتظار کی کوفت میں مبتلا نہ کیا اور جلد ہی 1985 میں اس کا ایک مجموعہ کلام 'خود کلامی' منظر عام پر آگیا جسے بعد ازاں 'علامہ اقبال ہجری ایوارڈ' سے نوازا گیا۔

☆.....☆

'خود کلامی' پروین شاکر کی 'لڑکی' کا تیسرا پڑاؤ تھا۔

زندگی کے اس اہم ترین موڑ پر وہ رشتوں کی نزاکت' حقائق اور رویوں کی بدصورتی سے مکمل آگاہ ہوچکی تھی۔ کچی عمر کے جذبات تو اب کہیں پس پشت پہنچ گئے اور اس نے زندگی کی سبھی بدصورتیوں کو بھی تسلیم کرلیا۔ ہاں' وہ بات الگ تھی تسلیم و رضا کے اس عمل سے گزرتے اس کی روح چھلنی اور وجود زخم زخم تھا۔ خواب نگری میں اب ایک ہی موسم ٹھہر چکا تھا، اداسی و یاسیت کی گھٹاؤں نے ناقابل برداشت حبس اور گھٹن پیدا کردی۔

رشتوں میں فاصلے پیدا ہوئے تو آنکھوں سے اکثر یہ گھٹن برسات بن کر بہہ جاتی لیکن احساس بے بسی کسی طور پر بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔ یاسیت جب حد سے سوا ہوتی تو وہ اکثر اپنا وجود 'اک تنہا سیارہ' کی طرح کائنات کے مدار میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتی۔

میری پیشانی کو دیکھ کر
میری ماں نے میرا نام
اک تارے کے نام پر رکھا
جگمگ کرنے والا
لیکن میری کیمسٹری میں
ایسا کوئی طلسم نہیں ہے
جو میری تقدیر کو جھلمل کردے
میری مانگ میں اس کے نام کی افشاں بھردے!
میں اپنے سورج سے
ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر ہوں
کائنات کی بے اندازہ وسعت میں
اک تنہا سیارہ ہوں!

اپنی ذات کے خلاء' تنہائی اور افسردگی سے بے حال ہونے کے باوجود اس نے اپنی مثبت روش ترک نہ کی اور اپنی تمام تر تمناؤں' جذبات اور زندگی کا محور اولاد کو بنالیا۔ وہ ایک مثالی دتابعدار دختر تھی۔ بطور شریکِ حیات اس سے بڑھ کر وفادار' اطاعت شعار اور محبت سے چور ہمسفر بھی کوئی نہ تھا۔ اولاد سے دیوانہ وار محبت اور بہترین پرورش میں بھی کوئی اس کی ہمسری نہ کرپایا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی جانب بڑھتے ہوئے گرداب سے سدا اس کے ناکام ٹھہرنے کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ اسے دانستہ طور پر 'احساس کمتری' کے بھنور میں دھکیلا جارہا تھا تاکہ اپنی بقاء میں الجھ کر وہ مزید کوئی صدا بلند نہ کرسکے۔ اس بے یقینی اور افسردہ کیفیت میں ایک احتجاجی ندا اس کے ہونٹوں سے برآمد ہوکر الفاظ میں ڈھل

جاتی ہے۔

میرا گھر
میرے عورت ہونے کی مجبوری کا
پورا لطف اٹھاتا ہے
ہر صبح
میرے شانوں پر
ذمہ داری کا بوجھ لیکن
پہلے سے بھاری ہوتا ہے
لیکن پھر بھی میری پشت پر
نااہلی کا کوب
روز بروز نمایاں ہوتا جاتا ہے!

.....

سارے دائرے میرے پاؤں سے چھوٹے ہیں
لیکن وقت کا وحشی ناچ
کسی مقام پر نہیں رکتا
رقص کی لے ہر لحہ تیز ہوئی جاتی ہے
یا تو میں کچھ اور ہوں
یا پھر
یہ میرا سیارہ نہیں ہے!

اس وحشت زدگی سے بچاؤ کا اسے محض ایک ہی حل 'دکھایا' جاتا تھا کہ وہ اپنی نسوانیت' شخصی وقار' آن' خودداری اور عزتِ نفس کو نابود کرنے کے بعد ایک کچلی ہوئی اور زخم خوردہ زندگی بسر کرے۔ یہ انتخاب تو گویا موت سے بھی بدتر تھا۔ موت تو ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا خاتمہ کردیتی ہے لیکن ایسی زندگی ہر پل ایک دردناک موت دے کر سانس لینا بھی ایک 'عذاب مسلسل' بنادیتی ہے۔

اس نے یہ قربانی دینے سے 'انکار' کردیا۔

اگر بن میں رہنا مقدر ہے
اور یہ ایک طے شدہ امر بھی ہے
کہ ہر بن میں بس بھیڑیے منتظر ہیں مرے
تو یہ سوچتی ہوں
کہ اس صورتِ حال میں
کیوں نہ پھر
اپنی مرضی کے جنگل میں ہی جا بسوں!

☆.....☆

رات بہت وحشت ناک تھی۔

آسمان پر چاند ادھورا تھا۔ وہ کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح اپنے بن میں دبکی تھی۔ اسے اپنے اردگرد ہر سُو بھیڑیوں کی غراہٹ اور سرکش ہواؤں کا شور سنائی دیتا تھا۔ پھر ایک خوفناک آندھی نے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ غراہٹ اور شوریدہ سری بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ یکدم اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے قدموں تلے زمین نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے۔ اس نے سراسیمگی کے عالم میں اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن تاریکی اور دیگر عوامل نے اس کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہونے دی اور اگلے ہی لمحے اسے اپنا وہ خلاء میں معلق کسی پاتال میں دھنستا محسوس ہورہا تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے دیوانہ وار ہاتھوں کو جنبش دی اور پھر پروین کی نیند ایک جھٹکے سے کھل گئی۔

فضا میں مؤذن کی پُرتقدس آواز گونج رہی تھی۔ اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے اپنی کیفیت متوازن کی اور تھکے تھکے قدموں سے وضو کے لیے اٹھ گئی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد وہ گھٹنوں پر سر ٹکائے کچھ لمحات قبل عالم نیند میں دیکھے گئے مناظر کو سوچنے لگی۔ یہ خواب اسے کچھ عرصہ سے تواتر سے کم و بیش اسی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پردہ تصور پر کچھ شبیہات بار بار لہرا رہی تھیں۔

رشتوں کو سنبھالنے اور توازن برقرار رکھنے کی کوششوں کے باوجود تنہائی بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ منافقانہ زندگی جینے سے انکار نے بہت سے قریبی رشتوں کو بھی بے نقاب کردیا تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی کی ناؤ طوفانی لہروں کی زد میں تھی۔

گیارہ سال قبل جب وہ ڈاکٹر نصیر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی تھی تو شوہر نے رشتہ طے پانے سے قبل' منگنی کے بعد اسے اپنے مکمل تعاون' محبت اور شخصی آزادی کی یقین دہانی کروائی تھی۔ آغاز میں ازدواجی سفر بہت پُرسکون اور مثالی تھا۔ نصیر اکثر مشاعروں میں اہلیہ کے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ اس کی کامیابی پر فخر محسوس کرتے مزید بلند پروازی کے لیے تحریک دیتے لیکن وقت کے بے رحم شکنجے نے دھیرے دھیرے ناقابل محسوس انداز میں ان سب عوامل کو دیمک کی طرح کھالیا۔ کچھ سال بیتے تو علم ہوا کہ وہ دونوں دو مختلف دنیاؤں کے باسی ہیں۔ عزیز و اقارب کے دباؤ' معاشرتی رویہ اور وقت کی تیز دھاری کے سامنے وہ دعوے' محبتیں اور فخر و انبساط خاموشی سے نابود ہوگیا۔ ڈاکٹر نصیر کو محض اپنے حقوق یاد رہنے لگے۔ اہلیہ کے لیے اپنے فرائض اور عہد کی پاسداری فراموش ہوگئی۔ پروین شاکر کی مقبولیت اس کی

ناقابل معافی گناہ بننے لگی اور باہمی ذہنی ہم آہنگی کا خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ پروین ماضی کی تاریخی کتب میں بھی ایسے حادثات کی شاہد تھی۔ اس کی شاعری میں بھی اس کرب کی کراہٹ واضح نظر آنے لگی تھی۔

نوشتہ

تب زید نے بکر کو گالی دیتے ہوئے کہا:
کہ اس (بکر) کی ماں اس کے باپ سے زیادہ مشہور تھی

مرے بچے!
ترے حصے میں بھی یہ تیر آئے گا
تجھے بھی اس پدر بنیاد دنیا میں بالآخر
اپنے یوں مادر نشاں ہونے کی اک دن
بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی

...

اب ہجولیوں میں
گاہے بگاہے تیری نجالت
واقفوں کے آگے تیرے باپ کی مجبور خفت
اس گھرانے کا مقدر ہو چکی ہے
کوئی گنتی لگی ہو صدر دروازے پہ لیکن
حوالہ ایک ہی ہوگا
تیرے ہونے نہ ہونے کا!

طعن و تشنیع اور جبر اب چار دیواری میں در آیا تھا۔ پروین کے لیے یہ رشتہ شوہر کا ساتھ اور اپنے گھر کی بقاء بہت اہم تھی۔ وہ 'ورکنگ وومن' بھی لیکن اپنا گھر بسانے کی جبلی خواہش سے بہرحال محروم نہ تھی۔ ذہنی و قلبی دوری اور اس رشتے کے بچاؤ کے لیے اس نے بہت سوچنے کے بعد ایک نفسیاتی اصول کے اطلاق کا فیصلہ کیا۔ جب دو فریقین میں دوریاں بڑھنے لگیں تو انہیں کچھ عرصہ کے لیے خاموشی اور وقتی دوری اختیار کرلینی چاہیے تاکہ جسمانی دوری کی تڑپ اور کشش ان کے باہمی رشتہ کو ایک نیا خوش کن موڑ عطا کردے۔

اسی سوچ کے تحت اس نے ستمبر 1986 میں اپنا تبادلہ 'سینٹرل ریونیو بورڈ اسلام آباد' میں کروالیا جہاں وہ 'سیکنڈ سیکرٹری' متعین کر دی گئی۔ اسی سال 'مظہر نذر ایوارڈ برائے اردو نظم' کے لیے اسے بھارت کا سفر بھی درپیش رہا۔ اپنی ان تمام تر مصروفیات میں وہ ایک ہی خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ ڈاکٹر نصیر سے تعلقات بہتری کی جانب گامزن ہو جائیں گے لیکن اپنی فطری سادگی میں وہ ایک بنیادی نکتہ فراموش کر چکی تھی کہ بعض اوقات دوریاں اور فاصلے 'نئے رشتوں' کی استواری میں بھی بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں اور کسی بھی مرد کے لیے ایسے رشتوں کا آغاز مشکل نہیں ہوتا۔

اسلام آباد تبادلہ ہوئے کئی ماہ بیت چکے تھے مگر حالات ابتری کی جانب گامزن تھے اور پھر وہ جان لیوا لمحہ بھی آ گیا جس سے فرار کے لیے پروین نے 'جلاوطنی' اختیار کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر نصیر نے اپنی دلی و ذہنی کشمکش کو گویائی عطا کردی۔ ''میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن اپنی گرہستی کو چھوڑ کر ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں آپ؟'' پروین بے قراری سے بولی۔

''میں اب اس رشتہ کا بوجھ مزید نہیں ڈھو سکتا۔ معاشرتی چہ مگوئیوں اور زہریلے سوالات کے جواب دیتے میں تھک چکا ہوں۔''

''آپ نے شادی سے قبل مجھ سے کمٹمنٹ کی تھی کہ میرے قلمی سفر سے آپ کبھی معترض نہ ہوں گے۔''

''وہ میری نادانی تھی۔'' اس کی منطق نے پروین کی عزت نفس کی دھجیاں اڑا دیں۔ ''مجھے کیا علم تھا کہ تمہاری شاعری مجھے اہل عالم میں رسوا کردے گی اور لوگ کہیں گے کہ میں تمہاری تسکین کا سامان فراہم کرنے میں ناکام ہوں۔'' اس کے الفاظ نشتر کی طرح پارہ کی روح گھائل کرنے لگے۔

''لاحول ولا قوۃ! آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے ازدواجی بندھن سے بہت مطمئن ہوں اور میری شاعری محض ایک عورت کی آواز ہے، کائنات کی ہر عورت کے دل کی آواز۔'' اس نے کرب سے کہا لیکن مقابل فرعونیت کے زعم میں مبتلا تھا۔

''میں اس خدائی فوجداری کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ تمہارا نام میرے لیے مستقبل میں بھی رسوائی کا سبب بنا رہے گا۔ اس لیے ہمیں علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے۔'' نصیر کے الفاظ نے اس کا وجود پارہ پارہ کردیا۔ اب منت سماجت اور سمجھوتے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔

''آپ نے پل بھر میں ہی میری ہستی کا غرور پاش پاش کردیا۔ آپ شادی کرنا چاہتے تھے' کرلیتے لیکن میرے مجازی خدا ہونے کے ناتے میرے وجود پر یوں کیچڑ تو نہ اچھالتے۔'' اس نے ضبط سے کہا۔

''تمہارا مہر؟''

''طلاق تو دے رہے ہو غرور و قہر کے ساتھ
میرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ''

اس کے لبوں سے ایک سسکی کی صورت میں یہ فقرات برآمد ہوئے۔

''مراد کا نان و نفقہ بھی میں ادا کردیا کروں گا۔''

''مجھے آپ سے کچھ بھی درکار نہیں!! کچھ بھی نہیں! میں اپنے زور بازو سے بیٹے کو پروان چڑھا لوں گی۔'' اس نے وقار سے کہا۔

''تمہارا یہ فیصلہ بیٹے کے مستقبل میں مزید الجھنیں پیدا کردے گا۔''

''گیتو میرے وجود کا حصہ ہے' میرے لہو سے سینچی گئی کونپل..... وہ بجا طور پر ہمیشہ اپنی ماں پر فخر کرے گا۔''

اور پھر پارہ کے لاشعور میں وہ بے خدشات' تاریک راتوں کے وحشتناک خوابوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ ڈاکٹر نصیر اور پروین کا رشتہ طلاق کی صورت میں منتج ہوگیا۔

میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر اے خدا! لگ گئی
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بددعا لگ گئی

☆.....☆

اور پھر ہوا یوں کہ پینتیس سالہ پروین کی زندگی اسی کے کہے ایک شعر کی تفسیر بن گئی

ماتم کی فضا ہے شہر دل میں
مجھ میں کوئی شخص مر گیا ہے

زندگی تو پہلے ہی آزمائشوں اور کٹھنائیوں سے عبارت تھی۔ اس حادثہ کے بعد بچہ مگوئیاں ناقابل برداشت ہو چلی تھیں۔ اس نے رنگوں' زیبائش سے ناتہ توڑ لیا۔ سفید رنگ اس کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا۔ وہ ایک دائمی سوگ کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اپنی ہستی کا غرور چھن جانے کی اذیت سوہان روح تھی۔ روح میں ایک ہی موسم مستقل ٹھہر گیا' اداسی کا موسم۔ مزاج کی یہ تبدیلی اب اس کی آنکھوں سے واضح جھلکتی تھی۔ شہر دل میں 'پارہ' بے موت مر چکی تھی۔

وہ دور پروین کی زندگی میں کسی عذاب سے کم نہ تھا لیکن قدرت نے اس موقع پر دست غیبی سے امداد فرمائی۔ کچھ عرصہ قبل جب وہ کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوئی تو اس کی ملاقات 'پروین قادر آغا' سے ہوئی تھی۔ وہ کبھی کسی سے اپنے اندیشوں اور دکھوں کا ذکر نہ کرتی تھی لیکن وقت کے کسی کمزور لمحے میں پروین قادر کے سامنے اپنی زندگی کی تمام تر پرتیں کھول دیں۔ ماضی کے بعد حال میں درپیش مسائل بھی پروین اور آغا افضال سے پوشیدہ نہ تھے۔ انہوں نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور یہ شناسائی ازدواجی بندھن کے خاتمہ پر اس کی ڈھارس بن گئی۔ انہوں نے اپنا ذاتی اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے اخبارات اور میڈیا کی زینت بننے والی جھوٹی افواہوں اور اسکینڈلز کا سدباب کردیا۔

اس صورتِ حال پر وہ ذہنی طور پر بے حد منتشر ہو چکی تھی۔ والدین کے تشویش زدہ اور تفکرات کی جھریوں سے اٹے چہرے اس کی رگیں چٹخانے لگتے۔ شاکر زیدی اور افضل النساء نے اپنی دونوں بیٹیوں کو پھولوں کی سی نزاکت سے پروان چڑھایا تھا لیکن زندگی نے ان کے ساتھ انصاف نہ کیا۔ نسرین کی علالت اور آئے روز درپیش رہنے والے طبی مسائل کی وجہ سے اس کا ازدواجی بندھن بھی ناکام ہو چکا تھا اور اب پروین بھی اسی بدقسمتی کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی ذات کا اعتماد کبھی دوبارہ حاصل نہ کرپائے گی۔

اس موقع پر آغا فیملی نے اسے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھالا اور اس کے وجود میں گڑے سبھی کانٹے چننے لگے۔

''تم ہماری سگی اولاد نہیں لیکن خدا گواہ ہے کہ اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز ہوگئی ہو۔''

''میں آپ کی ان محبتوں کا قرض کبھی نہیں چکا پاؤں گی لیکن اب غیر معینہ مدت کے لیے اس منظر نامہ سے غیاب بہت ضروری ہو چکا ہے۔'' اس نے پژمردگی سے کہا۔

''ہم تمہارے ہر فیصلہ میں قدم ملائیں گے تاہم ایک بات کبھی فراموش مت کرنا۔ تمہارے خلاف جاری اس خصوصی مہم کا مقصد یہی ہے کہ ادبی سرگرمیوں سے کنارہ کشی کرلو۔'' انہوں نے شفقت سے کہا۔ ''اللہ تمہارا حامی و ناصر رہے۔''

پروین کے اردگرد ماحول اس قدر زہریلا ہو چکا تھا کہ سانس لینا بھی دوبھر تھا۔ طلاق یا فنگی کی سند ایک ناقابل معافی جرم قرار پایا تھا جس کی سزا دینے کے لیے ہر فرد نے سنگ زنی اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

ذہنی سکون اور انتشار سے بچاؤ کے لیے وہ امریکا منتقل ہوگئی۔ آب و ہوا اور ماحول کی اس تبدیلی نے اس کے قلب و

ذہن قدرے پُرسکون کر دیئے۔ بنیادی طور پر پروین ایک جنگجو تھی۔ وہ اپنی اندرونی کشمکش، کرب اور جنگ پر بالآخر قابو پا کر ایک نئے عزم سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیتی تھی اور اب اسے اپنے وقار کی بقاء درپیش تھی۔ چند ماہ امریکا میں بسر کرنے کے بعد وہ اپنی محکمہ جاتی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے ایک بار پھر 'اپنوں' میں لوٹ آئی۔ وہ اپنے جواسے سنگسار کرنے کے درپے رہتے۔

وطن واپسی کے بعد وہ دارالحکومت میں پروین قادر آغا کے گھر میں رہائش پذیر ہوگئی۔ آغا خاندان اس کے لیے ایک سائبان کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور وہ جذباتی طور پر اس خاندان کے خلوص و محبت کی قرضدار ہو چکی تھی۔ کچھ وقت مزید گذرا تو اس نے انہی کی رہائش گاہ کے پاس ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور گیتو کے ساتھ اسے 'گھر' بنانے کی ایک اور کوشش میں جت گئی۔

آغا خاندان نے اسے ایک لمحہ بھی تنہا نہ کرنے کا خاموش معاہدہ کر لیا۔ وہ جذباتی اور معاشرتی اعتبار سے اس کے لیے ایک ڈھال کا کردار ادا کر رہے تھے۔ پروین شاکر کے لیے ان پر انحصار ناگزیر ہو چلا تھا اور وہ بے اختیار کہنے پر مجبور ہوئی کہ؛

خدا
کبھی کبھی
اپنے فرشتوں کو
زمین پر بھیج دیتا ہے۔

☆.....☆

پروین کی ذمہ داریاں اب ماضی کی نسبت کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ 'سنگل پیرنٹس' کے طور پر بقاء کا کبھی تصور نہ کیا تھا لیکن زندگی میں یہی تو خوبی ہے کہ یہ بالائے تصور و سوچ سبھی افعال سرانجام دینا بھی سکھا دیتی ہے۔ دفتری معاملات میں سارا دن الجھنے کے بعد وہ گیتو کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیا کرتی۔ پروین کسی بھی لمحہ اپنے بیٹے کو تنہائی اور مایوسانہ سوچ کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس وحشت سے اٹی زندگی میں اس کی واحد اُمید مراد وہی تو تھا۔

قلم سے ناتہ برقرار تھا لیکن اپنی بدقسمتی کے باعث اسے ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ دیگر عزیز و اقارب اور قریبی رشتوں کی طرح یہ الفاظ بھی کہیں اس سے خفا ہو کر اپنا ناتہ نہ توڑ لیں۔

ہند سے گدھ کی طرح دن میرے کھا جاتے ہیں
حرف ملنے مجھے آتے ہیں ذرا شام کے بعد

شوہر کے سائبان سے محرومی کے بعد معاشرتی رواج میں جکڑے مخصوص نفسیات کے حامل افراد نے اس کے لیے حیات مزید دوبھر کر دی تھی۔ اس کی خوبصورتی، خودمختاری، مقبولیت ہی دشمن عظیم بن چکی تھی لیکن وہ ثابت قدم رہی۔ اس کی جانب مذموم ارادے لیے بڑھنے والا ہر قدم اس کے آہنی ارادوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا۔

اسی دوران اسے نئی دہلی میں منعقد ہونے والی 'بین الاقوامی اردو کانفرنس' میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا۔ بھارت سے وابستہ پروین کے جذبات بھی اسی کی طرح انوکھے تھے۔ ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے وہ ملکی تاریخ میں برپا جنگیں اور اس ہمسایہ ملک کا کردار ناقابل معافی تصور کرتی تھی لیکن دوسری جانب شاکر زیدی اور افضل النساء کا ماضی اور جڑوں کی بھارت میں موجودگی دل کا ایک گوشہ اس کی طرف مائل بھی رکھتے۔

دورہ بھارت اس کے لیے کئی لحاظ سے بے حد انقلابی ثابت ہوا۔ یہاں اس کی ملاقات 'پاکستان ہاؤس' (پاکستانی سفیروں کے لیے مختص کردہ رہائشگاہ، جو ماضی میں لیاقت علی خان کا آبائی گھر تھی) میں اس وفد کے لیے منعقد کردہ خصوصی ڈنر میں ایئر اٹاچی 'قاضی جاوید' اور ان کی اہلیہ 'رفاقت' سے ہوئی۔ رفاقت درمیانی عمر کی ایک باذوق اور انتہائی سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ شادی سے قبل افسانہ نویسی اور شاعری پر طبع آزمائی کرتی تھیں لیکن بعدازاں گھریلو ذمہ داریوں کے باعث ان سرگرمیوں کو خیرباد کہہ دیا۔ قاضی جاوید اور رفاقت پروین کی شاعری کی بہت معتقد تھے۔

یہ ملاقات اس قدر خوشگوار ثابت ہوئی کہ پروین نے ان کے اصرار پر بھارت میں باقی ماندہ ایام ہوٹل میں قیام کی بجائے انہی کی رہائش گاہ پر بسر کیے۔ اس دورہ میں گیتو بھی اس کے ہمراہ تھا جس کی رفاقت کے تینوں بچوں عمر، حمزہ اور سفیان سے گاڑھی چھننے لگی۔

بھائیوں جیسے دوستوں کا ساتھ نصیب ہوا تو گیتو کی طرف سے پروین کے بہت سے تفکرات زائل ہو گئے۔ دہلی مشاعرہ میں شرکت ایک یادگار شرکت تھی۔ دنیا بھر میں اردو پڑھنے اور سمجھنے والے افراد اس کے کلام کی خوشبو میں بھیگ چکے تھے۔ درحقیقت پروین شاکر کے کلام اور منفرد سوچ نے اس کے گرد پُراسراریت کا ہالہ قائم کر دیا تھا۔ انسانی جذبات کی سچائی کسی بھی تصنع یا ملاوٹ کے بغیر بیان کرنا کسی بھی شاعرہ کو

متنازعہ ٹھہرانے کے لیے بہت تھی لیکن اس سے ملاقات پر سادگی، سچائی، خاندانی رکھ رکھاؤ اور وضع داری کا عکس اس کی ذات سے وابستہ سبھی شکوک زائل ہو جاتے۔

اسی مشاعرہ میں اسے 'فیض احمد فیض بین الاقوامی ایوارڈ' عطا کیا گیا۔ وہ بے حد خوش تھی تاہم اس خوشی میں بھی عجز و انکساری کے سوتے پھوٹتے تھے۔ بعدازاں کے اس نے 'علی گڑھ' میں بھی ایک مشاعرہ میں شرکت کی۔ شاکر زیدی علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھے۔ بچپن میں ان سے اس ادارہ کی خوشگوار یادیں اور باتیں سنتے ہوئے وہ تاحال ایک سحر میں مبتلا تھی۔ ادارہ کے در و دیوار میں رچی اپنی اصل تہذیب کی خوشبو اور اساتذہ سے ملاقات کے بعد اس کی یادوں کے خزانے میں بے شمار قیمتی موتیوں کا اضافہ ہو گیا۔

پروین ہمیشہ اپنی یادیں سنجو رکھنے کی عادی تھی۔

☆.....☆

مشاعرہ سے فراغت کے بعد اس نے اپنے ایک دیرینہ خواب کی تکمیل کا آغاز کر دیا۔ رفاقت اور قاضی جاوید کے تعاون سے اس نے بھارت میں مقیم بین الاقوامی شہرت یافتہ ادباء سے یادگار ملاقاتیں کیں۔

اس کی پہلی ملاقات بھارتی ناول نگار، وکیل اور صحافی 'خشونت سنگھ' سے ہوئی۔ پروین کا کلام وہ بھی پڑھ چکے تھے۔ اس کی دلکش شخصیت اور خوبصورتی دیکھ کر وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے؛

''ارے واہ! یہ تو بہت سوہنی کُڑی (لڑکی) ہے۔ بالکل اپنی شاعری کی طرح۔'' وہ اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے بولے۔

''سردار جی! اب میں کُڑی ہی تو نہیں رہی۔ اب تو بڑھاپے کی آمد ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''نہ کڑیئے نہ!! ایسا نہیں سوچنا۔ واہگرو سے پراتھنا ہے کہ تو سدا جوانیاں مانے اور اپنی شاعری کی خوشبو سے یہ سنسار مہکاتی رہے۔'' ان کا انداز پُرخلوص تھا۔

''شکریہ سردار جی!'' اس کے چہرہ پر بیک وقت کئی رنگ لہرائے۔

''مینوں (مجھے) 'خوشبو' بہت پسند ہے۔ اور آج اگر اس کتاب کی لیکھت وہی کلام سنا دے تو سمجھوں گا کہ میں دھنیے ہو گیا۔''

پروین کبھی ذاتی ملاقات میں کسی کو شاعری سنانے کی قائل نہ تھی لیکن اس لمحہ ایک خیال برقی رو کی طرح ذہن میں کوندا کہ کیا خبر یہ پل، ماحول یا ملاقات دوبارہ کبھی نصیب نہ ہو۔

وہ ایک ادیب کی یہ خواہش ٹال کر اس کی اہانت نہ کر پائی اور اپنے مخصوص دھیمی آواز میں چند اشعار گوش گذار دیئے۔

آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی!
رات گہری ہے مگر چاند چمکتا ہے ابھی
مرے ماتھے پر ترا پیار دمکتا ہے ابھی
میرے سانسوں ترا لمس مہکتا ہے ابھی
میرے سینے میں تیرا نام دھڑکتا ہے ابھی
زیست کرنے کو مرے پاس بہت کچھ ہے ابھی

.....

آج کی شب تو بہت کچھ ہے، مگر کل کے لیے
ایک اندیشہ بے نام ہے، اور کچھ بھی نہیں
دیکھنا یہ ہے کہ کل تجھ سے ملاقات کے بعد
رنگ اُمید کھلے گا کہ بکھر جائے گا!
وقت پرواز کرے گا کہ ٹھہر جائے گا!
جیت ہو جائے گی یا کھیل بگڑ جائے گا
خواب کا شہر بہے گا کہ اجڑ جائے گا!

حسین شاعری، تصنع سے مبرا جذبات اور پروین کے لہجے کی گہرائی نے ماحول یکسر اداس کر دیا۔ خشونت سنگھ بھی خاموش ہو گئے۔ ان کے بشرے سے عقیدت جھلکنے لگی۔ وہ پروین کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ''تیرا من بہت سچا اور انمول ہے گُوئیے! تیرا ہر لفظ میرا تن من بھگو گیا۔ ایک ناری کے جذبات اور واہموں کی ایسی سچی تصویر! آج میں دعوی سے کہتا ہوں کہ تو بہت نام کمائے گی اور ایک دن آئے گا جب تیری شاعری ہر ناری کی پرینا بن جائے گی۔''

''یہ سنسار بڑا ظالم ہے سردار جی!! ناری کے جذبات کو کوئی بھی عزت نہیں دینا چاہتا۔ اور شہرت بہت قیمت وصول کرتی ہے۔'' پروین نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تو سچ کہہ رہی ہے۔ یہ جگ بڑے دوغلے معیار رکھدا ہے۔ اگر آپاں (ہمیں) نوں پیار کرن دی آزادی ہے تو ناری بھی ایس دی (اس کی) حقدار اے۔ تیری دلیری کا جواب نہیں! اور اک گل یاد رکھنا! دلیری ہمیشہ اپنی سنگی، ساتھی بنا لو۔ تم امر ہو جاؤ گی اور ہاں اک آخری گل! گھر جا کر اپنی نظر اتار لینا۔ کہیں تیری سندرتا کو میری ہی نظر نہ لگ جائے۔'' وہ سنجیدگی سے کہتے یکدم ماحول کا بوجھل پن ختم کرنے کے لیے حسب عادت چٹکلا چھوڑے بغیر نہ رہ سکے۔

اس ملاقات کا مجموعی تاثر جس قدر خوشگوار تھا

'قرۃ العین حیدر' سے ملاقات اسی قدر بوجھل ثابت ہوئی۔

قرۃ العین اپنی ذات اور لباس سے بہت بے نیاز دکھائی دیتی تھیں۔ بوائے کٹ بال نارنجی رنگ لیے ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک ترشی اور بیزاری دکھائی دیتی تھی۔ انہوں نے پروین سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''اچھا!! تو تم ہو پروین شاکر!! بڑا چرچا ہے تمہاری شاعری اور سچائی کا۔''

''جی! نوازش ہے آپ کی۔'' ماحول پر طاری بوجھل پن اب اسے مضطرب کرنے لگا تھا۔

''تم ایسے معاشرے میں سچائی کا پرچار کرنے نکلی ہو جہاں ہر کوئی مصلحتوں اور منافقت کا لبادہ اوڑھے پھرتا ہے اور سچائی کے علمبردار کو مصلوب کردینے میں عافیت سمجھتا ہے۔''

''سچائی کی راہ تو ازل ہی سے کٹھن ہے عینی آپا!'' وہ نرمی سے گویا ہوئی۔

''مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا بھلا! میرا جرم بھی سچائی تھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ آج میں پھر اسی ملک کی رہائکی ہوں جہاں سے ہر شے تج کر روانہ ہوئی تھی۔''

پروین کو ان کی حالت زار، ذہنی کیفیت اور تنہائی پر شدید دکھ ہونے لگا۔ اس کا دل تاسف سے لبریز ہوگیا اور اسی لمحہ احساس ہوا کہ اولاد کا سہارا اور نعمت اسے کس قدر اذیتناک زندگی سے بچائے ہوئے ہے۔

رفاقت اور پروین کی اگلی ملاقات 'الیف۔ ایم حسین' سے طے قرار پائی۔ ان کی مصوری اور طرز فکر سے پروین بے حد متاثر تھی۔ اس ملاقات میں حسین صاحب کے ایک نوجوان خاتون سے تعلقات اور انہی کے گھر میں قیام کے انکشاف نے طبیعت بہت مکدر کردی تاہم الیف ایم حسین کی برہنہ پا رہنے کی عادت میں اپنا عکس واضح نظر آیا۔ وہ ہنوز جوتوں کی موجودگی اپنے لیے قید تصور کرتی تھی۔

حسین صاحب کے بعد وہ کامنا پرشاد سے ملنے کی خواہشمند تھیں۔ دہلی سے تعلق رکھنے والی کامنا کو شاعری سے خاصا شغف تھا۔ وہ کافی عرصہ قبل ہی پروین کا کلام ہندی قالب میں ڈھالنے کی رضامندی حاصل کرچکی تھی۔ پروین اس کی کاوشوں سے بے حد مسرور تھی۔ مختلف ادبی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث جاری تھی۔ اسی دوران وہاں سہگل نامی نوجون کی آمد ہوئی۔ کامنا نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے انہیں آگاہ کیا کہ سہگل اس کا غیر رسمی منگیتر ہے۔ اس کا خاندان چاندی کے کاروبار سے منسلک ہے اور البلغانہ شادی کے لیے رضامند نہیں۔ اپنی محبت اور جذبات سے مجبور ہوکر وہ اپنا آشیانہ الگ بنائے زندگی بسر کررہے تھے۔

''ہم بہت جلد بیاہ کرلیں گے۔ آپ نے بھی تو اپنی کویتاؤں میں عورت کو آزادی دینے کی مانگ کی ہے ناں پروین!'' کامنا جوش سے کہتی چلی گئی۔

''آپ میری شاعری کی گہرائی سمجھ ہی نہ سکیں اور اسے ایک بہت سطحی رنگ میں ڈھال دیا۔'' وہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔ کامنا کو مزید سمجھانے اور کسی بھی پہلو پر بے جھجک بات اب ممکن نہ رہی تھی کیونکہ وہ کسی کی ذاتیات میں دخل دینے کی قائل ہی نہ تھی۔

کامنا پرشاد کے علاوہ کشمیر سے تعلق رکھنے والی 'پشپہ ڈوگرہ' بھی پروین سے ملنے کی متمنی تھی۔ پشپہ ایک کتھک رقاصہ تھی اور نوجوانوں کو باقاعدہ رقص سکھانے کی تربیت دیتی تھی۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کے لیے بھی خدمات سرانجام دینے کے لیے اکثر پاکستانی افسران سے تعلقات بنانے میں خاصی ماہر تھی۔ پشپہ اس سے قبل احمد فراز کی شاعری رقص کے قالب میں ڈھال چکی تھی اور اب پروین کے لازوال کلام کو ایک نئی گویائی عطا کرنے کے لیے اجازت کی طلبگار تھی۔ اس نے 'بسنت بہار کی نرم ہنسی' اور 'گوری کرت سنگھار' نظموں پر رقص کرکے پروین کو مبہوت کردیا۔ اپنے تخیل کا یہ روپ اس کے لیے خوشی کا ایک منفرد تجربہ تھا لیکن اب بھی اس مسرت میں عاجزی ہی کا عکس تھا۔

دورہ بھارت میں اسے بمبئی جانے کا اتفاق بھی ہوا جہاں شبانہ اعظمی اور جاوید اختر نے اسے اپنے گھر ایک مشاعرہ کی تقریب میں بطور خاص مدعو کیا تھا۔ یہاں اس کی ملاقات فلمی صنعت سے متعلقہ افراد سے بھی ہوئی جو بے حد بیزاری اور کوفت کا سبب بنتی رہی۔ وہ فلمی دنیا کے مصنوعی رویوں سے بہت ناخوش رہتی تھی۔ اس پہ مستزاد ان کے دعوت نامے اسے مزید کوفت زدہ کرنے لگے؛

''پروین جی! آپ کی کویتاؤں کا بھی جواب نہیں ویسے! آپ ہماری انڈسٹری جوائن کرلیجیے۔''

''بہت شکریہ! میں اپنے ملک سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔''

''اجی چھوڑیئے ایسی ویسی بھگتی کو۔ آپ ہی کے ویش سے کتنے مسلمان کلاکار آج ہماری انڈسٹری کی شوبھا بڑھا رہے ہیں۔ ہم کلاکاروں کو بھگوان کا درجہ دیتے ہیں۔''

''انسان بشریت کے مقام پر ہی بھلا لگتا ہے۔ مجھے

اس سے زیادہ کی طلب نہیں۔''

پروین ایسی تمام باتوں کو کامیابی سے نظرانداز کرتی رہی۔ ان افراد کی گفتگو سے اسے ایک ایسے شخص کی بابت علم ہوا جو علم نجوم اور زائچہ بنانے میں کمال ملکہ رکھتا تھا۔ ان کا اعتقاد دیکھ کر وہ بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کرپاتی تھی۔ تجسس اور شوخی طبیعت سے مغلوب ہوکر اس نے 'جوتشی چوہان' سے ملاقات کی ٹھان لی۔

☆.....☆

جوتشی چوہان کا گھر دہلی کی بیرونی سرحد پر واقع تھا۔ پاکستانی وفد کے ساتھ آنے والے کئی افراد اس کے پاس اپنی قسمت کا احوال دریافت کرنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ رفاقت اس صورتِ حال سے بہت مانوس تھی لیکن پروین کے لیے یہ تجربہ بہت سنسنی خیز تھا۔ اس کے اندر مقید شوخی و مہم جوئی برسوں بعد عود آئی تھی۔

چوہان صاحب کو اس کی ذات، کامیابیوں اور شہرت سے دانستہ لاعلم رکھتے ہوئے ان کے مطالبہ پر اس نے اپنا نام، تاریخ پیدائش اور والدہ کا نام گوش گذار دیا۔ وہ گہری سنجیدگی سے ایک کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کے بعد کہنے لگے۔ ''تمہاری جنم پتری میں عمر کی ریکھا بہت کم ہے بیٹا! چار کتابوں کی لیکھک ہو۔ (اس وقت چوتھی کتاب اشاعت کے مراحل میں تھی) پر تم مجھے پانچویں کتاب کہیں دکھائی نہیں دیتی۔''

''یہ بھلا کیسے ممکن ہے چوہان صاحب؟ میں پانچویں کتاب کی تیاری کا آغاز تو کرچکی ہوں۔'' وہ مضطرب ہوئی۔

''میرے علم پر شک ہے شاید تمہیں!'' وہ مسکرائے۔

''تمہاری ریکھاؤں نے مجھے بتایا ہے کہ زندگی نے تمہیں بہت کڑے سے دکھائے ہیں۔ تمہارا فرقہ اداسی ہے۔ رشتے ناتوں، دوست احباب سے گہرے زخم کھا چکی ہو۔ تمہاری گرہستی کی بربادی میں بڑا ہاتھ ساس کا تھا جو انتہائی حاکمانہ مزاج کی تھیں۔ جیون ساتھی بھی اپنے وچن نہ نبھا سکا۔ تمہیں مغلوب ہونے کی بجائے سچے من سے چاہے جانے اور وشواس کی چاہ رہی۔ شہرت نے تم سے بہت بڑی قیمتیں وصول کی ہیں۔'' وہ بلاتکان بولتے رہے۔

''میں آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کروں گی۔ لیکن جہاں اتنا کچھ بتایا ہے وہاں یہ بھی تو بتائیے کہ پانچویں کتاب کیونکر مکمل نہ کرپاؤں گی؟'' وہ اب حقیقتاً سنجیدہ ہوگئی تھی۔

''تمہارا بہت بھیانک حادثہ ہوگا۔ ڈرائیور تو اسی سے مرجائے گا۔'' وہ خلاء میں نادیدہ نکتہ تکتے ہوئے کہنے لگے۔

''اور میں..... بچ تو جاؤں گی ناں؟''

''تمہاری ٹانگ سلامت نہ رہ پائے گی، مجھے ہر طرف خون کی ندیاں بہتی نظر آرہی ہیں۔'' وہ جھرجھرا گئے۔

''کوئی بات نہیں! ہاتھ تو سلامت رہیں گے۔ قلم تو انہی سے تھامنا ہے۔'' وہ خائف ہوئے بغیر بولی۔

چوہان صاحب کے گھر سے واپسی پر وہ بے حد خاموش تھی۔ رفاقت سے اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ اس کی ڈھارس بندھاتی رہی۔

''مجھے اپنی زندگی میں مزید کسی بھی چیز کی چاہ نہیں رہی لیکن اپنے بیٹے کا تصور ہلکان کررہا ہے۔ وہ بہت کم عمر ہے۔ میرے بغیر کیسے زندگی گذارے گا؟ آج جانے کیوں بار بار ایک ہی خلش بے چین کررہی ہے۔ میں نصیر کا ساتھ نہ چھوڑتی۔ وہ بھلے ہی دوسری تو کیا چوتھی شادی بھی کرلیتا لیکن میرا سائبان سلامت رہ جاتا' میری ہستی ماضی کے طوفانوں کی زد میں نہ آتی اور کسی بھی حادثہ کی صورت میں مراد اپنے والد کے زیر سایہ زندگی بسر کرتا۔''

''آج آپ کے وجود پر ایک ماں غالب آگئی ہے اور عورت کہیں پس پشت چلی گئی پروین! اس عالم میں آپ ایک حقیقت فراموش کررہی ہیں کہ یہ بندھن شکوک اور بدگمانی کی دیمک نے کھوکھلا کیا تھا۔ اگر برقرار رہتا تو ہر پل اپنی عزت نفس کی موت برداشت کرنا بھی ہرگز سہل نہ ہوتا۔''

پروین خاموش رہی۔ اس کے بعد وہ دانستہ طور پر والد اور اس کی دوسری بیوی کے متعلق مثبت انداز میں مراد کی 'برین واشنگ' کرنے لگی۔ وہ اپنے ولی خدشات حسب سابق دل کے نہاں خانوں میں چھپائے وطن واپس لوٹ آئی۔

☆.....☆

وطن واپسی کے بعد زندگی مصروفیت کے گرداب میں گھر گئی۔

محکمہ جاتی مصروفیات کی ادائیگی کرتے وہ کسی بھی لمحہ بیٹے کی ضروریات اور والدین کے تصور و خبرگیری سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ دارالحکومت میں آغا خاندان کے گھر کے پاس ہی رہائش پذیر تھی۔ اس کی ولی خواہش تھی کہ افضل النساء اس کے پاس قیام کریں لیکن نسرین کی علالت ہمیشہ آڑے آجاتی۔ شاکر زیدی بھی اب بڑھاپے کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جب سفر کی کٹھنائی جھیلنی سہل نہیں ہوتی۔ ان معاملات میں گھرے وہ لمحہ بھی آگیا جب 1990 میں پروین کی چوتھی

کتاب 'انکار' کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔

'انکار' اس کی سابقہ کتب سے قدرے منفرد تھی۔ 'خوشبو' سے سفر کا آغاز کرنے والی دوشیزہ نے تصورات اور خواب نگری کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس کا ذہنی افق وسعت اختیار کر چکا تھا۔ جذبات کی روشنائی اب درد و کرب میں ڈھلتی نظر آتی تھی۔ وطن عزیز سیاسی طور پر انتشار کی زد میں تھا، سرکاری نظام کا حصہ ہونے کے باعث وہ اس اذیت کو کسی بھی عام ادیب کی نسبت زیادہ محسوس کرتی۔ 'انکار' میں کئی ایک مقامات پر ملک عزیز کے لیے محبت بھرے جذبات جھلک دیتے ہیں۔ ذاتی زندگی میں بھی وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیرون ملک روانگی اور قیام پر بہت افسردہ رہتی تھی۔ تڑپ اور کرب نوک قلم پر مچل کر اپنی مملکت کے لیے اشعار میں ڈھل جاتے؛

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے
بزم انجم میں قبا کی خاک پہنی میں نے
اور مری ساری فضیلت اسی پوشاک سے ہے

اسی کی دہائی کا اختتام مجموعی طور پر بہت منتشر تھا۔ ہر جانب نفسا نفسی کا بازار گرم تھا۔ اس کی جائے پیدائش 'کراچی' کے حالات ایک ایسے بھنور کا شکار تھے جس کے خاتمہ کا کوئی ورماں نظر ہی نہ آتا۔ روشنیوں کا شہر اپنے شہریوں کے تاریک باطن کی کج ادائیاں سہتے ایک ایسے موڑ پر آن پہنچا تھا جہاں اس کا وقار اور درخشندہ ماضی گرہن کا شکار ہونے لگا۔

کراچی
ایک ایسی بیسوا ہے
جس کے ساتھ
پہاڑوں، میدانوں، صحراؤں سے آنے والا
ہر سائز کے بٹوے کا آدمی
رات گزارتا ہے
اور صبح اٹھتے ہی
اس کے داہنے رخسار پر
ایک تھپڑ رسید کرتا ہے
اور دوسرے گال کی توقع کرتے ہوئے
کام پر نکل جاتا ہے
اگلی رات کے نشے میں سرشار!

'انکار' ایک ایسی ہمہ جہت کتاب تھی جس نے اپنے عہد کی تمام تر اخلاقی قباحتیں ایک آئینہ کی طرح منعکس کیں۔ اس دور میں تعلیم یافتہ خواتین اور 'ورکنگ وومن' کو درپیش مسائل بھی علامتی انداز میں جا بجا نظر آتے ہیں، بحیثیت اسسٹنٹ کلکٹر پروین کو بھی ناقابل بیان مسائل کا سامنا رہا تھا۔ جنسی طور پر ہراساں کرنے کے علاوہ حوصلہ و عزم ڈھانے کی کوششیں تو ایک معمول بن چکی تھیں۔ اس کی شاعری کے معاشرے میں مقام کو جسم میں 'اپنڈکس' سے تشبیہہ دی جانے لگی جو بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر اس کی ان تھک محنت کے باوجود محض انہی 'غیر سرکاری مصروفیات' کے باعث اس کی کاوشوں کی حتی الامکان حوصلہ شکنی کی گئی اور ایک ناکام افسر قرار دے دیا گیا۔ ان عوامل کی تلخی اب اس کے قلم کی روشنائی بن گئی تھی۔ خواب، خوشبو، گیت، بادل، نغمے، معطر ہواؤں، بہار، برکھا رت کی خوبصورتی بیان کرنے والے معصوم فطرت قلم سے ایک احتجاجی صدا بلند ہوئی اور لفظوں کی کاٹ نے سبھی کو دنگ کر دیا۔

ہمارے ہاں
شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے
ہر مرد خود کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے
اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا
اس لیے اس کا دشمن ہو جاتا ہے !!

پروین کا کلام ہر دور میں 'صنف نازک' کے دلی جذبات و احساسات کا ترجمان رہا۔ خوشبو میں کچی عمر کے جذبات نے چھب دکھلائی تو 'صدبرگ' شعور کی پہلی سیڑھی ثابت ہوئی۔ 'خود کلامی' نے 'ماں' کے عظیم رتبے پر فائز ہونے کے بعد عورت کے خدشات اور مامتا کا عکس دکھلایا اور 'انکار' میں بھی یہی امر اپنے جوبن پر نظر آیا۔ عورت کے خمیر میں گھر بنانے اور بسانے کی خواہش گندھی ہوتی ہے۔ ازدواجی بندھن کی بقاء کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتی ہے کیونکہ اسے بخوبی علم ہوتا ہے کہ یہی رشتہ اس کا پاسبان ہے اور علیحدگی کی صورت میں دہشت کے جنگل میں 'شکار' کی تلاش میں سرگرداں بھیڑیے عرصہ حیات مزید تنگ کر دیں گے۔ 'بھیڑیے اور جنگل' کا استعارہ بھی 'انکار' میں جا بجا نظر آیا۔

دیمک ہماری نیند میں اتر چکی تھی
سو میں نے اسے بلڈوزر چلانے کا اختیار دے دیا
آج میں اپنے ملبے پر بیٹھی
سوچ رہی ہوں
ٹپکتی ہوئی چھت

اور گرتی ہوئی دیواروں نے
کتنے بھیڑیوں کو
مجھ سے دور رکھا تھا!

پروین شاکر کے قلم کا جادو اب سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

☆.....☆

مشکلات و مصائب کے باوجود پروین کی جستجو، بلند پروازی اور شوق تسخیر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مشاعروں میں شرکت کے علاوہ وہ 'پاکستان ٹیلی ویژن' کے کسی بھی ادبی پروگرام کی ترجیحی انتخاب اور ہر دلعزیز میزبان بن چکی تھی۔ اس قدر مصروفیت کے بعد فراغت کے گنے چنے لمحات میں خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا ہو کر تنہائی، اداسی اور مایوسی کے آسیب میں بندش کی بجائے اس نے سلسلہ تعلیم بڑھانے کے لیے کمر کس لی۔ اس کی قابلیت و ذہانت تو پہلے ہی مسلمہ تھی اس لیے امریکا کی 'ہارورڈ یونیورسٹی' کے سرکاری اسکول میں 'ایڈورڈ مین وظیفہ' کے حصول میں کامیابی کے بعد 'فل برائٹ اسکالرشپ' ملتے ہی وہ امریکا روانہ ہو گئی۔

بدقسمتی سے ہارورڈ اسکالرشپ میں ایک سالہ تاخیر پیدا ہو گئی۔ اس نے واپسی اختیار کرنے کی بجائے ایک مقامی یونیورسٹی میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ اس کی زندگی مسائل و کامیابیوں کا ایک انوکھا سنگم بن چکی تھی۔ وہ وطن عزیز کی جانب سے سب سے مایہ ناز ایوارڈ 'پرائڈ آف پرفارمنس' کے لیے منتخب ہو چکی تھی۔

1991 میں اس ایوارڈ کی وصولی کے لیے پاکستان آمد اور اپنے قلم کی اس پذیرائی اس کی زندگی کے چنیدہ بہترین لمحات میں شمار کی جا سکتی تھی لیکن اس خوشی کے گلوں میں بھی خار سنگ تھے۔ چند تکنیکی وجوہات کی بناء پر پہلے اس کا وظیفہ منسوخ ہوا اور پھر انتظامیہ نے داخلے ختم کر دیئے۔ بظاہر یہ صورت حال بہت مایوس کن تھی۔ ان تھک کوششوں کی ایسی ناکامی کسی بھی ذی نفس کی حوصلہ شکنی اور ترک خواہش کی ناکامی کا سبب بن سکتی تھیں لیکن پروین نے ہمت ہارنا تو کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔ مزید محنت کے بعد 'کیمبرج میسا چوسٹس' میں ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ کا اذن مل گیا۔

جون 1992 میں اس کی یہ محنت رنگ لائی اور وہ 'جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ' سے وہ 'ماسٹرز آف پبلک ایڈمنسٹریشن' کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس ڈگری کے لیے نصابی مضامین قطعی سہل نہ تھے۔ تجزیے اور انتظام و انصرام میں تاریخ کا استعمال اور اہمیت 'امریکا کی خارجہ پالیسی' پریس، سیاست، تیسری دنیا میں ترقیاتی پالیسی کا تجزیہ، پبلک پالیسی اور مائیکرو اکنامکس' خواتین سیاست میں ایک ساستدان ہونے کی حیثیت کا تجزیہ، وہائٹ ہاؤس میں پالیسی کے ارتقاء پر غور و خوض، اختیارات کا استعمال، خواتین اور رہبری، غریب طبقات میں صحت کا بگاڑ اور سد باب، ذہانت و فطانت پر سیمینار، جیسے خشک مضامین اور شاعری جیسی لطافت لیے کامیابی حاصل کرنا صرف پروین ہی کا کمال تھا۔

حسب سابق یہ خوشی بھی گرہن زدہ ثابت ہوئی لیکن اس مرتبہ تقدیر کا وار اس قدر کاری تھا کہ اس کی روح پر ان مٹ گھاؤ نقش ہو گئے۔ امتحانات کے دوران اسے اطلاع ملی کہ شاکر حسین زیدی نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا ہے۔ یتیمی کی کڑی دھوپ اس کا تن من جھلسانے لگی تھی۔ سائبان سے محرومی کے بعد سر پر موجود چھت بھی نابود ہو گئی تھی۔ افضل النساء کا کرب اسے مزید اذیت میں مبتلا کر رہا تھا لیکن بدقسمتی کی انتہا تو یہ تھی کہ وہ خواہش کے باوجود پاکستان میں والد کی آخری رسومات میں شریک نہ ہو سکی۔

اس کا عزم اور ہمت یہ صدمہ بھی جھیل گئے۔

☆.....☆

وطن واپسی کے بعد ذمہ داریوں کا ایک کوہ گراں پروین کا منتظر تھا۔ 1993 میں اسے ''ڈپٹی ڈائریکٹر، انسپکشن اینڈ ٹریننگ، کسٹم اینڈ سینٹرل ایکسائز، اسلام آباد'' کے عہدہ پر تعینات کر دیا گیا 2010 میں سرکاری گھر ملتے ہی اس نے افضل النساء اور نسرین کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ اس سے قبل وہ انہیں حج اور مقدس مقامات کی زیارتیں بھی کروا چکی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ والدہ اور بہن اس کے پاس مستقل رہائش اختیار کر لیں۔

''میری زندگی میں محض چنیدہ رشتے باقی رہ گئے ہیں۔ آپ دونوں یہیں کیوں نہیں رہ جاتیں۔'' اس نے افضل کو محبت سے نہارتے ہوئے کہا۔

''میری روح تو دو حصوں میں منقسم ہو چکی ہے پارہ!! قلب و ذہن کا ایک گوشہ تیری جانب میرا دل رہتا ہے تو دوسری طرف نسرین کی علالت بھی بے چین رکھتی ہے۔ مجھے یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی وگرنہ میرا دل تیری تنہائی اور اداسی سے بہت کڑھتا ہے۔''

''اب تو میں بھی بڑھاپے کی منتظر ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ عمر کا وہ دور اپنے وقت سے قبل ہی مجھ پہ طاری ہو جائے۔'' اس نے یاسیت سے کہا۔

''آج میں نے زندگی میں پہلی خاتون دیکھی ہے جسے اپنے بڑھاپے کا انتظار ہے۔'' نسرین نے وانستہ ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب کیا۔

''شاید وہی ایسا وقت ہوگا جب تنازعات اور افواہوں کی گرد میرے وجود سے چھٹ جائے گی اور میرے لوگ بالآخر میری اصل روح پہچاننے لگیں گے۔'' اس کے لہجے میں صدیوں کی مسافت تھی۔

''اتنی افسردہ کیوں رہنے لگی ہو پارہ!! خوش رہا کرو۔''

''جب ساز کی لے بدل گئی تھی
وہ رقص کی کون سی گھڑی تھی
اب یاد نہیں کہ زندگی میں
میں آخری بار کب ہنسی تھی؟''

پروین کے وجود میں پارہ کی یہی بازگشت سنائی دیا کرتی تھی۔

''پہاڑسی زندگی موجود ہے ابھی! شادی کے بارے کچھ سوچو۔'' انہوں نے دبے الفاظ میں کہا۔

''مجھے شادی کی حاجت ہے نہ تمنا!! تنہائی میری بہترین رفیق ہے۔ میری زندگی کا محور صرف مراد ہے اور یہ آپ بھی جانتی ہیں کہ مجھے شوہر تو شاید مل جائے لیکن گیتو کو والد کبھی نہیں مل پائے گا۔ اس معاشرے کی سوچ اب مجھ سے بہتر کون جانتا ہے بھلا؟ مردوں کے اس معاشرے میں عورت کے لیے مساوی حقوق کی صدا اٹھانا میرا جرم ہے جو ہمیشہ ناقابل معافی رہے گا۔ منافقانہ زندگی کے سوا میرے لیے کوئی انتخاب نہیں چھوڑا گیا اور یہ امر میرے لیے موت سے بھی بدتر ہے۔'' وہ اپنی ازلی صاف گوئی سے بولی۔

زندگی کی کج ادائیاں سہتے اب اسے مراد کے نیورو سرجن بننے اور خانہ خدا پر حاضری کے سوا مزید کوئی طلب نہ رہی تھی۔ معاشی اور معاشرتی چکی میں پستے اسے کہاں علم تھا کہ یہ خواہشات بھی کسک بن جائیں گی۔

☆.....☆

پروین کا حلقہ احباب مزید محدود ہو چکا تھا۔ لغو گوئی اور الزام تراشیوں سے بچاؤ کے لیے وہ اپنی ذات محض آغا فیملی اور رفاقت جاوید کے خاندان تک ہی محدود رکھتی لیکن یہ عمل اور احتیاط بھی ایک اور گناہ کی صورت میں اس کی داستان حیات میں شامل کر دیا گیا۔ اس کا دوٹوک رویہ' لیا دیا انداز' کم گوئی اور تنازعات سے بچنے کی شعوری کوششیں 'غرور و تکبر' قرار دے دی گئیں لیکن اب وہ ہر جوار بھاٹا سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اس کا ذہنی ارتکاز بلوغت کے زینوں پر قدم رکھتا گیتو تھا۔ اس کی بہترین تعلیم کے لیے پروین نے بورڈنگ اسکول بھی بھیجا لیکن وہ ماں سے جدائی برداشت نہ کر پایا اور علیل ہو کر واپس آ گیا۔ خود پروین کی کیفیت بھی ماہی بے آب سے کم نہ تھی۔

اس کی ذاتی اور پیشہ وارانہ زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ اس کے کلام کی خوشبو ادب اور شاعری کے دلدادہ افراد کو مزید سحر زدہ کرنے لگی تھی۔ ہر گزرتا دن اس کی تصانیف کی طلب میں اضافہ کرتا گیا۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے چاروں شعری مجموعوں کی یکجائی کے بعد 'ماہ تمام' تشکیل دی گئی۔

پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود اس کا تعلیمی سلسلہ کسی نہ کسی صورت رواں رہتا تھا۔ ستمبر 1994 میں برطانوی کامن ویلتھ اسکالرشپ کمیشن کے حصول کے بعد اس نے 'بی۔ ایچ۔ ڈی' کی تیاری کا آغاز کر دیا اور مقالے کے لیے '1971' کی پاک بھارت جنگ میں میڈیا کا کردار' بحیثیت موضوع منتخب کیا۔ اس مقالہ میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا دکھ افزا اور کرب بن کر جھلکتا تھا۔

انہی کامیابیوں اور مصروفیات کے درمیان اس کی 'بیالیسویں' سالگرہ کا دن آن پہنچا۔

اس روز افسروگی نے اس کے بشرے کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ چار روز قبل گیتو کی سالگرہ کا کیک کاٹنے کے بعد وہ اب دوبارہ اپنے لیے اس عمل سے نہیں گذرنا چاہتی تھی لیکن رفاقت اور پروین آغا نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور ذاتی کوششوں سے تمام تر انتظامات مکمل کر کے ایک سادہ سی تقریب کا اہتمام کر لیا۔ پروین اپنے مخلص دوستوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے ان کی خوشی کے لیے اس تقریب میں شریک ہو گئی۔ اس روز وہ معمول سے زیادہ خاموش تھی۔ آنکھوں میں اداسی کے ڈیرے اور ناخن خلاف معمول 'نیل پالش' سے محروم تھے۔

احباب کے استفسار پر وہ پھیکی سی مسکراہٹ لیے محض یہی بتا سکی کہ اس نے اپنی سنگھار میز سے کاسمیٹکس کا چنیدہ سامان منتقل کر دیا ہے لیکن وہ انہیں یہ نہ بتا پائی کہ وہ کچھ نادیدہ آہٹیں اپنی جانب بڑھتی محسوس کرنے لگی ہے اور دنیاوی مال و

متاع سے بے رغبتی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ترک متاع اب رتی بھر بھی دشوار نہیں لگتا۔

الفاظ اور خیالات کی تال میل میں ملکہ رکھنے والی اور دیار غیر میں بھی ذہانت کے جھنڈے گاڑنے والی پروین شاکر اپنی یہ کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔

☆.....☆

اپنے انجام تک آ گئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی

ماہ دسمبر کا آخری عشرہ تھا۔

شمسی سال کا یہ آخری مہینا جدائی کا استعارہ ہے۔ سرو موسم' دھند آلود صبحیں' ٹھٹرتی شامیں اور کہر میں لپٹی طویل راتیں اسے بہت پسند تھیں۔ وہ ہر لمحہ اس کی شدت سے لطف اندوز ہوتی تھی لیکن اب کے برس بے کلی اور اضطراب نے اس کے مزاج میں پژمردگی پیدا کر رکھی تھی۔

رفاقت اپنے اہل وعیال سمیت وارالحکومت میں ہی مقیم تھی۔ مراد کی عمر' حمزہ اور سفیان سے دوستی پروین اور رفاقت ہی کے تعلق کی طرح گہری ہو چکی تھی۔ 25 دسمبر کی دوپہر وہ دونوں ان کے یہاں کھانے پر مدعو تھے۔ رفاقت نے اس کی مرغوب غذا پلاؤ' چائنیز اور سوپ تیار کیا تھا جو لیکن ڈرائیور کی غیر موجودگی اور چند دیگر ذاتی مصروفیات کے باعث یہ پروگرام ڈنر پر مؤخر کر دیا گیا۔ رفاقت ہمیشہ اس کے ڈرائیور کی بے پروائی سے نالاں رہتی تھی۔ پروین ایک چھوٹی نیلی اسٹارلٹ گاڑی استعمال کرتی تھی جس کے لیے ہلکا سا دھچکا بھی بہت ناقابل برداشت ہوتا۔

یوسف نامی ڈرائیور اکثر دائیں بائیں دیکھے بغیر موڑ کاٹتا اور اب یہ عادت اس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ پروین کے سمجھانے بجھانے کے باوجود وہ لاشعوری طور پر اس غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا لیکن وہ احباب کے بارہا سمجھانے کے باوجود اسے نوکری سے برخاست نہ کر پائی تھی۔ احساس مروت کے علاوہ کسی بھی شریف النفس ڈرائیور کا دوبارہ حصول بھی عملی طور پر کٹھن ہی نظر آتا تھا۔

25 دسمبر کے اس ابر آلود دن میں شاکر زیدی کا خیال بار بار اس کے دریچہ ذہن پر دستک دے کر ملول کرتا تو کبھی ماضی کی بازگشت افسردہ کرنے لگتی۔ اس روز اس کا دل بار بار بھر آ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی مراد کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے رہی تھی جبکہ مراد تھا کہ اپنے دوستوں سے ملاقات کی ضد کیے جا رہا تھا۔

اس شام وہ بھی معمولات سے فارغ ہو کر خاصی تھکاوٹ کا شکار ہو گئی تھی۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے رفاقت کو ٹیلی فون پر اس پروگرام کی منسوخی کی درخواست کی لیکن دلی طور پر عہد شکنی اسے خلش میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ رات ڈھلنے کے بعد اسے اپنے کمرے میں چند زیورات کی موجودگی کی یاد نے بے کل کر دیا۔ یہ زیورات اس نے کچھ عرصہ قبل رفاقت ہی سے مستعار لیے تھے۔ اس کے دل میں ان کی فوری واپسی کے خیال نے اس قدر شدت سے سر ابھارا کہ وہ اپنی تھکن' موسم اور وقت نظر انداز کیے مراد کے ہمراہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے رفاقت کے گھر پہنچ گئی۔

بے کلی اور بوجھل پن وہاں بھی اس کا ہمراہی تھا۔ رفاقت اس کی بے پرواہ روش پر قدرے حیران تھی؛

''اس وقت ایسا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی پروین؟ زیورات پھر کسی وقت بھی تو لوٹائے جا سکتے تھے۔''

''زندگی کا کیا بھروسا رفاقت؟ اس جیسا بے وفا اور ہرجائی تو کبھی دیکھا نہ سنا۔ کیا خبر کب' کس لمحہ میں اپنی زندگی کی بازی ہار دوں۔ اس لیے میں اپنے ذمہ کوئی قرض نہیں رکھنا چاہتی۔''

''لگتا ہے آج مزاج میں قنوطیت کا اثر غالب ہے۔ شاعر قبیلہ پر تو دسمبر یوں بھی بہت ستم ڈھاتا ہے۔'' رفاقت مسکرائیں۔

''شاید آپ درست ہی کہہ رہی ہیں۔''

اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ ابھی تو آپ نے پوتا پوتی بھی کھلانے ہیں۔'' رفاقت کی دلجوئی پر وہ مسکرا کر رہ گئی۔

''آج میرا دل آئسکریم کھانے کے لیے مچل رہا ہے۔ اگر آپ راضی ہوں تو قریبی مارکیٹ تک چلتے ہیں۔'' پروین نے کہا۔

''ارے نہیں! یہ بھی بھلا کوئی موسم ہے آئسکریم کھانے کا۔ میں آپ کے لیے سوپ بنا لاتی ہوں۔''

''نہیں! آئسکریم کے سوا کسی چیز کی تمنا نہیں۔'' اس کا کھویا کھویا لہجہ رفاقت کو بے چین کرنے لگا۔

''اس وقت مارکیٹ گئے تو جاوید بہت خفا ہوں گے۔''

پروین نے اس کی مجبوری بھانپ لی اور خوشدلی سے الوداعی کلمات کے بعد واپسی کے لیے تیار ہو گئی۔ رفاقت اس کی خوشدلی میں پنہاں بے دلی واضح محسوس کر رہی تھی لیکن موسمی اثرات اور طبیعت کی گرانی گردانتے ہوئے نظر انداز

کردیا۔

گھر واپسی کے بعد اس نے خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنی کتب کھنگالنا شروع کردیں۔ نوجوان انگریزی شاعر 'جان کیٹس' کی مشہورِ زمانہ نظم When I Have Fears پر نظریں پھسلتی چلی گئیں۔ کیٹس اپنے غیر متوقع متعدی مرض کے باعث ان خدشات کا شکار رہتا تھا کہ اس کے تخلیقی زرخیز ذہن میں پنپنے والے خیالات اشعار کے قالب میں ڈھلنے سے قبل ہی موت اسے اپنی آغوش میں لے لے گی۔ پروین کے ذہن میں کچھ سال قبل جوتشی چوہان کی ایک پیش گوئی پر اپنا اضطراری ردِعمل یاد آگیا۔

''ہر دور کا شاعر اپنے تخیل کو کبھی فنا کے گھاٹ اتر تا نہیں دیکھ سکتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے خود کلامی کی۔

اپنی بوجھل کیفیت کے باوجود وہ ہمیشہ کسی بھی 'ٹرنکولائزر' کے بغیر قدرتی نیند کے حصول میں کامیاب رہتی تھی سو اس روز بھی ذرا سی تگ ودو کے بعد دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔

☆.....☆

26 دسمبر سوموار کی صبح آسمان پر چھائی گھٹائیں برس رہی تھیں۔ بارش تو یوں بھی اس کا اوّلین عشق تھی۔ رات بھر نیند کے بعد اب وہ پُرسکون اور قدرے تازہ دم تھی۔ بارش کی دلفریب جلترنگ نے بھی مزاج پر بہت اچھے اثرات مرتب کیے۔ دفتر روانگی سے قبل وہ ہمیشہ اپنا کمرا سمیٹ لیا کرتی تھی لیکن اس روز بستر پر کمبل بے ترتیبی سے پڑا رہنے دیا۔ تپائی پر پانی کا گلاس اور چائے کی خالی پیالی بھی یونہی دھری تھی۔ ٹجلت میں الماری سے کپڑے نکالے اور جی بھر کے مراد کو نہارنے کے بعد ڈرائیور کے ساتھ دفتر روانہ ہوگئی۔

نادیدہ آہٹیں اور دھیمی سرگوشیاں آج بہت واضح محسوس ہو رہی تھیں لیکن جانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ سبھی اندیشے اور واہمے آئندہ کبھی جھلک نہ دکھلائیں گے۔ اس کے پردہ تصور میں 'پارہ' کھلکھلاتی ہوئی چھب دکھلاتی رہی۔ بچپن' والدین' عزیز از جان' بہن اور مراد کے خیالات میں کھوئے ہوئے یکدم اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ بے اختیار یوسف کو دیکھنے لگی۔ لمحہ کے ہزارویں حصہ میں اس کا وجدان یہ حقیقت آشکار کرچکا تھا کہ یوسف کی لاشعوری دائیں اور بائیں نہ دیکھنے کی عادت ایک بار پھر عود آئی تھی۔ فیصل ایونیو مارگلہ چوک پر اس کی نیلی گاڑی ٹین کے کسی خالی ڈبہ کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ مراد کی تنہائی کا خیال اذیت کی تیز لہر کی مانند اس کے وجود میں سنسنایا لیکن اگلے ہی لمحے موت نے مہربان مادر کی طرح اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

خوشبو منتشر ہو کر ان ابر آلود فضاؤں میں بکھر گئی۔
صد برگ پر دائمی خزاں مسلط ہوگئی۔
خود کلامی کرنے والے ہونٹوں کو فنا نے مقفل کردیا۔
معاشرتی فرسودگی کی قبولیت سے ہمہ وقت انکار کرتی احتجاجی صدائیں نابود ہوگئیں.....ایک عہد تھا جو تمام ہوا۔

☆.....☆

عکس خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

اس جواں مرگی کے وقت اس کا کوئی قریبی رشتہ دار اسلام آباد میں موجود نہ تھا۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ خبر ملک کے طول وعرض میں پھیل چکی تھی عزیز و اقارب کی آمد تک مداحوں کا تانتا بھی بندھ چکا تھا۔ پروین کی آخری منزل H/8 قبرستان ٹھہری۔ اس کی موت کے بعد جائے حادثہ کو 'پروین شاکر روڈ' کے نام سے منسوب کردیا گیا۔ اپنی جس کتاب کی تیاری وہ دوران حیات کرتی رہی وہ بعد از مرگ 'کفِ آئینہ' کے عنوان سے 1996 میں شائع ہوئی۔ پروین قادر آغا نے حق وفا نبھاتے ہوئے نہ صرف 'پروین شاکر ٹرسٹ' قائم کیا بلکہ حکومتِ وقت سے اپیل کے بعد پروین کے سرکاری گھر کو مراد کی تعلیم مکمل ہونے تک اس کے لیے الاٹ کروالیا۔ پروین کی سرکاری خدمات کے صلہ میں اس کی فیس کے اخراجات بھی حکومتی انتظامیہ نے اپنے ذمہ لے لیے۔ ڈاکٹر نصیر بیٹے کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے نسرین کے ساتھ دارالحکومت رہائش کو ترجیح دی۔ والد سے وقتاً فوقتاً ملاقات پر بہرحال وہ معترض نہ تھا۔ خودداری اور صبر وتحمل میں وہ والدہ ہی کا پرتو تھا۔

بعد ازاں پروین کا کلام کئی ایک غیر ملکی زبانوں کے تراجم میں ڈھالا گیا۔ 2013 میں محکمہ ڈاک نے اس کی برسی کے موقع پر ایک خصوصی تصویری ٹکٹ کا اجراء کیا لیکن ان اعزازات کے باوجود یہ حقیقت اٹل ہے کہ نفرت اور حسد کی جان لیوا تپش سے اپنی بقاء کی جنگ لڑتا وہ 'ادھورا چاند' غروب ہوچکا ہے اور اب محض الفاظ کی کرنیں باقی ہیں۔

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے مرے ہونے کی گواہی دیں گے

جاسوسہ

عبداللہ احمد حسن

اس نے پختون خون کی لاج رکھی، پشتینی بہادری کے جوہر دکھائے، ثابت کیا کہ نرم و نازک سی دوشیزہ ہو کر بھی دشمن کے آگے جھکنا اسے گوارہ نہیں۔ حکومتِ برطانیہ نے اس کی شجاعت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ایک بڑے جنگی اعزاز سے نوازا۔

اس نے کم عمری میں موت کو گلے لگا کر تاریخ کا نیا باب رقم کیا

خفیہ ادارے کے سربراہ نے اپنے سامنے بیٹھی خوبصورت دوشیزہ کی طرف دیکھا جس کی حرکتوں سے اضطراب جھلک رہا تھا، وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی، ملیح چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جارہا تھا، آنکھوں سے اُمید وبیم کی کیفیات جھلک رہی تھیں سربراہ نے اپنے سامنے رکھی فائل پر نظر دوڑائی اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔: ''نورا بیکر، تم کو پیرس میں تعیناتی کے لیے منتخب کیا گیا تھا مگر تمہارے اساتذہ کا کہنا ہے کہ تم ایک کمزور اعصاب کی مالک ہو جلد گھبرا

جانے والی۔ تم آتشی اسلحے کے استعمال سے بھی گھبراتی ہو۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ یہ ایک جاسوس کے لیے بہت خطرناک بات ہے۔" لڑکی خاموش رہی تو سربراہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دوسری طرف تم لاسلکی آلات اور مورس کوڈ کے استعمال میں ماہر ہو، تمہاری اضافی خوبی یہ ہے کہ تم نے زندگی پیرس میں گزاری ہے۔ تم اس شہر سے اچھی طرح واقف ہونے کے علاوہ فرانسیسی بھی اہل زبان کی طرح بول سکتی ہو۔"

سربراہ نے اپنے سامنے رکھے پروانہ تقرر پر دستخط کر کے مہر لگا دی اور اسے دوشیزہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "نورا بیکر، ہم آپ کو اس مشن کے لیے منتخب کر رہے ہیں، آپ کا تقرر خفیہ اہلکار کے طور پر کیا جا رہا ہے اور آپ کو پیرس بھیجا جا رہا ہے۔ مبارک ہو۔"

دوشیزہ نے بے یقینی سے کاغذ کی طرف دیکھا اور لرزتے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا، اس کی آنکھیں بھر آئیں اس کے کانپتے ہونٹوں سے بھرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ "شکریہ جناب، بہت بہت شکریہ، جو مہم بھی میرے سپرد کی جائے گی میں اسے پورا کرنے کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل جاؤں گی۔"

نورا بیکر جسے اتنی عزت دی جا رہی تھی وہ کوئی یورپی یا امریکی دوشیزہ نہیں تھی۔ وہ برصغیر سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی کہانی آگے بڑھانے سے پہلے اس کے بزرگوں پر روشنی ڈال دوں۔

☆☆☆

1833 عیسوی کو میسور کے ایک زمیندار خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام چولے خان رکھا گیا۔ اس کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور کچھ ہی عرصے بعد اس کی والدہ بھی چل بسیں۔ اب چولے خان اکیلا رہ گیا تھا، اس پر آشوب وقت پر اس کے ایک چچا نے ہمت دکھائی اور یتیم بھتیجے کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

چچا کے زیر کفالت اس نے ہوش سنبھالا تو اس کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ ان دنوں برصغیر کے ہر کونے میں سب سے مقبول کھیل کشتی تھی۔ اس کھیل سے دلچسپی رکھنے والوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے بھی اس کھیل میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ ان دنوں وہاں کئی اکھاڑے بنے ہوئے تھے جہاں نوجوان زور آزمائی کیا کرتے تھے۔ اس نے بھی کشتی کی تربیت لینی شروع کر دی۔ مگر اس کے اندر کوئی چیز تھی جو اسے بے چین کر رہی تھی۔ اس لیے جلد ہی اس کا دل اکھاڑے سے اچاٹ ہو گیا اور اس نے اکھاڑے میں جا کر زور آزمائی جانا بند کر دیا۔ اب اس کی اندرونی بے چینی اسے لیے پھرنے لگی۔ وہ سارا سارا دن گاؤں سے باہر ویرانوں میں بھٹکتا رہتا تھا۔

وہ مردم بیزار نہیں تھا وہ عام زندگی میں بہت خوش اخلاق اور ملنسار تھا، مگر جب اس پر ایک کیفیت سی طاری ہوتی تو وہ ویرانوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ جب اس کی عمر پندرہ برس کی ہوئی تو ایک روز وہ اسی کیفیت کے تحت گاؤں سے باہر نکل گیا۔

گاؤں کے باہر دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان ہریالی کو نظر انداز کرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب اس پر تھکن طاری ہونے لگی تو وہ ایک کھیت کی منڈھیر پر جا بیٹھا۔ اسے وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ سامنے سے آتا ہوا ایک درویش نظر آیا۔ اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس درویش کی جانب بڑھنے لگا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے سلام کیا۔ درویش نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ "کیا تم اسی گاؤں میں رہتے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

"میں کافی دور سے چلتا چلا آ رہا ہوں۔ سوچا ہے کہ یہاں رک کر تبلیغ کروں گا۔"

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ کوئی اللہ والا ہمارے گاؤں کی طرف آیا ہے۔"

درویش نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس درویش کا تعلق چشتی سلسلے سے تھا اور چشتی سلسلے میں سماع کو خاص اہمیت حاصل ہے، وہ سماع کے ذریعے خود پر ایک جذب کی سی کیفیت طاری کر کے مراقبہ کرتے ہیں۔

"تمہاری آواز بہت اچھی ہے کچھ گا کر سناؤ۔"

چولے خان نے کہا۔ "مجھے گانا نہیں آتا۔" مگر درویش نے ضد باندھ لی۔ کئی بار کے اصرار پر چولے نے ایک لوک گیت سنایا جسے سن کر درویش بہت متاثر ہوا اور خوش ہو کر بولا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری بات مان لی۔"

درویش نے اسے اپنے سلسلے میں بیعت کر لیا اور ایک نیا نام مولا بخش رکھا۔ یہ اس کی زندگی کا ایک بڑا موڑ تھا۔ اس دن سے اس نے خود کو مولا بخش کہلوانا شروع کر دیا۔ ان کے کی آواز کا جادو پھیل گیا۔ اسے راجاؤں اور نوابوں کی طرف سے بلاوے آنے لگے۔ اسے سننا اعزاز سمجھا جانے لگا۔ جب وہ مشہور ہو گیا تو جیسا کہ دستور ہے اس کے حاسد بھی پیدا ہو گئے۔ یہ وہ ہندو برہمن تھے جو موسیقی کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے تھے۔ ایک موقعے پر برہمنوں نے اس پر اعتراض کیا کہ چونکہ وہ برہمن نہیں ہے اور نہ کسی برہمن کا شاگرد اس لیے اسے شاستر یہ سنگیت یعنی کلاسیکی موسیقی گانے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس اعتراض کو خود پر سے ہٹائے گا، چنانچہ وہ ایک برہمن فنکار کے پاس پہنچا اور اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ وہ برہمن اوروں کی طرح متعصب نہیں تھا اس لیے جو فن اس کے پاس تھا وہ مولا بخش کو سکھانے میں اس نے کسی بخل سے کام نہیں لیا، یہاں تک کہ سنسکرت کے پرانے راگ اور گیت بھی سکھا دیئے۔ اب وہ لوٹ کر میسور پہنچا مگر یہاں برہمن اب بھی اس کی حیثیت کو متنازعہ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ برہمنوں نے اس پر کیس کر دیا۔ کیس چلا تو عدالت میں یہ طے پایا کہ سب اپنا اپنا فن پیش کریں۔ یہ مقابلے کوئی دس ماہ تک جاری رہا ایک طرف شہر کے سارے پنڈت تھے دوسری طرف اکیلا مولا بخش۔ لیکن جب مولا بخش نے اپنا فن پیش کیا تو سب سکتے میں رہ گئے اور مولا بخش کو فاتح قرار دے دیا گیا۔ اس کے مخالف برہمنوں کے منہ بند ہوئے۔ اب وہ ایک مستند گائک کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس کی شادی قاسم بی سے ہوئی جس کا تعلق بعض روایات کے مطابق ٹیپو سلطان شہید کے خاندان سے تھا جبکہ بعض روایات اس کا تعلق مغل خاندان سے جوڑتی ہیں۔ اکثر محققین کا خیال ہے کہ وہ ٹیپو شہید کے خاندان سے تھی اسی لیے اپنی شناخت چھپا کر رکھتی تھی۔ یہ تو مصدقہ امر ہے کہ وہ کسی شاہی خانوادے سے تعلق رکھتی تھی، اس کے اندر ایک خاص وقار و تمکنت تھی جو شاہی خاندان کے لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس بارے میں اس نے اپنے بچوں کو بھی بتایا تھا مگر بچوں نے بھی اس بارے میں زبان بند رکھی اور کسی کو بھی تفصیل بتانے سے ہمیشہ گریز کیا۔ قاسم بی سے اس کی چار اولادیں ہوئیں خدیجہ بی بی، مرتضی خان، فاطمہ بی اور عنایت بی۔ قاسم بی چاہتی تھی کہ اس کے بچے بھی اس کے نقش قدم پر چلیں اور اپنے ننھیال کے شاہی انداز اختیار کریں، ان میں خدیجہ بی بی نے اپنی ماں کا اثر کچھ زیادہ ہی قبول کیا تھا وہی انداز و وہی وقار وہی تمکنت جیسے کوئی شہزادی ہو۔ اس عنایت بی بی کی شادی ایک مشہور گائک رحمت خان پٹھان سے ہوئی جس کا تعلق بڑودا سے تھا۔

مولا بخش نے ایک اور شادی امیر بی سے بھی کی تھی جس سے ایک بیٹا علاء الدین تھا جو ڈاکٹر اے ایم پٹھان کے نام سے مشہور تھا، ان کے بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں۔

اب مولا بخش اس مقام پر تھا کہ کئی والیان ریاست نے اسے دعوت بھیجی کہ وہ ان کے دربار سے وابستہ ہو جائے، اس نے بڑودا کے مہاراجا کانڈاراؤ کی دعوت قبول کر لی۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑودا پہنچ گیا۔ یہاں اسے درباری سازشوں اور حسد کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے بے مزہ ہو کر اس نے وہاں سے رخت سفر باندھ لیا۔ اس نے سرسالار جنگ کی دعوت قبول کر لی اور وہ حیدرآباد جا کر وہاں دربار سے وابستہ ہو گیا۔ حیدرآباد میں اس نے موسیقی کے حوالے سے کافی کام کیا کچھ نئے تجربات بھی کیے۔

اس دوران مہاراجا کانڈاراؤ کا انتقال ہو گیا تو مولا بخش بڑودا لوٹ آیا۔ اس نے نئے مہاراجا کے دربار میں پیش ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کر کے داد سمیٹی۔ اسی دوران اس کے علم میں نئے مہاراجا کے باغیانہ خیالات آئے جو انگریزوں کے غاصبانہ قبضے کے خلاف تھا۔ مولا بخش چونکہ ایک فنکار تھا اور سیاست سے دور رہتا تھا اس لیے اس نے ایک بار پھر وہاں سے کوچ کرنے کی ٹھان لی۔ اس بار بڑودا سے نکل کر وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گیا۔ اس دوران اس کو مغربی موسیقی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے اب تک خود کو مشرقی موسیقی تک محدود رکھا تھا، مغربی اور مشرقی موسیقی میں بہت فرق تھا۔ یہاں اس نے اس دور میں ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا کہ میں مغربی موسیقی بھی سیکھوں گا۔ اس نے مغربی موسیقی کی تربیت لی اور اس میں نت نئے تجربات کیے اس نے دونوں انداز کو ملا کر ایسی دھنیں بنائیں جو مشرق کے علاوہ مغرب والوں کے ذوق پر بھی پوری اتریں۔

بڑودا کے مہاراجا شیواجی راؤ گائیکواڑ نے بڑودا میں ایک موسیقی سکھانے کا ادارہ گیان شالا (یہ ادارہ آج بھی موجود ہے اب اس کو مہاراجا شیواجی راؤ یونیورسٹی آف بڑودا کا نام دیا گیا ہے) کے نام سے بنایا تو اس کے لیے اس کی نظر انتخاب مولا بخش پر پڑی جو اس ادارے کا پہلا ناظم بنا۔

آج وہ بہت خوش تھا کیونکہ یہ تو اس کا ایک پرانا خواب تھا جس کو اس طرح تعبیر مل گئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔ اس نے اس ادارے کو مکمل توجہ دی موسیقی کے اسباق مرتب کیے شاگردوں کو سکھانے کے لیے نئے انداز اختیار کیے، الغرض اس نے رات دن محنت کر کے اس ادارے کو موسیقی کے حوالے سے ایک مستند تربیت گاہ میں بدل دیا۔ مہاراجا نے کھلے دل سے اس کا ساتھ دیا اور ہر موقع پر دامے درمے سخنے جیسے بھی ضرورت پڑی اس کے ساتھ کھڑا رہا۔ اس کے پاس بڑودا میں مختلف دانشور، فنکار اور ذی علم لوگ آنے لگے جن میں ہر طرح کے لوگ جیسے شاعر، موسیقار اور فلسفی وغیرہ شامل تھے۔ اس کے گھر میں ان لوگوں کی وجہ سے ہر وقت چہل پہل رہتی تھی۔

1896 میں 63 برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی تدفین میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل تھے۔ وہ خود تو اپنے عقیدے پر قائم تھا مگر اس نے ہمیشہ اوروں کے عقائد کا بھی احترام کیا جس کی وجہ سے سب لوگ، کیا ہندو کیا مسلمان اس کی عزت کرتے تھے۔

☆☆☆

بڑودا کے رحمت خان کا تعلق مشائخ خاندان سے تھا۔ وہ پیر جمعہ شاہ کی اولاد سے تھا مگر ان کے خاندان میں موسیقی کی بھی وراثت چلی آ رہی تھی اس کے والد بہادر خان بھی گائک تھے اور اس نے بھی گانے کی تربیت لی تھی اور ایک مشہور گائک بن چکا تھا۔ اس کی شادی مولا بخش کی دختر خدیجہ بی بی سے ہوئی جس سے ان کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے، عنایت خان، کرامت خان، محبوب خان اور مشرف مولا میاں خان۔

عنایت خان کی پیدائش بڑودا میں 5 جولائی 1882 کو ہوئی۔ وہ ذرا بڑا ہوا تو اسے گیان شالا میں داخل کر دیا گیا جہاں کا منتظم اس کا نانا مولا بخش تھا۔ اس نے نانا کی نگرانی میں گانے اور مختلف روایتی ساز بجانے کی تربیت حاصل کی۔ اسے خصوصاً دینا بجانے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ اپنے بچپن میں ہی مختلف ساز بجانے کا ماہر ہو چکا تھا۔ اس نے نو سال کی عمر میں مہاراجا بڑودا کے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا جس سے مہاراجا بہت متاثر ہوا اور اس کے لیے باقاعدہ وظیفہ جاری کر دیا۔ جب وہ چودہ سال کا تھا تو اس کے نانا مولا بخش کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے اسی گیان شالا میں استاد کی حیثیت سے شاگردوں کو تربیت دینی شروع کر دی۔

اس زمانے میں اہالیان ریاست مختلف فنون کی سرپرستی کرتے تھے اس سلسلے میں مقابلے بھی منعقد کیے جاتے تھے۔ عنایت نے مختلف ریاستوں میں ہونے والے مقابلوں میں

حصہ لینا شروع کر دیا، جن میں زیادہ تر اس نے جیتے۔ اس نے بہت سے سونے کے تمغے حاصل کیے اس پر انعامات کی بارش ہوتی رہی۔ اس کی خصوصیت دینا پر دھرپد گانا تھا۔ سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک مشہور درباری گائک بن چکا تھا اور اس کی دینا میں مہارت کی وجہ سے اسے "سرسوتی دینا نواز" کا خطاب مل چکا تھا۔ ابھی وہ بیس سال کا تھا کہ اسے دکن کے دربار سے دعوت نامہ ملا۔ اس وقت برصغیر کی ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست دکن تھی۔ کشمیر سے بنگالہ تک اس ریاست کی برابری کرنے والی کوئی دوسری ریاست نہیں تھی۔ اتنی بڑی ریاست سے دعوت نامہ موصول ہوا تو نہ صرف وہ بلکہ مہاراجا بڑودم بھی خوش ہوا اٹھے خود انہوں نے نظام حیدرآباد کے دربار میں شرکت کی اجازت دے دی۔

وہ حیدرآباد دکن پہنچے تو پتا چلا کہ وہاں برصغیر کے کونے کونے سے ماہر فن آئے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے فن پر پورا بھروسا تھا اسی لیے جب دکن پہنچے تو پتا چلا کہ وہاں برصغیر کے کونے کونے سے ماہر فن آئے ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے فن پر پورا بھروسا تھا اسی لیے جب انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں کسی کا سر ہلا تو پرندے اڑ جائیں گے۔

درباریوں نے اس سے قبل ایسا فن کبھی سنا بھی نہ تھا۔

مقابلے کے اختتام پر اسے خلعت خطاب سے نوازا گیا۔ چونکہ اس کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا، تو حسب روایت اس کے لیے ایک روحانی استاد کی تلاش ہوئی جس کے ہاتھ پر وہ بیعت کر کے سلوک کی منازل طے کر سکے۔ یہ تلاش 1903 میں پوری ہوئی جب اس کی ملاقات سید محمد ابو ہاشم مدنی (متوفی 1907) سے ہوئی۔ ان کا تعلق چشتیہ سلسلے سے تھا۔ عنایت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور چار سال تک ان کے ساتھ رہا۔ تعلیم کا یہ سلسلہ سید ابو ہاشم کی وفات تک چلا۔ ابو ہاشم نے عنایت کو وصیت کی "عنایت میرے بیٹے مغرب کی طرف جاؤ، تمہیں اپنے موسیقی کے فن سے مشرق اور مغرب کو قریب لانا ہے، اللہ نے تمہیں ایک عظیم کام کے لیے منتخب کیا ہے جو تمہیں کرنا ہے۔ تمہیں پہچان پیدا نہیں کرنا ہے، تصوف کا پیغام دنیا میں پھیلانا ہے۔"

ابو ہاشم کی موت کے دو سال بعد اس نے اپنے مرشد کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے مغرب کا رخ کیا۔ وہ اپنے بھائی محبوب خان اور چچیرے بھائی محمد علی خان کے ہمراہ امریکا پہنچا

کچھ عرصے بعد اس کا چھوٹا بھائی مشرف بھی وہاں ان سے آ ملا۔ یہ سب موسیقی کے مختلف شعبوں میں مہارت رکھتے تھے۔ 1912 میں انہوں نے پہلے یورپ کا دورہ کیا پھر امریکا کی ریاستوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس نے اس دوران نہ صرف موسیقی کا مظاہرہ کیا بلکہ اس نے اپنی تقاریر کے ذریعے بھی لوگوں کو متاثر کیا۔ اس کے مریدوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اسی سال اس کی ملاقات ایک نوجوان امریکی حسینہ Ora Ray Baker سے ہوئی (اورا کا تعلق برطانیہ سے تھا مگر اس کی ساری زندگی امریکا میں گزری تھی۔ وہ امریکی یوگی اور فلسفی ہیئر برنارڈ کی سوتیلی بہن تھی، ہیئر نے ہی اس کی پرورش کی تھی) جلد ہی ان میں دوستی ہوئی جو محبت میں ڈھل گئی۔ عنایت سے شادی سے پہلے اورا نے اسلام قبول کر لیا اس کا نام امینہ بیگم رکھا گیا۔ 1931 میں ان کی شادی انجام پائی۔ چونکہ عنایت کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا مگر اس کی اپنی نئی پہچان ایک موسیقار کے طور پر ہو گئی تھی۔ وہ ایک روحانی شخصیت ایک مرشد کے طور پر بھی جانا جاتا تھا، اب لوگ اسے حضرت عنایت خان کے نام سے اور اس کی بیوی کو پیرانی امینہ بیگم کے نام سے پکارتے تھے۔

1913 میں وہ اپنی بیوی کے ہمراہ روس پہنچا۔ وہاں کا ماحول اسے بہت پسند آیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہندوستان میں ہی ہو۔ وہاں اس کی ملاقات مشہور ادیب لیو ٹالسٹائی کے موسیقار بیٹے سرگئی ٹالسٹائی سے ہوئی۔ سرگئی اس کی شخصیت اور فن سے بہت متاثر ہوا۔ انہوں نے ساتھ مل کر ہندوستانی موسیقی پر کام کیا۔ سرگئی نے عنایت کی مدد سے ہندوستانی موسیقی پر تحقیق بھی کی اور انہوں نے مل کر کالی داس کے لکھے ہوئے مشہور ناول شکنتلا کو بیلے ڈانس کی صورت میں پیش کیا۔ یہاں اس کی ملاقات روسی موسیقار الیگزینڈر سکرابین سے بھی ہوئی جو سرگئی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ عنایت کی دعوت پر سرگئی نے اس کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ عنایت نے سرگئی کو تصوف کے حوالے سے روس میں اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ اسی سال میں ان کے ہاں پہلی بیٹی نورالنساء کی ولادت ہوئی۔ اگلے سال 1914 میں پہلی عالمی جنگ چھڑنے سے کچھ دن قبل وہ فرانس سے ہوتے ہوئے انگلستان لوٹ آیا اور بلومسبری میں رہائش اختیار کی۔

عالمی جنگ 28 جولائی 1914 سے 11 نومبر 1918 تک لڑی گئی۔ عنایت اس دوران انگلستان میں ہی رہا۔ اس دوران اس کے ہاں دو بیٹے ولایت خان، ہدایت

خان اور ایک بیٹی خیرالنساء پیدا ہوئی۔ عنایت ایک ادارہ یونیورسل صوفی ازم کے نام سے بنا چکا تھا۔ اب وہ اس کی ترقی وترویج کے لیے رات دن مصروف رہنے لگا۔ اس کے بے شمار شاگرد یورپ بھر میں پھیلے ہوئے تھے جو اس کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے اور اپنے اپنے ملک میں اس ادارے کے مراکز کھولتے جا رہے تھے۔ اب اس حوالے سے اس کی مصروفیات اتنی بڑھ چکی تھیں کہ موسیقی کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ موسیقی کے بجائے ادارے کو مکمل وقت دیا جائے سو اس نے موسیقی کے پروگرام ختم کر دیئے اور ادارے کے لیے کام کرنے لگا۔ 1920 میں عنایت اپنے خاندان کے ہمراہ فرانس پہنچا، پہلے وہ Wissous نامی قصبہ میں رہائش پذیر رہا، بعد ازاں اس کو صوفی تحریک کی ایک مخیر شخصیت نے Suresnes میں ایک گھر بطور تحفہ پیش کیا تو عنایت اس میں سکونت پذیر ہو گیا۔ یہ گھر فضل منزل کے نام سے مشہور ہے۔ ویسو میں اس نے پہلی بار ایک اسکول کی ابتداء کی تھی۔

1933 میں اس کی تقاریر پر مشتمل چودہ کتابیں صوفی مسیج کے نام سے شائع کی گئیں۔ یہ کتابیں اس کے شاگردوں نے مرتب کی تھیں۔ اب اس نے یورپ بھر کے دورے شروع کیے۔ وہ بھائی چارے اور امن ومحبت کا درس دیتا تھا۔ اس نے سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، اٹلی کے علاوہ سکینڈے نیویا کے ممالک کے بھی دورے کیے۔ سوئٹزرلینڈ میں اس نے یونیورسل صوفی ازم کا صدر دفتر بنایا۔ ان سب مصروفیات نے اسے بہت تھکا دیا تھا، اس کی صحت گرتی جا رہی تھی کمزوری میں اضافہ ہو رہا تھا کہ 1926 میں اسے دمے کی یاد نے ستایا تو دسمبر کے مہینے میں وہ اپنے سیکریٹری کے ساتھ عازم ہند ہوا۔ ہندوستان میں پہلے وہ دہلی پہنچا کچھ دن قیام کے بعد 1927 کی ابتداء میں اس نے اجمیر کا رخ کیا۔ اجمیر میں اس نے خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری دی اور قیام کیا۔ اس دوران اسے سردی لگ گئی جو خراب ہو کر نمونیا میں بدل گئی، علاج ہوتا رہا مگر اب اس کا آخری وقت آ گیا تھا۔ فروری میں وہ دہلی لوٹ آیا جہاں ۵ فروری ۱۹۲۷ کو اس نے آخری سانس لی۔ عنایت کو درگاہ نظام الدین اولیا کے مغرب میں دفن کیا گیا۔ بعد میں وہاں مقبرہ بنا دیا گیا جہاں آج بھی دور دور سے لوگ آتے ہیں۔

☆.....☆

عنایت خان کی بڑی بیٹی نورالنساء کی پیدائش 2 جنوری 1914 کو ہوئی جب عنایت ماسکو میں تھا۔ پہلی عالمی جنگ سے قبل ہی وہ انگلستان لوٹ آئے اور بلومسبری میں رہنے لگے۔ نور کو ٹنگھم ہل میں نرسری میں داخل کروا دیا گیا۔ 1920 میں وہ فرانس منتقل ہو گئے جہاں نور نے تعلیم حاصل کی مگر ابھی وہ تیرہ سال کی تھی کہ ان پر قیامت گزر گئی۔ ہندوستان سے عنایت کی موت کی اطلاع ملی تو ان پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ نور نے اس موقع پر ہمت سے کام لیا اور اپنا غم چھپاتے ہوئے ماں اور بہن بھائیوں کو تسلی دیتی رہی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے خاندان کی کفالت کرے گی۔ وہ ایک شرمیلی، کم گو، حساس اور خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔

اس نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور سوربون یونیورسٹی پیرس سے child psychology کی ڈگری حاصل کی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی خاندانی روایت کو نباہتے ہوئے پیرس کنزرویٹری میں داخلہ لیا جہاں نادیہ بولونژے موسیقی سکھاتی تھی۔ اس نے بربط، ستار اور پیانو بجانا سیکھا۔ وہ اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ بھی کرنے لگی۔ اس نے بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں بھی لکھنی شروع کیں جو بچوں کے رسالوں میں چھپنے کے علاوہ پیرس ریڈیو سے بھی پیش کی جاتی تھیں۔ 1939 میں اس کی اصلاحی کہانیوں کی کتاب 20 جٹاکا کہانیاں کے عنوان سے چھاپی گئی اس میں اس نے گوتم بدھ کی روایتی کہانیوں میں سے 20 کہانیوں کا انتخاب کیا تھا۔

اس دوران یکم ستمبر 1939 کا تاریک دن آ گیا اور یورپ پر جنگ کے بادل چھانے لگے۔ دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ 1940 کے مئی میں جرمنی نے فرانس پر حملہ کر دیا اور کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے نور کے خاندان نے انگلستان کا رخ کرنے کا سوچا۔ نور اور اس کے بھائی ولایت نے آپس میں مشورہ کیا؛ ولایت نے کہا ”نور جنگ کے بادل فرانس پر چھا گئے ہیں کیا ہم یونہی بیٹھے رہیں گے۔“

”مگر بھائی ہم کیا کر سکتے ہیں ہم تو صوفی ہیں ہمارا ایمان ...عدم تشدد پر ہے۔“

”مانا کہ ہم صوفی ہیں اور عدم تشدد کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ ہم یہاں بیٹھے رہیں اور غیروں کی غلامی قبول کر لیں۔ اس سے پہلے کہ جرمن پیرس پر قبضہ کر لیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”ہم کہاں جائیں گے؟“

”ہم انگلستان جائیں گے اور وہاں پہنچ کر حکومت کو

اپنی خدمات پیش کریں گے اور اپنی بساط بھر اس جنگ میں حصہ لیں گے۔ ہم فاشزم اور نازی ازم کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس وقت ملک کو ہماری ضرورت ہے اور ہمیں کسی بھی حال میں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے بھائی میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس وقت ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“

ان کا پیرس چھوڑنے کا فیصلہ بہت صائب تھا کیونکہ پیرس کے اطراف میں صرف چھ ہفتے کی جنگ کے بعد پیرس کو ایک معاہدے کے تحت بنا ایک بھی گولی چلائے جرمنی کے حوالے کر دیا گیا۔ ان دنوں فرانس میں نئے نائب وزیراعظم چوراسی سالہ Marshal Henri Petain نے حکومت سنبھالی تھی۔ وہ ایک سابق فوجی تھا اور پہلی جنگ عظیم میں حصہ لے چکا تھا۔ اسے ایک جنگی ہیرو مانا جاتا تھا۔ اسی لیے اسے لایا گیا کہ قوم اور فوج کا گرتا ہوا حوصلہ بلند ہو۔ مگر اس نے 22 جون 1940 کو جرمنی کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور Forest of Compiègne کے مقام پر جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے بعد پیرس سمیت آدھے سے زیادہ فرانس پر جرمنی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ فوریسٹ اوف کومپین وہی جگہ تھی جہاں 1918 میں جنگ عظیم اوّل کے دوران جرمنی نے فرانس سے ہار مانی تھی گویا آج جرمنی نے اپنی اس ہتک کا بدلہ لے لیا تھا۔

جب نور کا خاندان سفر کی تیاریوں میں مصروف تھا اس وقت نور کی آنکھوں میں آنسو تھے، اسے آج اپنے والد کی بہت یاد آ رہی تھی جس نے زندگی کا بڑا حصہ یورپ روس اور امریکا میں گزار دیا مگر اپنی آخری سانس اپنے ملک میں اپنی فضاؤں میں لی تھی۔ اسے اپنا گھر فضل منزل چھوڑنے کا ازحد صدمہ تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کیا تھا۔ اس گھر کے ہر کونے میں اس کے والد کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کی لائبریری اس کے ساز، موسیقی کا کمرا مراقبے والا حصہ غرض کون سی جگہ تھی جہاں اسے اپنے والد کی یاد نہیں آتی تھی۔ ہر طرف اس کی سانسوں کی اس کے پیار کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔

وہ ایک بڑی فنکارا اور موسیقار بننا چاہتی تھی مگر فرانس کی ہار نے اس کی زندگی کا دھارا تبدیل کر دیا۔ پیرس میں وہ بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی کی منزل میں داخل ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر سے جس کی ہواؤں کی خوشبو اب بارود کی بو میں تبدیل ہو رہی تھی جس کی رومان پرور فضاؤں میں خوف و دہشت پھنکار رہی تھی۔ اس شہر سے اسے بہت پیار تھا وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی مگر مجبوراً چھوڑنا پڑ رہا تھا۔

نور کا خاندان فرانس کے ساحلی شہر Bordeaux بوغدو پہنچے وہاں سے سمندری راستے کے ذریعے انگلستان کے علاقے فولمتھ کورنوول میں 22 جون 1940 کو جہاز سے اترے۔ لندن پہنچ کر وہ دنگ رہ گئے کیونکہ یہ وہ ان کے بچپن والا خوبصورت لندن نہیں تھا، یہ تو ایک اجڑا دیار تھا۔ ہر طرف خوف کے سائے منڈلا رہے تھے ہوائی حملوں کی وجہ سے ہونے والی تباہیاں جگہ جگہ بکھری اپنی داستان الم سنا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید لندن اب زیادہ عرصہ تک مزاحمت نہیں کر سکے گا۔ برطانیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو ہر وقت ہنستے مسکراتے مختلف تفریحات میں مشغول رہتے تھے اب ان کی آنکھوں میں وحشت اور ویرانیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جہاں نغمے گونجتے تھے وہاں اب بموں کے دھماکے گونج رہے تھے۔ جہاں بے فکرے رقص کرتے تھے وہاں اب اجل رقص کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ لندن کے باسی جینا بھول چکے ہیں اور موت کا انتظار کر رہے ہیں، موت جو کبھی بھی کسی بھی وقت اچانک نازی ہوائی جہازوں کی صورت میں نازل ہو جاتی تھی اور ان پر بموں کی برسات کر دیتی تھی۔ لندن پر مسلسل چھہتر راتوں تک بمباری ہوتی رہی۔

لندن کے باسی سائرن بجتے ہی خوف کے عالم میں گھروں سے نکلتے اور زیرزمین ریلوے اسٹیشنز میں گھس کر پناہ لیتے تھے۔ نور پر اپنے والد کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا جو عدم تشدد کا حامی تھا۔ وہ نازیوں کے سخت خلاف تھی اس لیے اس موقعے پر نور اور اس کے بھائی ولایت نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ نازیوں کے جبر و استبداد کے خلاف کام کریں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی بھی اس جنگ میں حصہ لیں اور امتیازی حیثیت حاصل کریں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسا کر لیں اور متحدہ افواج کی طرف سے بہادری کا مظاہرہ کر کے کوئی مقام حاصل کر لیں تو اس سے یقیناً انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان کی خلیج کم ہو جائے گی۔ ان دنوں برطانیہ کو فوجیوں کی سخت ضرورت تھی اس نے اپنے مقبوضات سے بھی فوجیں منگوا لی تھیں اور لندن میں بھی دیواروں پر فوجی بھرتی کی ترغیب کے لیے اشتہارات لگائے ہوئے تھے۔ ولایت فوج میں شامل ہو گیا۔ نور نے بھی فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا اور درخواست بھیج دی۔

مگر جو جواب آیا وہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی درخواست کو رد کر دیا گیا تھا، وجوہات یہ لکھی گئی تھیں کہ ایک، وہ فرانسیسی شہری ہے۔ دو، اس کی پیدائش ماسکو کی ہے۔ اور تین اس کا نام نور عنایت خان، ہندوستانی نام ہے۔ جہاں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اسے بہت افسوس ہوا کچھ دیر وہ افسردہ سی بیٹھی رہی پھر اس کے اندر سے غصے کی ایک لہر اٹھی تو اس نے فوراً ایک نئے عزم سے اٹھ کر خط لکھنا شروع کیا۔ اس نے لکھا ”میں ایک برطانوی ماں کی بیٹی ہوں میرے پاس برطانوی حکومت کا جاری کردہ برٹش پروٹیکٹڈ پرسن کا پاسپورٹ ہے تو میں برطانوی کیسے نہیں ہوں؟ میں برطانوی ہوں اور اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں مجھے موقع دیجیے۔“

اس نے یہ خط ڈاک کے حوالے کر دیا۔ چند ہی روز بعد اسے جواب موصول ہوا جس کے ساتھ انٹرویو لیٹر بھی تھا۔

ان دنوں ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف تحریک زوروں پر تھی۔ تمام بڑے لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ وہ ان حالات سے واقف تھی۔ اسی لیے دوران انٹرویو اس سے سوال کیا گیا کہ کیا تم ان ہندوستانی لیڈروں کے آزادی کے مطالبے سے متفق ہو؟

نور نے بڑی متانت سے بنا ہچکچائے جواب دیا کہ اس وقت ہم ایک مشکل وقت کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ اس وقت ہمیں فاشزم کے خلاف لڑنے کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت پوری طرح برطانیہ کا ساتھ دوں گی، ہاں جب یہ جنگ ختم ہو جائے گی تو میری حمایت بھی ان کے ساتھ ہوگی جو ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

انٹرویو کرنے والے اس لڑکی سے ایسے جواب کی توقع نہیں رکھتے تھے اس لیے وہ چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گئے پھر انہوں نے اس کی سچائی سے متاثر ہو کر اسے تقرر نامہ دے دیا۔ اب اس نے اپنا نام بدل لیا وہ نور عنایت خان سے نورا بیکر بن گئی۔ جب پہلی بار اس نے یونیفورم پہن کر خود کو آئینے میں دیکھا تو اسے اچھا لگا اور اسے لگا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ اب نور وہ گھریلو لڑکی نہیں رہی، وہ اب آزاد فضاؤں میں اڑنے والا ایک پرندہ بن چکی ہے۔ اب وہ حضرت عنایت خان کی بیٹی پیرزادی نور نہیں رہی تھی وہ ایک فضائیہ کی آفیسر تھی۔ اب اسے نور خان نہیں، نورا بیکر کی حیثیت سے زندگی گزارنی ہوگی۔

اس نے 19 نومبر 1940 میں Women's Auxiliary Air Force (WAAF) میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسے ایک دوسرے درجہ کی خاتون معاون کے طور پر وائرلیس آپریٹر کی تربیت کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کو دوسری چند لڑکیوں کے ساتھ وائرلیس استعمال کرنے کی تربیت دی گئی اور مورس کوڈ سکھایا گیا۔ نور کو اس میں بہت دلچسپی محسوس ہوئی۔ اس نے خوب دل لگا کر سیکھا اور بہت کم عرصے میں مہارت حاصل کر لی۔ ان دنوں اس نے اپنی ماں کو خط لکھا جس میں اس نے اپنی تمام دن کی مصروفیات کے بارے میں لکھا کہ ”اگر ہماری طرح کے اور بھی ہندوستانی اس موقع پر برطانیہ کے لیے کام کریں ان کے ہاتھ مضبوط کریں ان کی فوج میں بھرتی ہو جائیں تو جنگ کے بعد برطانیہ کو ہمیں آزادی دینی ہی پڑے گی، اگر آج ابو ہوتے تو ضرور میری بات سے اتفاق کرتے۔“

تربیت کے بعد اسے بمبار ٹریننگ اسکول میں تعینات کر دیا گیا جہاں وہ اپنے کام سے بے زار ہو گئی، وہ محض آفس میں بیٹھ کر کام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی، کوئی بڑا کام، کچھ ایسا جو یادگار ہو، ایسا کارنامہ جس سے اس کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جائے۔ اس نے جون 1941 کو کمیشن کے لیے درخواست دی۔ اسے ترقی دے کر سیکشن آفیسر بنا دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد نور کو اسپیشل آپریشنز ایگزیکٹو کے F Section الف یعنی فرانس سیکشن کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ ایک برطانوی خفیہ ادارہ تھا، جو یکم جولائی 1940 کو قائم کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ میں نازیوں کے بڑھتے قدموں کو روکا جائے۔ ان ممالک کی مدد کی جائے جن پر جرمنی نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ ایک طرح کی پیشہ ور تھی کہ ان مقبوضہ ممالک میں مزاحمتی تحاریک بنائی جائیں۔ انہیں تربیت اسلحہ اور مدد فراہم کی جائے تاکہ جب برطانیہ اور امریکا مل کر بڑا حملہ کریں تو وہاں پہلے سے ہی زیر زمین حریت پسند موجود ہوں جو اندر سے تخریبی کارروائیاں کر کے ان کی مدد کریں۔

نور کو جب ایس ای او نے بلایا تو اس سے پوچھا ”کیا تم پیرس میں خفیہ جاسوس کے طور پر کام کرنا پسند کرو گی۔“

”جی ضرور کیوں نہیں۔“ نور نے اثبات میں جواب دینے میں ایک منٹ بھی نہ لگایا۔

وہ بہت خوش تھی۔ مگر انٹرویو کرنے والے نے اسے ذرا تفصیل سے سمجھایا۔ ”تم اچھی طرح سوچ لو یہ بہت خطرناک مہم ہوگی۔ تم کو چھپ کر کام کرنا ہوگا۔ کوئی یونیفارم تمہارے بدن پر نہیں ہوگا... اور پکڑے جانے کی صورت میں کوئی

تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ اس صورت میں صرف تشدد اور گولی ہی تمہارا مقدر ہوگا کیونکہ جاسوسوں پر جنیوا سمجھوتے کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔“

”جی میں سمجھتی ہوں، مگر اس وقت ملک کو میری ضرورت ہے اگر مجھے اپنی جان بھی قربان کرنی پڑی تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ اس نے عزم سے کہا۔ اس وقت اس کی خوبصورت آنکھوں میں چٹان کی سی سختی نظر آ رہی تھی۔ اسے منتخب کر لیا گیا۔

فروری 1943 میں اسے وزارت ہوابازی کی ڈائریکٹوریٹ آف ائر انٹیلی جینس کے فرسٹ ایڈ نرسنگ یومینری میں تعینات کر دیا گیا۔ اسے وانبورو میز بھیج دیا گیا جو گلفورڈ سرے کے قریب واقع ایک تربیت گاہ تھی جہاں سیکرٹ ایجنٹس کو تربیت دی جاتی تھی۔ یہاں سے تربیت کے بعد اسے چند اور مراکز پر بھی مزید تربیت کے لیے بھیجا گیا جن میں ونٹر فولڈ ہاؤس، بورمانس اور تھیم پارک بھی شامل تھے۔ اسے پیغامات کی ترسیل کے لیے کوڈ ورڈز کی تربیت دی گئی۔ یہ ایک نئی زبان تھی جو ان کو خود ہی ترتیب دینی تھی اس میں ان کو پیغامات ڈیکوڈ کرنے کے لیے کوڈ کی بنانی پڑتی تھی۔ اس نے اپنی لکھی ہوئی ایک نظم کو کوڈ کی بنایا۔ اس کے علاوہ انہیں جسمانی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ جس میں مختلف ہتھیار چلانے کی تربیت بھی شامل تھی۔ ان کا نظام کچھ یوں تھا کہ یہاں سے تربیت مکمل کر کے پاس ہونے والی لڑکیوں کو اسکاٹ لینڈ بھیجا جاتا تھا جہاں انہیں پیرا ملٹری کی تربیت دی جاتی تھی۔ یہاں انہیں سکھایا جاتا تھا کہ وہ مشکل حالات میں کیسے زندہ رہیں۔ یہ ایک طرح سے کمانڈوز جیسی تربیت تھی۔ انہیں خالی ہاتھ لڑنے کی تربیت دی جاتی، بغیر چابی کے تالا کھولنا سکھایا جاتا۔ جسمانی مضبوطی کے لیے ورزشیں کروائی جاتیں لمبی دوڑ کی تربیت دی جاتی۔ اس دوران ان کو کئی بار نقلی تفتیش سے گزارا جاتا تھا تاکہ انہیں پتا چلے کہ کسی اور ملک میں جا کر ایسے کام کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس میں دیکھا جاتا تھا کہ وہ اس کا سامنا کیسے کرتی ہیں۔ نور کے ساتھ بھی ایسا ہوتا رہا، وہ دن بھر کی تربیت کے بعد تھک کر سو رہی ہوتی کہ اچانک جرمن وردی میں ملبوس نقلی گستاپو آفیسر اس کے کمرے پر ہلہ بول دیتے اسے نیند سے اٹھا کر سختی سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیتے۔

نور اس معاملے میں کچھ کمزور ثابت ہوئی کیونکہ وہ ایسے مواقع پر گھبرا جاتی تھی اور رونے لگتی تھی۔ جو لوگ گستاپو کے روپ میں ہوتے غصہ ہو کر اسے روتا چھوڑ جاتے۔ اکثر وہ سوچتی تھی کہ اگر کبھی سچ میں ایسا ہوا تو کیا میں اس صورت حال کا سامنا کر پاؤں گی؟ یہ تربیت مکمل کر کے انہیں مانچسٹر کے ریلوے ائرپورٹ لے جایا جاتا تھا جہاں انہیں پیراشوٹ سے کودنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اس کے بعد آخری مرحلے میں انہیں وائرلیس کی اضافی تربیت دی جاتی تھی۔ تب کہیں جا کر خفیہ ایجنٹ نامزد کیا جاتا تھا۔ اپنی کمزوری کا علم ہونے کی وجہ سے نور کافی مایوس تھی اور اسے لگتا تھا وہ فیل ہو جائے گی۔ دوسری طرف اس کے اساتذہ بھی اس سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے ملی جلی رپورٹس دی تھیں جن میں ایک طرف یہ لکھا گیا تھا کہ وہ قابل تعریف ہے، بہت فرض شناس ہے، مگر بہت جذباتی اور تصورات میں کھوئی رہنے والی، بہت زیادہ متلون مزاج اور پھوہڑ ہے۔ وہ اس مہم کے لیے موزوں نہیں ہے۔ کسی نے لکھا وہ ہتھیاروں سے ڈرتی ہے خصوصاً آتشیں اسلحے سے اور ضرورت پڑنے پر وہ کسی پر گولی نہیں چلا سکے گی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے صوفی پس منظر کی وجہ سے وہ عدم تشدد کی قائل تھی اور کسی کی جان لینا اس کے لیے انتہائی مشکل کام تھا۔ اس کے اساتذہ کے خیال میں وہ ایک ڈرپوک اور کمزور اعصاب کی لڑکی تھی جسے اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی تھی۔

اپنے بارے میں اساتذہ کے تبصرے اور آراء سن کر وہ بہت مایوس تھی وہ مانتی تھی اس میں یہ خامیاں ہیں مگر وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ یہ کام کر سکتی ہے۔ اس کا ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اسے اس کے والد نے ہمیشہ سچ بولنے کی تعلیم دی تھی اور جھوٹ سے نفرت سکھائی تھی مگر یہاں اسے جو کام ملا تھا اس میں ہر وقت جھوٹ ہی بولنا تھا۔ یہاں تک کہ جھوٹا نام، جھوٹی شناخت، جعلی کاغذات مگر اس نے سوچا کہ کسی ارفع مقصد کے لیے جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں، اگر میرا ملک، میرا فرض مجھ سے یہ قربانی مانگتا ہے تو میں یہ بھی کر گزروں گی۔

ادارے کے بڑے اسے میدان عمل میں بھیجنے سے ہچکچا رہے تھے، انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ اچھی کارکردگی دکھا بھی پائے گی۔ مگر اس کے ایک استاد لیو مارکس نے اسے ایک موقع اور دینے کا فیصلہ کیا۔

اس نے ایک دن نور کو اکیلے میں بلایا اور اسے ڈھائی سو حروف کا ایک کوڈ پیغام بنانے کے لیے کہا۔ وہ اس وقت بہت اعصاب زدہ ہو رہی تھی، حالانکہ اس نے پیغام جلدی لکھ لیا تھا مگر گھبراہٹ کی بنا پر بار بار اسے دیکھ اور لکھ رہی تھی، بالآخر اس نے کانپتے ہاتھوں سے لکھا ہوا کاغذ لیو کی طرف بڑھایا۔

لیو نے کاغذ لے کر دیکھا اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں اس کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ وہ ویسے بھی ایک ٹھنڈے مزاج کا اور مشفق قسم کا انسان تھا۔ اس نے نور سے نہایت شفقت سے بات کی، کیونکہ وہ نور کے ماضی سے واقف تھا کہ وہ کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ گھر میں اس کی تربیت کیسے ہوئی ہے۔ اس نے انہی خطوط پر اس کو سمجھایا۔ وہ اوروں سے بھی کہتا تھا کہ اس کے ساتھ نرمی سے کام لیں، سخت رویہ نہ اپنائیں۔ لیو نے نور کی کتاب ”جٹا کا کہانیاں“ سے بندروں کی ایک کہانی منتخب کر کے اسے سنائی جو کچھ یوں تھی کہ بندروں کا قبیلہ پہاڑ کی دو چوٹیوں کے درمیان پھنس جاتا ہے تو ایسے میں سردار بندر ان چوٹیوں کے درمیان لیٹ کر اپنے جسم کا پل بنا دیتا ہے جس پر سے اسّی ہزار بندر بخیر و عافیت گزر جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی جان دے کر پورے قبیلے کو بچا لیتا ہے۔ لیو نے کہا یوں سمجھو یہ کوڈز بھی پل ہیں اگر تم نے غلط کوڈ بھیجے تو تم کسی کی جان خطرے میں ڈال دو گی۔ تمہیں وہ بندر بننا پڑے گا جو اپنی قربانی دے کر دوسروں کو بچا لیتا ہے۔ یہ بات نور کے دل میں اتر گئی۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ ”میں کبھی کوئی غلط کوڈ نہیں بھیجوں گی۔ میں اپنا کام پوری توجہ اور ذمہ داری سے کروں گی۔“

باوجود اس کے کہ ابھی ایک سیکرٹ ایجنٹ کے طور پر اس کی تربیت نامکمل تھی مگر اس کی وائرلیس کی مہارت اور فرانسیسی زبان روانی سے بولنے کی بنا پر ادارے نے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ جنگ زوروں پر تھی اور ماہر سیکرٹ ایجنٹس کی کمی تھی اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ اسے خفیہ مہم پر مقبوضہ فرانس بھیج دیا جائے جہاں نازی قابض تھے۔ اسے ایک جعلی شناخت ژون میری رینیئر دی گئی۔ اس کا وائرلیس شناختی کوڈ نرس تھا جبکہ اسے بطور خفیہ ایجنٹ میڈلین کا کوڈ نام دیا گیا تھا۔ نور بہت خوش تھی وہ ایک بار پھر پیرس جا رہی تھی۔

پیرس جہاں اس نے زندگی کے قیمتی ماہ و سال گزارے تھے جہاں اس کا بچپن گزرا جہاں اس نے جوانی کی بہار دیکھی اور جسے بھرے دل کے ساتھ مجبوراً چھوڑ آئی تھی۔ ان کے جانے سے پہلے بی بی سی فرنچ سروس نے کوڈڈ پیغام کے ذریعے پیرس میں موجود ایجنٹس کو ان کی آمد سے آگاہ کر دیا۔ روانگی سے قبل اس نے اپنے بھائی کو ایک خط لکھا جس میں اسے اپنی نئی ذمہ داریوں کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ ”میں جا رہی ہوں، میرے ساتھ کیا ہو گا یہ نہیں جانتی مگر امید رکھتی ہوں کہ شاید ہم آئندہ کبھی کسی جگہ مل سکیں۔“

لیو مارکس نے چلتے وقت نور کو ایک سونے کا بنا چھوٹا شیشہ دیا تھا جو ان دنوں اونچے طبقے کی عورتیں اپنے پرس میں رکھتی تھیں۔ شاید اس قیمتی تحفے کے پیچھے یہ مقصد ہو کہ اگر نور کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو اسے بیچ کر کام چلا سکے۔

16 جون 1943 کو نور و دیگر خواتین ایجنٹس کے ساتھ اپنی خفیہ مہم پر روانہ ہو گئی۔ اس کو ژون میری رینیئر کے فرضی نام سے کاغذات دیئے گئے تھے۔ اسے رات کے وقت شمالی فرانس میں انگرس میں اتارا گیا۔ اسے صرف ایک پستول کچھ فرانکس اور راستے کا ایک نقشہ رکھنے کی اجازت تھی۔ مگر چونکہ وہ آتشیں اسلحہ پسند نہیں کرتی تھی، اور اپنے ہاتھوں سے کسی کی جان نہیں لینا چاہتی تھی، اس لیے اس نے اپنا پستول لندن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک خاص جہاز سے روانہ ہوئے جو لائسٹر کہلاتا تھا۔ یہ جہاز چاندنی راتوں میں خفیہ پرواز کرتا تھا کیونکہ چاندنی رات میں پائلٹ اس مقام کو صاف دیکھ سکتا تھا جہاں جہاز اترتا تھا۔ وہاں پر چند ایجنٹس کھڑے رہتے تھے، ان کے پاس ٹارچ ہوتی تھیں جن سے وہ جہاز کو روشنی کے سگنلز دیتے تھے۔ ان سگنلز کو دیکھ کر پائلٹ صحیح مقام تک پہنچ کر پٹی کو دیکھ لیتا تھا اس طرح جہاز اتر جاتا تھا۔ یہ خاصا خطرناک کام تھا، مگر مہم کو خفیہ رکھنے کے لیے ضروری بھی تھا۔

جیسے ہی جہاز اترا تو وہاں موجود ایجنٹس نے انہیں سائیکلیں دے کر کہا نقشے کے مطابق فوراً نکل جاؤ۔ اسے ایک فرانسیسی ایجنٹ ہونری ویرتیور سے ملنا تھا۔

وہاں سے وہ اپنی دو ساتھی خواتین ایجنٹس ڈیانا روڈین کوڈ پولیٹ، چیپلن اور سیسلی لیفورٹ کوڈ ایلس، ٹیچر کے ساتھ پیرس پہنچی، جہاں وہ الگ ہو گئیں۔ اسے ایک پتا دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا اس پتے پر تمہیں ایک خاتون رینی سے ملنا ہے۔ مطلوبہ دروازے پر پہنچ کر نور نے گھنٹی بجائی تو اندر سے ایک جوان آدمی نکلا۔ ”جی محترمہ آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

”مجھے رینی سے ملنا ہے، کیا وہ موجود ہے؟“

”مگر یہاں تو میں رہتا ہوں کوئی رینی نہیں رہتی۔“

”کیا، کیا یہ، یہ پتا نہیں ہے۔“ اس نے پتا بتاتے ہوئے پوچھا۔

”پتا تو یہی ہے مگر یہاں کوئی رینی نہیں رہتی۔“

دفعتاً اندر سے ایک نسوانی آواز آئی ”گیری یہ کون ہے۔“ اس کے ساتھ ہی دروازے پر ایک خاتون نمودار ہوئی۔

”جی میرا نام میڈلین ہے مجھے رینی سے ملنا تھا مگر یہ

کہہ رہے ہیں یہاں کوئی رینی نہیں رہتی۔“

اس خاتون نے ذرا غصے سے نوجوان کو دیکھتے ہوئے ڈانٹا۔ ”گیری، تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے“ پھر نور سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ”میڈیلین۔ میرا ہی نام رینی ہے اور یہ میرا شرارتی بھائی گیری ہے، اس کی مذاق کرنے کی عادت ہے اسی لیے تمہیں تنگ کر رہا تھا۔ آؤ اندر آ جاؤ تم صحیح جگہ پہنچی ہو ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“

نور ان کے ساتھ اندر آ گئی۔

یہ دونوں بھائی بہن مزاحمتی تنظیم کے رکن تھے۔ دراصل فرانس میں ہتھیار ڈالنے کی قرارداد پر دستخط ہونے کے فوری بعد مزاحمت کا آغاز ہو گیا تھا۔ ابتداء میں کچھ لوگ انفرادی طور پر احتجاج کرتے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہاں مختلف تنظیمیں بن گئی تھیں جو جرمن قبضے کے خلاف اپنے اپنے طور پر مزاحمت کر رہی تھیں۔ ان میں سے چھوٹی تنظیمیں کتابچے، اور اخبار چھاپ کر بانٹتے تھے اور لوگوں کو مزاحمت پر ابھارتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ مزاحمت ایک تحریک کی صورت اختیار کرنے لگی۔ اس سلسلے میں برٹش براڈ کاسٹنگ ایجنسی یا بی بی سی نے بہت فعال کردار ادا کیا۔ کچھ عرصے بعد امریکا بھی جرمنی کے خلاف فرانس کی مدد کے لیے آ پہنچا اور برطانیہ کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ جس سے اس تحریک کو اور طاقت ملی۔ انہوں نے مزاحمت کاروں کو منظم و مسلح کیا۔ انہیں پیسا، اسلحہ اور تربیت فراہم کی۔

رینی اور گیری نے نور کو پیرس کے حالات سے آگاہ کیا۔ اسے بتایا کہ وہاں انگریز جاسوس کیا کر رہے ہیں اور گستاپو کیسے ان کی بو سونگھ رہی ہے۔ یہ تینوں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک جانب رکھا ریڈیو چل رہا تھا اچانک بی بی سی کی نشریات میں کہا گیا ”کہ آج رات جاسمین بانسری بجائے گی۔“

یہ ایک کوڈ پیغام تھا اور اس میں نور اور اس کی ساتھیوں کے پیرس پہنچنے کی اطلاع پوشیدہ تھی۔ نور جلد ہی رینی اور گیری سے بے تکلف ہو گئی۔ ان دونوں بہن بھائی کا ساتھ اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ دشمنوں کے شہر میں ان کا ساتھ اس کے لیے ایک بڑا نفسیاتی سہارا تھا۔

پیرس میں ایک خفیہ جاسوس میجر فرانسس الفریڈ سوتی جس نے پرسپیٹر فیزیشن کے کوڈ نام سے ایک نیٹ ورک قائم کیا ہوا تھا یہ پیرس کا سب سے بڑا گروپ تھا۔ یہ خفیہ اطلاعات لندن پہنچاتے تھے، اسلحہ اور رقم وصول کر کے تقسیم کرتے تھے۔ تربیت کے لیے لوگوں کو انگلستان بھیجتے تھے اور وہاں سے آنے والے خفیہ جاسوسوں کو مدد فراہم کرتے تھے۔ رینی اور گیری بھی اس کے ارکان تھے۔ نور اس کے ساتھ شامل ہو گئی۔ پرو سپیٹر کے خفیہ ارکان خاصی تعداد میں تھے اور پیرس کے بہت بڑے علاقے میں کام کر رہے تھے۔ یہ خاصا سخت وقت تھا نازی خفیہ ادارے SD Sicherheitsdienst کے اہلکار جگہ جگہ جاسوسوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ ابھی نور کو پیرس پہنچے ایک ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ 24 جون 1943 کو کچھ لوگ گستاپو کے ہاتھ لگ گئے پھر تو ان پر قہر سا ٹوٹ پڑا، اور اس کے نتیجے میں آنے والے ڈیڑھ مہینے کے دوران پرو سپیٹر فزیشن سے تعلق رکھنے والے سب وائرلیس آپریٹرز اور سینکڑوں مزاحمت کار گرفتار ہو گئے۔ یہاں تک کہ جولائی میں پورے پیرس میں صرف ایک ہی وائرلیس آپریٹر باقی رہ گئی، نور عنایت خان عرف نور ایکر عرف میڈلین۔

وائرلیس آپریٹر کا کام انتہائی خطرناک تھا۔ اس میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ جو یہ کام کرتا ہے اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ چھ ہفتے ہوتی ہے اس دوران وہ پکڑا جاتا ہے یا مارا جاتا ہے۔ عموماً یہ کام مرد ہی کرتے تھے نور پہلی خاتون تھی جس نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔

نور کو محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس کے لیے بھی خطرہ بڑھ رہا ہے مگر اس نے سوچا کہ یہ نازک وقت ہے اس وقت اسے اپنی لکھی ہوئی کہانی جو لیو نے اسے سنائی تھی یاد آئی اس نے سوچا ”میں وہ بندروں کا سردار ہوں جس نے اپنی قربانی دے کر اسّی ہزار بندروں کی جان بچائی تھی، ہاں لیو نے مجھے یہی مثال دے کر سمجھایا تھا۔“

نور نے ایف سیکشن کے سربراہ بکماسٹر سے رابطہ کر کے اسے موجودہ خطرناک حالات سے آگاہ کیا اور پرو سپیٹر کے ختم ہونے کی اطلاع دی تو اس نے نور سے کہا۔ ”وہاں خطرہ بہت بڑھ گیا ہے، تم فوراً واپس آ جاؤ۔“

مگر خطرہ محسوس کرنے کے باوجود نور نے واپس آنے سے انکار کر دیا اس نے کہا۔ ”میں ابھی تو آئی ہوں مجھے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اور اب پیرس میں میرے علاوہ کوئی دوسرا وائرلیس آپریٹر بھی تو نہیں رہا۔ اگر میں بھی آ گئی تو یہاں کا سارا کام رک جائے گا۔ سر آپ مجھ پر بھروسا کریں میں دوسرا نیٹ ورک بناؤں گی مجھے اجازت دیں۔“

دراصل بکماسٹر کی خواہش تو یہی تھی کہ نور ابھی وہیں رہ کر کام کرے کیونکہ ان کا بڑا نیٹ ورک ٹوٹ چکا تھا اور اب نور نے کہا تھا کہ وہ وہاں کام جاری رکھنا چاہتی ہے۔ مگر وہ نور کو

لاحق خطرات سے بھی واقف تھا اس لیے ہچکچا رہا تھا۔ کچھ دیر غور کر کے اس نے نور کو اجازت دے دی۔

"ٹھیک ہے نورا، مگر اپنا خیال رکھنا اور کبھی بھی غیر ضروری خطرہ مت مول لینا۔"

حالانکہ نور کے اساتذہ کا خیال تھا کہ وہ بہت کمزور اعصاب کی لڑکی ہے اور مشکل حالات سے نہیں گزر پائے گی۔ مگر نور نے ان کو غلط ثابت کر دیا۔ اپنی کمزور طبیعت کے باوجود اس کڑے وقت میں جب سارا نیٹ ورک ٹوٹ چکا تھا اور وہ اکیلی وائرلیس آپریٹر بچی تھی، اس نے ہمت و بہادری سے سب سنبھال لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے سر پر بھی خطرے کی تلوار لٹک رہی ہے مگر اسے احساس تھا کہ وہ لندن اور پیرس کے درمیان رابطے کی آخری کڑی ہے۔ اس لیے وہ خم ٹھونک کر میدان عمل میں اتر گئی۔

پروسپیٹر کے اکثر اہلکاروں کی گرفتاری کے باوجود اب بھی کئی لوگ میدان میں باقی تھے اور اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ نور نے ان سے رابطہ بحال کیا۔ وہ اکیلی وائرلیس آپریٹر رہ گئی تھی جو آزاد تھی۔ وہ پروسپیٹر اہلکاروں سے ملنے والی معلومات لندن بھیجتی رہی۔ اب وہ SD کو انتہائی مطلوب ایجنٹ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی جس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ گستاپو کو علم ہو چکا تھا کہ اب پیرس میں صرف ایک ہی آپریٹر باقی ہے، جس کی تلاش میں وہ پاگلوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ انہیں اس کے بارے میں یہاں تک معلوم ہو چکا تھا کہ یہ آخری آپریٹر ایک عورت ہے اور اس کا نام میڈلین ہے۔ اس کا حلیہ مشتہر کیا جا چکا تھا جرمنی کے خفیہ ادارے کے اہلکار خصوصی طور پر سب وے اسٹیشنز اور بس کے اڈوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ وائرلیس کی نشریات پکڑنے والی گاڑیاں بھی استعمال کر رہے تھے، یہ گاڑیاں شہر بھر میں گھومتی رہتی تھیں۔ نور بھی پارے کی طرح حرکت کر رہی تھی وہ ایک نشست میں پندرہ منٹ سے زیادہ وائرلیس کا استعمال نہیں کرتی تھی کیونکہ زیادہ دیر استعمال کی وجہ سے وہ گاڑیاں نشریات کے مخرج کا پتا لگا لیتی تھیں۔ وہ بار بار جگہیں تبدیل کرتی تھی۔ وہ کسی ایک جگہ زیادہ دیر نہیں رکتی تھی۔ اسے میک اپ میں مہارت تھی۔ اس موقع پر یہ فن کام آیا اور وہ مختلف حلیے اور نام اختیار کرنے لگی۔ اس نے اپنے بالوں کو بھی رنگ کر کے پہلے سرخ کیا پھر سنہری کر دیا۔ وہ وائرلیس پر بات کرتے ہوئے بھی گرد و پیش نظر رکھتی تھی اور ذرا سا بھی شبہ ہو تو فوراً سے پیشتر وہ جگہ چھوڑ دیتی تھی۔ اس نے جرمنوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اور ایسے حالات میں جب پیرس میں رکنا خطرناک تھا وہ خطرے کو خاطر میں لائے بغیر بڑی خوش اسلوبی سے اپنا کام کر رہی تھی۔

روزانہ تین بجے جی ایم ٹی دوپہر کو لندن میں اس کے پیغام کا انتظار کیا جاتا تھا۔ ہر بار رابطہ ختم کر کے وہ کسی پارک میں جا بیٹھتی تھی۔ اس کا وائرلیس سیٹ ایک بریف کیس کی شکل میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ جس کا وزن تقریباً پندرہ کلو تھا۔ اس بریف کیس کا ہر وقت ساتھ رہنا بذات خود ایک بڑا خطرہ تھا۔ وہ اس دوران پابندی سے اپنی ماں کو خط بھی لکھتی رہی مگر ان میں اس نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے، وہ بس اپنی خیریت کے بارے میں لکھتی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں میری صحت اچھی ہے اور میں جلد ہی گھر آؤں گی پھر ہم مل کر خوشیاں منائیں گے۔ وہ یہ خطوط جانے والے ایجنٹس کے ساتھ بھیجتی تھی۔ وہ لندن سے پوسٹ کر دیئے جاتے تھے۔

ایک اور SOE ایجنٹ فرانس انٹیلے نے سنیما کے نام سے ایک زیر زمین تنظیم تشکیل دی ہوئی تھی جس کی ذمہ داری رینی اور گیری کو سونپی تھی۔ بعد ازاں اس تنظیم کو فونو کا نام دے دیا گیا تھا۔ نور ان کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ ایک روز حسب معمول وہ نشریاتی رابطہ ختم کر کے ایک پارک میں بیٹھی تھی کہ اچانک دو جرمن آفیسرز وہاں سے گزرے انہیں کچھ شبہ ہوا تو انہوں نے نور سے پوچھا

"ماموزیئل، اس بریف کیس میں کیا ہے۔"

نور جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنی تنظیم کے نام کی رعایت سے کہا "اس میں سنیما کی مشین ہے۔ چاہیں تو دیکھ لیں۔"

نور نے جیسے ہی بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا انہوں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ماموزیئل، ہم معذرت چاہتے ہیں۔"

اس کے علاوہ بھی وہ کئی بار خطرات میں پھنسی مگر خوش قسمتی سے بچ گئی۔

اب اس کی ذمہ داریاں بڑھ چکی تھیں۔ وہ اب محض ایک وائرلیس آپریٹر ہی نہیں رہی تھی بلکہ ایک ساتھ کئی کام کر رہی تھی۔ جیسے لندن سے آنے والے ہتھیار وصول کرنا۔ انہیں خفیہ مقامات تک پہنچانا پھر مزاحمت کاروں کو ان کی ترسیل، لندن سے آنے والے ایجنٹس کہاں اتریں گے، وہاں سے آنے والی رقمیں کیسے مزاحمت کاروں میں تقسیم ہوں گی۔ وہ

لندن سے آنے والوں کی مزاحمت کاروں سے ملاقاتیں بھی کرواتی تھی۔ رقم کبھی ایجنٹس کے ذریعے بھیجتی تھی، کبھی مقام مخصوص کر کے وہاں خود رقم دینے بھی جاتی تھی۔ ایک طرح سے وہ اپنی ذات میں ایک تنظیم کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ نور سے پہلے یہ سارے خطرناک کام مرد انجام دیتے تھے۔ نور وہ پہلی عورت تھی جس نے اتنے بڑے پیمانے پر کام کیا۔ اس نے جرمنوں کے خلاف معلومات حاصل کر کے ہیڈ آفس بھیجیں۔

ان کا ایک اہلکار بیل نامی تھا ایک روز نور اس سے ملنے گئی مگر وہ وقت مقررہ پر نہیں پہنچا۔ وہ ایک ذمہ دار شخص تھا اور اس سے پہلے اس نے کبھی ایسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، وہ وقت کا بھی پابند تھا۔ نور کو تشویش ہوئی تو اس نے ایک فون بوتھ سے اس کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر گھنٹی بجنے کے بعد اس نے فون اٹھایا۔ "ہیلو" اس کی آواز میں اضطراب سا تھا مگر نور نے پریشانی کی وجہ سے اس پر توجہ نہیں دی۔

"ہیلو بیل تم کہاں ہو؟ وقت پر پہنچے کیوں نہیں؟"

"میں ابھی فون پر زیادہ بات نہیں کر سکتا۔"

"پھر کب ملو گے۔"

"ایسا کرو تم فلاں جگہ فلاں وقت پر آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے ایک نئی جگہ اور نیا وقت بتا دیا۔

"ٹھیک ہے میں وقت پر پہنچ جاؤں گی۔"

نور اس رات مقررہ مقام پر پہنچی تو اسے دور بیل کھڑا نظر آیا۔ وہ بیل کی طرف بڑھنے لگی۔ بیل کے قریب ذرا آڑ میں دو آدمی کھڑے تھے جن کا تعلق گستاپو سے تھا۔ اصل میں بیل آج گرفتار ہو چکا تھا اور اس کے ذریعہ گستاپو نے نور کو پکڑنے کا پلان بنایا ہوا تھا۔ بیل نے اپنی طرف بڑھتی نور کو اشارے سے خطرے کا سگنل دیا۔ اشارہ دیکھتے ہی نور نے برق رفتاری سے راہ فرار اختیار کی وہ دونوں گستاپو کے اہلکار اور ان کے ساتھ اور بھی چند اہلکار جو آس پاس چھپے ہوئے تھے اسلحہ نکال کر اس کے پیچھے دوڑے۔ انہوں نے اس پر فائر بھی کیے مگر پیرس اس کا اپنا شہر تھا وہ اس کے گلی کوچوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ بھاگنے میں بہت تیز تھی۔ اس نے ان کو گلیوں میں خوب چکر دیئے اور بالآخر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔

اب تک گستاپو کے پاس صرف اس کا حلیہ تھا مگر اب ان اہلکاروں نے بھی تھے جنہوں نے اچھی طرح سے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اگلی بار لندن رابطے میں اس نے بکماسٹر کو یہ سب بتایا تو بکماسٹر نے سختی سے آرڈر دیا کہ بس اب بہت ہو چکا تم فوراً واپس آؤ۔ چونکہ اب حالات تبدیل ہو چکے تھے اور خطرہ بہت بڑھ گیا تھا تو اس نے بھی سوچا کہ یہی بہتر ہے سو اس نے لیو کو واپسی کا عندیہ دے دیا۔

اس رات اس نے رینی اور گیری کو بتایا۔ "میں واپس لندن جا رہی ہوں۔"

گیری۔ "کیا ہوا اتنا اچانک؟ ہم تمہیں بہت یاد کریں گے۔"

"میں بھی تم لوگوں کو نہیں بھول سکتی۔ تم لوگوں نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔"

نور نے 15 اکتوبر 1943 کا دن اپنے سفر کے لیے مقرر کیا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ رینی کچھ اور سوچ رہی تھی اس کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ چکی تھی۔ گستاپو نے نور کی گرفتاری کے لیے ایک لاکھ فرانک کا اعلان کیا تھا۔ رینی نے اپنی عزیز دوست کے ساتھ دھوکا کیا اور گستاپو کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ بعض محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ رینی نے صرف انعام کے لالچ میں یہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کا بھائی گیری اور نور قریب ہو رہے تھے جو اسے پسند نہیں تھا۔ جبکہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ رینی فرانس انٹیلے کو پسند کرتی تھی مگر ان دنوں وہ کام کی وجہ سے نور کے قریب تھا تو رینی نے حسد و جلن کی وجہ سے یہ حرکت کی تھی۔

اپنے جانے سے دو دن قبل 13 اکتوبر 1943 رات کے وقت نور سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک گستاپو والے اس کے فلیٹ کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ دوران تربیت اس کے اساتذہ جو SOE سے تعلق رکھتے تھے، ان کو شبہ تھا کہ نور کسی بھی قسم کی سختی یا سنگین صورت حال کا سامنا نہیں کر سکے گی مگر اس کے برعکس نور نے اپنی گرفتاری کے وقت زبردست مزاحمت کی اور اس دلیری سے SD آفیسرز کا سامنا کیا کہ وہ بھی گھبرا گئے۔ تین تین لوگ اس پر قابو پانے میں ناکام رہے۔ آخر انہوں نے اس پر گنیں تان لیں اور مزید نفری طلب کر لی تب کہیں جا کر وہ اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسے 84 ایونیو فوچ پر واقع SD ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا۔

یہ ایک خوبصورت پانچ منزلہ عمارت تھی۔ اس کی پانچویں منزل پر وہ جگہ تھی جہاں قیدیوں سے پوچھ گچھ کی جاتی تھی اور ان پر بدترین تشدد بھی کیا جاتا تھا۔ وہاں اور بھی ایس ای او ایجنٹس قید تھے۔

وہاں پہنچتے ہی اس نے بیت الخلاء جانے کا مطالبہ کیا،

اسے لے جایا گیا۔ دروازہ مقفل کر کے اس نے دیکھا وہاں ایک کھڑکی تھی مگر وہ پانچویں منزل سے کودنہیں سکتی تھی اس نے کوشش کی کہ چھت تک پہنچ سکے۔ مگر اتنے میں باہر کھڑے سپاہیوں کو شک ہوا تو انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور جواب نہ ملنے پر دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور اسے غائب پا کر فوراً سیٹیاں بجانی شروع کر دی گئیں نتیجتاً وہ فوراً ہی پکڑی گئی۔ اس سے تفتیش کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر اس فرار کی کوشش کے بعد اسے انتہائی خطرناک قیدی کا درجہ دیا گیا۔ گستاپو نے دوران تفتیش اس پر بے حد تشدد کیا، مگر اس نے زبان نہ کھولی۔ اس سے ایک ماہ سے زائد تفتیش کی جاتی رہی۔ جرمن اس کوڈ کی، کی جاننا چاہتے تھے جو وہ استعمال کرتی رہی تھی مگر اس نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا تھا، بدترین تشدد کا سامنا کر کے بھی اس نے ان کو کچھ نہیں بتایا۔

اس نے اپنی سرگرمیوں سے متعلق انہیں ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ مگر اسی دوران اس کی نوٹ بک ایس ڈی کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ اس کی ایک فاش غلطی تھی کہ اس نے سیکورٹی قواعد کے برعکس وہ تمام پیغام نوٹ بک میں لکھ رکھے تھے جو اس نے ایس او ای آپریٹرز کو بھیجے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ اس نے اس غلط فہمی میں سب لکھے ہوں کہ اس کو یہ سمجھ نہیں آیا ہو کہ فائلنگ کا کیا مطلب ہے۔ چونکہ اس کو جلد از جلد پیرس بھیجنے کے لیے اس کا کورس جلد ختم کر دیا گیا تھا اس لیے ممکن ہے یہ چیز اسے سمجھانے سے رہ گئی ہو۔

حالانکہ اس نے جرمنوں کو اپنے کوئی سیکرٹ کوڈز نہیں بتائے مگر جرمنوں کو اس نوٹ بک سے اتنی معلومات حاصل ہو گئیں کہ وہ نور بن کر غلط پیغامات بھیجنے لگے۔ لندن آفس فوری طور پر یہ سمجھنے میں ناکام ہو گئی کہ یہ پیغامات دشمن کی طرف سے آ رہے ہیں۔ (خاص طور پر آپریٹرز کے مورس کوڈز ٹرانسمیشن کی طرز میں تبدیلی) اگرچہ ایم آر ڈی فوٹ کے مطابق زیشار تسڈ نیز ڈ والے کوڈز کانی کرنے میں بہت ماہر تھے۔ نور خان کو ڈبلیو اے ایف کی سگنلر ہونے کی حیثیت سے 'بینگ اوے لولو' کی عرفیت دی گئی تھی کیونکہ اس کا انداز بھاری ہاتھ سے وائرلیس استعمال کرنے کا تھا۔ لندن آفس کی غلطی کی وجہ سے تین اور ایجنٹ جو پیرس بھیجے گئے وہ پیراشوٹ کے ذریعے زمین پر پہنچتے ہی پکڑے گئے۔

سونیا اد لشنسکی (تانیا) جسے مقامی طور پر ایس اوای نے ایجنٹ کے طور پر بھرتی کیا تھا، اسے نور کی گرفتاری کا پتا چلا تو اس نے اپنے منگیتر جیکوئس ویل کے ذریعے لندن پیغام بھجوایا۔ اس نے محکمے کو نور کی گرفتاری کی اطلاع دی اور ہیڈ کوارٹر کو میڈیلین کی طرف سے کسی بھی قسم کی مشکوک ٹرانسمیشن سے آگاہ کیا۔

کرنل مورس بکماسٹر نے سونیا کے پیغام کو غیر مصدقہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا کیونکہ وہ سونیا کے نام سے ناواقف تھا۔ جس کے نتیجہ میں وہ نور کے ٹرانسمیٹر سے آنے والے پیغامات کو اصل سمجھتے رہے جس کی وجہ سے متعدد ایس او ای ایجنٹس مارے گئے۔ جن میں سونیا بھی شامل تھی۔ سونیا کو 6 جولائی 1944 کو ہیلس ویلر ٹرتھ آف کونسٹریشن کیمپ میں سزائے موت دی گئی۔

25 نومبر 1943 کو نور ایس ڈی ہیڈ کوارٹر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے ساتھ اس کے دو ساتھی جون رنشو اشار اور لیون فائی تھے مگر بدقسمتی سے وہ کچھ ہی دیر بعد پکڑے گئے۔ یہ لوگ چھت سے فرار ہو رہے تھے۔ اتفاق سے اسی وقت ہوائی حملہ کا سائرن بجا۔ ایسے وقت میں قانون کے مطابق تمام قیدیوں کا شمار کیا جاتا تھا۔ جب پہریداران کی کوٹھڑی تک آئے تو ان کے غیاب کا فوراً علم ہو گیا اور وہ پکڑے گئے۔

نور خان کو کہا گیا کہ وہ ایک اقرار نامہ پر دستخط کر دے جس میں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ آئندہ فرار کی کوشش نہیں کرے گی۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس کے انکار کے بعد 27 نومبر 1943 میں نور کو حفاظتی تحویل میں بذریعہ ریل گاڑی جرمنی لے جایا گیا اور اسے پفورزیم میں ایک خفیہ قید خانے میں قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ یہ ایک ایسی کال کوٹھڑی تھی جہاں دن رات کا بھی پتا نہ چلتا تھا۔ وہاں وہ دس مہینے یوں رہی کہ اس کے ہاتھوں میں مستقل ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ اسے انتہائی خطرناک قیدی کی حیثیت دی گئی تھی۔

جیسا کہ اس کے قید خانے کے انچارج نے جنگ کے بعد تصدیق کی کہ نور نے عدم تعاون کا رویہ برقرار رکھا اور مسلسل جرمنوں کو کسی بھی قسم کی بے مطلوبہ معلومات دینے سے انکار کرتی رہی۔ اس قید خانے میں جب اس پر زیادہ مایوسی طاری ہوتی تھی تو وہ روتی تھی جسے دوسرے قیدی سنتے تھے۔ SD کے سابق سربراہ Hans Kieffer ہانس کیفر نے جنگ کے خاتمے کے بعد بیان دیا کہ نور نے دوران تفتیش گستاپو کو ذرا سی بھی حقیقی معلومات نہیں دی البتہ مسلسل جھوٹ بولتی رہی۔ تاہم دیگر ذرائع سے پتا چلتا ہے کہ اس نے ایک سادہ لباس تفتیش کار کو ذاتی تفصیلات فراہم کیں جس کے بعد اس کے بچپن اور خاندان کے بارے میں

کیے گئے سوالات کے لحاظ سے جانچ پڑتال کرنے کے لئے ایس ڈی کو فعال کیا گیا۔

11 ستمبر 1944 کو نور کو تین ساتھیوں کے ساتھ جنہیں کارلسر ہی جیل سے لایا گیا تھا۔ ان کے نام ڈائنا رون (یہ نور کے ساتھ ایک ہی جہاز میں فرانس پہنچی تھی مگر پکڑی گئی تھی)، آندرے برایل اور ویریلی تھے۔ ان کو ڈچو کونسٹریشن کیمپ لے جایا گیا۔ 15 ستمبر 1944 کو علی الصباح ان چاروں عورتوں کو باہر میدان میں لایا گیا، جہاں ان کو سر کے پچھلے حصے میں پوائنٹ بلینک سے گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ قتل کے بعد ان کے اجساد کو فوری طور پر بھٹی میں ڈال کر جلا دیا گیا۔

ایک ڈچ قیدی جو وہاں تھا اس نے 1958 میں بیان دیا ہے کہ نور خان کو قتل کرنے سے پہلے لہیم روپرٹ نامی ایس ایس آفیسر نے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا وہ اسے جانوروں کی طرح پیٹتا رہا، اس نے نور پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ اس کا چہرہ خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ جب وہ گر گئی تو وہ اس پر لاتیں برسانے لگا۔ مگر نور نہ روئی نہ اس نے رحم کی بھیک مانگی یہاں تک کہ وہ لہولہان ہو گئی اس کے کپڑے خون سے تر بتر تھے۔ آس پاس زمین بھی نور کے خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ روپرٹ کے جوتوں پر بھی نور کا خون لگا ہوا تھا۔ روپرٹ تھک کر ہانپنے لگا۔ مگر نور یونہی پڑی اسے گھورتی رہی۔ تب وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی، یہ دیکھ کر وہ چلایا اسے گولی مارو۔

نور کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اسے اسی حالت میں اٹھا کر بٹھایا گیا اور پیچھے سے سر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ نور کے آخری الفاظ تھے 'لیبرتے'' یہ فرنچ لفظ ہے بمعنی آزادی۔

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جہاں ایک طرف خوشیاں منائی جا رہی تھیں وہیں نور اور اس جیسی چند دوسری خواتین ایجنٹس کے گھر والے ان کی گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھے۔ تب بکماسٹر کی اسسٹنٹ ویرا اٹکلس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ان گمشدہ خواتین کا پتا لگائے۔ جنگ کے دوران دشمن ممالک میں کام کرنے والی عورتوں کی خبر گیری اسی کی تھی۔ وہ پیرس پہنچی اور تفتیش شروع کی تو ابتداء میں یہ اطلاعات ملیں کہ چار خواتین قیدیوں کو پیرس سے بذریعہ ریل گاڑی جرمنی کے شہر کارلسرو لے جایا گیا تھا، ان میں نور بھی شامل تھی۔ ان میں سے تین عورتوں کی شناخت ڈائنا، آندرے اور ویریلی کے نام سے ہو گئی مگر چوتھی کی شناخت ہنوز ایک راز تھی۔ مگر یہ مسئلہ اس وقت حل ہوا جب چھ مہینے بعد نور کے بھائی ولایت کو ایک خط ملا۔ یہ خط ایک انگریز قیدی نے لکھا تھا اس نے لکھا کہ میں جرمنی میں شورزیم کے قید خانے میں تھا میرے ساتھ والی کوٹھڑی میں ایک انگریز عورت قید تھی جو ایس ای او کی ایجنٹ بتائی جاتی تھی، اس نے اپنا نام نور انیکر اور پتا 4 ٹاویٹن اسٹریٹ لندن بتایا تھا۔ اسے بہت بری حالت میں رکھا گیا تھا اس کے ہاتھ پیر زنجیروں سے اس طرح جکڑے رہتے تھے کہ وہ اپنے جسم کو پوری طرح سیدھا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہم اکثر اس کے رونے اور کراہنے کی آوازیں سنتے تھے۔

اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ وہ نور ہی تھی۔ ولایت نے مزید معلومات حاصل کیں جب ویرا کو پتا چلا تو وہ بھی اس کی مدد کو آ پہنچی۔ ان دونوں کی مشترکہ کوششوں نے ثابت کر دیا کہ اس دن جن چار عورتوں کو ہلاک کر کے بھٹی کی نذر کر دیا گیا تھا ان میں چوتھی نور ہی تھی۔

رینی میٹ انگلینڈ میں ائر فورس میموریل میں نور خان کی علامتی قبر بنائی گئی ہے۔

اسے بعد از مرگ جو ایوارڈز اور تمغے ملے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

جارج کراس 1949۔

فرنچ کراس دو گورے مع سلور ستار۔

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جن تین ایف اے این آئی ممبرز کا انتخاب کیا گیا جنہیں جارج کراس دیا جانا تھا نور بھی ان میں شامل تھی۔ جارج کراس برطانیہ کا سب سے بڑا اعزاز ہے جو جنگ کے دوران انتہائی بہادری کا مظاہرہ کرنے پر دیا جاتا ہے۔

2011 کے آغاز میں ایک مہم چلائی گئی۔ جس کا مقصد تھا کہ ایک لاکھ پاؤنڈ جمع کیے جائیں جس سے نور کا کانسی کا مجسمہ بنا کر اسنٹرل لندن میں واقع اس کے پرانے گھر کے قریب نصب کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلی یادگار ہے جو برطانیہ میں کسی مسلم یا ایشین عورت کی بنائی گئی ہے۔

نائٹس برج کے ولٹن پیلس میں واقع سینٹ پول چرچ میں جنگ عظیم دوئم کے ایف اے این آئی کی یادگار میں باون ایسے ممبرز کا ذکر ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں قربان کر دیں ان میں نور کی یادگار بھی شامل ہے کیونکہ نور کی ابھی عمر ہی کیا تھی؟ ابھی تو اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے مگر موت کے بھیانک جبڑے نے اسے چبا لیا۔

جواں مرگ

منظر امام

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں لیکن کچھ اموات ایسی ہوتی ہیں جو کئی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ پورے معاشرے پر اس کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ ایسے ہی افراد کا مختصر مختصر سا ذکر۔

چند معروف و مشہور ہستیوں کا تذکرہ

موت سے کس کو رستگاری ہے، آج وہ تو کل ہماری باری ہے۔

آنے جانے کا ایک سلسلہ لگا ہوا ہے۔ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ جو آیا ہے اسے ہر حال میں جانا ہے۔ اس مضمون پر گفتگو سے پہلے نظیر اکبر آبادی کی ایک بے مثال نظم کے کچھ ٹکڑے سن لیں اور یاد رکھ لیں۔

ٹک حرص و ہوس کو چھوڑ میاں، مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

کیا بدھیا، بھینسا بیل شتر، کیا گونیں پلاسر بھارا
کیا گیہوں، چاول، موٹھ، مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو یہ کہانی یوں ہی چل رہی ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ کیا پیغمبر، کیا ولی، کیا سپہ سالار، کیا دانش ور، کیا عام انسان جو بھی ہو وہ زندگی کے اسٹیج پر اپنے حصے کا کردار ادا کرتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں طیور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

ان میں باکمال بھی ہیں اور بے کمال بھی۔ نہ جانے ایسے کتنے باکمال ہوں گے جن کو شناخت نہیں مل سکی۔ جو گمنام چلے گئے۔ غالب نے اسی لیے کہا تھا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

یہ مضمون ان باکمالوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنے اپنے شعبے میں نام پیدا کیے اور ناگہانی موت مر گئے یا جوانی یا کم عمری میں موت آ گئی۔ ان ہی کے لیے کہا گیا ہے کہ ”کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔

چلیں ہم دنیا کے باکمال ادیبوں اور شاعروں سے شروع کرتے ہیں۔

ایڈگر ایلن پو

نہ صرف امریکا بلکہ عالمی ادب کا ایک بڑا نام ہے۔ افسانوں کا ذکر ہو اور پو کا نام نہ آئے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ پو کو شارٹ اسٹوریز کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ صرف چالیس سال زندہ رہا لیکن کام کے لحاظ سے اس کے یہ چالیس سال سو سالوں پر بھاری ہیں۔

پو 19 جنوری 1809ء بوسٹن امریکا میں پیدا ہوا۔ اس کی وفات 1849ء میں بالٹی مور میں ہوئی۔ اس طرح اسے صرف چالیس سال کی حیات ملی تھی۔

پو کا کمال پُراسرار کہانیاں ہیں۔ اس نے پُراسرار اور جاسوسی کہانیوں کی ایسی بنیاد ڈالی کہ بعد میں آنے والے تمام قلم کاروں نے اس کی تقلید کی جن میں شرلاک ہومز کے موجد سر آرتھر کانن ڈائل اور پیری میسن کے مصنف ارل اسٹینلے گارڈنر تک شامل ہیں۔

پو کی تکنیک سے ہر دور میں استفادہ کیا گیا۔ اس کی ابتدائی زندگی بہت پریشانی میں گزری ہے۔

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے فنکار چاہے دنیا کے جس خطے کا بھی ہو اس کے نصیب میں پریشانیاں شروع ہی سے لکھ دی جاتی ہیں۔

اس کے ماں اور باپ دونوں اداکار تھے۔ دونوں بالٹی مور کے اسٹیج پر اداکاری کیا کرتے۔ 1811ء میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی موت کے بعد اس کی زندگی کے مشکل مراحل اس کے سامنے آنے لگے۔ باپ نے توجہ دینی چھوڑ دی۔ پھر اسے جان ایلن کے گھر بھیج دیا گیا۔

جان ایلن ایک بے اولاد تاجر تھا۔ اس نے پو کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ یہاں سے پو کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ زندگی جو اپنی انا اور آزادی کی قیمت پر تھی۔ یہ درست ہے کہ جان اس کا بہت خیال رکھا کرتا لیکن کسی اور کا گھر کسی اور ہی کا ہوتا ہے اور شاعروں، ادیبوں کے لیے تو اس قسم کا ماحول ان کی موت کے برابر ہوا کرتا ہے۔

ان سب دشواریوں کے باوجود اس کے اندر کا فنکار زندہ رہا۔

اس نے شاعری تو شروع کر دی تھی لیکن اس کی شاعری ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی۔ پھر اسے اسکاٹ لینڈ بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے کلاسک کی تعلیم حاصل کی لیکن یہ سب کچھ اس کے مزاج سے مطابقت نہیں تھا۔

وہ واپس رچمنڈ آ گیا جہاں جان رہا کرتا تھا اور جہاں اس کا گھر تھا، اس کی محبت تھی۔ یہ بھی زندگی کا ایک لازمی جز ہے، محبت۔ اس کے بغیر تخلیق ادھوری سی اور پھیکی رہتی ہے۔ اس میں سوز پیدا نہیں ہوتا۔ چاشنی اور مہارت نہیں آتی۔

اس کا سرپرست یا اسے باپ سمجھ لیں۔ وہ چاہتا تھا کہ پو اس کے بزنس میں اس کا ہاتھ بٹائے لیکن قدرت نے تو اسے شاعری کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس کے دل میں تو نازک اور لطیف احساسات کا گھر بنا دیا تھا۔ وہ کس طرح بزنس کر سکتا تھا۔ اسے تو زندگی کی علامتیں اور زندگی کی معنویت یا لامعنویت تنگ کرتی رہتی تھیں۔ اسی لیے اس نے لکھنا شروع کر دیا۔

شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ہوتا یہی ہے کہ ان کو سمجھا نہیں

جاتا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ وقت برباد کررہے ہیں۔ لیکن قدرت جانتی ہے کہ اس نے جس کو پیدا کیا ہے اس سے کیا کام لینا ہے۔

دنیا کا ہر شخص اپنے حصے کی ذمے داری لے کر پیدا ہوتا ہے۔ چاہے یہ ذمے داری گھاس چھیلنے کی ہو یا بادشاہت کرنے کی۔ لکڑی کا کام کرنے کی ہو یا شاعری کی۔ ہر شخص اپنے اپنے کام کا ذمے دار ہوتا ہے۔

پو نے بھی شاعری کی۔ افسانے لکھے اور کمال کر دکھایا۔ پو کو نفع یا نقصان سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپی گیت گانے سے تھی۔ کہانیاں بننے سے تھی۔ صرف تیرہ برس کی عمر میں اس نے نظمیں لکھنی شروع کردی تھیں لیکن اس کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ یہ حوصلہ شکنی اس کے باپ جان اور ہیڈ ماسٹر کی طرف سے تھی۔ انہوں نے بھی پو کو اس قابل نہیں سمجھا۔ ان حالات میں زندگی کی دشواریاں اس طرح اور بھی بڑھ گئیں۔ جب جان نے اس کے اخراجات بند کردیئے۔ اب جو کچھ بھی کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔

دن رات اس نے محنت کی تاکہ اپنے تعلیمی اخراجات کے ساتھ اپنی زندگی کی گاڑی کو بھی چلا سکے۔

اس وقت صرف محبت اس کے کام آتی رہی تھی۔ سارہ کی محبت جو اس کے پڑوس میں رہا کرتی۔ ایک خوب صورت ذہین سی لڑکی جو محبت کے مفہوم سے واقف تھی جو جانتی تھی کہ جب چاند روشن ہو تو اس وقت محبوب کے شانے پر سر رکھ دینے سے اہم اور کوئی لمحہ نہیں ہوسکتا۔

اسے اپنے روزگار کے سلسلے میں بوسٹن جانا تھا۔ اس کو اُمید تھی کہ بوسٹن میں اسے کام مل جائے گا۔ وہ کئی مہینوں تک بوسٹن میں رہا لیکن جب کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تو رچمنڈ واپس آگیا۔

یہاں اس کی زندگی کی ایک بری خبر اس کا انتظار کررہی تھی۔ اس کی محبوبہ کی کہیں شادی ہوچکی تھی۔ سارہ کسی اور کی ہو گئی تھی۔ اس حادثے نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔

اس نے ایک نئی زندگی کی ابتدا اس انداز سے کی کہ امریکی فوج میں شامل ہوگیا۔

ایک ایسی زندگی جس میں نظم و ضبط کی اہمیت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا مزاج اس کے برعکس تھا اس کے باوجود اس نے اس کڑی آزمائش میں بھی ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک اچھے عہدے تک پہنچ گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کے مزاج کی بے پروائی نے اسے فوج سے نکلوا دیا۔

وہ پھر بے روزگار تھا۔ اس نے اپنی دادی کے یہاں رہائش اختیار کرلی جہاں ورجینیا بھی تھی۔

ورجینیا دور کی کزن تھی۔ دونوں کے درمیان تعلقات استوار ہونے لگے۔ ورجینیا اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس وقت پو صرف پندرہ یا سولہ برس کا تھا جب کہ ورجینیا اس سے بہت بڑی تھی۔

اس گھر میں پو کو وہ محبت ملی جس قسم کی محبت اور توجہ وہ جان کے یہاں حاصل نہیں کرسکا تھا۔ اس دوران وہ اپنی شاعری اور افسانے امریکا کے مختلف میگزینز میں بھیجتا رہا تھا لیکن کہیں سے بھی حوصلہ افزائی نہیں ہورہی تھی۔

1831ء سے اس کی شاعری شائع ہونے لگی۔ وہ نیویارک آگیا۔ بالآخر اس کی ایک کہانی ایک مقابلے میں اوّل آئی۔ the manuscript found in a bottle ایک اخبار نے اسے جاب کی آفر کردی۔

وہ اس اخبار کا ایڈیٹر بن گیا۔ تھوڑی بہت آمدنی ہونے لگی۔ اس نے اپنی دادی اور ورجینیا کو اپنے پاس بلا لیا اور ورجینیا سے شادی کرلی۔ اس شادی نے ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ کیوں کہ ورجینیا عمر میں اس سے بہت بڑی تھی۔ یہ ہنگامہ اس انداز کا نہیں تھا جس انداز کا آپ کے ذہن میں ہوگا بلکہ یہ ادبی حلقوں میں تھا۔

وہ لوگ جو پو سے واقف تھے اس کی ادبی حیثیت سے جنہیں دلچسپی تھی۔ ان کے لیے پو کی شادی میں بھی ایک تجسس کا عنصر تھا۔

ایڈگر کی شاعری کا بھرپور اظہار اس کی مشہور نظم tamer lane سے ہوا۔ اس مجموعے میں اس نظم کے علاوہ اور بھی چھوٹی نظمیں شامل تھیں۔ اس کے بعد اس کی شاعری کا دوسرا مجموعہ سامنے آیا جس کی نظمیں بھی پو کے سری مزاج سے ہم آہنگ تھیں۔ ان نظموں نے ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

پو نے تنقید لکھنی شروع کردی۔ اس کی تحریروں میں ایسی کاٹ تھی کہ وہ بخیے ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ بہت بے رحمی سے تجزیے کیا کرتا۔ اسی لیے اسے tom hock man خطاب دیا گیا تھا۔

اس کی کہانیاں ایک طرف اپنا مقام بنا رہی تھیں پُراسرار کہانیاں جن میں ایک بے نام سے خوف کی آمیزش ہوتی۔

پو کا انتقال بھی اس کی پُراسرار کہانیوں کی طرح پُراسرار انداز سے ہوا تھا۔

1847ء میں اس کی محبوبہ اور بیوی ورجینیا کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثے نے پو کو شکستہ کرکے رکھ دیا۔ زندگی میں کوئی امنگ نام کی چیز نہیں رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔ اس کے ساتھ مفلسی تھی۔ صحت کی خرابی تھی۔ پریشانیاں تھیں۔ زندگی ایک بھیانک خواب کی طرح ہوگئی تھی۔

27 ستمبر 1847ء کو وہ رچمنڈ سے فلاڈلفیا کے لیے روانہ ہوا اور بالٹی مور کے ایک مقام پر بے ہوش پایا گیا۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں وہ سات اکتوبر کو انتقال کرگیا۔ اس کے آخری الفاظ تھے۔ ”میرے خدا میری روح کی حفاظت فرمانا۔“

ایک خیال یہ ہے کہ شاید اس کے دماغ میں اچانک اتنی شدید گھٹن ہوئی کہ وہ برداشت نہیں کرسکا اور انتقال کرگیا لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی موت کا سبب کچھ اور تھا اور یہ کچھ اور کیا تھا یہ بھی ایک معما ہے۔

اس کی پراسرار موت کے بعد ایک طرف تو اس کے حاسدوں نے اس کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔ تو دوسری طرف اس کی کہانیاں اور نظمیں دنیا بھر کے ادبی حلقوں میں اپنا مقام قائم کرنے لگیں۔

ویسے تو اس کی کہانیوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان ہم چند خاص خاص کہانیوں کا حوالہ دے رہے ہیں۔ The angel of the odd, The black cat, The fall of the house of usher, The man of the crowd وغیرہ۔

اس کی موت کے بعد امریکا میں کئی مقامات پر اس کی یاد میں مجسمے قائم کی گئیں۔ اس کے اس گھر کو میوزیم بنا دیا گیا، جس میں وہ رہا کرتا تھا۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

پو کی موت صرف چالیس برس میں ہوئی تھی۔

جارج اورویل

اس کا پورا نام ایرک آرتھر بلیئر تھا لیکن وہ اپنے قلمی نام جارج اورویل سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے ایک ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے۔ اس کے دو ناولوں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔

پیدائش برما میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں برما ہندوستان ہی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے والد برطانوی سول سروس سے تھے اسی لیے ان کی تعیناتی ہندوستان میں ہوئی تھی۔ وہ

کچھ بڑا ہوا تو اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ لیکن ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اس کے ساتھ رہی۔ برما کے گھنے جنگلات۔ وہاں کی پہاڑیاں اور سبزہ اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ رہے۔ اسی لیے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ دوبارہ ہندوستان واپس آگیا اور پولیس سروس جوائن کرلی۔ زندگی کے کئی رنگ اس نے اس دوران دیکھے۔ 1927ء میں اس نے اپنی ملازمت چھوڑ دی اور کل وقتی لکھنے لکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس قسم کے فیصلے مشکل ہوا کرتے ہیں لیکن جو اس راہ کے مسافر ہوتے ہیں۔ ان کو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ بہ حیثیت رائٹر اپنی جگہ بنانے پیرس چلا گیا۔ لیکن سب کچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا اسے بہت محنت کرنی پڑی۔ اس دوران اس نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں اور اپنے تجربات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ Down and out in paris and london.

یہ صرف ایک کتاب ہی تھی۔ یعنی اس کو اتنی پذیرائی نہیں ملی تھی۔ یہ کتاب 1933ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد اس کا پہلا ناول سامنے آگیا ”Burmese days“۔ یہ کتاب برما میں اس کی یادوں کے حوالے سے ہے اور اسے ایک اچھا ناول مانا جاتا ہے لیکن اس کا اصل کام بعد میں سامنے آنے والا تھا۔

1936ء میں اسے انگلینڈ کے کچھ پس ماندہ علاقوں میں غربت زدہ لوگوں کی زندگی کے بارے میں ایک کتاب یا رپورٹ لکھنے کا کام ملا اور اس کا ایک اہم کام سامنے آیا جس کا نام The road to wigen pier. اس کتاب میں اس کی تحریر کی مہارت نے بہت سوں کو متوجہ کرلیا۔

اس کے مزاج میں قرار نہیں تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جن کو اس بات کا ادراک ہوجاتا ہے کہ ان کی زندگی کم ہے۔ وہ بہت تیزی سے اپنے کام سمیٹنے لگ جاتے ہیں۔ وہ بہت تیز ہو جاتے ہیں۔ جارج نے اسکول ہی کے زمانے سے اپنی ذہانت ثابت کردی تھی۔ اس کی لکھنے کی غیر معمولی مہارت نے اس کے اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اس نے کئی مضامین

لکھے اور وہ پذیرائی حاصل کرتے رہے۔

عام دستور کے مطابق اس نے ایک اسکول میں ملازمت کرلی تھی جہاں اس کا وقت تو گزر جاتا تھا لیکن خواب پورے نہیں ہو پاتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اسپین میں سول وار شروع ہوگئی تھی۔ اس وقت جارج بھی سوشل ازم کا پرچاک بن چکا تھا۔ اس نے اسپین کی سول وار میں باقاعدہ حصہ لینے کا ارادہ کرلیا اور اپنی بیوی ایلین کے ساتھ اسپین چلا گیا۔ جہاں اسے کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور وہ متنفر ہوتا چلا گیا۔ اسی دوران ایک انقلابی نے اس پر قاتلانہ حملہ بھی کیا۔

اس کی گردن میں گولی لگی تھی لیکن وہ بچ گیا پھر وہ ایلین کو لے کر واپس انگلینڈ آگیا۔ یہاں آکر اس نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس دوران جنگ عظیم کی ابتداء ہوچکی تھی۔ جارج نے کئی مراحل کے بعد بی بی سی جوائن کرلیا لیکن پھر استعفیٰ دے کر مشہور اخبار ٹریبیون میں کالم لکھنا شروع کردیا۔ جس کا نام As i please تھا۔

اس کو بہت سراہا گیا۔ اس دوران اس نے لکھنے کا جو کام شروع کیا تھا اس میں تیزی آگئی تھی۔ اس کے رپوتاژ اپنی نوعیت کے بے مثال ہیں جیسے Homage to Catalonia یہ اسپین کی سول وار کے تجربات کے حوالے سے ہے اور بہت شاندار رپوتاژ ہے۔

Down and out in Paris and London. یہ ان دو شہروں کا وہ چہرہ ہے جو غربت زدہ ہے جس میں بہت سے لوگ فاقے کیا کرتے ہیں یا کچروں سے اپنی روٹی حاصل کرتے ہیں۔

اس نے اپنی تحریروں کا مواد زندگی سے حاصل کیا تھا۔ آس پاس کے مناظر، کچرے چنتے کردار، پلیٹ فارم پر بیٹھے لوگ۔ یہ سب اس کی تحریروں کے خام مال تھے۔ یعنی وہ زندگی کے سچے معاملات کا ادیب تھا۔ پھر اس کی دو شاہکار تحریریں سامنے آگئیں جنہوں نے ادبی دنیا میں ایک ہلچل سی مچادی۔ ہر پڑھا لکھا آدمی اس کے دو ناولز کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک تھا Animal farm اور دوسرا تھا Nineteen eighty four یہ کمال کے ناول ہیں۔

اینمل فارم ایک ایسے فارم کی کہانی ہے جس میں خنزیر رہتے ہیں۔ یہ کمال کی طنزیہ تحریر ہے۔ جارج کا ایک کام یہ بھی ہے کہ اس نے انگریزی زبان کو سیاسی اصطلاحات دیں کیونکہ اس کا میدان ہی طنز تھا۔ اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ بی بی سی میں اپنی ملازمت کے دوران اردو میں خبریں پڑھا کرتا تھا۔

1950ء میں اس کا انتقال لندن میں ہوگیا۔ اس نے صرف 47 سال کی عمر پائی لیکن ادب کو شاہکار تحریریں دے گیا ہے۔

اسٹیفن کرین

امریکی ناول نگار، شاعر اور افسانہ نگار۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں ادب میں اضافہ کیا ہے۔ اس کی پیدائش یکم نومبر 1871ء کو نیویارک میں ہوئی تھی۔ اس نے بہت کم عمر پائی اور 1900ء میں انتقال کرگیا۔ یعنی صرف 29 برس کی حیات پائی تھی۔

اس کی تحریریں ادب کی ان مکاتب فکر کی نمائندہ ہیں جن کو naturalism اور Impression ism کہا جاتا ہے۔

وہ ایک ایسے کٹر عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا جہاں اس کے کئی بھائی بہن تھے۔

اس نے صرف چار برس کی عمر میں لکھنا شروع کردیا تھا اور جب وہ سولہ برس کا ہوا تو اس کی تحریریں شائع ہونے لگیں۔

یہاں پھر وہی بات سامنے آتی ہے کہ جن لوگوں کو جلد اس دنیا سے جانا ہوتا ہے وہ اسی حساب سے جلدی جلدی اپنے کام نمٹا دیتے ہیں۔ اسٹیفن کو یونیورسٹی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے 1891ء میں یونیورسٹی چھوڑ دی کیونکہ وہ ایک رپورٹر اور رائٹر کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا تھا۔

1893ء میں اس کا پہلا ناول meggi شائع ہوا یہ شاہکار ناول ایک خانہ بدوش لڑکی کی کہانی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جس کا کام کچرا چننا ہے۔ اس کہانی کا انجام اداس کردینے والا ہے اور برسوں یاد رہ جاتا ہے۔ ادبی حلقوں میں اس ناول کو امریکی ادب کا پہلا نیچرسٹک ناول کہا گیا ہے۔

اس نے جنگ کے پس منظر میں بھی ایک شاہکار ناول تخلیق کیا جس کا نام d badge of courage تھا۔ اس ناول میں جنگ کے حالات اور کیفیات اس کے ہیں جیسے پڑھنے والا آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور کمال بات یہ ہے کہ اسٹیفن نے کبھی میدان جنگ نہیں دیکھا تھا۔

1896ء میں اسے ایک جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے کیوبا جانے کا موقع ملا۔ جب وہ اس سفر کے آغاز پر تھا تو فلوریڈا میں اس کی ملاقات کورا ٹیلر سے ہوگئی۔ بہت جلد دونوں کے درمیان گہرے مراسم ہوگئے جو تا زندگی برقرار رہے۔

اس کا سفر ایس ایس کماٹڈونامی بحری جہاز سے ہوا تھا لیکن اس کی زندگی کا ایک اور تجربہ اس کے انتظار میں تھا۔

سمندر میں کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ جہاز ڈوب گیا۔ وہ تیس چالیس گھنٹوں تک ایک کشتی میں سمندر کے سینے پر ڈولتا رہا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ پھر انہیں بچا لیا گیا۔ اس تجربے کو بھی اس نے ایک افسانے کی شکل دے دی۔ The open boat. اس کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔

اسٹیفن کو یونان کے سول وار کی کوریج کے لیے یونان جانا پڑا۔ جہاں وہ اپنی دوست کورا کے ساتھ گیا۔ اس کے تجربات بھی اس کی زندگی میں شامل ہوگئے۔ اس کی دوستی اپنے وقت کے مشہور اور مستند ادیبوں سے رہی تھی جن میں ایچ جی ویلز کا نام بھی شامل ہے۔ اس کا انتقال ٹی بی کے مرض میں جرمنی میں ہوا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف اٹھائیس برس تھی۔ جینے کی عمر ہی کیا ہوتی ہے اور وہ بھی نامساعد حالات میں۔ جب زندگی مسلسل امتحان لے رہی ہو۔ ایسے میں اگر کوئی ادب یا فن کی خدمت کرتا ہے تو یہ ایک بڑی بات ہے۔ اسٹیفن نے شاعری بھی کی۔ افسانے بھی لکھے اور ناول بھی۔ اس کے مشہور افسانوں میں Red badge of The blue hotel, The bride courage comes to yellow sky, The monster وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسٹیفن نے اپنی پہلی کہانی Uncle jack and the bell handle اس وقت لکھی جب وہ صرف 14 برس کا تھا۔ اس کی یہ کہانی اس کے اسکول اور دیگر حلقوں میں پسند کی گئی۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب کسی میں اس قسم کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں تو پھر اس کا آغاز بہت پہلے ہی ہوجاتا ہے۔ پھر ہر قسم کی ادبی یا فنی زندگی کا سفر رکاوٹوں کے باوجود جاری رہتا ہے۔

اسٹیفن کو اس کی زندگی میں زیادہ اہمیت نہیں دی گئی لیکن اس کی موت کے بعد جب اس کے کام کا جائزہ لیا گیا تو پتا چلا کہ اس نوجوان نے کیسا اثاثہ چھوڑا ہے۔

ایمن برونٹے

ایمن برونٹے اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی بہنیں اور بھائی پہلے ہی ادب کے میدان میں تھے۔ اس کا باپ ایک غریب کسان تھا۔ یہ لوگ آئرلینڈ کے تھے۔ باپ کے دس بھائی بہن تھے۔ بہت غربت میں برونٹے کی زندگی بسر ہورہی تھی۔ اس غربت کے باوجود ایمن کے باپ پیٹرک نے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بچوں کو بھی تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتا تھا۔

ایمن برونٹے نے شوق شوق میں لکھنا شروع کردیا۔ 1802ء میں اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے سینٹ جان کالج کیمبرج میں مطالعہ کا موقع فراہم کیا گیا۔ 1810ء میں اس کی پہلی نظم winter evening thoughts ایک مقامی اخبار میں شائع ہوئی۔

اور اس کا ادبی سفر شروع ہوگیا..... 1811ء میں اس کی نظموں کا ایک مجموعہ کالج پوئم کے نام سے شائع ہوا تھا۔

اسی سال اسے وڈہاؤس گروو اسکول میں ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ یہیں اس کی ملاقات ماریا براون ویل سے ہوئی۔ جو بعد میں اس کی بیوی بن گئی۔ ان دونوں نے مل کر ادبی سرگرمیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔

پیٹرک اور ماریا کئی بچوں کے والدین تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سب کے سب فنکارانہ صلاحیتیں رکھنے والے تھے۔

اس کے بہن بھائیوں میں شارلٹ برونٹ، ایمیلی برونٹ، براون ویل برونٹ، ماریا برونٹ اور الزبتھ برونٹ تھے۔

اس کا بھائی شارلٹ برونٹ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ایک بہت اچھا مصور بھی تھا۔ اس کی بہن ایمیلی برونٹ پوری دنیا میں ادبی شہرت رکھتی ہے۔ اس نے انگریزی ادب کو ورنگ ہائیٹس جیسا ناول دیا جس کا شمار انگریزی کلاسک میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ یہ پورا خاندان سینے کی

بیماریوں میں مبتلا تھا۔ این برونٹے بھی ٹی بی کا شکار ہو کر مری۔ اس وقت اس کی عمر صرف 29 برس تھی۔ اس مختصر عرصے میں اس نے کئی خوب صورت تحریریں دیں جو آج بھی یاد کی جاتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں۔

ان بہنوں نے انگریزی ادب میں ایسا اضافہ کیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

ایمیلی نے اگر وردنگ ہائیٹس تحریر کیا تو شارلٹ برونٹے نے جین آئر لکھ کر ہمیشہ کے لیے ادب میں اپنا مقام بنا لیا۔

این برونٹے بھی کسی سے کم نہیں رہی۔ اس نے شاعری کی اور کئی ناول لکھے جن میں The tenant of wild fell hall اور Agnes gray جیسے ناول بھی ہیں۔

29 برس کی کیا عمر ہوتی ہے لیکن یہی عمر این کی موت کی تھی۔

ایمیلی برونٹے

یہ برونٹے خاندان کی فرد ہے۔ اسی گھر میں پرورش پانے والی۔ اب سب کا بیک گراؤنڈ ایک ہی جیسا رہا۔ ایک ہی جیسے حالات میں زندگی گزاری اور ایک ہی جیسی فنکارانہ صلاحیتیں پائیں۔

ایمیلی کی عمر بھی بہت کم رہی۔ یعنی صرف تیس برس۔ یہ بھی سینے کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی لیکن جاتے جاتے دنیا اور خاص طور پر انگریزی ادب کو وردنگ ہائیٹس جیسا تحفہ دے گئی۔

ایمیلی کی پیدائش 1818ء میں ہوئی اس کا انتقال 1848ء میں ہو گیا۔ ادب میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ جب ہمہ خان آفتاب است کی مثال جن پر صادق آسکے۔

جان کیٹس

انگریزی ادب کا ایک درخشاں ستارہ جو بہت جلد اپنی روشنی دکھا کر ہمیشہ کے لیے چھپ گیا۔ اس باکمال روحانی شاعر نے نہ صرف انگریزی ادب کو بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ اس کی خوب صورت شاعری دلوں پر اثر کرنے والی تھی۔

کیٹس کی پیدائش 1795ء لندن میں ہوئی اور انتقال 1821ء میں ہو گیا۔ اس کا انتقال بھی ٹی بی سے ہوا تھا۔ اس زمانے میں ٹی بی ایک مہلک مرض تھا۔ کیٹس نے اپنی خوب صورت رومانٹک شاعری کے ذریعے پوری نسل کو متاثر کیا۔ نہ صرف نسل کو بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس کی شاعری کو بھلا نہ سکیں۔

ابتداء ہی میں ایک حادثے میں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت کیٹس کی عمر صرف آٹھ برس تھی۔ اس کے

حساس دل نے اس سانحے کو بہت شدت سے محسوس کیا۔ اس المیے نے اس کو زندگی کے دوسرے رخ سے روشناس کرایا۔ وہ دکھ جو دھیرے دھیرے سلگتا ہوا جسم و جاں کو خاکستر کر دیتا ہے۔ یہیں سے اس کی روح میں شاعرانہ خیالات کا بسیرا ہو گیا۔ وہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ دکھ، سکھ، محبتیں، نفرتیں، تعلق، دنیا اور دنیا میں رہنے والے لوگ۔ یہ سب اس کی شاعری کا مواد بنتے چلے گئے۔

حادثات پر حادثات ہوتے رہے۔ باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ دوسرا شوہر ایک لالچی شخص تھا۔ اس نے کیٹس کی ماں کو دھوکا دیا اور اس کے پاس جو کچھ تھا وہ ہتھیا لیا۔

ماں نے اس سے بھی علیحدگی اختیار کر لی اور بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی۔ اپنے بہن بھائیوں میں کیٹس ہی سب سے بڑا تھا۔ اس کے تین بہن بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ اس کی ماں ان بچوں کو اپنی ماں (یعنی کیٹس کی نانی) کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ لیکن وہ بھی چین سے نہیں رہ سکی۔ اس کے ساتھ پریشانیاں لاحق رہیں۔ کبھی کبھی وہ بچوں سے ملنے بھی آجایا کرتی تھی۔ اسی دوران اس کو بھی ٹی بی ہو گئی اور وہ بھی اس دنیا سے چل بسی۔

کیٹس نے زندگی کے ان تلخ حقائق سے گھبرا کر آرٹ اور شاعری میں پناہ تلاش کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی کا کوئی

سہارا نہ ہو تو قدرت خود سہارا فراہم کر دیتی ہے کیٹس جس اسکول میں تھا اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اس کا بہت خیال رکھا۔ اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ حالات یہ نہیں بتاتے کہ کیٹس کو کن حالات میں انگلینڈ سے جانا پڑا تھا۔ وہ 1810ء میں این فیلڈ چلا گیا تھا جہاں اس نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ اس نے ڈگری بھی حاصل کر لی تھی لیکن وہ اس فلیڈ میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسے تو شاعری کرنی تھی۔ حالات نے اسے لی ہانٹ سے ملوا دیا جو ایک باغی قسم کا شاعر بھی تھا اور پبلشر بھی۔

ہانٹ کو اس کے خیالات کی وجہ سے قید میں بھی رہنا پڑا تھا۔ جب وہ قید خانے سے باہر آیا تو کیٹس نے اس کے لیے ایک نظم لکھی۔

"written on the day that mr.leigh hunt left prison."

ہانٹ ہی کے ذریعے کیٹس کو انگلینڈ کے مقتدر حلقوں سے جان پہچان کا موقع ملا تھا۔ سیاست دانوں سے لے کر ارباب حکومت تک۔ جن میں پرسی بائش، شیلے اور ولیم ورڈس ورتھ بھی شامل تھے۔ اس طرح کیٹس کا ایک حلقہ بن گیا تھا۔

1817ء میں ہانٹ نے کیٹس کو پیشکش کی کہ وہ اس کی شاعری کے پہلے مجموعے کو شایع کر دے گا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور کیٹس کی شاعری کا پہلا مجموعہ سامنے آگیا۔ جس کا نام poems by john keats ہے۔

اس کے بعد کیٹس نے ایک اور بڑے کام کا عہد کر لیا۔ اس نے طویل ترین نظم شروع کر دی Endy mion یہ ایک یونانی اپیک ہے۔ کیٹس نے اس کو منظوم کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ چار ہزار لائنوں یا مصرعوں کی نظم ہے کیٹس نے خود سے عہد کیا کہ وہ کم از کم چالیس پچاس لائنیں روزانہ کہا کرے گا۔ اس کی یہ طویل نظم اسی سال مکمل ہو گئی تھی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی نیا ہنر مند سامنے آنے لگتا ہے۔ اس کی مخالفت بھی ہونے لگتی ہے اگر کچھ لوگ اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو بہت سے اس کی حوصلہ شکنی بھی کرنے لگتے ہیں۔ کیٹس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

اس نے جب اپنی طویل ترین نظم شائع کروائی تو اس پر چاروں طرف سے تنقید شروع کر دی گئی۔

کہا گیا کہ وہ اساطیر کو مسخ کر رہا ہے لیکن کیٹس نے کان نہیں دھرا۔ اسے ایک شاہکار مکمل کرنا تھا اور وہ کر گیا۔

اسی دوران اس کا بھائی بیمار پڑ گیا۔ کیٹس کو اس کی عیادت اور دیکھ بھال کے لیے اس کے ساتھ ہی رہنا پڑا۔ اسی دوران محبت کے نرم جذبے نے اس کے دل میں اپنی جگہ بنا لی۔ اس لڑکی کا نام فینی تھا۔ فینی سے محبت اور اس کی مصروفیات کے باوجود اور تنقید کی پروا کیے بغیر شاعری جاری رکھی اور اپنا ایک لازوال سونیٹ When i have fears that i may cease to be مکمل کر لیا۔

اس سانیٹ کی اشاعت 1818ء میں ہوئی۔ اس کے دوسرے ہی مہینے اس کی ایک اور خوب صورت نظم ''ازابیلا'' سامنے آگئی۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس نے اپنی پسند سے ایک ایسے شخص سے شادی کر لی تھی جو اس کی سماجی حیثیت سے بہت کم تھا۔ اس سونیٹ میں کیٹس نے محبت کے لازوال جذبے کو بہت خوب صورتی و نزاکت سے بیان کیا ہے۔

ایک سال بعد اس کی وہ نظم سامنے آئی جس میں فطرت کے دلکش مناظر کو انتہائی حساس دل کے ساتھ محسوس کر کے بیان کیا گیا ہے۔ اس بے مثال نظم کا عنوان The autumn ہے۔

وہ جس طویل متھ پر کام کر رہا تھا۔ اس کی تکمیل تو ہو گئی تھی لیکن اس کی اشاعت اس کی موت کے تیس برسوں بعد ہوئی تھی۔ اپنے بیمار بھائی کی موت کے بعد وہ بہت دنوں تک کچھ نہیں لکھ پایا تھا۔ اس کے بعد جب اس نے خود کو سنبھالا تو اور بھی شاہکار نظمیں سامنے آئیں۔

اس کی شاعری کے تین بڑے مجموعے لامیاء ازابیلا اور اوروی ایو ہف سینٹ اگنس دوسری نظموں کے ساتھ اس کی زندگی کے آخری دنوں میں شائع ہوئے۔

1819ء ہی سے وہ بیمار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کو بھی ٹی بی تھی۔ اس کا دوست اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے کیٹس سے کہا کہ اسے کسی گرم مقام پر منتقل ہو جانا چاہیے۔ اس طرح وہ اٹلی چلا گیا اور یہی سفر اس کی محبت بھری زندگی کا اختتام تھا۔

وہ چونکہ مستقل بیمار تھا۔ اسی لیے فینی کو بھی مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ اٹلی آکر اس کی صحت اور جواب دے گئی۔ اس کے آخری ایام بہت تکلیف میں گزرے تھے۔ وہ خون تھوکتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے کھانے کے لیے صرف دلیا دیا جاتا۔

بالآخر 23 فروری 1821ء کو اس خوب صورت شاعر

کی موت ہوگئی۔اس نے صرف 26 برس عمر پائی لیکن انگریزی ادب کے ماتھے پر وہ ایک دمکتے ہوئے تارے کی طرح ہے اور رہے گا۔

کرسٹوفر مارلو

انگریزی ادب کا ایک بے مثال نام جس کی موت بہت کم عمری میں ہوئی یعنی صرف 29 برس میں۔

مارلو چاقو کے ایک حملے میں زخمی ہو کر موت کا شکار ہوا تھا۔ مارلو کے ڈراموں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شیکسپیئر کے مقابلے کا ڈراما نگار تھا۔ مارلو کی پیدائش کنٹربری نامی مقام پر ہوئی۔ اس کا باپ ایک جوتا ساز تھا اور ماں کیتھرین ایک گھریلو عورت تھی۔

مارلو کی تاریخ پیدائش پتا نہیں چل سکی لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فروری 1564ء میں پیدا ہوا ہوگا۔ کیونکہ اس کو عیسائی دستور کے مطابق چرچ میں لے جا کر بپتسمہ دیا گیا تھا اور یہ کام پیدائش کے دو تین دن بعد ہوتا ہے۔

مارلو اپنے ہمعصر ولیم شیکسپیئر سے دو تین ماہ بڑا تھا۔ 1587ء میں اس نے کیمبرج کے ایک کالج سے بیچلر آف آرٹس کی ڈگری حاصل کی۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اسے ماسٹر کی ڈگری بھی مل گئی۔ یہ ہچکچاہٹ اس کی ان سرگرمیوں کے حوالے سے تھی جس میں یہ خیال کیا گیا تھا کہ مارلو ملکہ کے خلاف کسی خفیہ ایجنسی میں کام کرتا ہے لیکن اس کا ثبوت نہیں مل سکا۔

1587ء اور 1593ء کے درمیان اس نے اپنے ابتدائی ڈرامے تحریر کیے۔ ان ڈراموں کو اسکولوں اور کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں نے اسٹیج کیا تھا۔ ان ڈراموں میں Dido, Queen of carthage وغیرہ شامل ہیں۔ ابتدا... ہی میں دیکھنے والوں کو پتا چل گیا تھا کہ اس لڑکے میں ڈراما نگاری کی صلاحیتیں ہیں۔

1587ء ہی میں اس کا وہ شاہکار ڈراما لندن میں باقاعدہ اسٹیج کیا گیا۔ جس کا نام Tamburline The great تھا۔ یہ ڈراما چنگیز خان کے حوالے سے تھا اور اسے اب ایک کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ یہ اتنا کامیاب ڈراما تھا کہ اس کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اس کا دوسرا حصہ بھی پیش کیا گیا۔ 1590ء میں اس ڈرامے کے دونوں حصے شائع ہو گئے تھے۔

اس کا دوسرا شاہکار ڈراما The jew of Malta تھا۔

Edward the second برطانیہ کی تاریخ کے حوالے سے تھا اور یہ بھی ایک کامیاب ڈراما تھا۔ جو آیندہ پچاس برسوں تک دکھایا جاتا رہا۔

کیا زندگی گزاری تھی اس ڈراما نگار نے۔

اس پر ایک بار توہین کا الزام لگ گیا۔ کہا گیا تھا کہ اس نے اپنی تحریروں میں کچھ مذہبی گستاخی کی ہے جب کہ اس کا کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ اس کے خلاف وارنٹ جاری ہو گیا۔ اسے عدالت میں کھینچ لیا گیا۔

اسے کوئی سزا تو نہیں دی گئی لیکن وہ معتوب بن چکا تھا۔ بہرحال شاید اسی الزام نے اس کی جان لے لی۔ عدالت میں پیش ہونے کے ٹھیک دس دن بعد اسے قتل کر دیا گیا۔

یہ واقعہ 30 مئی 1593ء کا ہے۔ اس وقت اس کی عمر صرف 29 برس تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مارلو کو مہلت ملی ہوتی تو شاید وہ شیکسپیئر سے بھی بڑا ڈراما نگار ہوتا۔

مارلو کے ڈرامے۔

Dido Queen of carthage.
Tamburline the great.
The tragical history of Dr faustus.
Edward 11.
The massacre at paris.

ڈراموں کے علاوہ اس نے شاعری بھی کی جن میں طویل نظموں کے تراجم بھی شامل ہیں۔

اس شاعر اور ڈراما نگار کو کام کرنے کا وقت بہت کم ملا لیکن اس قلیل زندگی میں بہت شاندار کام کر گیا ہے۔ انگریزی ادب میں مارلو کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی لٹریچر کے نصاب میں اس کے ڈرامے شامل ہیں۔

ساکی

اس کا اصل نام ایچ ایچ منرو تھا۔

پُراسرار کہانیاں اس کی پہچان ہیں۔ اسی مناسبت سے اس نے اپنا نام ساکی رکھا تھا۔ جو ساقی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

اس کا باپ رائل فورس میں انسپکٹر جنرل تھا۔ اسی لیے ساکی کو بھی برما میں رہنے کا موقع ملا تھا۔

اس کی پیدائش اکیاب، برما میں ہوئی تھی۔ اس نے

بے شمار چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں۔ جن میں پُراسرار ماحول کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ساکی کی کہانیاں ابتدا میں اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ان کو جمع کر کے کئی جلدوں میں شائع کیا گیا۔ ادب میں اس کا تقابل اوہنری سے کیا جاتا ہے۔

برطانوی والدین کے گھر پیدا ہونے والا یہ رائٹر ایک عہد کو متاثر کر گیا تھا۔

ساکی کئی جہت رکھنے والا ادیب تھا۔ کہانیوں کے علاوہ اس نے اسٹیج کے لیے بھی لکھا۔ ریڈیو کے ڈرامے بھی تحریر کیے۔ ٹیلی ویژن کے ڈرامے بھی لکھے۔

اس کی ایک لاجواب سیریز The story teller تھی۔

1896ء میں ساکی نے لکھنے لکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی لیے وہ انگلینڈ آ گیا۔ اس نے بہ حیثیت ایک جرنلسٹ کے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ اس نے morning post اور Daily express جیسے اخبارات سے اپنی تحریروں کا آغاز کیا تھا۔

ویسے تو باپ کی ریٹائرمنٹ کے بعد ساکی کو بھی رائل فورس میں ایک عہدہ مل گیا تھا۔ اسے بھی برما بھیج دیا گیا تھا لیکن صرف پندرہ مہینوں کے بعد ہی وہ بیمار پڑ گیا اور استعفیٰ دے کر انگلینڈ آنا پڑا۔

ساکی نے اپنا قلمی نام رباعیات عمر خیام سے متاثر ہو کر رکھا تھا۔

اس کی زندگی بھی کچھ عام روٹین سے ہٹی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ جتنے ادیب و شاعر اور فلاسفر وغیرہ ہوتے ہیں ان کی زندگی میں کچھ ابنارمل ضرور ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ ساکی بھی ایسا ہی تھا۔

اس پر ہم جنس پرست ہونے کا الزام تھا۔ اس زمانے میں یہ ایک بڑا جرم اور گھٹیا کام سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ساکی کو بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

بدقسمتی سے ساکی کا بہت سا کام ضائع کر دیا گیا تھا اس کے باوجود جو کچھ بھی ادبی دنیا تک آ سکا ہے وہ بھی بہت ہے جیسے The Gabraiel ernest, The inter lopers, The toys of peace, The story teller, The open window esme وغیرہ۔

ویسے تو اس کے کام کی تعداد اور بھی ہے لیکن ہم نے چند خاص خاص کاموں کا حوالہ دیا ہے۔

اس کی موت بھی اس کی زندگی اور کہانیوں کی طرح پُراسرار رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ رائل فورس میں شامل ہو کر محاذ پر چلا گیا۔ وہاں وہ زخمی ہوا اور انتقال کر گیا۔ اس کی قبر کے بارے میں اب تک صرف اندازے ہی لگائے جا سکے ہیں۔ انتقال کے وقت وہ 45 برس کا تھا۔

موپاساں

ایک بے مثال افسانہ نگار۔ فرانسیسی ادب کا تابناک ستارہ۔

1850ء میں فرانس کے ایک دیہی علاقے میں پیدا ہوا لیکن زیادہ تر زندگی پیرس میں گزاری۔ موپاساں کو مختصر کہانیوں کا ماسٹر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے سماجی اور نفسیاتی مسائل پر انتہائی حیرت انگیز اور پُراثر کہانیاں تحریر کیں۔

موپاساں نے بہت کچھ لکھا۔ اسی سے اندازہ لگا لیں کہ اس نے تین سو سے زائد افسانے، چھ ناولز اور کئی عدد سفر نامے تخلیق کیے۔

اس کی پہلی کہانی جو 1880ء میں شائع ہوئی ball of fat جو ماسٹر پیس کہی جاتی ہے۔ ویسے اس کا ہر افسانہ ہر کہانی اپنی جگہ بے مثال ہے کئی کئی بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

ہمارے یہاں موپاساں کو بہت چھاپا گیا ہے۔ ہر ڈائجسٹ نے اس کی کہانیوں کے ترجمے کئی کئی بار شائع کیے ہیں۔ موپاساں کی کہانیاں لفظی، فطری اور فوری انجام سے پہچانی جاتی ہیں۔ وہ کم لفظوں میں اپنا کمال دکھا دیتا ہے۔ خاص طور پر اس کی کہانیوں کا انجام نہ صرف چونکاتا ہے بلکہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی بہت سی کہانیاں 1870ء کی فرانس اور جرمنی کی جنگ کے تناظر میں لکھی گئیں۔ اس کی اکثر کہانیوں میں ان معصوم لوگوں کی بے بسی

اور دکھوں کو دکھایا گیا ہے جو جنگ کی تباہ کاریوں کا نشانہ بنے تھے۔

موپاساں کے ماں باپ دونوں خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا۔ جب موپاساں کی عمر گیارہ برس تھی تو اس کا بھائی پانچ برس کا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔

اس کی ماں ایک روشن خیال عورت تھی جو کلاسیکی ادب کی شائق تھی۔ اس نے معاشرتی اقدار کے خلاف جدوجہد کی اس کے نظریات شوہر سے نہیں ملتے تھے۔ اسی لیے اس نے طلاق لے لی تھی۔

موپاساں اور اس کا بھائی دونوں ماں کے ساتھ ماں کے آبائی علاقے میں آ گئے جہاں موپاساں نے بہت بے فکری کے دن گزارے۔ دونوں بھائی تتلیاں پکڑتے رہتے تھے۔ موپاساں پر اس کی ماں کی شخصیت کا بہت گہرا اثر ہے چونکہ باپ کی سرپرستی نہیں تھی اسی لیے جو کچھ بھی تھی وہ ماں ہی تھی۔

تیرہ سال کی عمر میں اسے ایک چھوٹی سی مذہبی درس گاہ میں روایتی تعلیم کے لیے داخل کرا دیا گیا تھا۔

موپاساں فرانس کے ایک بہت بڑے ادیب گستاؤ فلابے سے بہت متاثر تھا۔ ایک طرح سے فلابی اس کا استاد ٹھہرا۔ اسی کے مشورے اور ہدایت پر موپاساں نے اپنی تحریروں کی بنیاد رکھی تھی۔

عام شاعروں یا ادیبوں کے برعکس اس نے ایک خوش حال زندگی گزاری تھی۔ وہ اپنے نجی بحری کروز پر سیر کرتا تھا تاکہ دنیا بھر کے تجربات سمیٹ سکے۔ اس سلسلے میں اس نے اٹلی، سسلی، انگلینڈ، الجیریا وغیرہ کی سیر کی۔ جب اس کی واپسی ہوتی تو ایک نیا سفرنامہ تیار ہوتا۔

موپاساں نے کئی سال پیرس میں گزارے۔ وہ نیوی کے ایک محکمے میں کام کرتا تھا اور فرصت کے لمحات میں لکھا کرتا تھا۔ پیرس میں ایفل ٹاور کے پاس ایک ریسٹورنٹ میں اس کی بیٹھک ہوا کرتی۔ جہاں اور بھی ادیب آیا کرتے تھے اور کہانیوں پر گفتگو ہوا کرتی۔ کوئی اپنی شاعری سنا رہا ہے تو کوئی اپنی کہانی۔

1880ء میں Baul de sufii کی اشاعت ہوئی جس کو موپاساں کا پہلا ماسٹر پیس کہا گیا ہے۔ اس نے بے پناہ کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ اسی تناظر میں اس نے deux amis..mother sawage mademoisel fifi. جیسی کہانیاں لکھ ڈالیں جن کا تاثر آج بھی برقرار ہے۔

1880 سے لے کر 1891ء کا دور موپاساں کے عروج کا دور ہے۔ اس نے بہت سی کہانیاں اسی عرصے میں تحریر کیں وہ کہانیاں جنہوں نے پوری دنیا کو چونکا دیا۔

موپاساں کا انتقال 1893ء میں ہوا تھا۔ اس طرح اس باکمال مصنف نے صرف 42 برس کی عمر پائی لیکن اس مختصر عرصے میں وہ دنیا کو بہت کچھ دے گیا۔ آج بھی اس کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں اس کی کہانیوں کے تراجم ہو چکے ہیں۔

موپاساں کی کہانیوں کی فہرست اگرچہ بہت طویل ہے لیکن اس کی خاص خاص کہانیاں یہ ہیں۔

A Country excurtion, A coward, after all over bed29۔

bed 29 موپاساں کی ایک انتہائی پراثر کہانی ہے جس کو ریڈیو کے لیے پاکستان میں سلیم احمد مرحوم نے لکھا تھا اور اسٹوڈیو 9 میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی کہانی ''نوکھا ہار'' بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

ایک طویل فہرست ہے اور کمال یہ ہے کہ اس کی ہر کہانی ماسٹر پیس ہے۔ ایسے فلم کار بہت کم ہوا کرتے ہیں۔

انٹان چیخوف

چیخوف کو جدید افسانہ نگاری کا امام سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ چیخوف دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔

1860ء میں وہ روس کے ایک چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھا۔ اس کا باپ سودا سلف کی ایک چھوٹی سی دکان چلایا کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بچپن کے دن بہت مشکل دیکھے ہوں گے۔

چیخوف جنوبی روس کے اس حصے میں پیدا ہوا جہاں یونانی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نے اس طرح یونانی بھی سیکھی۔

بچپن کی ناخوشگوار یادیں عمر بھر چیخوف کے ساتھ رہیں۔ چیخوف کو اسکول میں داخل تو کرا دیا گیا تھا لیکن وہ ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا البتہ اس کی ماں ایک مثبت سوچ رکھنے والی اور ایک اچھی تربیت دینے والی عورت تھی۔ اس نے چیخوف کو بچپن ہی سے کلاسیکی کہانیاں سنانی شروع کر دی تھیں۔

اس کے باپ کی فضول خرچی اور بے پروائی نے یہ دن دکھایا کہ وہ قرض کی ادائیگی کے خوف سے اپنے خاندان کو لے کر ماسکو بھاگ گیا۔ جب کہ اس نے چیخوف کو بے آسرا چھوڑ دیا تھا۔

چیخوف نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے زندگی گزارنے کے لیے ٹیوشن شروع کر دی اور چھوٹے موٹے کام کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اس طرح تین سال گزارو یئے تین سال بعد وہ خود ماسکو چلا گیا جہاں وہ اپنے خاندان سے ملا اور تعلیمی سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اس نے ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔

فطرت کی دی ہوئی لکھنے کی صلاحیت یہاں اس کے کام آئی۔ اس نے ماسکو کے ایک اخبار Homurous sketches میں کالم اور افسانے لکھنے شروع کر دیئے۔ اس طرح کچھ آمدنی ہونے لگی۔

پہلے مجموعے کی کامیابی کے بعد وہ مستقل لکھنے لگا۔ چیخوف کو ٹی بی کا مرض تھا لیکن وہ اس مرض کو اپنے خاندان سے چھپائے رکھتا تھا۔ اس نے طب کے پیشے کو بھی ترک نہیں کیا۔ جب تحریروں سے آمدنی ہونے لگی تو اس نے اپنی تعلیم باقاعدہ کر لی۔ خود اس کا کہنا تھا کہ ڈاکٹری میری قانونی بیوی ہے اور ادب رکھیل ہے۔

ٹی بی ہی کے مرض میں اس کا انتقال جولائی 1904ء کو جرمنی میں ہوا۔ اس نے صرف 44 برس کی عمر پائی۔

چیخوف بلاشبہ جدید افسانہ نگاری کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ اس نے جو بھی لکھا وہ ایک طویل فہرست ہے۔ اس کی چند کہانیاں The lady with dog, The bet, The man in a case, The death of a clerk. وغیرہ۔ اس کے افسانے ہر دور میں پڑھے جاتے رہے ہیں۔ ایسے لکھنے والے مرتے نہیں ہیں زندہ رہتے ہیں۔ اس کے کچھ اقوال سن لیں۔

☆ اس علم کی کوئی حیثیت نہیں جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔

ڈیانا پہلی جولائی 1961ء میں نورفوک میں پیدا ہوئی۔ وہ اپنے والدین کی چوتھی اولاد تھی۔ اس کے والدین کا تعلق برطانیہ کے شاہی خاندان سے تھا۔ اس نے انگلینڈ اور سوئٹزرلینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ جب اس کے باپ کو ارل اسپنسر کا خطاب ملا تو ڈیانا لیڈی ڈیانا ارل اسپنسر کے نام سے جانی جانے لگی۔ 1967ء میں اس کے والدین کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔ ڈیانا اس وقت صرف سات سال کی تھی۔ علیحدگی کے بعد میاں بیوی کے درمیان ڈیانا کی تحویل کا مقدمہ بھی ہوا جو اس کے باپ نے جیت لیا۔ ڈیانا اپنے باپ کی تحویل میں چلی گئی۔ اس کی پرورش پارک ہاؤس میں ہوتی رہی۔ ڈیانا کا بچپن پرنس اینڈریو اور ایڈورڈ کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ 1975ء میں یہ خاندان پارک ہاؤس سے اتھرپ منتقل ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے لندن اور سوئٹزرلینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ شہزادہ چارلس سے اس کی ملاقات 1977ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ سولہ سال کی تھی۔ 6 فروری 1981ء کو چارلس نے ڈیانا کو شادی کی آفر کی۔ 24 فروری کو منگنی ہوئی اور 29 جولائی 1981ء کو شادی ہو گئی لیکن صرف پانچ سال کے بعد دونوں کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ پامیلا بھی بتائی جاتی ہے جو ایک ماڈل گرل تھی یہ اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ طلاق ہو گئی۔ اس ہر دلعزیز شہزادی کی موت پیرس میں ہوئی تھی جب وہ پاپارازی فوٹو گرافر سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ حادثہ 31 اگست 1997ء کو پیرس میں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس وقت اس کا ایک دوست محمد ڈوڈی بھی بیٹھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حادثہ ڈرائیور کی تیز رفتاری سے ہوا تھا۔ وہ صرف 36 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

☆ لوگ اگر اندر سے خوش ہوں تو انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ سردی ہے یا گرمی ہے۔

☆ ہم زندگی کو صرف مثبت باتوں سے نہیں سمجھتے بلکہ منفی باتیں بھی سبق سکھانے کے لیے ضروری ہیں۔

فرانز کافکا

جرمن ادب کا ایک مشہور اور مستند نام۔

جبکہ اس کا تعلق جرمنی سے نہیں تھا۔ وہ چیکوسلواکیہ کے دارالحکومت پراگ میں پیدا ہوا۔ پیدائش کی تاریخ 3 جون

1883ء ہے۔ وہ جرمن زبان بولنے والے یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ جس جگہ پیدا ہوا وہاں اس کی خدمات کے اعتراف میں ایک میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ کافکا کا انتقال صرف چالیس سال کی عمر میں 1924ء کو ہوا تھا۔ اس کا پیشہ وکالت تھا لیکن وہ زندگی بھر معاشی طور پر پریشان رہا۔ اس کی خدمات کا اعتراف اس کی وفات کے بعد دنیا کے بہترین ادیب کے طور پر کیا گیا ہے۔ کافکا کا انتقال بھی ٹی بی میں ہوا تھا۔

ہم نے اب تک جتنا جائزہ لیا ہے دو باتیں حیرت انگیز طور پر سامنے آئی ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ بہت سے ادیب ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کے لیے الگ سے ریسرچ کرنا پڑے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر چالیس سے پچاس برس کی عمر میں مرے ہیں۔ کافا بھی انہی میں سے ایک تھا۔ شاید یہاں وہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ قدرت کسی کو اتنی ہی مہلت دیتی ہے جب تک وہ اپنا کام مکمل نہ کر لے۔ چاہے اس کا شعبہ کوئی بھی ہو۔ ادھر اس نے کام مکمل کیا ادھر موت کا فرشتہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ یعنی کام ختم ہوتے ہی اس کا بلاوا آ گیا۔

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ یاد آ رہا ہے۔ مناسب ہے کہ تحریر کر دیا جائے۔

ایک مشاعرے میں سودا تشریف فرما تھے۔ اندازہ لگا لیں کہ جس مشاعرے میں سودا شریک ہوں اس مشاعرے کا کیا معیار ہو گا۔

بہر حال ایک بارہ تیرہ برس کے بچے نے ضد کی کہ اس نے بھی ایک شعر کہا ہے۔ وہ سنانا چاہتا ہے۔ پہلے تو اس کو اجازت نہیں مل رہی تھی۔ پھر اجازت دے دی گئی اس بچے نے جو شعر سنایا وہ ایسا شعر ہے کہ ضرب المثل بن کر رہ گیا اور جب تک اردو زبان زندہ ہے وہ شعر زندہ رہے گا۔

وہ شعر یہ ہے ”دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے“

کون ایسا شخص ہے جس نے یہ شعر نہیں سنا خود سودا بھی شعر سن کر چونک اٹھے تھے۔ شعر کی تعریف کے بعد ان کا تبصرہ قابل غور ہے۔ انہوں نے پاس بیٹھے لوگوں سے کہا کہ یہ بچہ بڑا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ اپنا کام کر چکا ہے۔ اور یہی ہوا وہ بچہ اگلے سال ہی دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں کسی کی جوان موت پر افسوس یا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ قدرت اس کو اس کے حصے کا کام ختم کر لینے کے بعد ہی بلاتی ہے۔

تو ہم بات کافکا کی کر رہے تھے۔

کافکا کو اپنی تحریروں پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اس قابل نہیں ہے کہ دنیا کے سامنے لایا جائے۔ ایسے creative لوگوں کو اپنی موت کا احساس ہو جاتا ہے۔ کافکا کو بھی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست میکس براڈ سے کہا کہ اگر وہ مر جائے تو اس کی موت کے بعد اس کی تمام تحریروں کو جلا کر ضائع کر دیا جائے لیکن اس کے دوست نے اس کی وصیت کی پروا نہیں کی اور کافکا کی موت کے بعد اس کی تحریریں منظر عام پر لے آیا۔

ان تحریروں نے پوری دنیا کو چونکا دیا۔ دنیا بھر کے ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔

کافکا کی پیدائش ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ ہرمین کافکا کپڑوں کا ایک تاجر تھا جب کہ اس کی بیوی (کافکا کی ماں) جولی بھی ایک تاجر کی بیٹی تھی۔ کافکا کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد یہ خاندان پراگ منتقل ہو گیا تھا۔ کافکا کی ماں اپنے شوہر سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔

1889ء سے 1893ء تک کافکا کی تعلیم رواج کے مطابق ادھر مذہبی اسکول میں ہوتی رہی لیکن اسے اس قسم کی تعلیم زیادہ پسند نہیں تھی۔ یہ کہنا چاہیے کہ وہ مذہبی نہیں تھا۔ اس اسکول سے فراغت کے بعد کافکا کو ایک بڑے اسکول میں داخل کرایا گیا۔

ذریعہ تعلیم جرمن تھا لیکن کافکا اپنی زبان زیچ بھی بولا کرتا تھا۔ 1901ء میں اس کی تعلیم مکمل ہوئی۔ اس نے وکالت کی تعلیم حاصل کی اگرچہ اس کا رجحان نہیں تھا لیکن گھر والوں کے کہنے پر یہ کرنا پڑا تھا۔

تعلیم کے دوران اس نے ایک ادبی سوسائٹی کی شمولیت اختیار کر لی تھی جہاں کتابیں پڑھی اور سنائی جاتیں ادبی رجحانات پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اسی دوران اس ملاقات ایک میکس براڈ سے ہوئی جو اسی کی طرح قانون طالب علم تھا۔

ان دونوں کی یہ دوستی آخری عمر تک برقرار رہی تھی۔

کافکا اور اس کے والدین نے پیراگ منتقل ہونے کے پہلے ایسبسٹس بنانے والی فیکٹری کی بنیاد رکھی۔ یہ بڑا چلنے والا کام تھا۔ شروع شروع میں کافکا نے بھی اپنے باپ کے اس بزنس میں بہت دلچسپی لی۔ اس کے بعد وہ اکتا سا گیا۔ اس کی توجہ لکھنے لکھانے کی طرف ہوتی چلی گئی۔

کافکا نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ اس کی بیماری بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ٹی بی کا مریض تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ خوف زدہ سا رہنے والا شخص تھا۔ سہما سہما سا۔ اس کو احساس کمتری تمام عمر رہا۔ حتیٰ کہ اپنی تحریروں سے بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔

اس کی بیماری جب بڑھنے لگی تو وہ برلن سے پیراگ واپس آ گیا۔ جہاں اس کی بہن اس کی دیکھ بھال کرتی رہی لیکن پھر اسے ایک سینیٹوریم میں داخل کرا دیا گیا جہاں وہ اپنی آخری عمر تک رہا۔

اس باکمال ادیب کی موت جون 1924ء کو ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال تھی۔

یہ وہ ادیب تھا جس کی شہرت اس کی موت کے بعد ہوئی۔ پھر دنیا نے جانا کہ اس کے درمیان سے کتنا بڑا ادیب رخصت ہو گیا ہے۔ اگر اس کے دوست نے اس کی وصیت پر عمل کر دیا ہوتا تو جو کچھ آج ہمارے سامنے آیا ہے وہ بھی نہ آیا ہوتا۔ خود کافکا نے اپنی تخلیقات کا ایک بڑا حصہ نذر آتش کر دیا تھا۔

کافکا کی پہلی آٹھ کہانیوں کا مجموعہ 1908ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی شاہکار کہانیوں میں A hunger artist, Transformtion, The judgement. وغیرہ ہیں۔ اس نے ناولز بھی لکھے تھے۔

تھامس چیٹرٹن

یہ شاید ادبی دنیا کے کم عمر ترین لوگوں میں سے تھا جس نے بہت مختصر عمر پائی۔ یعنی صرف سترہ سال۔ وہ ایک شاعر تھا۔ اس نے بہت چھوٹی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔

وہ 25 نومبر 1752ء کو میڈیول انگلینڈ میں پیدا ہوا اور 1770ء کو مر گیا۔ اس نے خود کشی کر لی تھی۔ یعنی صرف سترہ سال کے لیے دنیا میں آیا، شاعری کی اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس نے جتنی بھی زندگی گزاری وہ بہت غربت کی تھی۔

اس کے باپ کا انتقال اس کی پیدائش سے دو تین مہینوں پہلے ہو گیا تھا۔ شوہر کی موت کے بعد چیٹرٹن کی ماں نے لڑکیوں کو سلائی کڑھائی سکھانا شروع کر دیا۔ یہ ایک بہت

دکھ بھری زندگی تھی۔

چیٹرٹن نے ان ہی حالات میں شاعری کی ابتداء کی۔ اس کا سب سے پہلا کام اس وقت سامنے آیا جب وہ صرف گیارہ برس کا تھا۔

اس کے بے شمار دشمن ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ اس کی شاعری تھی۔ اس نے انقلابی قسم کی شاعری کی جو بہت سوں کو ہضم نہیں ہو سکی تھی۔ اس سے وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے زہر کھا کر اپنے آپ کو مار لیا۔

اس کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔

یہ ایک جائزہ تھا ادب سے تعلق رکھنے والے مغربی ادیبوں اور شاعروں کا۔ ہمارے ..... یہاں بھی ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایسے کئی نام ہیں۔ کئی لوگ ہیں۔ جو بہت مختصر وقفے کے لیے دنیا میں آئے۔ اپنا کام کیا اور رخصت ہو گئے۔

ایسے ہی لوگوں کے لیے ایک حسرت بھرا شکوہ رہتا ہے۔ ”کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور“

ہندوستان اور پاکستان میں بھی ایسے بہت سے نام ہیں جن کے بارے میں پڑھ کر ہو سکتا ہے کہ آپ بھی دنگ رہ جائیں کہ بس اتنی سی عمر میں دنیا سے چلے گئے؟ آئیں ابتداء کرتے ہیں مشرق کے ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے۔

انعام اللہ یقین

مرزا مظہر جان جاناں کے عہد کے ایک باکمال شاعر۔ اس کی شاعری رومانس کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں ذومعنی شاعری کی ابتداء یقین ہی نے کی تھی جو بعد میں اردو شاعری کا وتیرہ بن گئی۔

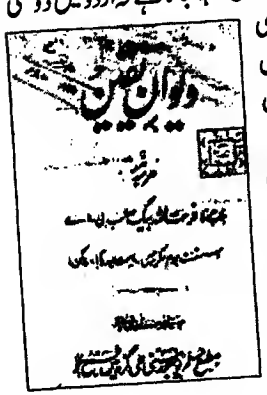

یقین کی پیدائش 1827ء میں دہلی میں ہوئی۔ اس کا انتقال 1855ء میں ہو گیا۔ اس طرح اس شاعر نے کل 27 یا 28 برس کی عمر پائی

تھی۔اس کی موت کے ساتھ ایک اسرار یہ بھی ہے کہ اس کو قتل کر دیا گیا تھا اور یہ قتل خود اس کے والد نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر کیا تھا۔

یقین کے کچھ اشعار

اگرچہ عشق میں آفت بھی ہے اور بلا بھی ہے
نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے
اس قدر غرق لہو میں یہ دل زار نہ تھا
جب حنا سے ترے پاؤں کو سروکار نہ تھا
صریر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا
ہمیں ظل ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا
یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے
کون اس کوچے میں جز تیرے گزر کرتا ہے

قابل اجمیری

بہت اچھے شاعر، بہت نازک خیالی، بہت بڑے صناع (شاعری کے) چھپے ہوئے نازک احساسات کی نازک شاعری کرتے رہے۔

اصل نام عبدالرحیم تھا۔ قابل اجمیری کے نام سے شہرت پائی۔

ان کی ولادت 27 اگست چردلی، اجمیر شریف راجستھان میں ہوئی۔ اس شخص نے ابتداء ہی سے پریشانیاں دیکھی ہیں۔ جب یہ سات سال کے تھے تو والد کا تپ دق (ٹی بی) کے عارضے میں انتقال ہو گیا تھا۔

گھر کے حالات اتنے خراب تھے کہ قابل کو کچھ عرصہ یتیم خانے میں رہنا پڑا تھا۔ اسی دوران والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ بہن کے گھر رہنے لگے لیکن وہ بھی چل بسیں۔ ان حالات میں مایوسیوں نے شاعری کا روپ دھار لیا۔ قابل شاعری کرنے لگے۔

1948ء میں اپنے بھائی شریف کے ساتھ پاکستان آ گئے اور حیدرآباد سندھ میں رہائش اختیار کی۔ قابل نے چودہ سال کی عمر سے شاعری کی ابتدا... کر دی تھی اور اسی زمانے میں ان کے اشعار سننے والوں کو تڑپا کر رکھ دیتے تھے۔

باذوق لوگ سمجھ گئے تھے کہ اس چنگاری میں شرر بننے کی بھرپور صلاحیت ہے۔ حیدرآباد کے مقامی مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے۔ اسی زمانے میں حیدرآباد میں مولانا ماہی اجمیری ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے قابل کی شاعری کو نکھارنے میں بہت مدد کی۔ اصلاح دینے لگے لیکن یہ شاعر ایسا تھا کہ اس نے شاعری میں روایت سے ہٹ کر اپنی الگ راہ نکال لی اور ایک شناخت بنا لی۔

ان کو حیدرآباد میں دوستوں کا ایک بڑا حلقہ مل گیا۔ چھپنے چھپانے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ حیدرآباد سے ''قدریں'' نام کا ایک ادبی جریدہ نکلا کرتا تھا جس کے مدیر اختر انصاری اکبرآبادی تھے۔ انہوں نے اپنے جریدہ میں قابل کو چھاپنا شروع کر دیا پھر کیا تھا ان کی شہرت پورے ہندوستان پاکستان میں ہو گئی۔

روزگار کا مسئلہ کچھ اس طرح حل ہوا کہ حیدرآباد ہی سے ایک روزنامہ ''جاوید'' نکلا کرتا تھا۔ قابل نے اس میں قطعات لکھنے شروع کر دیئے۔ ان کے قطعات نے ایک دھوم سی مچا دی جو بھی پڑھتا اش اش کرنے لگتا۔

اس کے بعد روزنامہ ''آفتاب'' میں قطعات لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

لیکن زندگی کے یہ چند دن بہت ہی کم تھے۔ خوشی بہت کم ان کے پاس آئی۔ 1960ء کے آتے آتے ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تو انہیں کوئٹہ کے سینی ٹوریم میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو بہت کم دنوں کے لیے تھا لیکن کسی کی نرم و نازک انگلیوں نے کچھ ہی دنوں کے لیے سہی ان کے بالوں کو پیار سے سنوارا تو تھا کسی نے سہارا تو دیا تھا جو ان کا حق بنتا ہے۔

اس سینی ٹوریم میں ایک نرس تھی۔ نرگس سوزن بہت ہی باذوق قسم کی لڑکی۔ وہ عیسائی تھی لیکن اسے اردو شاعری سے عشق تھا۔ خاص طور پر قابل کی شاعری سے۔ جب اسے پتا چلا کہ داخل ہونے والا نیا مریض خود قابل ہے تو وہ قابل کے قریب آ گئی۔

وہ ان کی دل و جان سے دیکھ بھال کرنے لگی۔ خود قابل بھی اس سے بہت متاثر ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ دونوں میں قربت بڑھنے لگی۔

پھر یہ ہوا کہ ایک بجھتی ہوئی شام کو قابل نے نرگس سے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ نرگس نے فوراً ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ایک بے آسرے کو سہارا مل گیا۔

سینی ٹوریم سے واپسی پر قابل نے سوزن نرگس کو مسلمان کر کے اس سے شادی کر لی جس سے ایک اولاد ہوئی۔ ظفر قابل اجمیری۔

زندگی نے قابل کو زیادہ مہلت نہیں دی۔ 13 اکتوبر 1962ء کو حیدرآباد ہی میں قابل کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف اکتیس برس تھی۔ ان کی شریک حیات نرگس کا انتقال 2001ء میں ہوا ہے۔ قابل اجمیری کی داستان حیات سرگزشت کے شمارہ اکتوبر 1992ء میں آ چکی ہے۔

قابل کا ایک مکمل مجموعہ ''دیدہ بے دار'' کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ خون رگ جاں۔ ''عشق انسان کی ضرورت ہے اور کلیات قابل۔

ان کی شاعری سے کچھ انتخاب۔

ان کی پلکوں پہ ستارے اپنے ہونٹوں پہ ہنسی
قصہ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے
خود تمہیں چاک گریباں کا شعور آ جائے گا
تم وہاں تک آ تو جاؤ ہم جہاں تک آ گئے

.....☆.....

ہستی کو اپنی شعلہ بداماں کریں گے ہم
زنداں میں بھی گئے تو چراغاں کریں گے ہم

.....☆.....

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

.....☆.....

تضادِ جذبات میں یہ نازک مقام آیا تو کیا کرو گے
میں رو رہا ہوں تم ہنس رہے ہو، میں مسکرایا تو کیا کرو گے
مجھے تو اس درجہ وقت رخصت سکوں کی تلقین کر رہے ہو
مگر کچھ اپنے لیے بھی سوچا، میں یاد آیا تو کیا کرو گے

.....☆.....

رکا رکا سا تبسم جھکی جھکی سی نظر
تمہیں سلیقہ بے گانگی کہاں ہے ابھی
تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

.....☆.....

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو میری ضرورت ہے

.....☆.....

مجھ ہی پہ اتنی توجہ مجھ ہی سے اتنا گریز
میرے سلام سے پہلے میرے سلام کے بعد

شکیب جلالی

ایک باکمال شاعر۔ پورا نام سید حسن رضوی تھا۔ شکیب کے تخلص سے شاعری کی اور سب کو چونکا دیا۔ ادب میں ان کا لہجہ اور تازگی ایک نئی بات تھی۔

یکم اکتوبر 1934ء کو علی گڑھ کے ایک قصبے جلال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بدایوں میں تعینات تھے۔ شکیب کو شعور بدایوں کی فضا میں ملا۔ والدہ کی حادثاتی موت نے ان کے ذہن پر کچھ ایسا اثر مرتب کیا کہ ان کی حساس طبیعت نے ایک شاعر کا رخ اختیار کر لیا اور وہ سید حسن رضوی سے شکیب جلالی بن گئے۔ انہوں نے پندرہ یا سولہ سال کی عمر سے شاعری شروع کر دی تھی اور شاعری بھی ایسی جو لودیتی ہوئی تھی جس میں جیسے صدیوں کا تجربہ بول رہا ہو۔ انہوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن جدید غزل میں انہیں ایک ایسا مقام حاصل ہو گیا کہ آج تک ان کے پیٹرن کو کوئی اور چھو نہ سکا۔

ان کی وفات کے بعد ان کا شعری مجموعہ ''روشنی اے روشنی'' شائع کیا گیا۔ اس مجموعے کی اشاعت احمد ندیم قاسمی نے اپنے ادارے مکتبہ فنون سے 1974ء میں کی۔ شکیب اس عہدے کے ایک اہم غزل گو شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے اثرات نئی نسل پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی والدہ کی موت ناگہانی ہوئی تھی۔ والدہ کی موت کے بعد ایک اور گہرا دکھ یہ ہوا کہ ان کے والد کا ذہنی توازن خراب ہو گیا۔ یعنی وہ شدید نفسیاتی مریض ہو گئے۔

شکیب نے لاہور آ کر ایک اخبار میں ملازمت کر لی تھی۔ انہوں نے میٹرک بدایوں میں کیا تھا۔ پاکستان آ کر راولپنڈی سے انٹر کیا اور سیالکوٹ سے بی اے کیا۔

اس ناکام انسان لیکن کامیاب شاعر کی زندگی بھی اداس کر دینے والی تھی اور اس کی موت بھی ویسی ہی ثابت ہوئی۔ انہوں نے سرگودھا کے قریب چلتی ٹرین کے آگے کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اس وقت وہ صرف 32 سال کے تھے۔

شکیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اردو کے ان

چند شاعروں میں سے ہیں جن کو نظر انداز کیا گیا۔ احمد ندیم قاسمی اور عدیم ہاشمی نے ان کو متعارف کروایا۔ ان کے اعزاز میں تقریبات منعقد کیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی شاعری پڑھ پڑھ کر سنائی گئی۔

بہرحال یہ جواں مرگ شاعر اس قابل ہے کہ اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ سرگزشت نومبر 1991ء کے خودکشی نمبر میں ان پر مکمل تحریر آچکی ہے۔

شکیب کی شاعری سے کچھ انتخاب۔

پھر سن رہا ہوں گزرے زمانے کی چاپ کو
بھولا ہوا تھا دیر سے میں اپنے آپ کو
رہتے ہیں کچھ اداس سے چہرے پڑوس میں
اتنا نہ تیز کیجیے ڈھولک کی تھاپ کو

.....☆.....

شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

.....☆.....

آ کے پتھر تو میرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے
وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے
مجھ کو گرنا ہے تو خود اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے

.....☆.....

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے
نہ اتنی تیز چلے سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

.....☆.....

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مرجھا کے آ گرا ہوں مگر سرد گھاس میں
سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

.....☆.....

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

پنڈت دیا شنکر نسیم

اردو زبان کا ایک بے مثال شاعر۔ پنڈت صاحب کی

سوانح حیات کا زیادہ سراغ نہیں ملتا لیکن پیدائش لکھنو کی تھی۔ 1811ء میں پیدا ہوئے اور 1845ء میں انتقال کر گئے۔ یعنی صرف 34 سال کی عمر پائی لیکن اتنی سی عمر میں وہ کام کر گئے جو اس وقت تک زندہ ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ ان کی مثنوی گلزارِ نسیم کو بجا طور پر دنیا کی ادب عالیہ کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔

مصطفیٰ زیدی

ایک ہائکا شاعر۔ جس کی شاعری کا بھی چرچا رہا اور جس کی موت کا بھی۔

جدید اردو شعراء میں ایک اہم نام۔ پہلے تیغ الہ آبادی کے نام سے لکھتے رہے۔ پھر مصطفیٰ زیدی ہو گئے۔

سید مصطفیٰ حسن زیدی کی پیدائش اکتوبر 1930ء میں ہوئی تھی۔ ایک متمول گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کے والد ایک اعلیٰ افسر تھے اور وہ خود بھی ایک بیورو کریٹ تھے۔ انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ صرف انیس سال کی عمر میں ان کا مجموعہ ''موج میری صدف صدف'' کے نام سے شائع ہو گیا تھا جس کا دیباچہ فراق گورکھ پوری جیسے بڑے شاعر نے لکھا تھا اور یہ پیش گوئی کی تھی کہ آگے چل کر یہ بہت بڑا شاعر ثابت ہوگا اور فراق کی پیش گوئی صد فی صد درست ثابت ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ زندگی نے مصطفیٰ زیدی کے ساتھ وفا نہیں کی لیکن وہ جو کچھ اردو ادب کو دے گئے ہیں وہ بہت ہے۔

پاکستان آنے کے بعد ان کی زندگی نے بہت الٹ پھیر دیکھے۔ اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھاتے رہے۔ مزاج میں ہر انقلابی شاعر کی طرح ان میں بھی ایک باغیانہ روش تھی۔ حالات کے جبر سے تنگ آچکے تھے۔ بار بار کے مارشل لا نے ان کی شاعری میں تلخی بھر دی تھی۔

پشاور کالج سے ان ہی باتوں کی وجہ سے نکالے گئے۔ ایس ایس پی کا امتحان دیا۔ کامیاب ہوئے۔ بڑے بڑے عہدوں پر کام کرتے رہے لیکن جو ان کا مزاج بن گیا تھا وہ حاصل نہیں ہو سکا۔ ایک بار کہتے ہیں۔

جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو مل گئی دل شاہانہ چھٹ گیا

وہ جب کراچی میں اسسٹنٹ کلکٹر تھے اس وقت وہ یحییٰ خان کے عتاب کا شکار ہو گئے۔ یحییٰ خان نے جو تین سو تین افسران کی ہٹ لسٹ تیار کر رکھی تھی۔ ان میں مصطفیٰ زیدی بھی تھے لیکن کسی آمر کی گولیوں کا نشانہ بننے سے پہلے موت نے ان کو اپنے حصار میں لے لیا اور اس موت کا سبب بنی ایک خاتون شہناز گل سہگل۔ ان کی لاش 12 اکتوبر 1970ء کو کراچی میں ان کے ایک دوست کے بنگلے سے ملی تھی۔

بعد میں ایک تحقیقاتی کمیشن بھی بیٹھا تھا اور مقدمہ عدالت میں بھی گیا۔ اس زمانے کا یہ ایک ہائی پروفائل کیس تھا۔ اس کے مہینوں چرچے ہوتے رہے لیکن ان کی موت کے صحیح سبب کا پتا نہیں چل سکا۔

عدالت نے طویل ردوکد کے بعد یہ فیصلہ دے دیا کہ یہ قتل نہیں خودکشی تھی اور شہناز سہگل بری ہو گئی۔

مصطفیٰ زیدی نے شہناز سہگل کے لیے کئی نظمیں کہیں۔ کئی اشعار اس کی محبت میں لکھے۔ ایک شعر تو بہت مشہور اور بہت کمال کا ہے۔

فنکار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی
وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی

مصطفیٰ زیدی کو جس درد و کرب سے گزرنا پڑا۔ اس کی بازگشت ان کی شاعری میں سنائی دیتی ہے۔

جدید غزل کی تشکیل میں مصطفیٰ زیدی کا بہت اہم حصہ ہے۔

ان کے شعری مجموعے موج مری صدف صدف، شہر رزد، کوہِ ندا اور قبائے ساز۔ اردو کے شعری ادب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی مکمل داستان سرگزشت نومبر 1991ء میں آچکی ہے۔

غمونہ کلام

کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غمِ مرے رفیقو غم رائیگاں نہیں ہے
کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی ہم زباں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو مہرباں نہیں ہے

اختر شیرانی

ایک رومان پسند شاعر۔ جس نے پہلی بار اردو شاعری میں براہِ راست عورت کو مخاطب کر کے شاعری کی ورنہ عام طور پر اردو شعراء فارسی کی تقلید میں مخاطب مرد ہی کو کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں نوجوانوں کو ازبر تھیں اور وہ اپنی نجی محفلوں میں ان کو سنایا کرتے تھے۔ ان کا اصل نام محمد داور خان تھا۔ راجپوتانے (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر لاہور میں گزری۔ ان کے والد پروفیسر محمود شیرانی اورینٹل کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔

اختر شیرانی کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ منشی فاضل کا امتحان پاس کیا لیکن والد کی کوششوں کے باوجود آگے نہ پڑھ سکے اور اپنا مشغلہ شاعری ہی کو بنا لیا۔

لاہور کی فضا شروع ہی سے علم و ادب کی رہی ہے۔ اس شہر میں کیسے کیسے لوگ آکر آباد بھی ہوئے اور یہاں کی خاک میں مل بھی گئے۔ اختر شیرانی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ لاہور میں انہیں کئی رسالوں کی ادارت کے مواقع ملے۔ جیسے ہمایوں، سہیلی، انقلاب وغیرہ۔

بہت اچھے شاعر تھے لیکن جوانی میں ہی شراب نوشی کی عادت پڑ گئی اور اسی عادت نے ان کی جان لے لی بقول جگر مرادآبادی

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

ان کی پیدائش 1905ء کی ہے اور 1948ء میں فوت ہو گئے۔ یعنی کل 43 برس کی عمر پائی۔ ان کی روداد زندگی سرگزشت کے شمارہ مارچ 2002ء میں آچکی ہے۔

کلام اختر شیرانی

یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی
دل چاک امیدوں کی سفاک نگاہوں کی
ظلموں کی جفاؤں کی، آہوں کی کراہوں کی
ہیں غم سے حزیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر، بیداد نہ کر، اے عشق ہمیں برباد نہ کر
راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں رو رو کر دعائیں کرتے ہیں
آنکھوں میں تصور، دل میں خلش، سر دھنتے ہیں آہیں بھرتے ہیں
اے عشق یہ کیسا روگ لگا، جیتے ہیں نہ ظالم مرتے ہیں
ان خوابوں سے یوں آزاد نہ کر، اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اسرار الحق مجاز

ایک جواں فکر شاعر جس کے جانے سے واقعی اردو ادب میں خلا پیدا ہو گیا تھا۔ مجاز نے بھی بہت کم عمر پائی لیکن مقبولیت میں بہت کم ان کے ہم پلہ ہوں گے۔

19 اکتوبر 1911ء کو یوپی کے شہر رودولی میں پیدا ہوئے۔ (لکھنو) اسی مناسبت سے مجاز لکھنوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی رومانوی اور انقلابی شاعری نے ایک ہلچل مچا دی تھی۔ ابتدائی تعلیم لکھنو اور سینٹ جان کالج آگرہ میں ہوئی۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ مشہور شاعر فانی بدایونی کو اپنا ابتدائی کلام دکھاتے رہے تھے۔

مجاز کا تعلق علمی اور ادبی خاندان سے تھا۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ مضطر خیر آبادی ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کے آباؤ اجداد میں حضرت عثمان ہارونی جیسے ولی اللہ تھے۔ ان کی ایک بہن صفیہ تھیں جو خود بھی بلند ادبی ذوق رکھنے والی خاتون تھیں۔ ان کی شادی مشہور شاعر جان نثار اختر سے ہوئی تھی جن کے صاحبزادے ممبئی کی فلمی دنیا کے جاوید اختر ہیں۔ مجاز نے علی گڑھ سے شاعری کی ابتداء کی اور بہت جلد شہرت، محبت اور مقبولیت حاصل کر لی۔ بڑے بڑے شاعروں سے دوستانہ رہا، جن میں جوش ملیح آبادی اور فراق جیسے شعراء بھی تھے۔

ان کی انہی مقبولیت نے انہیں ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر دیا۔ اس تحریک کے صفِ اوّل کے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ان کے ساتھ فیض احمد فیض، جذبی، علی سردار جعفری جیسے لوگ ہوا کرتے تھے۔

مجاز نے علی گڑھ یونیورسٹی کا ترانہ بھی لکھا تھا جو آج بھی پڑھا جاتا ہے۔

یہ میرا چمن ہے میرا چمن
میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

مجاز کو آل انڈیا ریڈیو کے جریدے ''آواز'' کی ادارت کی آفر ہوئی۔ وہ دہلی چلے گئے جہاں ایک خاتون سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے لیکن وہ کسی اور کی ہو گئی۔ مجاز نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ ان کی بے شمار نظمیں اس خاتون کے حوالے سے ہیں۔

اسی دوران مجاز کو شراب نوشی کی بری عادت پڑ گئی اور اسی عادت نے ان کی جان لے لی۔

مجاز نے اس خاتون کے لیے جو شاعری کی اس کا ایک شعر سن لیں آپ کو بہت کچھ یاد آ جائے گا

چھلکیں تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ

اس غزل کو گایا بھی گیا ہے۔

مجاز ذہنی مریض بن گئے تھے۔ ان کی ذہنی حالت جب مخدوش ہونے لگی تو جوش صاحب کی کوششوں سے انہیں رانچی کے پاگل خانے بھیج دیا گیا۔

مجاز کی موت بھی شدید تنہائی کی موت تھی۔ ایک شراب خانے میں مردہ پائے گئے تھے۔

یہ سانحہ 5 دسمبر 1955ء کو ہوا تھا۔ اس طرح انہیں زندہ رہنے کے لیے صرف 44 سال ملے تھے لیکن ان کم برسوں میں انہوں نے اپنی شاعری کو ایک خوب صورت نغمے کی طرح بنا دیا تھا۔

ان کی قبر لکھنو میں ہے جس پر ان ہی کا ایک شعر لکھا ہے۔

اب اس کے بعد سبو ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ختم شامِ غریبانِ لکھنو

مجاز کو بے شمار اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی پذیرائی ہر محفل میں ہوتی رہی۔

حکومتِ ہندوستان نے ان کی یاد میں 2008ء کو ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا تھا جس پر ان کا شعر لکھا ہے

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

ان کی سوویں سالگرہ پر لندن اور ہندوستان میں

مشاعرے ہوئے ان کی شاعری پر بات کی گئی، نہرو سینٹر کے تعاون سے دہلی میں بھی ایک شاندار تقریب ہوئی۔

1970ء میں ایک فلم ریلیز ہوئی۔ ''ٹھوکر'' جو مجاز کی زندگی پر تھی۔ اس میں ان کی مشہور نظم کو شامل کیا گیا تھا۔ ''اے غمِ دل کیا کروں۔ اے وحشتِ دل کیا کروں''۔

''کہکشاں'' مجاز کی زندگی پر ایک ٹی وی سیریل بنائی گئی جو دوردرشن سے دکھائی جاتی رہی۔ ہدایات کار علی سردار جعفری تھے۔ اس سیریل میں مجاز کی بہت سی غزلیں اور نظمیں شامل کی گئی تھیں جن کو مشہور گلوکار جگجیت سنگھ نے گایا تھا۔ مکمل حالاتِ زندگی سرگزشت کے شمارہ فروری 1992ء میں آ چکا ہے۔

انتخابِ کلام

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری مے خواری اب تک راز ہے

.....☆.....

عیش سے بے نیاز ہیں ہم لوگ
بے خودِ سوز و ساز ہیں ہم لوگ
جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ
کوئی اس راز سے نہیں واقف
کیوں سراپا نیاز ہیں ہم لوگ

.....☆.....

عقل کی سطح سے کچھ اور ابھر جانا تھا
عشق کو منزلِ پستی سے گزر جانا تھا
حسن کو غم بھی حسیں، فکر حسیں، وروحسیں
ان کو ہر رنگ میں ہر طور سنور جانا تھا
مجاز کو سمجھا ہی نہیں گیا۔ نہ جانے کیا کیا کہہ دیا گیا۔ اسی لیے اس نے کہا تھا

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملتے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

یہ تو کچھ شعراء تھے۔ اب کچھ ذکر افسانہ نگاروں کا ہو جائے جن کا تعلق برصغیر سے تھا۔

یہ تو کچھ شعراء تھے۔ اب کچھ ذکر افسانہ نگاروں کا ہو جائے جن کا تعلق برصغیر سے تھا۔

اردو کے دو یوقامت فنکاروں کو بہت جلدی موت آ گئی

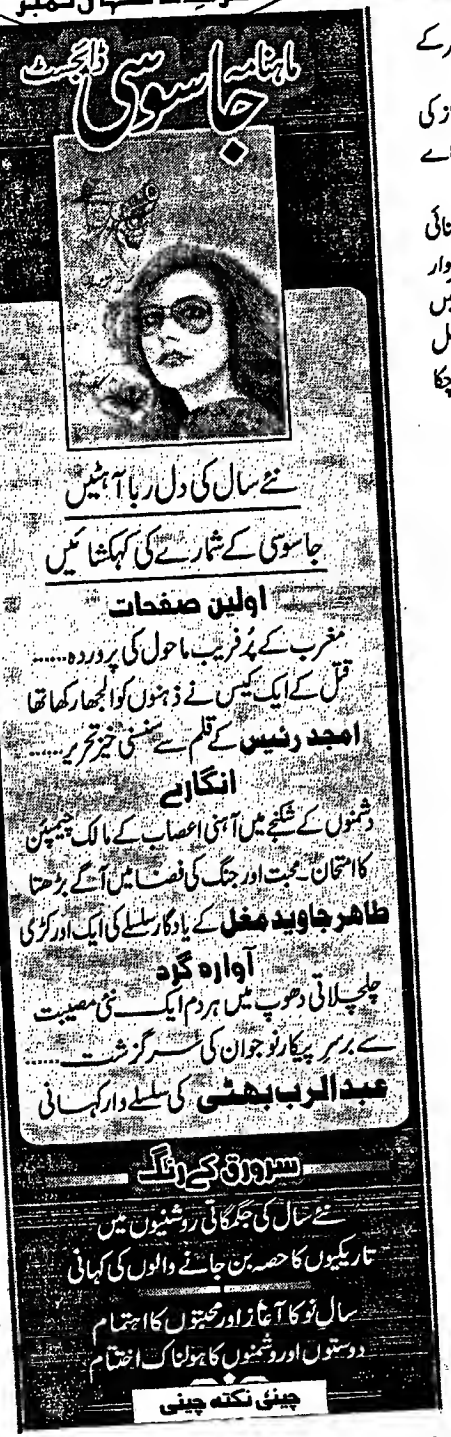

تھی۔ ایک بار پھر وہی نظریہ کہ سب اپنا اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ سب کو جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ اس مضمون کی ابتداء میں عالمی سطح کے کچھ نثر نگاروں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اب ہندوستان اور پاکستان کی طرف آجائیں۔ خاص طور پر اردو زبان کے ادیب۔

سعادت حسن منٹو

متفقہ طور پر اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار۔

11 مئی 1912ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لدھیانہ کی کسی تحصیل میں تعینات تھے۔

دوست منٹو کو ٹامی کہہ کر پکارتے تھے۔ منٹو اپنے گھر میں ایک سہمے ہوئے بچے تھے جو کہ سوتیلے بہن بھائیوں کی موجودگی اور والد کی سختیوں کی وجہ سے اپنا اظہار نہیں کر پاتے تھے۔ صرف والدہ ہی ان کی طرف دار تھیں۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے والے منٹو کو اسکول کی تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

ان کی ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ 1921ء میں انہیں ایم اے او اسکول میں چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ میٹرک کے امتحان میں تین بار فیل ہونے کے بعد انہوں نے 1931ء میں یہ امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ہندو سبھا کالج میں ایف اے میں داخلہ لیا لیکن اسے چھوڑ کر ایم او کالج میں سال دوم میں داخلہ لے لیا۔

تعلیمی کیریئر چاہے جیسا بھی سہی لیکن فن کا کیریئر اتنا شاندار ہے کہ پورے جنوبی ایشیا میں ان جیسا افسانہ نگار نہیں ملتا۔

ان کو انسانی نفسیات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کی سب سے پسندیدہ کتاب خود انسان تھا جس کا وہ مشاہدہ اور مطالعہ کیا کرتے۔ ہر طرح کے انسان، شاعر، ادیب، سبزی فروش، مزدور، طوائف، تانگے والے غرض کہ ہر طبقے کے انسان ان کے مشاہدے اور مطالعے میں رہتے اور انہوں نے ان ہی کرداروں کی بے مثال کہانیاں لکھیں اور باکمال خاکے تحریر کیے جو اردو ادب میں ایک شاندار اضافہ ہیں۔

پاکستان آکر انہیں ادیبوں اور شاعروں کا ایک وسیع حلقہ مل گیا۔ جن کے درمیان انہوں نے لازوال افسانے اور خاکے تحریر کیے۔ ان میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کھول دو، ٹھنڈا گوشت، دھواں، بو وغیرہ ہیں۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ان کے خاکوں کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔

وہ ایک انا پسند شخص تھے۔ دنیا نے تلخیوں کی صورت میں جو بھی دیا تھا وہ اسی طرح لوٹا رہے تھے۔

اپنے کرداروں کے خاکے لکھتے تو قلم ان کے ہاتھ میں نشتر بن جاتا تھا۔ وہ اپنی جوانی ہی میں ان راستوں پر چل پڑے تھے جو اخلاقیات کے زمرے میں شاید نہ آتی ہو لیکن زندگی گزارنے کا ان کا ایک الگ نظریہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں افسانہ نہیں لکھتا۔ بلکہ افسانہ مجھے لکھتا ہے۔

شراب نوشی شروع کی تو اس کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اسی شراب نوشی نے ان کی جان لے لی۔

ان کا انتقال 18 جنوری 1955ء کو ہوا تھا۔ ان کی قبر لاہور میں ہے۔ وہ صرف 43 سال زندہ رہے۔ ان کی مکمل سرگزشت دسمبر 1991ء اور اگست 1992ء میں آچکی ہے۔ دیکھیں اس تلخ لیکن عظیم کہانی نگار نے کیسی کیسی سچائی لکھی ہے۔

☆ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ہی ناقابل برداشت ہے۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا کیونکہ یہ میرا کام نہیں درزیوں کا ہے۔

☆ ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد تھا لیکن انسان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام، مذہبی جنون کا غلام، حیوانیت اور بربریت کا غلام۔

☆ میں ایسی دنیا پر ایسے مہذب ملک پر ایسے مہذب سماج پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دھل کر آئے اور رحمت کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔

☆ ہمارا معاشرہ ایک عورت کو کوٹھا چلانے کی اجازت تو دیتا ہے مگر تانگہ چلانے کی نہیں۔

کہاں تک لکھا جائے منٹو تو منٹو ہی تھے۔

خودکشی

وسیم بن اشرف

بھر جائیں گے جب زخم تو آؤں گا دوبارہ
میں ہار گیا جنگ مگر دل نہیں ہارا
اپنے لیے تجویز کی شمشیر برہنہ
اور اس کے لیے شاخ سے اک پھول اتارا

اس نے اس شعر کی تشریح میں اپنی رودادِ زندگی رقم کردی۔ وہ درد جو دل میں چھپا تھا اسے عیاں کرنے کی بجائے موت کو سینے سے لگانے کے لیے ریل کی پٹڑیوں کا انتخاب کیا۔

اردو شاعری میں اپنی الگ پہچان بنانے والے شاعر کا تذکرہ

اردو ادب کے آسماں پر روشن اس ستارے کی داستان کو الفاظ کا روپ دیتے ہوئے قلم بھی آنسو چھلکانے لگتا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد نے عباسی دور میں عراق سے ایران کی طرف ہجرت کی اور زاہدان میں رکتے ہوئے افغانستان پہنچے، وہاں سے غزنوی دور میں ہندوستان کا رخ کیا اور اتر پردیش کے علاقوں امروہہ، بریلی اور بدایوں کو اپنا ٹھکانا بنایا۔ اس کے آباؤ اجداد زیدی سادات اور ان کا سلسلہ نسب حضرت امام زین العابدین سے جاملتا ہے۔

رفعت حسین نے بدایوں میں اس صاحب عزت خاندان میں جنم لیا جن کے اجداد نے اس شہر اور اس کے نواح

میں کھیت کھلیان سے محبت کی اور زمینداری کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ رفعت حسین سے بڑی چار بہنیں تھیں اور ان کے ایک چھوٹے بھائی تصور حسین تھے۔ دونوں بھائیوں نے بریلی کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کیا اور اسکول بورڈنگ میں رہائش رکھی۔ رفعت حسین اپنے آباؤ اجداد کے پیشے کھیتی باڑی میں زیادہ دلچسپی نہ رکھتے تھے چنانچہ میٹرک کے بعد انہوں نے سول انجینئرنگ کا کورس کیا۔ کورس کے دوران ان کے والد انتقال کر گئے، انہوں نے کورس کی تکمیل کے بعد بدایوں میں ہی ملازمت کرلی۔

1940ء میں رفعت حسین شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ بدایوں کے ایک زمیندار گھرانے کی شوق بانو ان کی دلہن بن کر آئیں۔ شادی کے بعد ملازمت کے سلسلے میں انہیں آگرہ جانا پڑ گیا، انہوں نے وہاں سات سال گزارے، اس عرصے میں رحمت خداوندی سے ان کے ہاں تین بچوں کی پیدائش ہوئی، ایک بچہ بچپن میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا، منیرہ فاطمہ 1943ء میں آگرہ میں پیدا ہوئیں، منیرہ کے بعد 1946ء میں فرحت حسین نے اس دنیا میں آنکھ کھولی، 1947ء میں یہ خاندان ہجرت کے گھاؤ سہتا پاکستان آ گیا اور رہائش کے لیے کراچی کے علاقے ملیر کینٹ کا انتخاب کیا۔ یہاں رفعت حسین نے ملٹری انجینئرنگ سروس میں بطور اوورسیز ملازمت کا انتخاب کیا۔ ملیر کینٹ کی عسکری کالونی میں سکونت اختیار کی، پاکستان آمد اور فوج میں شمولیت کے بعد رفعت حسین اور شوق بانو کے ہاں اس فرزند ارجمند نے جنم لیا جس کی شاعری اور فکر نے اردو شاعری کو ایک نئے طرز احساس سے روشناس کرایا۔ اردو شاعری کے خوابوں کو ارجمند کرنے والے یہ فرزند 9 نومبر 1949ء کو کمبائنڈ ملٹری اسپتال (سی ایم ایچ) ملیر کینٹ میں پیدا ہوئے، ان کے بعد اللہ نے پھر رحمت کی اور رفعت حسین کے ہاں ایک اور ستارہ چمکا، یہ شوکت عابد تھے جنہوں نے 1953ء میں اس جہان فانی میں آنکھ کھولی، رحمت خداوندی برستی رہی اور 1956ء میں سعیدہ عباسی اور 1959ء میں عشرت بانو اس دنیا میں آئیں۔

عسکری کالونیوں اور عسکری ماحول کی خاموشی، اداسی اور نظم وضبط کی فضاء میں اس کا بچپن گزرنے لگا، ایک خاص طرز معاشرت کی عکاس عسکری کالونیوں میں عام گلی محلوں کے برعکس ایک اور ہی دنیا آباد ہوتی ہے۔ جہاں ملک کے دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے خاندان مختلف زبانیں بولنے والے لوگ رہتے ہیں، آتے جاتے بھی رہتے ہیں، ان کالونیوں کے بچوں میں ہجرت کے دکھ کے ساتھ ہر برس کسی دوسری جگہ جانے والے دوستوں اور جان سے پیارے انکل اور آنٹیوں کی محبت کا درد بھی دل میں رچ بس جاتا ہے۔ بچپن میں ہی وہ بچھوڑے کے غم سے آشنا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی سی مسجد اور اس کا خوش الحان مؤذن، فوج کے لیے سامان رسد لانے اور لے جانے والی ریل کی بوگیاں، پٹڑی کے ساتھ اگی خودرو پُراسرار جھاڑیاں، جگہ جگہ لان، پارک، فوارے اور باغ ان کالونیوں کو شہر کے دوسرے علاقوں سے کہیں زیادہ پُرکشش، جاذب نظر اور خواب ناک بنا دیتے ہیں۔ یہی ماحول تھا جس نے اس بچے کے تخیل کو جلا بخشی اور آنے والے وقت میں اس کی شاعری بہشت کی شاعری سے تعبیر کی گئی لیکن اس وقت تو میں اس کے بچپن کی باتیں بتا رہا ہوں۔

سرمئی دھند میں نو دس برس کا وہ بچہ اپنے باپ کی بائیں ہاتھ کی انگلی تھامے ایک ایسے آسمان کو دیکھتا ہے جو پو پھٹنے کی ملگجی روشنی میں نہایا ہوا ہے، اسے لگتا ہے جیسے یہ اذان کی آواز اسی آسمان سے نیچے اتر رہی ہے، اور جس خدا کا اسے بتایا گیا ہے وہ آسمان سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، بچہ باپ کے بائیں ہاتھ سے چھٹے 6,7 برس کے اپنے بھائی کی طرف دیکھتا ہے، جو اسی کی طرح محو حیرت ہے اور وہی کچھ محسوس کر رہا ہے جو اس کا بڑا بھائی محسوس کر رہا تھا۔ مسجد میں باپ کے ساتھ سجدے میں جاتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ مسجد کی محراب میں طاق کے اندر جلتا دیا ان پر ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ سجدے میں سر تھے، چھوٹا بڑے کے کان سے منہ لگا کر کہتا ہے ''بھائی! تم نے اللہ میاں کو دیکھا؟'' سجدہ ختم ہوتا ہے تو دونوں پھر طاق میں رکھے ''دیے'' کی طرف دیکھتے ہیں اور رات کو سنی ہوئی قرآن کی آیات پھر یاد آ جاتی ہیں۔ ''اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو، اس میں ایک چراغ ہو، وہ چراغ شیشے کی قندیل میں ہو، وہ شیشے کی قندیل گویا ایک تارہ ہے موتی کی طرح چمکتا ہوا، جلایا جاتا ہے زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے، نہ وہ مشرق کی جانب ہے اور نہ مغرب کی جانب۔ قریب ہے کہ وہ جل اٹھے اگرچہ نہ چھوئے اسے آگ۔ نور پہ نور۔ اللہ اپنے نور کی طرف جسے چاہتا ہے راہ دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا ہے''۔ (القرآن: سورۃ نور: آیات: 42:53)۔

کوئلوں کی انگیٹھی کے ساتھ بیٹھے، انبیاء کے واقعات، قرآن کی آیات کے تراجم، پریوں، شہزادے، شہزادیوں کی کہانیاں ان کی حیرت میں اضافہ کرتی رہیں، وہ دن میں والد صاحب کے اوزاروں والے صندوق سے اڑن کھٹولے بنانے کی ترکیبیں سوچتے، باغ میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، کبھی درختوں میں کبھی فوارے کے پیچھے چھپ جاتے، گھر کے قریب ٹرین کی پٹڑیوں پر بغیر گرے چلنے کا مقابلہ کرتے، گھر جا کر بہنوں اور بڑے بھائی سے کبھی ٹرین میں بیٹھے دور دیس کے مسافروں کے بارے میں پوچھتے، فجر کی نماز کے لیے گھر سے مسجد تک جھٹپٹے میں چلنے کا خوابوں جیسا سفر، شام سے پہلے پھولوں اور پرندوں، بچوں بھرا باغ انہیں اپنی سلطنت لگتا تھا۔ مغرب سے پہلے پہلے اسٹیشن پر اسٹینڈ سے لٹکتی ریت سے بھری بالٹیوں کو دیکھنا، جنگلے کو تھام کر بڑھتی ہوئی بیلوں میں اُگے ننھے پھولوں کو چھو کر گزرنا، ریل میں بیٹھے دور دیسوں کے مسافروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کرنا، ان کی اس جنت کے معمولات میں سے تھا۔ یہ اس ماحول کا اثر تھا کہ رومانویت اور جمال پسندی ان کے تن، من میں رچ بس گئی۔

اس عمر میں باغ کی دیوار کے ساتھ چلتے، اندر نظر آتے درختوں کے بارے میں سوچنا، انہیں کسی اور ہی دنیا میں لے جاتا اور ٹرین کے راستے میں آنے والے دیار ان کے خوابوں کے نگر تھے، جہاں جہاں سے ٹرین گزرے گی ان کی آنکھیں ساتھ سفر کریں گی اور دور چمکتے تارے انہیں کسی پہاڑی کے دامن میں جلتی ہوئی آگ کی یاد دلاتے رہیں گے۔

باپ کے بائیں ہاتھ کو تھامے مسجد جانے والے اس بچے کو ملیر کینٹ کے اس ماحول نے شاعر اور رومان پرور شخص بنا دیا تھا۔ ابھی وہ کم عمر تھا، صحیح طریقے سے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ بہت احسن انداز میں اس کی رسمی اور غیر رسمی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا، گھر کا ماحول مذہبی تھا، قرآن پاک کی تعلیم، احادیث، بزرگان دین کے فرمودات، اقوال، احوال اور اشعار ہوش سنبھالنے سے قبل ہی اس کی یادداشت اور شعور کا حصہ بن چکے تھے، اس کی تخلیقی صلاحیتوں میں اس کے گھر کی تعلیم کا اہم کردار تھا، اس وقت اسکول میں داخلے کے لیے کم از کم عمر 6 برس مقرر تھی، والدین نے اسے 5 برس کی عمر میں ایک سال زیادہ یعنی 6 برس کا ظاہر کر کے داخل کرا دیا، اس بچے نے چوتھی یا شاید پھر پانچویں جماعت سے ہی نظمیں کہنا شروع کر دیں۔ اس عمر میں شاعری کے جوہر کو جاننے اور راستہ دینے میں ان کے گھر کے ماحول کا ادبی ہونا بھی شامل ہے۔

سوانحی خاکہ

نام:	سید ثروت حسین
قلمی نام:	ثروت حسین
پیدائش:	9 نومبر 1949ء
مقام:	ملیر کینٹ، کراچی
پیشہ:	لیکچرر
مشاغل:	شاعری۔ نظم، غزل
زبان:	اردو
وفات:	9 ستمبر 1996ء، کراچی

تصانیف: آدھے سیارے پر (1989 خاک دان (1998) ایک کٹورا پانی کا (2012)، کلیات ثروت حسین (2016) (بہت سا اہم کام اور کلام کتابی صورت میں نہیں آ سکا)

ان کے بھائی فرحت حسین بھی شاعری کیا کرتے تھے وہ اس سے 3 برس بڑے تھے۔ جب وہ اطمینان سے بیٹھ کر نظمیں اور شعر لکھا کرتا تب اس کے بھجولی کھیل کود میں مصروف ہوتے۔

اسکول کے زمانے سے ہی لکھنے اور چھپنے کی آتش شوق ایسی بھڑکی کہ خود ہی کتابت کر کے ایک رسالہ نکال لیا۔ دوستوں سے مل کر چھوٹی چھوٹی نظمیں اور کہانیاں لکھتے اور رسالے کی شکل میں انہیں محفوظ کرنے کی آرزو پوری کرتے۔ لکھائی ایسی جیسے موتی پروئے ہوئے ہوں۔ اپنی خوش نویسی کو کام میں لاتے اور اپنی شاعری، حکایات، کہانیوں کو خوش خط لکھ کر کہیں نہ کہیں چھپنے کا شوق پورا کر لیتے۔ مصوری کا شوق بھی ان کے مزاج میں شامل تھا۔ مختلف اسکیچ بنایا کرتے تھے۔

انہوں نے گورنمنٹ بوائز پرائمری اسکول ملیر کینٹ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چھٹی سے لے کر دسویں تک تعلیم گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول ملیر کینٹ سے مکمل کی، 1966ء میں انہوں نے میٹرک کیا۔ مزید تعلیم کے لیے علامہ اقبال کالج ایئرپورٹ کراچی میں داخل کرا دیا گیا۔ کالج کے پہلے ہی سال انہوں نے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا، 1967ء میں جداگانہ اسلوب لیے، ادبی دنیا میں خود کو متعارف کرایا ابھی وہ ایف اے کر رہے تھے کہ ان کی منگنی ہو گئی۔

اس نے کالج کے مقابلوں میں حصہ لیا تو سبھی کو حیران کر دیا، انہوں نے جہاں کالج کا نام روشن کیا وہاں اپنا مقام بھی بناتے چلے گئے۔ اپنے کنارے پر کھڑے ہو کر اپنے زاویے سے سمندر میں دور تک دیکھنے والے ثروت حسین نے کالج کے

ثروت حسین کا جہانِ نظم

اردو نظم میں ثروت حسین نے ایک الگ جزیرہ دریافت کیا۔ اس نے اپنی کول سجل نظموں سے اس جزیرے کو اتنا سجا سنوار دیا کہ نظم کے سمندر میں تیرتی ہوئی بادبانی کشتیوں کو دور سے اس کی کشش کھینچ لیتی ہے۔ اسرار اور حیرت میں ڈوبا ہوا یہ جزیرہ بہت لبھاتا ہے۔ تحیر کے سفر میں نظم کی ملائم گرفت دامن کھینچتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ہلکے دھندلکے میں بہت دلکش مناظر دکھائی دیتے ہیں، قاری کھو سا جاتا ہے۔

ثروت حسین کی نظم احساس کی سطح پر چلتی ہے وہ اتنی سبک رو نظم کہتا ہے کہ قاری معانی کے سنگ بہتا چلا جاتا ہے۔ اس کی نظم میں منظر در منظر ایک تحرک ہے جیسے ایک منظر کی انگلی تھامے دوسرا اور پھر تیسرا۔ مناظر کی اس زنجیر میں معنی کی سیال رو چلتی ہے جو بصری تمثال سازی میں اپنا ظہور کرتی ہے۔ مناظر سے معانی خود بخود یوں ٹپک پڑتے ہیں جیسے بے ساختگی سے پھول کھل جائے۔ Medlay ریس میں ٹیم کا ایک کھلاڑی Baton دوسرے کو پکڑا دیتا ہے جو اسے لے کر بھاگ پڑتا ہے اور اگلے چکر میں تیسرا کھلاڑی Baton پکڑے بھاگ رہا ہوتا ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس! اسی طرح ثروت کی نظم میں احساس کی رو ایک امیج سے دوسرے امیج کو منتقل ہوتی ہے جیسے تتلی ایک پھول سے اڑ کر دوسرے پر بیٹھ جائے۔ ثروت حسین امیج اتنا مکمل بناتا ہے کہ احساس، خیال اور جذبے کی واضح ترسیل ہو جاتی ہے۔ ثروت کی نظم امیجری کی نادر مثال ہے۔

روئے زمین پر دریا سے زیادہ محبت کرنے والا کوئی نہیں
دریا اپنے سمندر کی طرف بہتا رہتا ہے
یہ سپردگی ہے
سپردگی بچپن ہے اور بچپن بہشت (ایک پل بنایا جا رہا ہے، آدھے سیارے پر)

دریا کے سمندر کی طرف بہاؤ کے بعد صرف بچپن کا ایک لفظ استعمال کر کے ثروت نے بچے کا ماں کی طرف بہاؤ واضح کر دیا ہے۔ بچے کی کامل سپردگی اور معصومیت میں فی الحقیقت بہتے ہوئے جانا اور ماں کی آغوش میں جاگرنا ایسے مظاہر ہیں جن کو دریا اور سمندر کے تلازمے میں واضح کیا گیا ہے۔

متحرک امیجری کی ایک اور مثال نظم "اتنے بہت سے رنگ" ہے جس میں منظر کے بعد منظر بدلتے جاتے ہیں اور نظم کی چھوٹی سی کائنات رنگوں سے بھر جاتی ہے۔

ثروت کی نظم معانی کے گنجلک نظام پر یقین رکھتی ہے یعنی Linear رہتے ہوئے معنی کے دائرے کو زیادہ پھیلائے بغیر معنی کی گہرائی پر اپنا فوکس رکھتی ہے۔ شجرِ معنی کی جڑیں بہت گہری جاتی ہیں لیکن اوپر کھلا ہوا پھول سب سے پہلے توجہ کھینچتا ہے۔ اس کی نظم شعور کی رو میں بہتے ہوئے خون میں گھل جاتی ہے۔ اس کی نظم کو دیکھا جا سکتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمیں چھو لیتی ہے۔ ساتھی بن جاتی ہے۔ زمان و مکان میں اس دھیرج سے چلتی ہے کہ ہم ساتھ ساتھ وقت اور جگہ میں سفر کرتے ہیں اور تھکتے بھی نہیں۔ اس نے جدید نظم میں لطفِ سخن کا ایسا اہتمام کیا ہے کہ جس میں عجب اسرار ہے، عجب انبساط ہے اور عجب احساس!

ثروت حسین اپنی نظم میں زیادہ تر اضافت سے گریز کرتا ہے۔ پابند اور آزاد نظم میں بھی لیکن نثری نظم میں تو علامتِ اضافت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس سے ثروت نے اپنی نظم میں سادگی سے پرکاری پیدا کی ہے۔ پھر اس کی سادہ، سبک اور دلنشین زبان..... حسنِ اظہار سے لبالب بھری ہوئی ہے۔

ثروت حسین کی شاعری کے بارے میں ناقدین کہتے ہیں کہ جا بجا اُس کا تاریخی، ثقافتی، کائناتی اور سماجی شعور متاثر کرتا ہے۔ یہ شعور مکمل طور پر شاعری میں حل ہو کر آتا ہے اور قطعاً سطح پر نہیں تیرتا۔ اُس کے ہاں معنی کی کئی سطحیں چلتی ہیں جو ذرا غور کرنے پر ہی کھلتی ہیں اور ثروت کے فکری قرینے سے آشنا کرتی ہیں۔ اُس نے عام سی لفظیات میں عام مناظر بیان کر کے سطح در سطح معانی تخلیق کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ بوقلمون اور گوناگوں معنی برآمد کرنے کے لیے سادگی بھی بروئے کار لائی جا سکتی ہے۔

ثروت حسین نے اپنے پیش رو نظم گوؤں سے ہٹ کر اپنے لیے ایک خاص اسلوب چنا جو نظم میں رچاؤ، گھلاوٹ اور حُسن کاری کے ساتھ ساتھ رفعتِ فکر کا علم بردار بھی ٹھہرا۔ اُس کی نظم فکر، جذبہ، احساس، امیج اور حسنِ شعری کا حسین و نادر مرقع ہے۔

لیے متعدد ٹرافیاں اور انعامات جیتے، اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا کلام مقامی اور ملکی سطح کے اخبارات اور رسائل کو بھی بھیجنا شروع کر دیا۔ علامہ اقبال کالج کے ان چار برسوں میں اپنی محنت اور کوشش سے وہ کالج کے ہر دلعزیز طالب علم بن چکے تھے۔ سب ان سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ یہ ہر دلعزیزی صرف طلباء تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اساتذہ اور پرنسپل بھی ثروت حسین سے محبت، شفقت اور احترام سے پیش آتے تھے۔

کالج کے پرنسپل نے اردو نظم میں ایک الگ جزیرہ دریافت کرنے والے ثروت حسین کے فن سے متاثر ہو کر فائنل ایئر میں کالج کے فنڈز سے ان کے کلام کو کتابی شکل میں شائع کرانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ ان کے چھوٹے سے خاندان کے لیے جوش اور خوشی کا باعث بنا، مسحور کر دینے والی ہوا کا جھونکا تھا، خوشی اور جوش و جذبے کا عالم دیکھیے کہ اس مجموعے کی کتابت میں تینوں بھائیوں نے حصہ لیا، شوکت عابد جو تب تک خود بھی شعر کہنا شروع کر چکے تھے اور کالج کی طرف سے بین الکلیاتی و دیگر مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے، انہوں نے اور ثروت کے بڑے بھائی فرحت حسین نے اس مجموعے کی کتابت کی۔ مجموعے کا نام "نئے دن کا سورج" تجویز کیا گیا، بین الکلیاتی مقابلوں میں حصہ لینے اور "ماہ نو" جیسے بڑے ادبی جرائد میں اپنے قلم سے خود کو روشناس کرانے والے ثروت حسین کو کراچی کے ادبی حلقوں نے اچھے طریقے سے جاننا شروع کر دیا تھا، چنانچہ ثروت حسین کے اس مجموعے کا یہاں وہاں خوب چرچا رہا لیکن کالج کے انتظامی معاملات نے سب کیے دھرے پر پانی پھیر کر رکھ دیا۔ خوشیوں کا دیا بجھ گیا۔ ان کا مجموعہ کتابی شکل کا روپ نہ دھار سکا، ثروت حسین پر اس واقعہ کا گہرا اثر ہوا، ان کی شاعری اور طبیعت میں محتاط رویئے نے گھر کر لیا۔ فنکاروں پر بعض اوقات ایسا وقت آتا ہے کہ وہ خود کو ناامیدی کی دلدل میں دھنستا محسوس کرتے ہیں۔ ثروت حسین کو اپنے اس مجموعہ سے بڑی توقعات تھیں جب وہ منظرِ عام پر نہ آیا تو وہ ٹوٹ گئے۔

1967ء سے 1970ء تک انہوں نے کالج سے بی

اے کر لیا، اس دور میں لفظوں سے کھیلنے والے ثروت حسین نے کرکٹ بھی خوب کھیلی، وہ فاسٹ باؤلنگ کیا کرتے تھے، کالج کے ہی زمانے میں مسابقت کی فضاء میں جہاں ثروت حسین شاعری کرتے رہے وہاں انہوں نے بہت سے اساتذہ کا کلام نہ صرف پڑھا بلکہ ایک بڑا حصہ ازبر بھی کر لیا۔ بیت بازی کے بہت شوقین تھے۔ کلاسیکی اور جدید شعراء کا کلام سنانے لگتے، بے ساختہ شعر سناتے چلے جاتے۔

یوں تو ہر شخص کو مخلص پایا
ویسے ہر ہاتھ میں پتھر دیکھا
ایک اُڑتے ہوئے پتے کی طرح
خود کو حالات کی زد پر دیکھا

اس دور میں وہ زیادہ تر شعر چھوٹی بحر میں کہتے تھے۔ ذہین و فطین ثروت حسین نے ایم اے اردو کے لیے جامعہ کراچی کو منتخب کیا، وہ 1971ء سے 1973ء تک اردو کے طالب علم رہے، یہ وہ دور تھا جب ان کی شہرت کراچی کے ادبی حلقوں تک جا پہنچی تھی، بین الکلیاتی مقابلوں کے علاوہ انہیں ادبی تقریبات، مشاعروں، ریڈیو پاکستان کے ادبی پروگراموں میں مدعو کیا جانے لگا تھا۔ یونیورسٹی میں ان کی صلاحیتوں کو گویا چار چاند لگ گئے۔ اس دور میں انہوں نے اپنی زندگی کی بہترین شاعری کی۔ ان کی کلاس میں گلیمر بہت زیادہ تھا۔ کلاس میں پانچ یا 6 لڑکے تھے جبکہ 50 سے اوپر لڑکیاں تھیں۔ اقبال آفریدی اور ثروت کے بارے میں سبھی یہ رائے رکھتے تھے کہ دونوں میں سے کوئی ایک ٹاپ کرے گا۔

ادبی لحاظ سے ہمیشہ سے زرخیز جامعہ کراچی میں اس وقت ثروت حسین، پروین شاکر، ایوب خاور، صغیر ملال، انور سن رائے، عذرا عباس اور اقبال آفریدی جیسے باکمال لوگ زیرِ تعلیم تھے۔ شعراء اور شاعرات کی اس کہکشاں نے جہاں ان سب میں ایک فکری اور فنی مسابقت کا رجحان پیدا کیا وہیں ان میں سے کچھ میں قربت اور بعض میں رقابت کے ازلی تعلق کو بھی پروان چڑھایا۔ ثروت حسین کے لیے یہ فضاء ادبی لحاظ سے بہت سود مند ثابت ہوئی۔ اس دور میں وہ سلیم احمد اور قمر

جمیل کے ہاں ہونے والی ادبی تقریبات میں آنے جانے لگے تھے۔ ان محافل کے باعث ثروت حسین کا حلقہ احباب بھی وسیع ہوا اور یونیورسٹی کے باہر یہ لوگ احمد جاوید، سارہ شگفتہ، افضال احمد سید، اجمل کمال، آصف فرخی، شوکت عابد، عبیداللہ علیم، جون ایلیا اور سلیم کوثر سے شعری قربت اور ادبی زندگی کا حصہ بنے۔

یونیورسٹی کے ماحول میں مقابلے کی فضاء نے سب کو اپنا فن ''لشکانے'' پر لگا دیا، ہر کوئی خوب سے خوب تر کر کے دکھانے کی فکر میں تھا، کہتے ہیں شاعری حسن کی فراوانی میں ہی نکھرتی ہے۔ ثروت حسین خود کہتے ہیں: ؎

میں اپنی جلاوطنی کے پچیس برس
پنکھڑیوں اور تیتریوں کے ساتھ رہا

ثروت حسین ایم اے اردو کے سال اوّل کے طالب علم تھے جبکہ پروین شاکر ایم اے انگلش فائنل ایئر کی طالبہ تھیں، دونوں ایک دوسرے کو اپنی شاعری دکھاتے تھے اور دونوں ہی اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بڑا مقدس جذبہ رکھتے تھے۔ ان دنوں ثروت حسین کو عالم سرشاری میں دیکھا گیا۔ دونوں کا ابتدائی تعارف ہی ادبی تعلق کی بنیاد پر تھا اور دونوں ادبی رسائل یا ادبی تقریبات کے حوالے سے ایک دوسرے کے نام سے واقف تھے۔ ثروت اس وقت فنون، ماہ نو، سویرا اور دیگر ادبی رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ اسی تعلق نے انہیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔ پروین شاکر کا کلام احمد ندیم قاسمی کو ان کے تعارف کے ساتھ ارسال کرتے تھے جب کہ معروف یا بڑے شاعروں سے تعلقات یا بے تکلفی ثروت کی شخصیت میں شامل نہ تھی۔ ایک خاص وضع داری، رکھ رکھاؤ اور دوسروں کا احترام ان کی پہچان تھی۔ اسی لیے وہ اس دور کے معروف لوگوں کے بجائے اپنے مخصوص دوستوں تک سمٹے ہوئے تھے مگر جب پروین شاکر کی شاعری کو پروموٹ کرنے کی بات آتی تو وہ بہت آگے نظر آتے۔ ہر ایک سے اس کی شاعری پر بحث کرتے۔

ثروت حسین اور پروین شاکر کے ہم عصر دوستوں نے دونوں کے اسی تعلق کو عشق کا نام دے دیا (واللہ عالم بالصواب)۔ بوجوہ دونوں بڑے شاعر اور شاعرہ کا تعلق خزاں کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گیا، لگتا تھا کہ یہ ترک رفاقت کسی باہمی مشاورت اور سمجھوتے کے تحت عمل میں آیا۔

1972ء میں یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد ثروت حسین نے عملی زندگی کے خارزار راستوں پر قدم رکھا، حالات کا ستم دیکھیے کہ اپنی کومل سجل نظموں سے ایک الگ جزیرہ بسانے اور منظر در منظر نظمیں کہنے، قاری کو اپنی شاعری کے سنگ بہاتے چلے جانے والے اس سادہ، سبک اور دلنشیں زبان کے حسن اظہار سے لبالب بھری شاعری کے خالق کو پہلی نوکری محکمہ تعلیم میں کلرک کی ملی۔ حالات و واقعات نے اس قلم کار کو دوسرا گھاؤ تب لگایا جب اسے 1973ء میں (این ڈی وی پی) نیشنل ڈویلپمنٹ وانٹیئر پروگرام کے تحت جامعہ ملیہ کالج ملیر کینٹ میں وظیفہ پر پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

1976ء میں ثروت حسین دولہا بن گئے، حیدر آباد سے تعلق رکھنے والی ساجدہ بیگم ان کی دلہن بن کر آئیں، ساجدہ بیگم کے والد حیدر آباد کی بارسوخ شخصیت تھے۔ ساجدہ بیگم ایک گھریلو اور سادہ مزاج خاتون تھیں۔ تعلیم ایف اے تھی۔ ثروت حسین کی ازدواجی زندگی بہت مطمئن انداز میں آگے بڑھ رہی تھی کہ ٹھیک ایک سال بعد 17 ستمبر 1977ء کو بیٹے کی ولادت ہوئی۔ نام سلمان ثروت رکھا گیا۔ شادی کے بعد ثروت بہتر نوکری کے لیے انٹرویو دیتے رہے۔ نئے گھر کو چلانے کے لیے یہ ملازمت ناکافی تھی۔

1979ء میں ثروت حسین کو دو خوشخبریاں ملیں، بیٹی سدرہ ثروت نے 8 جون 1979ء کو جنم لیا۔ دوسری خوشخبری یہ تھی کہ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے وہ گورنمنٹ شاہ لطیف کالج قبر علی شاہ ضلع لاڑکانہ میں اردو کے لیکچرر لگ گئے، تاہم اس تقرر نے انہیں دوستوں سے دور کر دیا تھا۔ ادبی حلقوں سے تعلق میں فاصلے پیدا ہو گئے، وہ اس کالج سے 1984ء تک وابستہ رہے۔

یکم اکتوبر 1980ء کو ان کے ہاں فیضان ثروت پیدا ہوا، 15 دسمبر 1981ء کو ثروت کے ہاں ان کی سب سے چھوٹی بیٹی شمائلہ ثروت نے جنم لیا، اللہ کی خاص رحمت سے ان کے دو بیٹے سلمان ثروت اور فیضان ثروت اور دو صاحبزادیاں سدرہ ثروت اور شمائلہ ثروت ہیں۔ شمائلہ کو پیار سے پارو کہتے تھے اور اس سے پیار بھی سب سے زیادہ کرتے تھے۔ ان کی کتاب ''ایک کٹورا پانی کا'' کا انتساب اسی صاحبزادی کے نام ہے، ان کی بچوں کے لیے زیر طبع شاعری ''چڑیا گھر'' کا انتساب بھی شمائلہ ثروت کے نام ہی ہے۔

لاڑکانہ میں ثروت حسین کا بنیادی مسئلہ گھر سے دوری تھا، ماں، بھائیوں، ادبی فضاء سے اس دوری نے انہیں ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ ان پریشانیوں سے راہ فرار کے

لیے انہوں نے نشہ کا سہارا لیا اور پھر یہ سہارا ان کی کمزوری بن گیا۔ وہ لاڑکانہ سے اپنا تبادلہ کرانے کی پوزیشن میں تھے لیکن ان کی وضع دار اور خوددار طبیعت نے اپنے لیے کسی کو کہنے یا سفارش سے روکے رکھا، تیز رفتار کراچی کے باسی نے خود کو بدلنے کی وہاں کے ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی بہت کوشش کی لیکن وہ وہاں کے طرز زندگی کے عادی نہ ہو سکے، انہوں نے لاڑکانہ میں دوست بنائے، سندھی کافی کی طرز پر گیت نما نظمیں لکھیں، لیکن مسئلہ تو ان کے داخلی جمال کی آسودگی کا تھا۔ ان کے بعض خطوط اور رویے سے عیاں تھا کہ وہ اس ملازمت کو قید تصور کرتے تھے، زمین جو انہیں محبوبہ لگتی تھی وہ اس کے چپے چپے پر گھومنا چاہتے تھے۔ راستے جہاں ختم ہوتے تھے اس سے آگے کیا ہے؟ یہ جاننے کی لگن ان میں تھی، ستاروں اور سیاروں بھری کہکشاؤں کا بلاوا انہیں حقیقی لگتا تھا۔ گزرے ہوئے لوگوں سے ملنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ ایسے عالم میں حقیقی دنیا کا سامنا کرنا شاید ان کے لیے بہت دشوار ہوتا چلا گیا۔ وہ معاشرے کی دوغلی پالیسیوں اور رویوں سے شاکی رہے لیکن بغاوت کے بجائے اپنے آپ میں سمٹے چلے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں نفسیاتی معالج کے پاس زیر علاج رہنا پڑا۔

1983ء کے اواخر میں یا 1984ء میں ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ بے چینی اور بیقراری کے عالم میں راتوں کو گھر سے نکل جاتے۔ ان کی شریک حیات نے شوکت عابد کو کراچی سے بلایا، وہ آئے اور ثروت کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ساجدہ بیگم کے والد نے ان کا تبادلہ حیدر آباد کے قریب کیڈٹ کالج پنارو مٹیاری میں کرا دیا، حیدر آباد میں ان کا سسرال بھی تھا اور ان کی بڑی بہن منیرہ فاطمہ کی شادی بھی حیدر آباد میں ہوئی تھی۔ حیدر آباد میں ان کا علاج صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار حسن منظر سے کرایا جانے لگا۔ حیدر آباد میں مرزا سلیم بیگ ان کے گھر کے قریب ہی رہتے تھے، ان کے ساتھ شاموں کو نکل جاتے، چائے خانوں میں بیٹھ کر ادبی تشنگی کو پورا کرتے، وہ اکثر سلیم بیگ کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے قریب پل پر بیٹھ جاتے، ایک روز انہیں مخاطب کر کے کہنے لگے ''یہ سارا لوہا تقریباً کتنا ہوگا۔''

اشارہ، ٹرین، پٹڑیاں اور پل کی طرف تھا، مرزا سلیم بیگ نے جواب دیا کہ ٹنوں کے حساب سے ہوگا۔

ثروت کچھ دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے۔ ''ایک روز میں سب کو شکست دے دوں گا۔''

ثروت حسین کی موت پر اسد محمد خان

''میں نے اسے (ثروت حسین کو) ہمیشہ امنگوں سے بھرا زندگی سے پیار کرنے والا شخص پایا۔ بچے جو زندگی کی علامت ہیں ثروت حسین ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ مزا جاوہ مجید امجد کے قبیل کے آدمی تھے۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مست رہتے تھے اور کبھی کسی کے لیے برا نہ سوچتے تھے۔ میں ان سے ذرا بڑا تھا چنانچہ ہمیشہ ایک فاصلہ درمیان میں رکھتے تھے۔ وہ جینوئن شاعر اور اچھے استاد تھے۔ انہیں پاکستان اور اس کی زبانوں سے محبت تھی مثلاً انہوں نے پنجابی میں کاجیاں، سندھی میں وائیاں لکھیں، میرا خیال ہے اگر ان کو صوبہ سرحد میں جانے کا اتفاق ہوتا تو پشتو ضرور سیکھتے۔ وہ شاعری صرف اس لیے کرتے تھے کہ وہ اس کو گانا چاہتے تھے۔ جیسے بلبل کیوں بولتی ہے؟ چڑیاں کیوں چہچہاتی ہیں؟ وہ شاعری اس لیے کرتے تھے کہ وہ شاعر تھے۔ بلاخوف تردید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ جب وہ شاعری سے نثر کی طرف آئے تو اتنی طاقت سے آئے کہ بہت مختصر سرمایہ چھوڑنے کے باوجود یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ان کی نثر میں شاعری کا لطف آتا ہے۔ جیسے ایک بچہ والہانہ پن سے رقص کرتا ہوا میدان سے گزرتا ہے۔ ثروت حسین بھی ایسے ہی گاتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے گزر گئے۔ ان کی دوستی بڑے اچھے اچھے لوگوں سے تھی جن کو وہ اپنی غزلیں اور نظمیں بھیجتے تھے خود کو نمایاں کر کے پیش کرنے کا انہیں کوئی شوق نہ تھا۔ اپنے آپ کو آگے لانے کے لیے وہ تعلقات بنانے کی فکر میں نہیں رہتے تھے۔ کمرشلی یا پیسا کمانے کے لیے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد مصنوعی پیر لگا دیے گئے تو وہ ایک بچے کی طرح مجھے چل کر دکھاتے تھے۔ ثروت حسین ڈرامائی زندگی گزارنا پسند کرتے تھے مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کا خاتمہ ڈرامائی تھا۔''

مٹیاری کالج میں انہوں نے 9 سال پڑھایا لیکن حالت ایسی کہ پل میں تولہ پل میں ماشہ، حیدر آباد میں ان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ اور ان کی خوشی کا سبب بننے والی ان کی کتاب کی اشاعت تھی، یہ کتاب 1987ء کو شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت نے ان میں نئی روح پھونک دی لیکن ادبی حلقوں کے جانبدارانہ رویے، منافقت، گروہ بندیوں اور ستائش

یا ہی جیسے عناصر نے ثروت حسین کو پہلے اپنے دوستوں پھر خود تک محدود کر دیا۔

ثروت حسین سرشاری اور بیزاری کی شدید کیفیات میں رہنے لگے۔ ان کا ذہن بہت تیز رفتاری سے چلنا شروع ہوجاتا تھا، وہ تخلیقی دفور سے اتنا بھر جاتے کہ خود لکھنے کے قابل بھی نہ رہتے۔ وہ بیک وقت شاعری بھی کرنا چاہتے تھے، کہانیاں اور حکایات بھی امڈتی چلی آتی تھیں، مثنوی لکھنے کا خیال بھی ابھرتا تھا اور ناول لکھنے کے لیے بھی ان کے دماغ میں لفظ آنا شروع ہوجاتے تھے۔ اس سرشاری کی کیفیت میں ہر آنے والا خیال شاعری میں ڈھلا ہوا آتا تھا۔ وہ بکھرتے ہی چلے گئے۔

ستمبر 1993ء کے ایک دن انہوں نے کراچی کا قصد کیا اور حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پہنچے، شالیمار ٹرین آرہی تھی، اچانک وہ ریل کی پٹڑی پر جا لیٹے، قبل اس کے کہ لوگ انہیں وہاں سے ہٹاتے اور ٹرین ڈرائیور ایمرجنسی بریک لگا کر ٹرین روکتا، وہ ٹرین کی زد میں آگئے اور ان کے دونوں پاؤں بری طرح کچلے گئے، کراچی کے اے ایو اسپتال کے آئی سی یو میں انہیں رکھا گیا۔ زہر پورے بدن میں سرایت کر جانے کے خدشہ کے پیش نظر معالجین ڈاکٹر محمد علی شاہ اور ڈاکٹر ہارون کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ بچا تھا کہ ان کے پاؤں ٹخنوں سے کاٹ دیئے جائیں۔

اسے باقی کی زندگی اب مصنوعی پاؤں کے ساتھ گزارنا تھی، معاشرے نے کتنی المناک صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ ایک تخلیق کار کو خودکشی کے راستے پر چلنا پڑا۔ ثروت حسین معاشرے کے دفتری نظام اور زندگی کی منافقتوں سے اتنے شاکی تھے کہ انہوں نے ایک نظم لکھی:

وہ مجھے پریشان رکھتے ہیں
روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے
اور بدل دیتے ہیں ایک باپ کو درندے میں
بدل دیتے ہیں ایک شاعر کو آگ میں.....
میں درندے کی موت مرنا چاہتا ہوں
میں آگ کی موت مرنا چاہتا ہوں
میں ایک آدمی کی موت مرنا چاہتا ہوں

ٹرین حادثے کے بعد ثروت حسین کا تبادلہ نیاری سے ملیر کینٹ کرا دیا گیا، خودکشی کی کوشش کو حادثہ ظاہر کیا گیا، ثروت حسین نے پھر سے شاعری کا آغاز کیا لیکن کچھ اس طرح کے شعر کہے:

لوٹ کر کوئی جہاں سے نہیں آتا ثروت
انہی راہوں پر کسی روز نکل دیکھیں گے

ثروت کے جوتے بن کر آگئے اور وہ انہیں پہن کر اسٹک کا سہارا لے کر چلنے لگے، نیاری میں 1984ء سے 1993 تک سروس کر کے انہوں نے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ ملیہ ملیر کینٹ کراچی کو جوائن کیا۔ اب برسوں بعد یہاں کے مناظر بدل چکے تھے۔ یہ وہ ملیر کینٹ نہ رہا تھا جہاں انہوں نے بچپن گزارا تھا۔ وہ پھر سے بیزار اور اداس رہنے لگے، وہ بے نیاز سے رہنے لگے، اپنے جائز مقام کی آس امید انہوں نے چھوڑ دی، زندگی سے بے نیازی کا رویہ انہیں بتدریج موت کے قریب لا رہا تھا، ٹرین کی آمد کا نظارہ کرنا ان کا معمول بنتا چلا گیا، وہ ملیر سٹی اور ملیر ہالٹ کو ملانے والے فلائی اوور کے قریب جا کے ریل کی پٹڑی کے نزدیک بینچ پر بیٹھے رہتے۔

رکشا میں کالج جاتے، ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی ہوتی، معلوم ہوتا تھا کہ ان کے پاؤں نہیں کٹے، وہ مصنوعی پاؤں سے آہستہ آہستہ چل لیتے تھے، عموماً کالج میں ایک آدھ گھنٹا گزار کر واپس آجاتے تھے۔

9 ستمبر 1996ء کی صبح وہ گھر سے کالج کے لیے نکلے، سلمان ثروت جو ان کے ساتھ کالج جاتے تھے اس روز ان کے ساتھ نہ جا سکے اور وہ کالج جانے کے بجائے قمر جمیل کی ادارت میں نکلنے والے ''دریافت'' کے تازہ شمارے پر اپنے گھر کا پتا اور فون نمبر لکھ کر ملیر سٹی کی طرف کوئٹہ النور کا کڑ ہوٹل پر چائے پینے چلے گئے، یہاں وہ اکثر آیا کرتے تھے، ستمبر کے چمکتے ہوئے دن کی پیشانی کا سورج ابھر رہا تھا۔

دن 11 بجکر 55 منٹ پر ثروت حسین کراچی کینٹ سے کوئٹہ جانے والی بولان میل کے سامنے کود گئے، وہ لوہے کے منوں وزنی بے رحم پہیوں کو تو شکست نہ دے سکے اور ان پہیوں نے دونوں پاؤں کے بعد اب ان کے سر کو تن سے بھی جدا کر دیا۔ 47 سال 10 ماہ کی زندگی جی کر جب وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے تو ان کی جیب سے کالج انتظامیہ کی طرف سے جواب طلبی کا نوٹس نکلا۔ اس میں لکھا تھا کہ ''انہوں نے کچھ دن رجسٹر حاضری میں دستخط کیوں نہیں کیے۔''

انہیں آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ماڈل کالونی قبرستان کراچی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ (اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین)

برناڈ شا کا ایک معروف مقولہ ہے۔

''وہ مقام جہاں خواہش قلبی اور فرض منصبی کی حدود مل جائیں اسے خوش بختی کہتے ہیں۔''

کھلاڑی اس حوالے سے انتہائی خوش بخت واقع ہوتے ہیں کہ کھیل کے لحاظ سے جو ان کا فرض منصبی ہوتا ہے اسی سے وہ قلب کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ وہ اسی فرض منصبی کو اچھے انداز میں سرانجام دینے کی بدولت نیک نامی، شہرت اور دولت حاصل کرتے ہیں۔ تاہم کھلاڑیوں کے لیے یہ مقام حاصل کرنا اتنا سہل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے انہیں وقت کی کڑی دھوپ میں اپنا بدن جلانا پڑتا ہے۔ حالات کے ظالم تھپیڑے سہنے پڑتے ہیں۔ قسمت کے وار جھیلنے پڑتے ہیں۔

جو لوگ ان مشکلات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرنے میں کامیاب و کامران ٹھہرتے ہیں۔ خوش بختی کا تاج انہی کے سر سجتا ہے۔

کھیلوں کی دنیا میں چند کھیل ایسے ہوتے ہیں جن کو اپنانے والے ہر پل موت سے آنکھ مچولی کرتے ہیں۔ وہ موت

قاتل باؤنسر

کبیر عباسی

اسے مطلق اندازہ نہ تھا کہ جس کھیل کے لیے اس نے زندگی وقف کی ہے وہی اس کے لیے اتنا خطرناک ثابت ہو گا۔ پوری دنیا میں غم کا اک طوفان اٹھا دے گا۔ وہ شائقین جو اس پر قربان جایا کرتے ہیں، حیران رہ جائیں گے اور کرکٹ کی تاریخ کا ایک خونی باب رقم ہو جائے گا۔

اس میچ کے مرکزی کردار کی موت نے سب کو ہلا دیا

کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے قلب کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ایسے میں بعض اوقات موت انہیں شکست فاش سے دوچار بھی کر دیتی ہے مگر ایسے سرپھرے اپنی دھن سے باز نہیں آتے۔وہ یہ جانتے ہیں کہ موت ہمیشہ زندگی کی ہمرکاب ہوتی ہے۔پھر کیوں وہ موت سے گھبرا کے اپنی خواہشات سے،اپنے جنون سے دستبردار ہو جائیں۔موت تو ایسے کھلاڑیوں کو بھی کھیل کے میدان میں دبوچ لیتی ہے،جنہوں نے کھیل کے میدان میں موت کا تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔موت تو کرکٹ کے میدان میں بھی کھلاڑی کو دبوچ سکتی ہے۔

کرکٹ میں کھلاڑیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ہر طرح کی حفاظتی تدابیر کی جاتی ہیں۔اس وجہ سے کرکٹ میں کھیل کے دوران جان لیوا حادثات کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔آج تک کرکٹ کے میدان میں صرف چار بیٹسمین دورانِ بیٹنگ بال لگنے سے جاں بحق ہوئے۔ان میں سے ایک نام فلپ ہیوز کا بھی ہے۔

فلپ جوئیل ہیوز 30 نومبر 1988ء کو آسٹریلیا کے شہر میکسویل میں پیدا ہوا۔اس کا باپ گریگ کیلوں کے باغات کا مالک تھا۔اس کی ماں ورجینیا کا تعلق اٹلی سے تھا۔ہیوز کو اس کے ماں باپ اور ساتھی پیار سے ہیوزی بھی بلاتے تھے۔

فلپ ہیوز بچپن سے ہی رگبی اور کرکٹ کا شیدائی تھا تاہم کرکٹ کی طرف اس کا جھکاؤ زیادہ تھا۔بچپن میں ہی اس نے بیٹ اور بال کے ساتھ رشتہ جوڑ لیا،تاہم بیٹ کو بائیں ہاتھ سے پکڑنا اس کو زیادہ بھایا۔بیٹ کے ساتھ پسندیدگی کے رشتے کو نبھاتے ہوئے اس نے بالنگ کے بجائے بیٹنگ میں جوہر دکھائے۔

اس نے جونیئر کرکٹ میکسویل میں آر ایس ایل کرکٹ کی جانب سے کھیلی۔جیسے پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں ایسے ہی فلپ ہیوز کے بچپن میں ہی سب کو اس میں کرکٹ کا فیوچر اسٹار نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔اس نے صرف بارہ سال کی عمر میں گریڈ اے کی کرکٹ میں اپنی پہلی سنچری اسکور کی۔

سترہ سال کی عمر میں فلپ ہیوز نے کرکٹ کی خاطر میکسویل سے سڈنی ہجرت کی جہاں اس نے ویسٹرن سبرب ڈسٹرکٹ کرکٹ کلب کی جانب سے سڈنی گریڈ کرکٹ کا آغاز کیا۔ہوم بش بوائز ہائی کی ٹیم کے لیے ہیوز کی آمد مبارک ثابت ہوئی۔ہیوز نے اس ٹیم کی طرف سے کھیلتے ہوئے گریڈ کرکٹ کے ڈیبو میچ میں ہی ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے 141 رنز اسکور کیے۔اس شاندار آغاز کے بعد ہیوز کا بیٹ رکا نہیں بلکہ 2006-7 کے پورے سیزن میں اس کے بلے نے 35.81 کی اوسط سے 752 رنز بنائے۔اس کی شاندار پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے اسے آسٹریلیا کی انڈر نائنٹین کرکٹ ٹیم میں شامل کر لیا گیا جہاں اس نے 2008 کے ورلڈ کپ میں بھی حصہ لیا۔

سڈنی گریڈ کرکٹ میں اس کی پرفارمنس نیو ساؤتھ ویلز کو متاثر کرنے میں بھی کامیاب رہی۔نیو ساؤتھ ویلز نے 2007-8 کے سیزن کے لیے فلپ ہیوز کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔نیو ساؤتھ ویلز سیکنڈ الیون کی جانب سے کھیلتے ہوئے اس نے وکٹوریہ سیکنڈ الیون کے خلاف 51 اور 137 رنز کی اننگز نے اس کے لیے فرسٹ کلاس کیریئر کی راہ ہموار کر دی۔اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کا پہلا میچ اس نے 28 نومبر 2007 میں سڈنی کرکٹ گراؤنڈ میں تسمانیہ کے خلاف کھیلا۔اس وقت اس کی عمر محض اٹھارہ سال اور تین سو پچپن دن تھی۔یوں فلپ ہیوز اس کم عمری میں نیو ساؤتھ ویلز کی طرف سے فرسٹ کلاس ڈیبیو کرنے والے کھلاڑیوں میں مائیکل کلارک کے بعد سب سے کم عمر کھلاڑی کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔یہاں بھی قسمت کے ستارے نے اس کا ساتھ دیا اور اپنے پہلے ہی میچ میں 51 رنز بنا کے اس نے سلیکٹرز کے انتخاب کو درست ثابت کیا۔اس میچ میں اس نے دو وکٹیں بھی پکڑے،جن کی بدولت اس کی ٹیم اپنا میچ جیت گئی۔

نیو ساؤتھ ویلز کی جانب سے اس نے اس سیزن میں کل سات میچ کھیلے اور 62.11 کی متاثر کن اوسط کے ساتھ 559 رنز بنانے میں کامیاب رہا۔جن میں ایک سنچری اور سات ففٹیز بھی شامل تھیں۔اس سیزن میں اس کی سب سے جاندار پرفارمنس وکٹوریا کے خلاف شیفلڈ شیلڈ کے فائنل میں رہی۔اس میچ میں اس نے 175 بالز پہ 116 رنز کی اننگز کھیلتے ہوئے اپنی ٹیم کو میچ جیت کے قریب لا کھڑا کر دیا۔یوں وہ شیفلڈ شیلڈ کے فائنل میں سنچری بنانے والا شیفلڈ شیلڈ کی تاریخ کا کم عمر ترین کھلاڑی ٹھہرا۔اس وقت اس کی عمر محض انیس سال تھی۔

اس کی شاندار کارکردگی پر اسے نیو ساؤتھ ویلز رائزنگ اسٹار ایوارڈ سے نوازا گیا۔یہی نہیں،نیو ساؤتھ ویلز کے سلیکٹرز نے اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کے اگلے سیزن کے لیے اس کے کنٹریکٹ کو اپ گریڈ کرتے ہوئے فل سٹیٹ کنٹریکٹ میں تبدیل کر دیا۔

فلپ نے نیو ساؤتھ ویلز کے سلیکٹرز کے اس اعتماد کو درست ثابت کرتے ہوئے اس سیزن میں بھی اپنی کارکردگی کو برقرار رکھا۔اس کی نظر اس سال بھی ایک ایوارڈ پر تھی اور یہ ایوارڈ شیفلڈ شیلڈ پلیئر آف دی ائیر تھا۔یہ ایوارڈ معمولی نہیں بلکہ آسٹریلین ڈومیسٹک کرکٹ کا اہم ترین ایوارڈ تھا۔منزل مشکل تھی،راستہ کٹھن اور مقابلہ سخت لیکن منزل تو بنی ہی ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے آپ پہ یقین رکھتے ہیں،جو محنت کی اہمیت جانتے ہیں،جنہیں راستے کی مشکلات خوفزدہ کرنے کی بجائے تحریک دیتی ہیں،سخت حریفوں کی موجودگی جن کے لیے اضافی توانائی کا باعث بنتی ہے۔

ہیوز میں یہ ساری خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔وہ ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کرتا رہا اور جب سیزن ختم ہوا تو وہ ایوارڈ کا مضبوط ترین امیدوار بن چکا تھا۔آخر کار وہ اپنی محنت اور لگن کی بدولت شیفلڈ شیلڈ پلیئر آف دی ائیر کا ایوارڈ جیتنے میں کامیاب رہا۔

فرسٹ کلاس کیریئر کے آغاز میں ہی اتنی کامیابیاں حاصل کرنے کے باعث اس کی شہرت آسٹریلیا سے نکلتے ہوئے انگلینڈ تک بھی پہنچ گئی۔انگلینڈ کی ایک لیگ مڈل سیکس نے مرلی کارتک کی عدم دستیابی کے باعث 2009 میں فلپ سے ایک مختصر معاہدہ کر لیا۔وہ اس سیزن کے پہلے چھ ہفتے ہی مڈل سیکس کو دستیاب تھا۔اس مختصر عرصے میں اس نے کنٹری چیمپئن شپ کے تین میچز کھیلے۔یہ تین میچز اس کے کیریئر کے یادگار میچز ٹھہرے۔ان تین میچز میں فلپ نے 143.50 کی بھاری اوسط کے ساتھ 574 رنز اسکور کیے۔جن میں تین سنچریز بھی شامل تھیں۔اس کے رنز اگلتے بلے کو دیکھتے ہوئے مڈل سیکس نے فرینڈز پروویڈینٹ ٹرافی کے گروپ میچز کے آٹھ کے آٹھ میچز میں اسے کھیلنے کا موقع دیا۔علاوہ ازیں پینتھرز ڈیلفینس،ٹی ٹوینٹی کپ کے کچھ میچز میں بھی اس نے اپنی بیٹنگ کے جوہر دکھائے۔

ایک سیزن کے چھ ہفتے کے کنٹریکٹ میں ایک غیر ملکی کھلاڑی کو چار سے چھ کنٹری چیمپئن شپ میچز کے علاوہ فرینڈز پروویڈینٹ ٹرافی کے کچھ میچز میں ہی کھیلنے کا موقع ملتا تھا۔جبکہ وہ کسی بھی ٹی ٹوینٹی میچ میں شرکت نہیں کر سکتا تھا تاہم ورلڈ ٹی ٹوینٹی کے باعث اٹیشن فورڈ سیریز کینسل کر دی گئی تھی۔دوسری طرف فلپ ہیوز کے پاس اپنی اٹالین ماں کی مہربانی سے اٹالین پاسپورٹ بھی موجود تھا۔مڈل سیکس نے اس سے غیر ملکی کھلاڑی کے بجائے کول پیک کھلاڑی (یورپی یونین میں شامل تمام ممالک کے لوگوں کو برطانیہ میں کام کرنے کے لیے خصوصی مراعات حاصل ہیں۔اور بطور کھلاڑی یہ کول پیک کھلاڑی کہلاتے ہیں۔) کی حیثیت سے اس کے ساتھ معاہدہ کیا،یوں اس کا یہ چھ ہفتے کا وقت کھیلتے ہوئے ہی گزرا۔مڈل سیکس کی نمائندگی کرتے ہوئے فلپ ہیوز نے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

''میری تیاری بہت اچھی تھی اور میں اس سیزن سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہوا۔میرے لیے اس سیزن کی سب سے خاص بات جو تھی وہ تین بڑے گراؤنڈز میں کھیلنے کا موقع ملنا تھا۔لارڈ کا گراؤنڈ میرے لیے اسی طرح ہوم گراؤنڈ تھا جیسا کہ مڈل سیکس کے لیے۔اوول میں بھی میں ایسے ہی کھیلا جیسے اینجسٹن میں۔سب سے اہم چیز میرے لیے وہ تجربہ تھا جو مختلف ثقافت،موسم،وکٹس اور باؤلرز کی بدولت مجھے حاصل ہوا۔''

2010-11 کے سیزن کے اختتام پہ یکے بعد دیگرے دو سنچریز نے کرکٹ آسٹریلیا کے سلیکٹرز کے چیرمین اینڈریو ہلڈچ کو فلپ کی تعریف پہ مجبور کر دیا۔اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کے آخری دو میچز میں اس نے 54,115,138 اور 93 رنز بنائے۔اینڈریو ہلڈچ نے اس موقعے پر فلپ کے لیے کہا۔''فلپ کی اس پرفارمنس نے مجھے پرجوش کر دیا ہے۔میرے خیال میں اس نے آخری میچ کو اپنی ٹیم کے لیے بالکل ہی یک طرفہ بنا دیا۔میں نے اس کے ساتھ آخری میچ سے قبل تھوڑا وقت گزارا اور میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنی جگہ بنا لی ہے۔اتنے سخت سیزن میں اس نے جس انداز میں خود کو ابھارا اس پر وہ داد کا مستحق ہے۔''

فرسٹ کلاس میچز میں فلپ ہیوز نے مجموعی طور پر 114 ٹیسٹ میچ کھیلے۔جن میں 46.51 کی متاثر کن اوسط سے اس نے مجموعی طور پر 9023 رنز اسکور کیے۔ان اسکورز میں 26 سنچریز کے ساتھ 46 ففٹیز بھی شامل ہیں۔اس کا ایک اننگ میں زیادہ سے زیادہ اسکور 243 ناٹ آؤٹ رہا۔

فرسٹ کلاس میچز کے ساتھ ساتھ وہ لسٹ اے کی کرکٹ بھی کھیلتا رہا۔اپنے فرسٹ کلاس ڈیبیو سے ایک ہفتہ قبل ہی اس نے لسٹ اے کرکٹ کا ڈیبیو کیا تھا۔جب نیو ساؤتھ ویلز کے اوپننگ بیٹسمین فل جیکس کے اچانک بیمار پڑ جانے کے باعث اسے ٹیم میں جگہ دی گئی تھی۔فرسٹ کلاس کیریئر کی طرح اس نے لسٹ اے کے پہلے میچ کو بھی اپنے لیے یادگار بنا دیا۔میلبورن کرکٹ گراؤنڈ میں وکٹوریہ کے خلاف کھیلتے ہوئے اس نے

لسٹ اے کے ڈیبیو میچ میں 68 رنز کی شاندار اننگز کھیلی جو نیو ساؤتھ ویلز کی طرف سے ٹاپ اسکور تھا۔

لسٹ اے کی کرکٹ میں اس کی دو مزید اننگز یادگار کہلائی جاسکتی ہیں۔ جن میں 2009 میں مڈل سیکس کی طرف سے ورکشائر کے خلاف ون ڈے میچ میں 119 رنز کی اننگ اور 2014 میں ڈارون میں ساؤتھ افریقا اے کے خلاف ون ڈے میچ میں 151 بالز پر 202 رنز کی اننگ شامل ہیں۔

فرسٹ کلاس اور لسٹ اے کرکٹ میں اس نے مختلف ٹیموں کی نمائندگی کی۔ اپنے ملک میں اس نے اپنی کرکٹ کا آغاز نیو ساؤتھ ویلز سے کیا تھا۔ بعد ازاں وہ ساؤتھ آسٹریلیا، ایڈیلیڈ سٹرائیکرز اور سڈنی تھنڈرز کی طرف سے بھی کھیلا۔ ان ٹیموں کی نمائندگی کے دوران اس نے بگ بیش لیگ سمیت بہت سے ٹورنامنٹس میں حصہ لیا۔ انگلینڈ میں مڈل سیکس، ہیمپشائر اور ورکشائر کی ٹیموں کو اس کی بیٹنگ کی ضرورت پڑتی رہی۔ 2013 میں انڈین پریمیر لیگ کے لیے ممبئی انڈین کی ٹیم نے بھی اس سے معاہدہ کیا تاہم آئی پی ایل میں اسے کوئی میچ کھیلنے کا موقع نہ ملا۔

فروری، مارچ 2009 میں آسٹریلیا نے ساؤتھ افریقا کا دورہ کیا۔ ڈومیسٹک میچز میں مسلسل رنز اسکور کرنے کے باعث میتھیو ہیڈن کی جگہ فلپ ہیوز کو آسٹریلیا کی انٹرنیشنل ٹیم کی نمائندگی کا موقع ملا۔ ساؤتھ افریقن پریزیڈنٹ الیون کے خلاف اپنے ٹور میچ میں فلپ نے 53 رنز ناٹ آؤٹ بنا کے ساؤتھ افریقا کے خلاف پہلے ٹیسٹ میچ میں خود کو شرکت کا اہل ثابت کردیا۔ سلیکٹرز نے بھی اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اسے ساؤتھ افریقا کے خلاف کھیلے جانے والے پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں ڈیبیو کا موقع دیا۔ ڈیبیو میچز میں مخالف بالرز کو ناکوں چنے چبوانے کی اس کی عادت پرانی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کیا وہ اپنی اس عادت کو ڈومیسٹک کی طرح انٹرنیشنل میچز میں بھی برقرار رکھ پاتا ہے؟

26 فروری 2009 کا دن فلپ ہیوز کے لیے ناقابل فراموش ثابت ہوا، جب اس کے انٹرنیشنل کیریئر کا آغاز ہوا۔ یہ میچ نیو وانڈررز اسٹیڈیم، جوہانسبرگ میں کھیلا گیا۔ میچ کے پہلے اوور میں ہی اسے ورلڈ کلاس باؤلر ڈیل اسٹین کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈیل اسٹین بڑے بڑے بیٹسمینوں کو اپنی برق رفتار گھومتی بالز سے خوفزدہ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ہیوز نے ڈیل اسٹین کی پہلی تین گیندوں کا اعتماد سے سامنا کیا لیکن چوتھی بال اس کے لیے پویلین کی راہ دکھانے کا پروانہ ثابت ہوئی۔ ڈومیسٹک ڈیبیوز میں فٹفیئر اور سنچریز کرنے والے کو اپنے پہلے انٹرنیشنل میچ کی پہلی اننگ میں صفر کی ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا تھا لیکن میچ ابھی باقی تھا۔ اسے ایک اور اننگ بھی کھیلنی تھی۔ اس نے اگلی اننگ کے لیے اپنے داؤ پیچ تیار کرنا شروع کردیے۔

دوسری اننگ میں بھی وہ بطور اوپنر ہی آیا لیکن یہ پہلی اننگ والے ہیوز سے مختلف ہیوز تھا۔ اب کی بار وہ ساؤتھ افریقین بالرز کے سامنے بے بس ہونے نہیں بلکہ انہیں بے بس کرنے آیا تھا۔ دوسری اننگ میں اس نے ساؤتھ افریقن باؤلرز کی جم کے پٹائی کی۔ گیارہ چوکوں اور ایک فلک بوس چھکے کی مدد سے اس نے دوسری اننگ میں 75 رنز اسکور کر کے ٹاپ اسکورر کا اعزاز حاصل کیا۔ صفر پر آؤٹ ہونے کی ہزیمت کا بدلہ اس باری میں اس نے چکا دیا تھا۔

پہلے میچ کی دوسری اننگ میں شاندار کارکردگی نے اس کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ کردیا۔ دوسرے میچ کا آغاز صحارا اسٹیڈیم، ڈربن میں ہوا۔ فلپ کا اعتماد عروج پر تھا۔ کون جانتا تھا اس بار ''ڈیبیو ٹانٹ'' کیا کرنے جارہا ہے۔ اس سے اچھی بیٹنگ کی امید تو سب کو تھی لیکن یہ تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس میچ میں کرکٹ کی تاریخ بدلنے جارہا ہے۔

اس نے دوسرے ٹیسٹ کی دونوں اننگز میں سنچریز جڑ کے ایک عالم کو انگشت بدنداں کردیا۔ وہ بیس سال کی عمر میں ٹیسٹ سنچری کرنے والا آسٹریلیا کے ڈاگ والٹر کے بعد کم عمر ترین آسٹریلوی کھلاڑی اور دونوں اننگز میں سنچری کرنے والا دنیا کا کم عمر ترین کھلاڑی بن گیا۔ اتنا شاندار آغاز کم ہی کرکٹرز کو ملا۔ اس کارکردگی کی بدولت وہ بریڈمین ینگ کرکٹر آف دی ائیر 2009 کا اعزاز اپنے نام کرنے میں بھی کامیاب رہا۔

فلپ کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے 2009 میں ہونے والی ایشز سیریز کھیلنے والی ٹیم میں بھی اسے شامل کرلیا گیا۔ اسی سال مڈل سیکس کی طرف سے انگلینڈ میں وہ شاندار پرفارمنس دے چکا تھا۔ انگلینڈ کی پچز پر اس کے تازہ تجربے کو دیکھتے ہوئے، اسے شین وانسن جیسے عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی پر فوقیت دی گئی۔

ایشز سیریز آسٹریلوی کرکٹ ٹیم کے لیے سب سے اہم سیریز ہے، یہ سیریز ہر دو سال بعد یا چار سال میں کم از کم ایک بار انگلینڈ اور آسٹریلیا کی ٹیموں کے مابین کھیلی جاتی ہے۔ دونوں ممالک باری باری میزبانی کا بار اٹھاتی ہیں۔ ایشز سیریز کی تاریخ

خاصی دلچسپ ہے۔ اس سیریز کا آغاز 1882 میں ہوا تھا۔ جب آسٹریلیا نے پہلی بار اوول کے میدان میں انگلش ٹیم کو اس کی سرزمین پر ٹیسٹ میچ میں شکست سے دوچار کیا تو لندن کے اخبار ''وی سپورٹنگ ٹائمز'' میں خبر چھپی۔ ''انگلینڈ سے کرکٹ کا جنازہ نکل گیا اور راکھ کو آسٹریلیا لے جایا جائے گا۔'' اس جملے کی حدت کرکٹ کے متوالوں نے خوب محسوس کی۔

اگلے سال جب انگلینڈ نے سڈنی میں ٹیسٹ میچ جیتا تو چند آسٹریلوی عورتوں نے ایک گلدان میں راکھ رکھ کے انگلش کپتان آئیو بلائی کو پیش کی گویا انگلش کپتان نے ''ایشز'' (راکھ) واپس حاصل کرلی۔ اس واقعے کو بھی اخبارات میں خوب اچھالا گیا۔ بعد ازاں پانچ انچ کی ایک ٹرافی بنائی گئی جس میں جلی ہوئی کرکٹ بیلز کی راکھ ڈالی گئی۔ اس ٹرافی کو ایشز کہا جاتا ہے۔ اس ٹرافی کی حقدار وہ ٹیم ہوتی ہے جس نے زیادہ بار یہ سیریز جیت رکھی ہوتی ہے۔

اس وقت سے آج تک کل 69 بار یہ سیریز دونوں ٹیموں کے مابین کھیلی جاچکی ہے۔ میچز کے لحاظ سے تو آسٹریلیا کا پلڑا بھاری ہے تاہم سیریز کے لحاظ سے تاحال دونوں ٹیمیں بتیس بتیس بار یہ سیریز جیت چکی ہیں۔ پانچ بار سیریز ڈرا ہوئی ہے۔

انگلش ٹیم کے لیے بھی یہ سیریز خصوصی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور اس کی تیاری بھی وہ معمول سے ہٹ کے ہی کرتے ہیں۔ ویڈیو اینالسٹ ہر بیٹسمین اور بالر کی خوبیوں اور خامیوں خوب پرکھتے ہیں۔ فلپ کی کمزوریاں بھی انہوں نے ڈھونڈ نکالیں۔ وہ جسم کے اوپر آنے والی شارٹ پچ بالز سے گھبراتا تھا۔ اس کے علاوہ آف سٹمپ پر پڑنے والی بالز سے بھی وہ گریز کی کوشش کرتا تھا جس کے باعث اس کی آف سائڈ پر شارٹ سلیکشن محدود ہوجاتی تھی۔ خاص طور پر کٹ شاٹ اس کے لیے ایک مشکل شاٹ تھا۔ انگلش بالرز نے اس کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ ایشز سیریز کے پہلے دونوں میچز میں انگلش بالرز کے سامنے بے بس نظر آیا۔ نتیجے میں اسے شین وانسن کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔ شین وانسن کو کھلانے کی صورت میں آسٹریلوی ٹیم کو ایک اضافی بالنگ آپشن بھی مل رہی تھی۔ شین وانسن جیسے مایہ ناز کھلاڑی کو ایشز ٹیسٹ کے پہلے دو میچز میں فلپ ہیوز کی وجہ سے باہر بیٹھنا پڑا تھا۔ اس سے فلپ ہیوز کی آسٹریلوی ٹیم کے لیے اہمیت کا اندازہ باآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

ایشز سیریز میں خراب کارکردگی کا خمیازہ اسے اگلے پورے سال بھگتنا پڑا۔ 2010 میں وہ ٹیم کا حصہ تو رہا لیکن اسے کھیلنے کا موقع اسی صورت میں ملا جب اچانک کوئی کھلاڑی زخمی یا ان فٹ ہوا۔ پاکستان کے خلاف باکسنگ ڈے ٹیسٹ میں فلپ کوور کی پوزیشن کے زخمی ہوجانے کی وجہ سے اس کی جگہ کھیلنے کا موقع ملا۔ وہ اس میچ میں خاطر خواہ کارکردگی تو نہ دکھا سکا تاہم قسمت نے ایک بار پھر اس کا ساتھ دیا اور پاکستان کے خلاف نیو ائیر ٹیسٹ میں سائمن کاٹیچ کے ان فٹ ہوجانے کی وجہ سے ایک بار پھر اپنی بیٹنگ کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا۔ اسے نیوزی لینڈ کے خلاف سیریز میں اسکواڈ کا حصہ بھی بنایا گیا جہاں پہلے میچ میں اسے شین وانسن کے متبادل کے طور پر ٹیم میں کھلایا گیا۔ اس میچ کی آخری اننگ میں اس نے 75 بالز پر 86 رنز کی برق رفتار اننگ کھیلی۔

2010-11 میں ہونے والی ایشز سیریز میں اسے ڈراپ کردیا گیا تاہم تیسرے ٹیسٹ سے قبل سائمن کاٹیچ کے ان فٹ ہوجانے کے باعث اسے بلا لیا گیا۔ ایشز سیریز کے آخری تینوں میچ اس نے کھیلے۔ اسی برس اس نے ساؤتھ افریقا، سری لنکا اور نیوزی لینڈ کے خلاف ہونے والی تینوں سیریز میں حصہ لیا مگر وہ ہر میچ میں ہی سلپ یا گلی میں کیچ دے کے جلد ہی پویلین لوٹ جاتا۔ اس برس مجموعی طور پر اس نے چار سیریز کے گیارہ میچز میں صرف دو اننگز میں خاطر خواہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ جن میں سری لنکا کے خلاف کولمبو میں 126 رنز کی اننگ کے علاوہ ساؤتھ افریقا کے خلاف جوہانسبرگ میں 88 رنز کی اننگ شامل ہیں۔ ان دو پرفارمنسز کے علاوہ اس سال اس کا زیادہ سے زیادہ اسکور محض 36 رنز رہا۔ نیوزی لینڈ کے خلاف دو میچز کی چاروں اننگز میں اس نے صرف 41 رنز بنائے۔ چاروں بار وہ کرس مارٹن کی گیند پر سلپ میں کھڑے مارٹن کپتل کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہوا نتیجتاً اسے اس سیریز کے باقی میچز باہر بیٹھ کے دیکھنے پڑے۔

ٹیسٹ میچز میں ناکامی سے وہ دلبرداشتہ نہ ہوا بلکہ اس نے اپنی تکنیک کو بہتر بنانے اور کمزوریوں کو دور کرنے کی سعی شروع کردی۔ اس کے سامنے ٹیسٹ ٹیم میں واپسی کے علاوہ ون ڈے اور ٹی ٹوئنٹی ٹیم میں شمولیت کا ٹارگٹ تھا۔ اس سال اس نے ڈومیسٹک میچز کے علاوہ نیٹ میں پریکٹس کی اور انگلینڈ میں ورکشائیر کی طرف سے کھیلتے ہوئے اپنی تکنیک کو بہتر بنایا۔

رکی پونٹنگ کی ریٹائرمنٹ کے بعد اسے اس محنت کا حاصل سری لنکا کے خلاف کھیلے جانی والی ٹیسٹ سیریز میں شمولیت کی صورت میں ملا۔ اس نے ہوبارٹ میں سری لنکا کے

خلاف پہلے میچ میں تیسرے نمبر پر بیٹنگ کرتے ہوئے 86 رنز کی اننگ کھیلی۔ اس اننگ نے اسے اعتماد بخشا اور وہ اس سیریز میں ووقفیز کی مدد سے 46.60 کی اوسط سے 233 رنز بنانے میں کامیاب رہا۔

2012-13 میں انڈیا کے ٹور میں اسے ٹیم کا حصہ بنایا گیا۔ تاہم انڈیا کے خلاف سلو پیچز پر وہ یکسر ہی ناکام رہا۔ آٹھ اننگز میں وہ محض 147 رنز ہی اسکور کر پایا۔ اس کے باوجود انگلینڈ میں اس کے تجربے کو دیکھتے ہوئے 2013 کی ایشز سیریز میں اسے موقع دیا گیا۔ اس سیریز کے پہلے میچ کی پہلی اننگ میں وہ ایک ورلڈ ریکارڈ کا حصے دار بنا۔ ٹرینٹ برج میں کھیلے جانے والے میچ میں اس نے دسویں وکٹ کی شراکت میں اپنا پہلا میچ کھیلنے والے ایشٹن اگر کے ساتھ مل کے 163 رنز جوڑے۔ لیکن اگلا میچ اس کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ پہلے میچ کی دوسری اننگ اور دوسرے میچ کی دونوں اننگز میں وہ مجموعی طور پر وہ صرف دو رنز ہی بنا پایا۔ اسے ٹیم سے ڈراپ کر دیا گیا۔ ایشز سیریز کا یہ دوسرا ٹیسٹ میچ اس کی زندگی کا آخری انٹرنیشنل میچ ثابت ہوا۔ اسے امید تھی کہ وہ پھر سے ایک بار ٹیسٹ ٹیم میں جگہ بنا لے گا لیکن قدرت نے اس کے لیے کوئی اور ہی فیصلہ کیا ہوا تھا۔

ٹیسٹ کرکٹ میں فلپ نے مجموعی طور پر 26 ٹیسٹ کھیلے۔ ان 26 ٹیسٹ میچز میں 49 باریاں اس نے کیں اور 32.65 کی اوسط سے مجموعی طور پر 1535 رنز اسکور کیے۔ ان اسکورز میں 199 چوکے اور 11 چھکے شامل ہیں۔ اس دوران اس کا سٹرائیک ریٹ 53.55 اور زیادہ سے زیادہ اسکور 160 رہا۔ اس نے ٹیسٹ کرکٹ میں 3 سنچریز اور 7 ففٹیز اسکور کیں۔

☆.....☆

2012 کے اختتام پر آسٹریلیا کے لیجنڈ کھلاڑی مائیکل ہسی ریٹائر ہو گئے۔ انٹرنیشنل میچز میں گو کے فلپ کی کارکردگی میں عدم تسلسل رہا جس کی وجہ سے وہ ٹیم سے ان اینڈ آؤٹ ہوتا رہا تاہم ڈومیسٹک کرکٹ میں اس کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ 2012-13 کے سیزن میں وہ نیو ساؤتھ ویلز کے بجائے ساؤتھ آسٹریلیا کی ٹیم کی طرف سے کھیلا۔ اسے ٹیم کی یہ تبدیلی راس آ گئی اور ڈومیسٹک میں فلپ ہیوز کو سال کے بہترین ڈومیسٹک پلیئر کا ایوارڈ ملا۔ مائیکل ہسی کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے سلیکٹرز کی نظرِ کرم فلپ ہیوز پر پڑی۔ یوں 2013 میں اسے اپنا اون ڈے ڈیبیو کرنے کا موقع ملا۔

فلپ نے گریڈ کرکٹ، لسٹ اے کرکٹ، فرسٹ کلاس کرکٹ اور انٹرنیشنل ٹیسٹ کرکٹ، سبھی کے ڈیبیو میچ کو شاندار کارکردگی سے یادگار بنا دیا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک اور ڈیبیو میچ تھا۔ وہ اس میچ میں بھی کچھ نرالا کرنے جا رہا تھا۔ اس کی فینز کی سپورٹ اس کے ساتھ تھی۔ کسے پتا تھا کہ وہ اپنے ون ڈے ڈیبیو پہ ایک ایسا کارنامہ سرانجام دینے جا رہا ہے جو اس سے قبل کوئی آسٹریلوی کرکٹر سرانجام نہیں دے سکا تھا۔

سری لنکا کے خلاف اپنے پہلے ون ڈے میچ میں وہ ایرون فنچ کے ساتھ بطور اوپنر اترا۔ فنچ نے اس کا ساتھ خوب نبھایا لیکن اس سے پہلے ہی پویلین کی راہ چل دیا۔ فلپ کا ساتھ دینے کے لیے کپتان جارج بیلی میدان میں اترا۔ فلپ نے اس کے ساتھ مل کے 140 رنز کی پارٹنر شپ لگائی۔ اس دوران وہ اپنی سنچری اسکور کر چکا تھا۔ لسنتھ ملنگا کے ہاتھوں آؤٹ ہونے سے قبل وہ 129 بالز پر 112 رنز بنا چکا تھا۔ دن ڈے میں ڈیبیو میچ میں سنچری بنانے والا وہ پہلا آسٹریلوی ٹھہرا۔ اسی سیریز کے پانچویں میچ میں اس نے اپنے دن ڈے کیریئر کی دوسری سنچری اسکور کی۔ اس بار وہ 154 بالز پر 138 رنز بنا کے ناٹ آؤٹ ہی میدان سے گیا تھا۔

بعد ازاں وہ انڈیا، زمبابوے، ساؤتھ افریقا اور پاکستان کے خلاف کھیلے جانے والی دن ڈے سیریز میں ٹیم کا حصہ رہا۔ اپنا آخری ون ڈے میچ اس نے پاکستان کے خلاف یو اے ای میں 12 اکتوبر 2014 میں کھیلا تھا۔ اس میچ میں ہیوز چھٹے نمبر پر بیٹنگ کے لیے آیا اور 25 بالز پر محض 5 رنز بنا کے سہیل تنویر کی گیند پر ایل بی ڈبلیو ہو گیا تھا۔ پاکستان کے خلاف سیریز میں یہ واحد میچ تھا جو ہیوز کھیلا تھا۔

پاکستان ہی کے خلاف پانچ اکتوبر 2014 کو یو اے ای میں اسے اپنا پہلا ٹی ٹوئنٹی میچ کھیلنے کا موقع بھی ملا، جو اس کا پہلے کے ساتھ ساتھ آخری ٹی ٹوئنٹی میچ بھی ثابت ہوا۔ ٹی ٹوئنٹی کے اپنے پہلے میچ کو وہ اپنے لیے یادگار نہیں بنا سکا تھا۔ اس میچ میں وہ محض چھ رنز ہی بنا پایا تھا۔

مجموعی طور پر فلپ ہیوز نے 25 ون ڈے میچز میں حصہ لیا۔ جن میں 35.91 کی اوسط اور 75.09 سٹرائیک ریٹ سے اس نے مجموعی طور پر 826 رنز اسکور کیے۔ ان اسکورز میں دو سنچریز اور چار ففٹیز شامل ہیں۔ 91 چوکے اور 5 چھکے بھی اس کے ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

قومی ٹیم کی سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین جان انوئیرریٹی فلپ ہیوز کو 2015 کے ورلڈ کپ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ وہ

جانتا تھا کہ اپنی چند کمزوریوں اور پرفارمنس میں عدم تسلسل کے باوجود فلپ ہیوز آسٹریلیا کے ان کھلاڑیوں میں سے ہے جنہوں نے مستقبل میں تینوں فارمیٹس میں آسٹریلیا کی نمائندگی کرنی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ مستقبل میں اس کا مقام کہیں اور ہی ہے۔

☆.....☆

25 نومبر 2014 کو شیفلڈ شیلڈ کا میچ شروع ہوا۔ یہ میچ نیو ساؤتھ ویلز اور ساؤتھ آسٹریلیا کی ٹیموں کے مابین سڈنی کرکٹ گراؤنڈ میں کھیلا جا رہا تھا۔ ہیوز 63 رنز پر کھیل رہا تھا۔ نیو ساؤتھ ویلز کا بالر سین ایبٹ بالنگ کرا رہا تھا۔ وہ ہیوز کی کمزوری جانتا تھا کہ ہیوز جسم پر آنے والی شارٹ پچ بالز سے گھبراتا ہے۔ ہیوز نے گو کہ اپنی اس کمزوری کو خاصی حد تک کم کر لیا تھا تاہم بالرز اب بھی اس کی اس کمزوری کو نشانہ بنانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ لیگ سائیڈ پر بہت اچھا کھیلتا تھا۔ ایسی بالز پر وہ عموماً ''ہک'' کرنے کی کوشش کیا کرتا۔ سین ایبٹ نے بالنگ کے نشان سے دوڑنا شروع کیا۔ کسے پتا تھا کہ وہ ایک ایسی بال کرانے جا رہا ہے جو عمر بھر اس کے لیے احساس زیاں کا باعث بننے والی ہے۔ اس نے ہیوز کا باؤنسر مارا۔ ہیوز نے بال کو ہک کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں ناکام رہا۔ بال اس کے بیٹ کے پاس سے گزرتی ہوئی اس کی گردن پر بائیں کان کے نیچے جا لگی۔ اس نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا مگر وہ اس کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا۔ وہ گر گیا۔ گرتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ امپائرز اور فیلڈرز دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ ہیوز کی حالت دیکھتے ہوئے ان کے چہرے ہراساں ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہی اسے سینٹ ونسٹ ہاسپٹل سڈنی لے جایا گیا۔ جہاں کومے کی حالت میں اسے داخل کر لیا گیا۔

میچ فوری طور پر روک دیا گیا۔ اس وقت شیفلڈ شیلڈ کے دو اور میچز میلبورن اور برسبین میں کھیلے جا رہے تھے۔ شام تک ہیوز کی حالت میں کوئی بہتری دیکھنے میں نہ آئی تو شیفلڈ شیلڈ کے یہ دونوں میچز بھی روک لیے گئے۔ کرکٹ آسٹریلیا نے بیان جاری کیا۔ ''پورے ملک میں اس وقت جو کھلاڑیوں کے احساسات ہیں ان کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ یہ دن ایسا نہیں کہ کرکٹ کھیلی جا سکے۔''

26 نومبر کو آسٹریلیا میں کوئی میچ نہیں کھیلا گیا۔ 30 نومبر 2014 کو ہیوز اپنی چھبیسویں سالگرہ منانے جا رہا تھا لیکن اس سے تین دن قبل 27 نومبر 2014 کی صبح پوری دنیا میں کرکٹ کے متوالوں کے لیے خبر غم لے کے اتری۔ ہیوز اپنے زخموں سے جانبر نہ ہو سکا تھا۔ یوں کرکٹ کی دنیا کا ایک درخشندہ ستارہ اپنی تمام آب و تاب سمیت غروب ہو گیا۔

آسٹریلوی ٹیم کے کپتان مائیکل کلارک نے اس کی فیملی کی جانب سے اس کی موت کی خبر میڈیا کے سامنے پڑھی۔

اس وقت پاکستان اور نیوزی لینڈ کے مابین یو اے ای میں ٹیسٹ میچ کھیلا جا رہا تھا۔ جب ہیوز کی موت کی خبر نشر ہوئی تو دوسرے دن کا کھیل شروع ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ ہیوز کی موت کے باعث چند گھنٹوں کے لیے میچ ملتوی کر دیا گیا۔ پی سی بی کے کرتا دھرتاؤں نے میچ بند کرانے پر بھی سوچ بچار کی لیکن چند دن قبل ہی پاکستان میں ایک دہشت گردانہ کارروائی میں بیسیوں لوگ مارے گئے تھے لیکن اس کی وجہ سے پاکستان اور نیوزی لینڈ کے مابین ہونے والے میچ ملتوی نہیں کیا گیا تھا۔ اب اگر میچ بند کرایا جاتا تو پی سی بی تنقید کی زد میں آ جاتا۔ اس تنقید کی وجہ سے میچ کو چند گھنٹوں بعد جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

کرکٹ کے متوالوں نے سوشل سائٹس پر مختلف انداز میں ہیوز کی موت کا غم منایا۔ اس دن سوشل سائٹس پر پوری دنیا میں لوگ اپنے بیٹ کی تصاویر پوسٹ کر کے فلپ ہیوز کو خراج تحسین پیش کرتے رہے۔

سری لنکا اور انگلینڈ کی ٹیموں کے مابین 29 نومبر کو ون ڈے میچ کھیلا جانا تھا۔ ہیوز کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس میچ کو آگے کر دیا گیا۔

ہیوز کی تدفین 3 دسمبر 2014 کو اس کے آبائی علاقے میکسویل میں کی گئی۔ تدفین کے موقعے پر آسٹریلوی وزیراعظم ٹونی ایبٹ سمیت لاتعداد معروف لوگ موجود تھے۔ جن میں مائیکل کلارک، ایرون فنچ، ٹام کوپر، جیمز سودر لینڈ وغیرہ شامل ہیں۔ چند بھارتی کھلاڑی بھی جو آسٹریلوی ٹیم سے سیریز کھیلنے کے لیے آسٹریلیا میں موجود تھے، تدفین میں شریک ہوئے۔ مجموعی طور پر تدفین کے موقعے پر ہزار سے زائد لوگ موجود تھے۔ ملک بھر میں بہت سے شہروں میں ہزاروں لوگوں نے آنجہانی فلپ ہیوز کے لیے دعائیہ تقریبات منعقد کرائیں۔

ہیوز کی موت سے ہیلمٹ کی ساخت پر کڑی تنقید ہوئی۔ نتیجے میں ہیلمٹ کے ڈیزائنز میں تبدیلی کی گئی۔ نئے ہیلمٹ میں مزید ''سیفٹی گارڈز'' فٹ کیے گئے جو بیٹسمین کا بہتر طور پر تحفظ کر سکتے ہیں۔

مئی 2015 میں کرکٹ آسٹریلیا نے ہیوز کی موت کا

جوانی ہمیشہ رہے گی اور میں اسی طرح توانا رہوں گا مگر وقت بہت ظالم ہوتا ہے، ایک دن آپ کا سب کیا ہوا عمل آپ کے سامنے لا پھینکتا ہے لیکن تب تک دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ معافی کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ نا سمجھی میں ہم نے اپنے والدین سے دوبارہ رجوع بھی نہیں کیا تھا۔ ان دنوں کینیڈا جانے کا رواج بھی نہ تھا۔ میرے ایک ٹریول ایجنسی کے دوست نے کینیڈا کے لیے میرا ویزا لگوا دیا۔ اس دوران میرا ایک بیٹا بھی ہو چکا تھا۔ ہم دونوں اپنے والدین سے بغیر ملے کینیڈا آ بسے۔ ان دنوں یہاں کوئی ویسی نہ تھا۔ بہت تھوڑے سے سکھ ٹورنٹو کے مضافات میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ میری ڈگری اکاؤنٹ کی تھی مجھے ایک فرم میں جاب مل گئی۔ یہاں ہمارا ایک اور بیٹا ہوا اور پھر بیٹی پیدا ہوئی۔''

انہوں نے ایک اور سگریٹ سلگائی۔ شہباز کے خراٹے گونجنا شروع ہوئے ہی تھے کہ سرجی کی کہنی کی ضرب سے وہ اٹھ کر آس پاس دیکھنے لگا۔ ان صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اسی دوران پاکستان دو لخت ہو گیا۔ اتنے بڑے سانحے پر بھی ہم نے مڑ کر پیچھے خبر نہ لی کہ ہمارے والدین زندہ ہیں یا انتقال کر گئے۔ جب ہمیں خبر ملی تو ہم نے یہیں پر قرآن کا ختم کرا دیا اور کچھ رو دھو کر دوبارہ سے اپنی زندگی میں مست ہو گئے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ جو وقت گزر رہا ہے وہ اپنے ساتھ بہت کچھ سکھاتا جا رہا ہے۔''

میں نے دخل اندازی کی۔ ''اس دوران آپ لوگوں کا پاکستان کا کوئی چکر لگا؟''

''ہاں! جب بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ہم انہیں اپنا ملک دکھانے لے گئے۔ بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ دو بھائی آبائی گھر میں تایا کے ساتھ رہ رہے تھے۔ میں ٹھہرا تو اپنی خالہ کے ہاں مگر ان سے ملنے گیا۔'' ایک لمحاتی توقف کے بعد وہ بولا۔ ''ملنے نہیں بلکہ گھر سے اپنا حصہ مانگنے گیا۔ انہوں نے رقم جمع کر کے میرا قرض اتار دیا۔ میں والدین کی قبروں پر بھی نہ جا سکا تھا۔ میری بیوی اپنے والدین کے گھر گئی۔ وہ ماں باپ کی قبروں پر گئی تھی۔ اس کے بہن بھائیوں نے ہماری دعوت بھی کی تھی۔ پھر ہم بچوں کو لاہور دکھانے چلے گئے اور چند دن بعد واپس آ گئے۔''

میری نظر میں تو یہ عام سی کہانی تھی۔ نہ جانے وہ مجھے یا سب کو کیا سنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہمارے بچے بڑے ہوتے گئے۔ ویسی لوگ کم تھے، ہمارا میل ملاپ گوروں سے زیادہ تھا۔ انہی کے بچوں کے ساتھ ہمارے بچے کھیلتے تھے اور ہماری دعوتیں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم کیسی تربیت بچوں کی کر رہے ہیں۔ اردو بھی وہ ٹوٹی پھوٹی ہماری وجہ سے بول لیتے تھے۔ لڑکی کالج جانے لگی تو ہماری غیرت مسلمانی نے بھی جوش مارنا شروع کر دیا۔ اسے اسلامی آداب سکھانے کی کوشش کی تو اس نے ٹکا سا جواب دیا کہ ہم اب بالغ ہیں اپنا اچھا برا سمجھتے ہیں۔ لڑکے بھی اپنی زندگی گزار رہے تھے، جاب کے ساتھ انہوں نے پڑھائی جاری رکھی تھی۔ لڑکے اپنی مرضی سے گھر آتے۔ ساری ساری رات باہر گزارتے۔ ہم انہیں روکتے ٹوکتے مگر جب دیکھا کہ وہ سن نہیں رہے تو خاموش ہو گئے۔ اب ہم بوڑھے تھے اور ہماری اولاد جوان تھی۔ جس طرح میں جوان تھا اور والدین بوڑھے ہو چکے تھے۔ پھر وقت رکا اور اس نے پلٹ کر اپنا وار کیا۔ سات آٹھ سالوں میں ہی دونوں لڑکوں نے اپنی مرضی سے گوریوں سے شادیاں کر لیں۔ ایک لڑکا وینکوور جا بسا اور دوسرا مونٹریال۔ لڑکی نے ایک ہندو سے شادی رچالی اور وہ امریکا جا بسی اور ہم دونوں اسی طرح خالی ہاتھ رہ گئے جس طرح ہمارے والدین رہ گئے تھے۔ نہ ہم نے اپنے والدین کی خبر لی تھی اور نہ ہماری اولاد ہماری خبر گیری کرتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہماری شادی کی سالگرہ پر کوئی کارڈ یا تحفہ بھیج دیتے ہیں۔ ہمارے پوتے پوتیاں ہیں جن کو ہماری شاید کوئی خبر بھی نہیں ہے۔ بڑا لڑکا چند سال پہلے آیا تھا۔ وہ ہم سے ملا لیکن ہمارا حال احوال پوچھنے کی بجائے یہ پوچھنے لگا کہ اتنا بڑا اپارٹمنٹ رکھ کر ہم کیا کریں گے۔ ہم خاموش ہو رہے۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میری پینشن ہے اور یہ گھر ہے۔''

میں ان کے کرب کو سمجھ رہا تھا۔ یہ داستان انہوں نے چار گھنٹوں میں ختم کی تھی۔ یہاں میں نے اسے بڑے اختصار سے لکھا ہے۔ ان کا دکھ یہ تھا کہ انہوں نے مڑ کر اپنے والدین کی خبر گیری نہ کی تھی۔ اپنی زندگیوں میں ایسے کھوئے کہ بھول بیٹھے کہ ان کو چاہنے والے والدین کس طرح سے ان کی جدائی میں تڑپتے ہوں گے۔ وہ ہمیں اپنی کہانی شاید اس لیے سنا رہے تھے کہ ان کے دل کا بوجھ کم ہو جائے۔ اب ان کے غم کا کوئی مداوا نہ تھا۔ ان کے دل کا بوجھ صرف اس طرح کم ہو سکتا تھا کہ وہ پاکستان جا کر اپنے بہن بھائیوں کے سامنے اپنے کیے کا اعتراف کریں۔ ماں باپ کی قبروں پر جا کر کچھ آنسو بہا لیں تاکہ ان کا غم غلط ہو سکے کیونکہ اب وہ نہ اس پار رہے تھے اور نہ اس پار۔ کیا بے بسی کا عالم ہوتا ہے

جب انسان اپنے آپ کو رسیوں سے بندھا محسوس کرے۔ گو وہ بندھا نہیں ہوتا۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ جلد یا بدیر اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ میں نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ ایک بار واپس جا کر بہادری سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ وہ پاکستان گئے تھے مگر ان سے پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ جو اس بات کی تصدیق ہو گی کہ وہ اپنے بھائی بہنوں سے ملے تھے یا نہیں۔

رات بہت بیت چکی تھی۔ میرا پارک میں بیٹھنے کا ارادہ تھا جو آج کی رات پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ شہباز کا چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ تھیں۔ مطلب یہ تھا کہ اسے نیند آ رہی ہے۔ مفتی اور سرجی آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو عبرت دلا رہے تھے۔ مطیع اللہ نے کیا سمجھا تھا اور کیا سنا تھا۔ اس کا پتا ہمیں ابھی تک نہ چل سکا۔

ہم باہر نکلے تو موسم خنک ہو رہا تھا۔ درختوں پر وہی سفید پھول لدے تھے۔ زمین پر زرد اور سفید پھول بچھے تھے۔ ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی اور درختوں کی شاخوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ وقت اپنی رفتار سے رواں دواں تھا اور میں قدرت کے قانون کو مان رہا تھا۔ اس کے آگے سر خم ہو رہا تھا۔ کسی کے لیے اللہ کے وجود سے انکار ممکن ہی نہ رہا تھا۔ چالیس سال پہلے کی گم شدہ کہانی کے اوراق پھر سے کھل گئے تھے۔ یہ کیسے کھل گئے تھے انہیں سمجھنے والا بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

ہم سب ان کے گھر سے نکل آئے تھے مگر اس کہانی کے اثر سے نکل نہیں پائے تھے۔ سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے کہ سرجی کو کسی نے چھیڑا۔ ''آپ نے کینیڈا آ کر ماں باپ سے نافرمانی کی ہے۔''

وہ تنک کر بولے۔ ''مجھے تو ماں باپ نے ہی زبردستی کینیڈا بھیجا ہے۔'' پھر انہوں نے پتے کی ایک بات کی کہ محبت کر کے شادی کرو تو وہ بھی جرم اور نہ بھی کرو تو اس سے بڑا جرم۔ ''کہنے لگے محبت کرنی بھی نہیں چاہیے بلکہ دل لگی۔ صرف دل لگی کر کے اپنی عاقبت بچانی چاہیے۔''

☆.....☆

دوسرے دن دوپہر ایک بجے ہیموسال شام کی شفٹ میں پہنچا تو بہت سے ورکرز کے لیے کافی روم میں بیٹھے تھے۔ جین ہر روز صبح سات بجے آتی تھی اور دوپہر تین بجے چلی جاتی تھی۔ وہ شام کی شفٹ سے نفرت کرتی تھی۔ وہ ایسے مصروف نظر آتی کہ جیسے ہیموسال کی کراس لنکنگ ڈپارٹمنٹ اس کے زور پر چلتا ہے مگر کام میں اتنی تیز نہیں تھی جتنی دوسرے کاموں میں تھی۔ عمر پینتیس سے کم ہو گی اور شادی ابھی تک نہ کی تھی اور بقول اس کے ''مجھے شادی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے بوائے فرینڈز میرے لیے بہت ہیں۔''

مفتی یہ فقرہ مجھ سے بار بار سنتا اور کسی بھی حالت میں ہو، وہ اس سے بڑا لطف اٹھاتا تھا۔ جین کے سنہری بال تھے جو کندھے سے ذرا اوپر تھے۔ سنہری آنکھیں اور تانبے جیسا پکا رنگ، جسم چکیلا اور موٹے ہونے سے ایک منزل پیچھے تھی۔ جین کے علاوہ یہودی فزیکا بھی اپنے پکے رنگ کے گندمی چہرے پر نظروں کی سیاہ ہوتی عینک لگائے، اپنے فریم سے اوپر دیکھ رہا تھا۔ فلپائن کا فرڈی اور سیاہ فام اوٹس میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھے پرتگال کی فطیمہ کو نظروں میں ہر جانب سے جانچ رہے تھے۔ کینیڈا کا گورا براؤن سب سے الگ تھلگ بیٹھا بور ہو رہا تھا۔ پاکستانی منظر و اختر اور انڈین سریش ایک میز کے گرد بیٹھے چائے پی رہے تھے اور سریش ہمیشہ کی طرح سکھوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ اختر ہر وقت معزز اور سوبر سا رہتا تھا کہ مذاق بھی ہمارے کان میں آہستگی سے کرتا تھا اور مذاق کر کے خود ہی ہنستا تھا اور اگر ہم نہ ہنستے تو بہت زیادہ برا مناتا تھا۔

میں نے اپنا لنچ باکس دیوار کے ساتھ لگے کاؤنٹر پر رکھا پھر منظر، اختر اور سریش کے ساتھ جا بیٹھا۔ مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر فزیکا بھی وہیں آ گیا۔

میں نے منظر سے پوچھا۔ ''مفتی کہاں ہے؟''

جواب فزیکا نے دیا۔ ''وہ اپنے سیکشن میں ایک پائپ اٹھائے اس لیے پریشان پھر رہا ہے کہ اسے کہاں فٹ کروں۔'' پھر اپنے لنچ باکس سے کھیروں کے اچار کی بوتل نکالی اور بولا۔ ''میں تو ہر روز کی طرح یہی لاتا ہوں۔''

سریش بولا۔ ''ایک تو تم یہودی ہم جیسے پلے ہوتے ہو کہ روح چلی جائے پر گروے نہ جائیں۔''

اسی دوران منظر نے نہایت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اپنے لنچ باکس سے آلو گوشت کا سالن اور دو پراٹھے نکالے۔

اختر بولا۔ ''تم تو پورا ہفتہ آلو گوشت لاتے ہو۔ روزانہ بناتے ہو یا مہینے میں ایک بار؟'' یہ کہہ کر اس نے داد طلب نظروں سے سب کو باری باری دیکھا اور پھر خود کھلکھلا کر ایسے ہنسا کہ اس کی ہنسی مجھ تک بمشکل پہنچی۔

میں نے کہا۔ ”میرے پاس ایک عدد لطیفہ ہے جو منظر پر آپ نہ لیں بلکہ عمومی طور پر موقع کی مناسبت سے کسی پر بھی فٹ کردیں۔“

ماسوائے منظر کے سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”ایک دفتر جو عمارت کی بیسویں منزل پر تھا۔ وہاں ایک اطالوی، ایک امریکی اور ایک سکھ کام کرتے تھے۔ وہ روزانہ لنچ کے ٹائم پر اپنا باکس کھولتے تو امریکی کے پاس ہر روز کی طرح برگر اور کوک کا ٹن ہوتا۔ اطالوی کے پاس پیزا کے دو سلائس اور سکھ کے پاس ہر روز دال روٹی نکلتی۔ ایک روز وہ اپنے اپنے لنچ باکس کھول کر بیٹھے تو سب کا وہی کھانا نکلا جو ہر روز نکلتا تھا۔ سب نے مل کر ایک عہد کیا کہ اگر کل بھی یہی کھانا نکلا تو ہم اپنی بیویوں کی بے توجہی اور سستی پر بیسویں منزل سے بطور احتجاج چھلانگ لگا کر خودکشی کرلیں گے۔ وہ سب بہت افسردہ تھے اور یہی گلہ کرتے تھے کہ ان کی بیویاں اب ان کا خیال نہیں رکھتیں۔ دوسرے دن انہوں نے لنچ ٹائم پر اپنے باکس کھولے تو حسب سابق ان کے وہی کھانے نکلے یعنی برگر، پیزا اور دال روٹی۔ تینوں نے بیسویں منزل کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا ان کی بیویوں کو بلایا گیا۔ امریکن اور اطالوی کی بیوی رو رہی تھی اور ساتھ یہ کہتی تھیں کہ اگر ہمیں یہ بتا دیتے تو ہم ان کے کھانوں کا مینو تبدیل کرو بیتیں مگر سکھ کی بیوی رونے کے علاوہ کچھ شش و پنج میں بیٹھی تھی۔ اس سے پوچھا گیا تو وہ بولی کہ میں حیران اس لیے ہوں کہ لکھویر سنگھ پچھلے دو سال سے اپنا لنچ خود بناتے چلے آرہے ہیں۔“

اس پر سب کے قہقہے بلند ہوئے ماسوائے منظر کے۔ سب لوگ ہماری جانب دیکھنے لگے اور فطیمہ مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے ساتھ میری ایک سرد جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اسے اپنی شکل وصورت کے علاوہ اپنی اٹھتی جوانی پر بڑا ناز تھا۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں آپ خوامخواہ ناپسند کرتے ہیں۔ پہلی ملاقات سے ہی چند لوگ آپ کو نظر آتے ہی آپ کو ٹیشن دلا دیتے ہیں۔ فطیمہ انہی میں سے ایک تھی۔ مجھے کبھی سمجھ میں نہ آسکا کہ میری نفرت کی وجہ کیا ہے۔ شاید اس کا نام مسلمانوں والا تھا اور ادائیں مارلن منرو والی۔ ڈھائی سال ہیمو سال میں کام کرنے کے بعد بھی ہم نے ایک دوسرے سے بات نہ کی تھی۔

میں جین، فلیا نئی چیچو اور اوٹس کر اس لنکنگ کے سیکشن میں تھے۔ میں کام سیکھ رہا تھا اور وہ تینوں دو سال سے یہی کام کر رہے تھے۔ ان تینوں کے علاوہ پورے کیمیائی پروسس کی فزکس لکھنا صرف مجھے آتی تھی اور اس بات کا انہیں پتا نہ تھا۔ میں خود بھی یہ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ ہمارے درمیان کھنچاؤ شروع ہوسکتا تھا۔ اوٹس اور چیچو کا رویہ میرے ساتھ مناسب نہ تھا۔

ہر سیکشن میں باہر واشنگ ایریا کی جانب کھڑکیاں تھیں جن پر بلٹ پروف گلاس لگا ہوا تھا۔ لنچ، چائے یا ڈنر کرنا ہوتا تو فزیکا یا فلفلر یا پھر سریش شیشے کے پار کھڑے ہو کر اشارہ کرتے تو میں اپنا خلا بازوں والا لباس وردی پر سے اتارتا اور پھر ہم لنچ روم میں ایک ایک گھنٹا بیٹھے رہتے۔ آتا جاتا کوئی بھی ہمارے فقروں سے نہ بچتا۔ منظر کے پاس ہر نئے آنے والے یا والی کے بارے میں خبریں ہوتیں۔ آج منظر بتا رہا تھا کہ استقبالیہ پر ایک نئی لڑکی نتاشا کل سے جوائن کررہی ہے۔

فزیکا بولا۔ ”میں نے صبح دیکھی تھی۔ بالکل ٹافی کی طرح لگتی ہے۔“ (دراصل اس نے منظر کو پھبتی کستے سن لیا تھا۔ منظر نے ایک لڑکی کو بتاشا کہا تھا۔ فزیکا نے بتاشا کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا تھا کہ بتاشا اردو میں ٹافی کو کہتے ہیں)

اختر جسے اعلیٰ سے اعلیٰ مذاق پر بھی ہنسی نہیں آتی تھی مگر ایسی باتوں پر اس کی ہنسی کا فوارہ چھوٹ جاتا تھا۔ وہ بتاشا یعنی ٹافی کے اس مذاق پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

ہیمو سال میں کام سے زیادہ گپ شپ رہتی تھی۔ ہم نہیں بلکہ ساٹھ ستر افراد کا عملہ جن میں ڈائریکٹرز تک اس بات کو بخوبی جانتے تھے مگر ہر بندہ ایسے بھاگ دوڑ کر رہا ہوتا کہ اسے ایک سیکنڈ کی فرصت نہ ملتی۔ کوئی ایک پرزے گولائی میں لیے گھومتا رہتا اور بار بار اسے غور سے الٹ پلٹ کر دیکھتا۔ جب شفٹ ختم ہو جاتی تو وہ پرزہ کسی دوسری شفٹ میں آنے والے کو تھما کر خود چلتا بنتا۔ دوسری فیکٹریوں میں کام آپ کو ڈھونڈتا ہے اور یہاں ہم مصروف رکھنے کے لیے کام ڈھونڈتے تھے۔ پورے ہفتے میں ایک پروسس ہوتا جو دو دن میں ختم ہو جاتا۔ باقی کے تین دن ہم گزرے کام پر لاحاصل بحث کرتے اور گھر جا کر ایک دوسرے کو فون کر کے خوب ہنستے تھے۔ ہم مصنوعی خون بنا رہے تھے یا بنانا چاہتے تھے۔ ہم ریسرچ کررہے تھے اور اگر ہمارا پروڈکٹ حکومت کینیڈا سے منظوری حاصل کرلیتا تو ہماری کمپنی اربوں پتی بن

جاتی۔ ہم ارب پتی ہونے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ایک دن براؤن سے پوچھا۔ ”کیا ہمارا پروڈکٹ منظور ہو جائے گا؟“

اس نے پوچھے گئے سوال کا وہی جواب دیا جو اکثر دیتا تھا۔ ”ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔“

اگر اس سے پوچھتے کہ آج بارش ہوگی تو جواب یہی ہوتا کہ ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ میں نے ایک بار براؤن سے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ تمہارے بچے تمہارے ہیں۔“

بڑی سنجیدگی اور متانت سے اس نے جواب دیا۔ ”میرے ہی ہوسکتے ہیں اور نہیں بھی۔“

فزیکا کو بڑا زعم تھا کہ ہم مسلمان لوگ ان کی ہر ذبح کی ہوئی چیز کھا لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم مسلمان تمہاری کوئی بھی چیز ہڑپ کر جائیں گے بس اپنی چیزوں کو اپنا مت کہا کرو کیونکہ وہ چیز ہے ہی ہماری جس پر تمہارا غاصبانہ قبضہ ہے۔

فزیکا میرے اس مذاق پر دل کھول کر ہنسا اور ہنستے ہنستے کئی بار مجھ سے ہاتھ بھی ملایا۔

جین اور میں خلائی لباس پہنے اپنے سیکشن میں کام کررہے تھے۔ اسٹیل کے ڈرموں میں خون بھرا ہوا تھا۔ پائپوں کے ذریعے وہ ایک ڈرم سے دوسرے ڈرم میں جا کر گر رہا تھا۔ درمیان میں اس کی رفتار ایک سطح پر رکھنے کے لیے والو لگے تھے۔ سارا کنٹرول جین کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ جو بھی حکم دیتی میں بجا لاتا۔ میری سمجھ میں یہ سارا پروسیس نہیں آرہا تھا۔ میں صرف پریشر، رفتار اور درجہ حرارت دیکھتا اور نوٹ کررہا تھا۔ اچانک پریشر بڑھا اور میں نے با آواز بلند جین کو مطلع کیا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی اپنی سبز گول آنکھوں کو گھما گھما کر گیٹی اور فرڈی کی واشنگ ایریا میں نوک جھوک دیکھ رہی تھی۔ میری آواز پر وہ چونکی، پلٹی، جھپٹی اور جلدی میں ایک غلط والو کھول دیا۔ شاید دس سیکنڈ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ میں پورا پورا، جین اور کمرے کا فرش، دیواریں خون میں لت پت ہوگئیں۔ غلط والو کھولنے سے خون کا بہاؤ دوسری جانب ہوا اور سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے نکل کر کمرے کو نہلا گیا۔ کھڑکی کے پاس مجمع اکٹھا ہوگیا۔ جین بھاگ بھاگ کر والو بند کرنی اور کوئی کھولتی۔ سارا نظام الٹا ہوگیا۔ آخر موٹر بند کرنی پڑی۔ باہر سے صفائی کا سامان آیا۔ پورے دو گھنٹے ہم نے صفائی کی، کپڑے تبدیل کیے۔ باہر آئے اور پھر ہم دونوں پارکنگ لاٹ میں کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ اندر کم از کم پچاس ہزار ڈالر کا نقصان ہو چکا تھا۔ بعد میں بھی جین یہی حرکتیں کرتی رہی اور ہم شانت ہو کر باہر سگریٹ پیتے رہے۔ ہیمو سال کام کے علاوہ ہر قسم کے دلچسپ واقعات کا مجموعہ تھی۔

رات کی سیاہی امڈ آئی اور ہم ڈنر کرنے لنچ روم میں آئے۔ ایک میز کے گرد دیسی بیٹھے تھے۔ اختر لگاتار اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہنسے جارہا تھا۔ فزیکا نے مجھ سے پوچھا۔ ”اسے کیا ہوا ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”یہ اس لطیفے پر ہنس رہا ہے جو وہ اپنی ہنسی ختم ہونے پر سنانے والا ہے۔“

واقعی ایسا ہی تھا۔ وہ تھما اور اپنا کوئی واقعہ سنایا جسے وہ لطیفہ کہتا تھا، لطیفے کے بعد ہم نے خاموشی سے اپنے لنچ باکس کھولے۔ میں نے ابلے آلو منظر کے حوالے کیے۔ اس کا پراٹھا جھپٹا اور آلو گوشت سے کھانے لگا۔ فزیکا نے شیشے کی بوتل سے سرکے میں ڈوبا آدھا کھیرا نکالا اور جگالی کرنے لگا۔ اختر کی بھنویں چڑھی تھیں، شکنیں ماتھے پر رکھے بہت سخت ناراض نظر آرہا تھا، اس لیے کہ کوئی بھی اس کے لطیفے یعنی ایلیے پر نہ ہنسا تھا۔

فزیکا کی دو آنکھیں تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے قطعاً نہ ملتی تھیں۔ ہمیں غور و غوض کرنا پڑتا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ جب وہ بات کررہا ہوتا، یہ ہمارے لیے معما ہی رہا کہ وہ کس آنکھ سے دوسروں کو دیکھتا ہے، بائیں سے یا دائیں سے۔ وہ بھی سیانا تھا کیونکہ یہودی تھا۔ اس لیے جس سے بات کررہا ہوتا اسی کی جانب انگلی کا اشارہ کیے رکھتا۔ ہم اس کو عقل مندی کی داد دیتے تو بہت خوش ہوتا۔ اسے ہم اس کی انہی متعدد صلاحیتوں کی بنیاد پر جادوگر کہتے تھے۔ ہم میں سے جو بھی ”جادوگر سیاں چھوڑ میری بہنیاں“ گاتا تو فزیکا اٹھ کر کرنا چنے لگتا اور سریش میز پر طبلہ بجا کر سنگت دیتا۔

دیسیوں نے ہیمو سال کو چوں چوں کا مربہ بنا رکھا تھا۔ ایک وقت ہم دیسی بیس کے قریب ہوگئے تھے۔ لنچ روم میں اردو چلتی تھی اور پھر شکایتیں ہونا شروع ہوگئیں کہ ہم انگلش میں بات کیا کریں۔ ہم پھر بھی نہ مانے۔ فزیکا ہمارے ساتھ اتنا زیادہ بیٹھتا تھا کہ اردو اور پنجابی کی بہت سی گالیاں اسے ازبر ہوگئی تھیں۔ وہ ہمیں بتاتا تھا کہ یہ ساری گالیاں وہ اب اپنی بیوی کو سکھلا رہا ہے۔

واپسی پر ایک اور یہودی ایلیا مجھے ڈکسن پر، اپنی

گاڑی میں بٹھا کر آتا تھا۔ وہاں سے دس منٹ میں ہمارا اپارٹمنٹ آجاتا۔ ایلیا ہر وقت ہر ایک سے ناراض رہتا تھا۔ لمبا تڑنگا اور بے حد موٹا ایلیا ناراض ہونے کے باوجود پارکنگ میں اپنی گاڑی میں بیٹھا میرا انتظار کرتا رہتا۔ ڈکسن تک کے سفر میں وہ مجھ سے ایک بات بھی نہیں کرتا۔ ڈکسن پر مجھے اتار کر وہیں سے 401 ہائی وے سے اسکاربورا چلا جاتا۔

میں ہولڈنگ سینٹر اور ہیموسال کو اپنا اپارٹمنٹ سمجھتا تھا کیونکہ سب جگہ ایک جیسا ماحول تھا۔ ویسی ہی باتیں، وہی چٹکلے اور ایک جیسی ناراضگیاں۔

میں واپس اپارٹمنٹ پہنچا تو اسے ویسا ہی پایا جیسا اسے ہونا چاہیے تھا۔ سونے سے پہلے سب اکٹھے لیونگ روم میں بیٹھ جاتے، یا خاموشی ہوتی اور یا پھر گرم گرم بحث چلنے لگتی۔ آج قدرے خاموشی تھی۔ مفتی ہمیشہ کی طرح ٹی وی دیکھنے میں محو تھا۔ سرجی اور شہباز اپنی اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے ہوئے تھے اور مطیع اللہ چھت کو گھورتا ہوا اپنی سوچوں میں گم اپنی ناک مسلسل کھجلائے جارہا تھا۔ میں نے کچن میں جاکر دیگچی سے کھانا نکالا۔ دیکھا تو سرجی نے پھر بینگن میں انڈے ڈالے ہوئے تھے۔ شکر ہے شہباز اور سرجی نے مل ملا کر جو توے کی روٹیاں بنائی تھیں، وہ بھی موجود تھیں۔ سرجی تھوڑا سا اپنی جگہ سے ہلے۔ شہباز نے بھی انگڑائی لینے جیسی کوئی حرکت کی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ کوئی بحث شروع ہونے والی ہے۔ مطیع اللہ نے بھی اپنی سبز آنکھیں چھت سے اتار کر فرش پر رکھیں تو مطلب صاف ظاہر تھا کہ اکھاڑہ تیار ہوگیا ہے۔

میں نے کھانا کھاتے کھاتے سرجی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، خاموش خاموش کیوں ہیں؟“

وہ خفا خفا لگ رہے تھے اور اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”ہم بولیں تو بھی لوگ ناراض اور نہ بولیں تب بھی ناراض۔ ہم نے تو اپنے سینے پر صبر کی سِل رکھی ہوئی ہے۔“

وہ تول ہی رہے تھے کہ شہباز کے منہ سے غوں غوں قسم کی آوازیں برآمد ہونا شروع ہوگئیں۔ ان آوازوں کے دو مطلب میں نے اخذ کیے تھے۔ آیا کہ وہ بھوکا ہے اور یا پھر وہ زیادہ کھا بیٹھا ہے۔ مطیع اللہ بولا۔ ”سرجی کے ساتھ بہت بڑا کارروائی ہوا ہے۔ وہ گلاٹی سے بینگن لینے گئی تو پیچھے پھرج (فریج) میں سے کوئی مردود ان کی ساری جلیبیاں کھا گیا۔“

مردود کہنے پر شہباز کے چہرے کا رنگ زرد سے زیادہ زرد ہوا اور پھر سرخی مائل ہوا مگر وہ ضبط کیے لیٹا رہا۔ سرجی اپنی جگہ سے اٹھے۔ کچن میں گئے۔ فریج کھولا اور پھر خالی ہاتھ اور نم آنکھیں لیے واپس اپنے مقام پر جو کمپیوٹر ٹیبل کے نیچے ڈور وال کے ساتھ تھی، وہیں خاموشی سے افسردہ بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا اور دو تین بار پوچھا تو روہانسی آواز میں بولے۔ ”اچھا خاصا میں بیٹھا تھا۔ نصیب برا ہو تو ہو کر رہتا ہے۔ فریج میں جلیبیوں کا لفافہ میں نے خود دیکھا تھا۔ شہباز آیا اور میں نے کہا کہ گلاٹی سے بینگن لے آئیں۔ واپس آیا کھانا بنا رہا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ فریج کھول کر تو دیکھوں۔ دیکھا تو لفافہ پڑا ہے مگر کسی نے ساری جلیبیاں چٹ کردی ہیں اور آدھی جلیبی چھوڑ کر لمبے لیٹ گئے۔“ اپنی گفتگو کا اختتام جب کیا تو قہر آلود نظریں شہباز پر تھیں۔

بالآخر شہباز بمشکل اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کی ہے تو بولا۔ ”سرجی کے سارے سیاپے کیا صرف میرے لیے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مفتی بھی گھر پر تھا۔ میں تو کمرے میں جاکر لیٹ گیا تھا۔ باہر نکلا تو سرجی نے سیاپا ڈالا ہوا تھا۔ جلیبیاں جلیبیاں کرتے یہاں سے وہاں بھاگے پھرتے تھے۔ مفتی سے نہیں پوچھا اور سیدھا مجھ پر چڑھ دوڑے۔“

اسی دوران مفتی نے ایک بار بھی مڑ کر ہماری جانب نہیں دیکھا تھا۔ میں نے مفتی سے پوچھا۔ ”جلیبیاں شہباز نے کھائی ہیں یا پھر.....“

وہ مڑے بغیر بولا۔ ”یہ سرجی اور شہباز کا معاملہ ہے۔ میں اس میں نہیں پڑنا چاہتا۔“ پھر سرجی سے پوچھا۔ ”آپ کو صرف شہباز پر ہی کیوں شک ہے؟“

تو وہ بولے۔ ”آج اس نے کھانا کم کھایا ہے۔ روزانہ چھ روٹیاں کھاتا تھا اور آج صرف چار روٹی توڑی ہیں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”چار نہیں ساڑھے تین، آدھی روٹی تو بچا ہوا تھا۔“

میں نے کہا کہ اب آپ صبر کریں۔ کل جاکر دو لفافے بھروا کر لے آنا۔ اب کسی کے پیٹ سے تو نہیں نکال سکتے۔

سرجی بولے۔ ”وہی تو کہہ رہا ہوں کہ ہم نے صبر کی سِل سینے پر رکھی ہوئی ہے۔ کمزوروں کا کام صرف صبر ہی تو کرنا ہوتا ہے۔ موٹے کھائیں جلیبیاں اور کمزور کریں

صبر۔“

”صبر صرف لاچاری میں تو نہیں کیا جاتا۔“ میں نے اپنی بات کی۔

مطیع اللہ اپنے فقرے گنگنا کر بولا۔ ”تو صبر صرف وہ کرتی ہیں جو صحت مند بھی ہوں اور دولت مند بھی؟“

میں بولا۔ ”صرف وہ نہیں کرتے اور میں مانتا ہوں کہ کمزوروں کو زیادہ صبر کرنا پڑتا ہے۔“

شہباز سرجی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صبر کی بھاری سِل صرف کمزور و ناوار لوگوں کے سینے پر رکھی ہوتی ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”ہمارا مذہب اسلام یہ نہیں کہتا۔ بلکہ جو کہتا ہے اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔“

سرجی بولے۔ ”مفتی سے پوچھ لیتے ہیں۔“

مطیع اللہ نے عرض کیا۔ ”نام کے مفتیوں نے تو ہمیں ڈبویا ہے۔“

مفتی نے تب بھی مڑ کر نہ دیکھا اور پنے شو میں کھویا رہا۔

سرجی مجھ سے بولے۔ ”ہاں تو ہمارا مذہب صبر کے بارے میں کیا کہتا ہے؟“

”انسان ارادہ کرتا ہے۔ ایمان لاتا ہے اور پھر جب اپنے ایمان اور یقین پر بامردی سے اور ثابت قدمی سے جما رہتا ہے اور کسی مشکلات کی پرواہ نہیں کرتا تو یہ بھی صبر ہے۔“ میں نے ان سے کہا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”تو اس میں کیا ایسی چیز ہے جسے آپ بے بسی اور کمزوری کی حالت میں اختیار کرتے ہیں؟ اور پھر یہ تو عزم و ہمت کا سرچشمہ ہے۔“

مفتی نے ٹی وی کی آواز کم کردی اور مجھ سے پوچھا۔ ”آسان مطلب کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے خیال میں صبر وہ ہے کہ انسان خوف اور لالچ کے مقابلے میں اللہ کے فیصلوں پر راضی اور مطمئن رہے۔ صبر ثابت قدم رہنے کو کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو تنگدستی، بیماری اور جنگ کی تباہ کاریوں میں ثابت قدم رہتے ہیں، یہ بھی صبر ہے۔ بیماری تو پیسے والے کو بھی لگ سکتی ہے۔ بھلائی کی تلقین اور برائی سے روکنے پر جو بھی مصیبت اور مشکل کھڑی ہوتی ہے۔ اس پر ثابت قدم رہنا بھی صبر ہے۔ برداشت، تحمل اور معاف کردینے کے اوصاف بھی صبر کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ غم اور خوشی کے موقع پر ضبط سے کام لینا بھی صبر ہے۔ خوشی میں غرور پیدا نہ ہو اور غمی میں مایوسی یا بددلی پیدا نہ ہونے دے۔ یہ بھی صبر ہے۔ میرے خیال میں بلکہ میرے یقین کے مطابق صبر کسی مجبوری یا بے بسی کا نام نہیں۔ بندہ جب صبر کر کے اپنے رب کے فیصلوں پر بخوشی راضی ہو جاتا ہے تو پریشانی، اضطراب اور بے چینی سے بچا رہتا ہے۔ اس سے انسان اور اللہ کے درمیان جو تعلق پیدا ہوتا ہے اسے توکل کا نام دیا گیا ہے اور یہی صبر ہے۔“ میں نے اپنی بات ختم کی۔ سب خاموش تھے اور میں مطمئن تھا۔

میں اپنے پڑھنے والوں سے ایک بات شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ جب بھی میری زندگی میں کوئی کٹھن مقام آیا۔ کوئی مشکل آئی تو میں نے اللہ کے آگے اپنے آپ کو جھکایا اور کہا کہ یہ اگر تیری مرضی ہے تو میں راضی ہوں اور یہ بھی کہا کہ میں اپنے معاملات تیرے سپرد کرتا ہوں۔ تو میرے لیے کبھی برا نہیں کرے گا۔ اس کے بعد میں ان معاملات کو اس کے حوالے کر کے خود کو علیحدہ اس طرح سے کرلیتا ہوں کہ عمل سے پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ نتائج اس کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرا ہر عمل بھی اسی کی مرضی سے اب ہوگا۔ یہ کرنے سے میں بہت بڑے جھنجٹ سے بچ جاتا ہوں، اگر کام نہیں ہوا تو یہ یقین ہوتا ہے کہ اسی میں بہتری تھی۔ اگر ہوگیا تو اسی نے کیا ہے جو میرا رب ہے اور کرنا بھی اس نے ہے کیونکہ یہ میرے اور آپ کے بس کا روگ تو نہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت سی پریشانیوں سے اسی

4 جون 1984ء کو اردو و پنجابی کی ممتاز شاعرہ سارا شگفتہ نے کراچی میں ریل کے نیچے آکر خودکشی کرلی۔ سارا شگفتہ 31 اکتوبر 1954ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی شاعری کی مرغوب صنعت نثری نظم تھی جو ان کے ایک رنگ اسلوب سے مرصع تھی۔ سارا شگفتہ کی پنجابی شاعری کے مجموعے بلدے اکھر میں نگی چنگی اور لکن میٹی کافی پسند کی گئی۔ اردو شاعری کے مجموعے ”آنکھیں“، ”نیند کا رنگ“ کے نام سے اشاعت پذیر ہو کر مقبول عام ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی شخصیت پر امرتا پریتم نے ”ایک تھی سارا“ انور سن رائے نے ”ڈلتوں کے اسیر“ اور عذرا عباس نے ”درد کا محل وقوع“ کے عنوان سے کتابیں لکھیں۔ پی ٹی وی نے ایک ڈراما سیریل ”آسمان تک“ پیش کیا۔

طریقے سے بچتا چلا آیا ہوں۔ یہ نسخہ بہت کارآمد ہے۔ عمل کر کے دیکھیں تو بہت سی ذہنی کوفتوں سے بچ سکتے ہیں۔

☆.....☆

جمعہ کا دن تھا۔ ہیمو سال میں کام زیادہ نہیں تھا۔ میں صبح گیا اور ایک بجے دوپہر واپس اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔ مفتی موجود تھا اور اس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ سب اپنی اپنی نوکریوں پر گئے تھے۔ ریکس ڈیل روڈ پر مسجد میں ہم نے جمعہ نماز ادا کی۔ واپس باہر نکلے تو مفتی بولا۔ ”سرجی کے لیے جلیبیاں لیے چلتے ہیں۔ تمہارے اس رات صبر کے خطبے کے بعد اس نے دلی صبر تو کرلیا تھا مگر دوسرے دن صبح پھر فریج کھولے خالی لفافے کو سونگھ رہا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے جلیبیاں بھی لے لیتے ہیں پر تم نے ان کی جلیبیاں کھا کر چپ کیوں سادھ لی تھی۔“

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا اور حیرت سے بولا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ میں نے کھائیں؟“

میں نے جواب دیا۔ ”میں نے اور مطیع اللہ نے تو نہیں کھائی تھیں۔ شہباز کا بھی معلوم ہو جاتا اگر وہ کھاتا اور باقی رہ گئے تم..... اور جو سرجی پر اتنا ترس آرہا ہے تو کوئی نہ کوئی بات تمہارے دل میں پھنسی ہے جس کا تم ازالہ چاہتے ہو۔“

وہ بولا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ شہباز کا کیسے پتا چل جاتا ہے؟“

میں نے کہا کہ جب اسے اپنی کسی حرکت کے پکڑے جانے کا ڈر ہوتا ہے تو وہ زرد پڑ جاتا ہے۔ ہونٹ لگتا ہے اور پھر آنکھیں بھر بھر کر سب کی جانب دیکھتا ہے۔ اس دن ایسی کوئی نشانی کم از کم میں نے تو نہیں دیکھی تھی۔

مفتی ہنس ہنس کر دوہرا ہونے لگا اور جلیبیوں کی دکان کے آگے مجھے مارنے کی سعی کرنے لگا اور ساتھ بولا۔ ”تم سے تو کوئی چیز چھپانا بھی مشکل ہے۔“

ہم نے پھر جلیبیاں خریدیں۔ ساتھ میں سموسے اور پکوڑے بھی خرید لیے۔ واپس اپارٹمنٹ پہنچے تو سرجی بھی ایک جلیبیوں سے بھرا لفافہ لیے موجود تھے۔ ساتھ ایک بڑے پیالے میں دودھ ڈال کر انہیں بھگویا ہوا تھا اور شڑاپ شڑاپ دودھ پی رہے تھے اور بیچ سے جلیبیاں کھاتے چلے جارہے تھے۔ ہمیں دیکھا تو گڑبڑائے۔ پھر ہمارے ہاتھ سے لفافہ لیا اور پھر دوبارہ گڑبڑائے۔ پھر کئی بار قسمیں کھائیں اور پھر باقی کا دودھ پیا اور جلیبیاں چڑھا گئے۔

میں نے مفتی سے مذاق میں کہا۔ ”انہوں نے بہت جلیبیاں کھالی ہیں۔ اب مطیع اللہ کے بجائے انہیں کل ہفتے کی رات کلب لے جاؤ تاکہ جلیبیوں کا جادو بھی سر چڑھ کر بولے۔“

مفتی تادیر میری تجویز پر غور کرتا رہا شاید اس نے میرے مذاق کو سیریس لے لیا تھا۔

سرجی اب ہم سے بے پرواہ پیالے کو انگلیوں سے کھرچے چاٹ رہے تھے۔

☆.....☆

میں ہر جمعہ کی سہ پہر سیکورٹی کمپنی والوں کو فون کر کے معلوم کرلیتا تھا کہ سنیچر اور اتوار کو آیا مجھے ہولڈنگ سینٹر دن بارہ بجے سے رات بارہ بجے جاب پر جانا ہے۔ یہ ایک رسمی فون ہوتا تھا ورنہ میری جاب ان دو دنوں میں کنفرم ہوتی تھی۔ میں نے آج فون کیا تو کہا گیا کہ مجھے ہولڈنگ سینٹر کی بجائے ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں ہفتے کے روز رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے جانا ہوگا۔ رات کی جاب کے لیے میں نے انکار کردیا اور یہ بھی کہا کہ میری ان دنوں میں چوبیس گھنٹے جاب ہوتی ہے اور آپ لوگ مجھے صرف بارہ گھنٹے دے رہے ہیں۔ سپروائزر کہنے لگا کہ ہمارا سیکورٹی گارڈ چھٹی پر ہے اور وہ بلڈنگ میرے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ مجھے یہ ترغیب بھی دی کہ ہم تم کو ڈیڑھ گنا زیادہ ڈالر دیں گے۔

میں نے سوچا کہ میرے پاس ہفتے کا پورا دن بھی فارغ ہوگا جو کسی نعمت سے کم نہیں ہے اور مجھے ڈیڑھ گنا زیادہ معاوضہ بھی مل جائے گا تو میں نے ہاں کردی۔ سپروائزر نے میرا شکریہ ادا کیا اور ایڈریس لکھوا کر فون بند کردیا۔

میرے پاس اب آج کا آدھا اور کل کا پورا دن تھا اس لیے میں ریلیکس ہوگیا تھا۔ میں نے اعلان کردیا کہ آج کا کھانا میں خود بناؤں گا، اور اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

سوچا کہ آج نسرین کو فون ہی کردوں۔ کمرے میں جا کر فون ملایا تو وہ ابھی اپنی جاب سے گھر پہنچی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تھکی ہوئی ہو۔“

جواب آیا۔ ”اب تو عاری ہوگئی ہوں۔“ پھر پوچھنے لگی کہ ”کب ملو گے؟“

”میں بولا کہ چند دن پہلے تو ہم نے خوب صورت وقت ساتھ گزارا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم بیزار ہو جاؤ۔“

وہ بولی۔ ”بیزار ہونے کی اپنی بات کررہے ہو یا

میری؟“

”نہ اپنی اور نہ تمہاری۔ بس ایک فقرہ بولا ہے جو ایسے موقع پر بولا جاتا ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”لگتا ہے کہ یہ فقرہ بولنے کے بہت مواقع تمہارے پاس آئے ہیں؟ بڑا تجربہ رکھتے ہو۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم تو بیویوں کی طرح سوالات پوچھنے لگی ہو؟“

وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہوگئی اور پھر آہستگی سے بولی۔ ”جو رشتہ ہمارا بن نہیں سکتا۔ اس کا ذکر کیوں کرتے ہو؟“

میں نے پوچھا۔ ”کیا خفا ہوگئی ہو؟“

”خفا نہیں بلکہ اداس ہوگئی ہوں۔“

اتنے میں سرجی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ مجھے فون پر مصروف دیکھا اور پھر دروازہ بند کر کے واپس چلے گئے۔ میں نے نسرین سے سوری کیا اور پھر کہا۔ ”میں نے تمہیں اداس کردیا؟“

وہ بولی۔ ”یہ اداسی بھی مجھے بھلی لگتی ہے کیونکہ تمہارے پیار سے جڑی ہے۔“

”پیار تو خوشیاں دیتا ہے۔ تم اداس کیسے ہوگئیں؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ خوشی دیتا ہے یا اداس کرتا ہے۔ مجھے جو چیز ملی ہے اس کا بتا رہی ہوں۔ چند ماہ بعد تم سے ہمیشہ کے لیے دور چلی جاؤں گی۔ تمہاری اپنی زندگی ہوگی اور میری اپنی قسمت۔ تم کو میرے پیار سے خوشی ملی ہے تو میری خوش قسمتی ہے۔ مجھے اگر اداسی ملی ہے تو یہ میرا نصیب ہے۔“ وہ واقعی اداس تھی۔

میں اس کی باتیں سن کر دکھی ہوگیا اور پوچھا۔ ”کیا واقعی چلی جاؤ گی؟“

”کیا واقعی روک لو گے؟“ ذرا سی خاموشی کے بعد اس نے سوال کیا۔

”اگر روک لوں تو رک جاؤ گی؟“ میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

جواب میں بولی۔ ”ایک بار روک کر آزما لو۔“

میں نے کہا۔ ”پیار میں آزمایا نہیں جاتا۔“

وہ بولی۔ ”پیار میں چھوڑا بھی تو نہیں جاتا۔“

میں لاجواب ہوگیا اور بات بدلی، اس سے کہا۔ ”آج خوب سوؤں گا کیونکہ کل رات تک چھٹی ہے۔“

کہنے لگی۔ ”پھر گھر پر آجاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”پھر کبھی آؤں گا۔“

وہ بولی۔ ”میں انتظار کروں گی۔“

اس کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ کیسا رشتہ ہے جسے نہ توڑ سکتا ہوں اور نہ جوڑ سکتا ہوں۔ میں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ میری زندگی میں اب کسی اور کی گنجائش ہوسکتی ہے تو پھر یہ کیسے چپکے سے چلی آئی؟ میں اس سے گریز کرتے کرتے کیسے اس کے قریب آگیا تھا؟ وہ کیسے موڑ مڑتے مڑتے میرے سامنے اچانک آکھڑی ہوئی؟ میں نے اسے ڈھونڈا تو نہ تھا مگر وہ مجھے نصیب سے ملی تھی۔ میں نے اس کی تمنا تو کبھی نہیں کی تھی مگر نہ جانے وہ میری کس دعا کا حاصل تھی۔ میں اس رشتے کو کوئی بھی نام نہیں دے سکتا تھا۔ جس رشتے کو نام نہ دیا جاسکے تو اس کے ساتھ چلنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ان دنوں میں یہی سوچا کرتا تھا۔ میں ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ اسے چھوڑنا آسان بھی تھا اور آسان نہ بھی تھا۔ اگر اسے چھوڑ جاتا تو اس کا اور سعد کا کیا بنتا؟ اگر اسے نہ بھی چھوڑتا تو تب بھی اس کا کیا بنتا۔ اس کے ساتھ راحت بھی تھی اور سوچوں کا سمندر بھی۔ قرار بھی تھا اور بہت سے سوالات بھی۔ وفا بھی تھی اور بے وفائی کا خدشہ بھی۔ پیار بھی تھا اور پیار پر آنچ بھی۔

میں نے فی الحال اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر چھوڑا اور باہر آکر کچن میں پیاز کاٹنے لگا۔ دیکھا تو سرجی بہت دیر سے مجھے دیکھے جارہے تھے۔ ان کی نظروں میں سوالات تھے۔

میں اپنے ذہن کو جھٹک کر دال قیمہ بنانے لگا۔ کوکنگ کی کتاب میں پاکستان سے لایا تھا۔ وہ میرے بڑے کام آرہی تھی۔ سرجی کچن میں آئے اور بولے۔ ”باہر موسم بہت اچھا ہورہا ہے۔ کیا خیال ہے کہ کسی پارک میں جا کر بیٹھا جائے؟“

میں خود بھی کہیں باہر جانا چاہتا تھا۔ کھانا تیار ہوا تو مفتی سے باہر جانے کا کہا مگر وہ ٹی وی کے سامنے بت بنا بیٹھا تھا۔ شام اتر رہی تھی اور ہم دونوں اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے۔

ٹورنٹو میں بہار کا موسم نہ جانے میرے کن نیک اعمال کا انعام تھا جو مجھے آملا تھا۔ مخمور کرتی ہوائیں مجھے چھوتی ہوئی گزرتیں تو ایسا محسوس ہوتا کہ میری روح کائنات سے ہم کلام ہو۔ آنکھیں بند کرتا تو محسوس ہوتا کہ دنیا کی تخلیق ابھی ہوئی ہے اور بنانے والے نے موسم بہار سے اس کا آغاز کیا

ہے۔ پھر جھونکا ٹھہرا ہوا اور معطر۔ ہر قدم سبک رواں، ہر سانس خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی۔ ہر سوچ آسمان سے اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ فضاؤں میں سرایت کرتا زمین پر اتر رہا تھا۔ آنکھوں میں خمار تھا مگر ہر چیز واضح دکھتی تھی۔ ہم دونوں کچھ ہی دیر میں مارٹن گرودروڈ پر تھے۔ خاموشی سے چلتی ٹریفک نے ماحول کو خراب نہ کیا تھا۔ اردگرد کی اجلی نکھری بلند عمارتیں سکون سے کھڑیں ان مناظر کو تکتی تھیں۔

ہم نے سڑک کراس کی اور بس اسٹاپ سے ذرا آگے آئے اور دائیں جانب ایک حیرت کدہ میرا انتظار کررہا تھا۔

وہ پارک جو سردیوں میں برف کی سفید چادر اوڑھے سوتا رہا تھا اب بہار میں بیدار ہو چکا تھا۔ گہری اور مطمئن نیند کے بعد وہ تازہ دم تھا۔ میں اس منظر، ماحول اور اپنی کیفیت کو کس طرح بیان کروں کیونکہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو ان مناظر کو اپنے احاطے میں لاسکیں۔ وہ پارک تھا کہ خواب تھا یا میرے خواب کی تعبیر۔ وہ خواب جو میں ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا کہ ایسی جگہ جہاں کی زمین پر ویسٹر مخمل کی طرح کا سبزہ دور دور تک بچھا چلا گیا ہو۔ جہاں کا بیشتر حصہ سفید پھولوں نے ڈھانپ رکھا ہو جس کے اوپر آسمان پر ایسے بادل ہوں جن کی شبیہیں زمین پر جتنے خوب صورت جانوروں اور آسمان سے اڑتے خوشنما پرندوں سے ملتی ہوں۔ عطر بیز ہوائیں چلتی ہوں اور زمین کے پھول ہولے ہولے جھومتے ہوں۔

میں اور سرجی دونوں گنگ تھے۔ کناروں پر درختوں کے جھنڈ تھے جس کی شاخیں سفید پھولوں سے اٹی پڑی تھیں۔ ہوا کے جھونکے آتے تو ان پھولوں کی پتیاں فضا میں تیرتی زمین پر آپڑتیں۔ ہم گھاس پر چلتے تو پاؤں اس میں دھنستے تھے۔ بیچ میں وہ درخت تھا جو میرا ساتھی تھا۔ وہ تن تنہا کھڑا تھا۔ آس پاس کچھ نہ تھا اور اس کی زمین گھاس میں سر اٹھاتے، سفید اور زرد پھولوں سے بھری تھی۔ وہ خود سر سے پاؤں تک سفید پھولوں سے لدا تھا۔ اس پارک کے جھریوں کو بھی پھولوں کی سفید پتیوں نے ڈھانپ دیا تھا۔

سرجی کی ہمیشہ چلتی زبان سے صرف یہ الفاظ نکل پائے تھے۔ ”یہ ماحول ماشاء اللہ بہت دل آویز ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دیکھتا ہی چلا جاؤں۔“

میں نے سرجی سے کہا کہ ”اس کے بعد کچھ مت بولیں ورنہ یہ سحر ٹوٹ جائے گا۔“ پھر ہم دونوں بے اختیار ہو کر خاموش رہ گئے۔

میں نے سرجی کو وہیں چھوڑا اور چلتا ہوا اس تنہا درخت کے قریب پہنچ گیا جس کو میں نے برف میں بے رنگ اور اداس دیکھا تھا۔ جس میں مجھے اپنا آپ نظر آتا تھا۔ جسے میں آتے جاتے دیر تک تکتا رہتا تھا۔ جسے دیکھ کر میرے قدم رک جاتے تھے۔ کیونکہ مجھے اس درخت سے انس ہو چلا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ میں ہوں یا میں وہ ہوں۔

میں اس کی ٹہنیوں کے نیچے آ کھڑا ہوا تھا۔ ہزاروں پھول مجھ پر جھکے تھے۔ وہ پھول جو چند دن پہلے کلیاں تھیں اور جب سورج کی کرنیں پڑیں تو وہ کلیاں چٹخ کر پھول بن گئی تھیں۔ ان پھولوں نے ہواؤں کو بھی معطر کر دیا تھا۔ خوشبو بھرے جھونکوں کا لمس مجھ میں تازگی بھرتا تھا۔ میں خدائے ذوالجلال کا شکر بجالاتا تھا جس نے یہ سب کچھ آج مجھے دکھلایا تھا۔ میں وہیں زمین پر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ شام اترتی چلی گئی اور میں اپنے گیان دھیان میں بیٹھا رہا۔

شام کی سیاہی گہری ہونے لگی۔ میں سرجی کو بھول چکا تھا اور شاید وہ مجھے۔ دیکھتے دیکھتے پھولوں کا سفید رنگ شام کے ملگجے اندھیرے میں اور نمایاں ہونے لگا۔ پھولوں کی سفید پتیاں مجھ پر نچھاور ہو رہی تھیں اور میں ان کی بارش میں بھیگتا رہا۔ اللہ نے مجھے دنیا کے مختلف خطوں کے مختلف نظارے دکھلائے ہیں مگر میں آج تک وہ شام نہیں بھول سکا ہوں جب میرا وجود کا اندر اور باہر دونوں سفید پھولوں سے بھر چکے تھے۔

شام پر آہستہ آہستہ رات کا طلسم چھانے لگا۔

چوبیس گھنٹے کے دن میں میرے پسندیدہ لمحے تین ہیں۔ ایک جب سورج طلوع ہونے والا ہوتا ہے۔ اس وقت پرندے بول پڑتے ہیں۔ سپیدہ سحر کی نفاست رگ رگ میں سرایت کرتی ہے۔ سب شجر و پرند ورد کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا وقت شام کا جو ایک رومانس لیے ہوتا ہے۔ پورے دن کی مشقت اور دماغ سوزی کے بعد قدرت اپنے سارے رنگ انسان کے آگے کھول کر رکھ دیتی ہے۔ دل میں ایک ہلکی سی اداسی چھا جاتی ہے جو بے چین نہیں کرتی بلکہ دھیمے دھیمے آپ کو سہلاتی ہے۔ تیسرا وقت جب شام کا دھندلکا رات کی سیاہی میں گھلنے لگتا ہے۔ یہ اشارہ ہوتا ہے سوچوں میں ڈوبنے کا۔ یہ استعارہ ہوتا ہے سازوں کے کھلنے کا، دنیا سوتی ہے اور حساس دل محسوس کرنا شروع کرتے ہیں۔ رات ایک طلسم

ہے۔ رات ایک جادو ہے۔ رات ایک فتنہ ہے، رات ایک سجدہ ہے، رات ایک سفر ہے اور رات بھی کوئی منزل ہے۔ وہ سفر جو ہمکے کے ایک کچے گھر سے شروع ہوتا ہے جس کی منزل صدرۃ المنتہیٰ ہے۔ رات سارے بھید چھپاتی ہے اور رات ہی سارے بھید کھولتی ہے۔ رات ہی کو فرشتے آسمان سے زمین پر اترتے ہیں اور رات ہی کو شیطان گلیوں میں پھرتے ہیں۔ رات دنیا کی ہر شے کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ برف باری کی تنہا رات، ہولے ہولے آپ کے اندر دمکتی چاندنی رات۔ رم جھم گرتی برسات کی رات، معطر ہواؤں سے جھومتی ساری راتیں انوکھی ہوتی ہیں، سرشاری یا غم میں ڈوبی ہوئیں۔ دیکھی بھالی چیزیں رات کے سحر میں کسی اور طرح کی کشش میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ میں اس ماحول سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا۔ مجھے سرجی کی فکر ہوئی کہ وہ کیا کررہے ہوں گے۔ اپنے ساتھی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھنا چاہتا تھا مگر پھر بادل نخواستہ اٹھا اور سرجی کو ڈھونڈنے لگا۔ دیکھا تو وہ ایک سلائٹ پر پھسلتے نیچے آرہے تھے۔ معلوم نہیں وہ کب سے یہ حرکت جاری رکھے تھے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں قریب پہنچا تو ذرا سا شرمندہ ہونے لگا۔ میں نے کہا۔ ”سرجی! یہ تو بچوں کے پھسلنے کی جگہ ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”بڑوں کو زیب نہیں دیتا کہ اس عمر میں پھسلیں۔“

وہ ایک بار پھر سے پھسل کر زمین سے کراہتے ہوئے اٹھے۔ میری جانب مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولے۔ ”یہی تو کہتا ہوں کہ اس عمر میں پھسلنا ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ مجھ پر چوٹ کر گئے تھے۔ ہم باتیں کرتے دو درختوں کے درمیان رکھی بینچ پر بیٹھ گئے۔ مارٹن گرودروڈ پر گزرتی گاڑیوں کی روشنی سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔

سرجی ذرا دیر کو خاموش ہوئے اور پھر پوچھنے لگے۔

”اس رات کہاں تھے؟“

میں نے کہا۔ ”نسرین کے گھر پر تھا۔“

وہ پھر کچھ سوچتے ہوئے خلاؤں میں تکنے لگے۔ میں نے سگریٹ نکالی۔ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔ پارک میں کوئی نہ تھا تو میں نے اتنی آزادی لے لی تھی کہ سگریٹ پی لی۔ سرجی بولے۔ ”مجھے معلوم ہو گیا تھا مگر سب کے سامنے پوچھنا نہ چاہتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مہربانی فرما کر کسی کے سامنے ذکر بھی مت کیجیے گا۔ وہ لوگ معلوم نہیں اسے کیا معنی پہنائیں۔“

انہوں نے مختصر جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“ پھر پوچھا۔ ”بات کتنی آگے بڑھائی۔“

”اتنی ہی ہے جیسے کین سینٹر میں تھی۔ پہلے صرف اس کی جانب سے تھی مگر اب میری جانب سے بھی ہے۔“ میں نے ایک لمبا کش لینے کے بعد جواب دیا۔

”آپ کو معلوم بھی ہے کہ بھابی بچے آرہے ہیں۔“ انہوں نے مجھے یاد دلایا۔

میں بولا۔ ”ہاں انشاء اللہ چند ماہ میں آنے والے ہیں۔“

”پھر؟“

”پھر کیا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کچھ تو سوچا ہوگا۔“

”نہیں سوچا۔ بس یہ کہ وہ واپس ایران چلی جائے گی۔“

”یہ تو آپ کی زیادتی ہے۔ خود کینیڈا میں رہو اور اسے واپس بھیج دو۔“ سرجی نے مجھے ایک طرح سے جھنجھوڑا۔

”وہ خود جانا چاہتی ہے۔“ میں نے شاید اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے یہ جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے ہی تمہیں چھوڑ کر واپس جارہی ہے۔“

”میں اب کیا کروں؟“ میں نے سرجی سے پوچھا۔

”اسے مت جانے دو یہ زیادتی ہے۔ اس کے بیٹے کی آگے تعلیم بھی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے کبھی بار نہیں بنے گی۔ تم کہو گے تو آپ کو کبھی ملے گی بھی نہیں۔ میں اسے جانتا ہوں۔ میں نے آپ کو کبھی نہیں بتایا کہ وہ سینٹر میں جب بھی موقع ملتا مجھ سے آپ کے بارے میں باتیں کرتی تھی۔ وہ آپ کو بہت چاہتی ہے اور بدلے میں کچھ بھی آپ سے نہیں مانگتی۔ آپ اپنی زندگی گزاریں اور اسے اپنے سے اتنا دور نہ کردو کہ واپس بھی نہ آسکے۔“

سرجی آج بہت سنجیدہ تھے اور ان کی طرف سے ایسا طرز گفتگو میرے لیے تعجب خیز تھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش بیٹھا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب ایک فیصلہ ہو چکا ہے تو سرجی اسے کیوں بدلنا چاہتے ہیں۔ میں نے سرجی کو اس لیے اپنا ہمراز بنایا تھا کیونکہ مجھے ان پر پورا بھروسا تھا۔ وہ مذاق میں تو نسرین کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتے رہیں گے مگر سچ کسی کو نہ بتائیں گے۔

اتنے میں بوکھلایا ہوا مفتی اور اس کے کان بھرتا مطیع

اللہ اپنے ساتھ شہباز کو لیے پارک میں داخل ہوئے۔ ہم ساتھ ہی بینچ پر بیٹھے تھے اور وہ تینوں سیدھا ہماری جانب تیز تیز بولتے ہوئے آئے۔

مطیع اللہ نے چہرے پر تشویش کا ملا جلا اور پریشان زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”آپ لوگ کہاں تھیں۔ بتا کر تو جاتیں۔ میں آپ کے لیے کتنا پریشان ہو رہی تھی؟“ یہ کہہ کر اس نے تائیدی نظروں سے مفتی کی جانب دیکھا۔

مفتی بولا۔ ”یار ہم تو ایسے ہی چہل قدمی کے لیے باہر نکلے تھے۔ آکر سوچا کہ پارک میں دیکھ لیں کہ آپ لوگ بھی موجود ہوں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”شہباز کی قسم میں اندر اندر بہت پریشان ہو رہی تھی۔“

سرجی کی طرح اب مطیع اللہ بھی شہباز کی قسمیں کھانے شروع ہو گیا تھا۔ شہباز جواب تک خاموش کھڑا تھا۔ تلملایا اور بولا۔ ”جس کو بھی جھوٹی قسم کھانی ہو میرے سر کی کھاتا ہے۔ میں اچھا بھلا لیٹا تھا کہ مجھے لے آئے۔ کہہ رہے تھے کہ ندیم بھائی کہتے ہیں کہ باہر معطر ہوائیں چل رہی ہیں۔“ پھر میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ان کو تو برفوں میں بھی رنگ نظر آتے تھے جیسے بلی کو خواب میں چھیچھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے آرام میں بھی ان لوگوں نے سیاپا ڈالا۔“

سرجی بولے۔ ”میں بلا کسی ارادہ کے عرض کرتا ہوں اور ایک بار پہلے بھی فرما چکا ہوں کہ شہباز پکی بیری کے بیر کھانے والا شہباز ہے۔ یہ فضاؤں میں اڑنے والا شہباز نہیں ہے۔“ سرجی یہ کہہ کر مفتی سے بولے۔ ”آپ نے اپنے بہنوئی صاحب سے ٹورنٹو میں بہروں کے متعلق پوچھا تھا؟“

سرجی ایک ساتھ بھڑوں کے دو چھتوں میں ہاتھ ڈال چکے تھے۔ پہلے شہباز جھپٹا اور بولا۔ ”سرجی قسم سے اگر اپنے ہاتھ سے آپ کی گردن پکڑی تو مفتی کے بہنوئی صاحب بھی نہیں چھڑا سکیں گے۔“

پھر مفتی ناراض ہو کر بولا۔ ”جس کسی کو بیرون کا معلوم کرنا ہو یا سرجی کی گردن چھڑوانی ہو تو خود ہی بہنوئی صاحب سے بات کرے۔ مجھے درمیان میں گھسیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اب مطیع اللہ کی باری تھی۔ ”بیر ہوں یا آلوچے، اصل ذائقہ سوات میں ملتا ہے۔ اس خنزیر ملک میں کھانے پینے کا مزہ ہی نہیں ہے۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا کہ اس سے پہلے یہ تکرار بڑھ جائے

مفتی بولا۔ ”کیا خیال ہے آج پیچھے کی گلیوں میں واک کرتے ہیں۔ اس کے بعد گلاٹی اسٹور سے کچھ سامان بھی خریدنا ہے۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ سرجی بولے۔ ”میں تو واپس جا کر روٹیاں بناتا ہوں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”میں تو نوکر ہوں جہاں کہو گی وہاں چلوں گی۔“

شہباز بولا۔ ”باہر نکلے میں تو یہ سیاپا بھی ہو جائے۔“

وہ بے زار سا کھڑا تھا۔ سرجی واپس اپارٹمنٹ کی جانب چلے گئے اور ہم پارک کے ساتھ جاتی گلی سے اس طرف چلے جہاں سڑک کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے گھروں کے گھروں کی مانند صاف ستھرے مکانات تھے۔ ان کو سرخ اور سفید رنگ میں رنگا گیا تھا۔ ہر گھر کے آگے کیاریاں تھیں جہاں پھولوں کے خوب صورت گچھے تھے جو شاید چند دن پہلے لگائے گئے تھے۔

ہم آگے بڑھے تو سیدھے ہاتھ پر فائر بریگیڈ کا دفتر تھا۔ ان کی گاڑیاں ہر لحظہ مستعد اور تیار کھڑی ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ سرخ رنگ کا اصل دفتر پارکنگ کے پیچھے تھا۔ اندر جانے والے راستے کے قریب چند کمرے تھے جن سے بلب کی روشنی کھڑکیوں سے باہر اندھیرے میں آ رہی تھی۔ ہم قریب پہنچے تو نہ جانے مفتی نے کیا سونگھ لیا کہ وہ تیر کی مانند کمروں کی جانب بڑھا۔ ہم بھی رک گئے۔ باہر مکمل اندھیرا تھا اور خاموشی تھی سوائے ہوا کے جھونکوں سے سرسراتے پتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مفتی نے ایک کھڑکی سے اندر جھانکنا شروع کر دیا۔ وہ ہٹنے کا نام بھی نہ لے رہا تھا۔ پھر مطیع اللہ گیا اور وہیں ٹک گیا۔ وہ بھی اب جھانکتا جا رہا تھا۔ شہباز بولا۔ ”ان لوگوں نے کیا سیاپا دیکھ لیا ہے۔“ وہ بھی گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ مجھے الجھن ہونے لگی کہ اندر کیا سرکس لگا ہے کہ یہ سب دیکھے جا رہے ہیں۔ یہ ایک دفتر ہے اگر گھر ہوا تو پولیس کیس بن سکتا ہے کہ کسی کے گھر میں جھانکنا جرم ہے۔ میں ابھی ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ مطیع اللہ لاحول پڑھتا واپس آیا۔ میرے پوچھنے پر کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ دوبارہ پوچھا تو بولا۔ ”پہلے بھی بولا تھا کہ یہ خنزیر ملک ہم لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اتنی عریانی میں نے نہیں دیکھی۔“

”آخر کیا دیکھ لیا ہے؟“ میں تذبذب میں تھا۔ سو پوچھ لیا۔

مطیع اللہ نے کہا۔ ”خود جا کر دیکھو۔ میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”جسے تم شرم سے بیان نہیں کر سکتے تو میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔“

میں وہیں کھڑا رہا۔ مطیع اللہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ کچھ دیر میں مفتی اور شہباز سرگوشیاں کرتے واپس آئے، میں نے شہباز کو یہ کہتے سنا۔ ”یہ سیاپا تو یہاں بہت عام ہے۔ جہاں بھی جائیں یہ منظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔“

مفتی کا چہرہ ایسے ہی سرخ ہو رہا تھا جیسے اس کا ٹی وی کے لیٹ شو دیکھتے ہوئے ہوتا تھا۔ شہباز سے میں نے پوچھا۔ ”آخر تم کو کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی کیا ضرورت تھی۔“

وہ اکھڑ کر بولا۔ ”تھا کیا..... آف..... کیا تھا صرف لڑکا اور لڑکی بوس و کنار کر رہے تھے۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”صرف بوس و کنار؟“

بولا۔ ”ہاں تو کیا؟“

میں نے مطیع اللہ سے پوچھا۔ ”تم اتنا استغفار کیوں کر رہے تھے؟“

”یہ کچھ یوں سرعام..... عریانی نہیں ہے؟“

میں نے کہا۔ ”وہ سرعام تو نہیں کر رہے تھے۔ تم لوگ بھی جھانکنے گئے تھے۔ ایک بڑا جرم کر بیٹھے۔ پھر مفتی سے پوچھا۔ تم کو ان چیزوں کا معلوم کیسے ہو جاتا ہے؟ کیا سونگھ لیتے ہو کہ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح اسی جانب لپکتے ہو؟“

اس نے توجیح پیش کی کہ مجھے شک گزرا تھا۔

”ایسے مناظر پر کسی کی کھڑکیوں میں جھانکنے کی ضرورت ہی کیا تھی جب کہ یہ ہمیں ہر روز سب وے پر سرعام نظر آ جاتے ہیں۔“ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میرے ساتھی بہت پُرجوش تھے اور اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے چل رہے تھے۔

میں جان بوجھ کر آہستہ ہوا اور اس بے معنی گفتگو سے اپنے آپ کو دور کر لیا۔ میں اردگرد کے مکانات دیکھ رہا تھا جو کسی جنت کے ٹکڑے پر بنے محسوس ہوتے تھے۔

ہم اس گلی کے آخر پر بائیں جانب مڑے۔ پارک بھی بائیں جانب آ گیا۔ ہم مڑے اور سیدھے چلتے گئے۔ آگے یہ گلی گلاٹی سپر مارکیٹ کے پیچھے جا نکلتی ہے۔ میں ان تینوں سے پیچھے تھا۔ رات کے اس پہر ان گلیوں میں گھومنا بھی سحر انگیز تھا۔ ایک لائن میں دور دور تک یہ مکانات تھے۔ ایک ہی رنگ اور ایک ہی نقشہ، ہر مکان کے درمیان فاصلہ برابر تھا اور ایک انچ کا بھی شاید فرق نہ ہوگا۔ گھروں کے آگے گلی کے دونوں جانب درخت ایستادہ تھے۔ سڑک اور درختوں کے علاوہ چاندنی نے گھروں کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ خاموشی تھی اور بے حد سکون۔ وہ سکون جو باہر بھی تھا اور گھروں کے اندر بھی۔

ہر گھر کے باہر چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ لکڑی کے گھر اور برآمدے ایک نیا اور عجیب سا ماحول بناتے تھے۔ برآمدوں میں پھولوں سے لدے گملے لٹکے تھے۔ کھڑکیوں میں بھی پھول جھانک رہے تھے۔ کسی نے برآمدے میں پتھر سے بنے جانور رکھے تھے اور کہیں بینچوں پر بیٹھے چھوٹے چھوٹے بچے۔ گھر کے مکین شاید تنہا تھے اور انہوں نے اپنی تنہائی کا علاج ان پتھروں کی مخلوق میں ڈھونڈ لیا تھا۔ کسی بھی گھر میں نہ تو شور شرابا تھا اور نہ ہی چیخنے چلانے کی آوازیں تھیں۔ گلیاں دور دور تک خاموش تھیں اور ویران پڑی تھیں۔ گھروں کی کھڑکیوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ مجھے تو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ گھروں کے سارے مکین یا سو گئے ہیں یا سب مل کر کسی شادی میں گئے ہیں۔ مگر آگے ایک گھر کے سامنے سے گزرا تو کھڑکی کے پیچھے ڈرائنگ روم تھا۔ فرشی لیمپ روشن تھے۔ دو لیدر کی کرسیاں کھڑکی کے پاس پڑی تھیں۔ صوفے نظر آ رہے تھے اور کرسیوں پر ایک معمر مرد اور ایک بوڑھی خاتون بیٹھی تھی۔ مرد مطالعہ کر رہا تھا اور عورت آنے والی سردیوں کے لیے سلائیوں پر کچھ بن رہی تھی۔ آگے کے مکانوں کی کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے اور میں اندر نہ دیکھ سکا مگر اندر کے ماحول کا اندازہ مجھے ہو رہا تھا۔ اندر کا ماحول یہی ہوگا جو ابھی دیکھ کر آیا تھا اور وہ جو مفتی نے فائر بریگیڈ کی عمارت میں دیکھا تھا۔ کسی گھر کی چار دیواری تو نہ تھی مگر چادر اور چار دیواری کا تقدس تھا۔ پورے ماحول میں ایک چیز کی کمی تھی اور وہ یہ کہ نہ کوئی مٹی کا ذرہ تھا، نہ کوئی خالی ڈبہ اور نہ ہواؤں میں اڑتا کوئی شاپر۔ نہ گندگی اور نہ گندگی کے ڈھیر اور نہ کوئی بدبو۔ بلکہ پورے ماحول میں پھولوں کی خوشبو تھی۔ میں اپنے دل و دماغ میں بہت سی سوچیں۔ اپنے ملک کے بہت سے مسائل اور ان کے حل لیے ہوئے تھا کہ گلاٹی سپر مارکیٹ کے عقب میں پہنچ گیا۔

گلاٹی اسٹور کے اندر آئے تو پھلوں، سبزیوں سے بھرا

ہوا تھا۔ پھلوں کے ڈھیر ایسے پڑے تھے کہ جیسے ہم فروٹ منڈی میں آگئے ہوں۔ ریفریجریٹر الماریوں میں دودھ کے ڈبے، انڈے، پنیر اور کیا کچھ بھرا ہوا تھا جن کے مجھے نام بھی نہ آتے تھے۔ آپ ٹرالی لے کر اشیاء کو دیکھتے رہیں تو گھنٹوں گزر جائیں مگر اشیاء ختم نہ ہوں۔ ہم گھومتے پھرتے رہے۔ ایک ایک چیز کو بغور دیکھتے اور پھر ستائش بھری نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتے تھے۔ کچھ وقت گزارنے کے بعد جب ہم چاروں باہر نکلے تو ہمارے ہاتھ میں ایک ایک لیٹر کے صرف دو پائن ایپل جوس کے ڈبے تھے اور ہم ایک دوسرے سے سب جدا جدا ہو کر چل رہے تھے۔

ہم فٹ پاتھ پر آگے پیچھے درختوں تلے چل رہے تھے۔ مفتی ہم سے بیس قدم آگے ہوگا اور شہباز اتنا پیچھے۔ درمیان میں سرجی اور میں۔ ہم دونوں چپ تھے کہ اتنے میں پولیس کی ایک گاڑی ہوٹر بجاتی سرعت سے ہمارے پاس سے گزری۔ سرجی سہم کر درخت کے تنے سے لگ گئے۔ وہ چلی گئی مگر سرجی اپنی سانسیں کھڑے درست کر رہے تھے۔ اتنے میں شہباز ہمیں آملا۔ سرجی کو درخت تلے دیکھا تو بولا۔ ”یہ کیا بچوں کی طرح پولیس کو دیکھ کر کانپنا شروع کر دیتے ہو۔ شیر بنو شیر۔“

سرجی سچ مچ خفا ہو گئے۔ شہباز سے بولے۔ ”میں نے شیر والا لطیفہ سنا ہوا ہے۔ مجھے میرے چپڑاسی نے سنایا تھا اور وہ کم بخت کہتا تھا کہ صاحب شیر بنو شیر۔ ایس ای صاحب سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ پھر مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر بولے۔ ”شہباز اور میرا چپڑاسی۔ دونوں کا ضمیر ایک ہی ہے۔ دونوں میری آبرو کو بٹا لگانے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔“

شہباز بولا۔ ”ایک اور سیاپا! اب مجھے اپنے چپڑاسی سے ملا دیا اور کل اپنے خاکروب سے ملا دے گا۔“

سرجی بولے۔ ”ماشاء اللہ ایک خاکروب ہی تھا جو عزت کرتا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”سرجی! یہ پولیس کا ہوٹر سن کر آپ کیوں سہم جاتے ہیں؟“

بولے۔ ”ڈرتا نہیں مگر آواز اتنی باریک ہوتی ہے کہ سیدھا کان میں پڑتی ہے۔ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔“ پھر چلتے چلتے رکے اور ایک درخت کا پتا توڑا۔ اسے سونگھا اور سونگھ کر پھینک دیا۔ پھر فرمانے لگے۔ ”یہاں کی پولیس بھی تو بے تحاشا تنگ کرتی ہے۔ دن دیکھتی ہے نہ رات۔ بس سائرن بجاتی پھرتی ہے۔ ہم نوکری کر کے تھکے ماندے گدھوں کی طرح سو رہے ہوتے ہیں اور یہ اپنی مستیاں کرتے پھرتے ہیں۔ نہ شریف دیکھتے ہیں اور نہ لفنگے۔ ہر ایک کو در کے کھڑے ہوتے ہیں۔ میرا تو آٹا ہی گیلا ہو گیا جو کینیڈا میں آ پھنسا۔“ شہباز نے اپنے بازو کی قینچی بنا کر انہیں گردن سے جکڑ لیا اور بولا۔ ”گیلے آٹے کا مطلب بتا ڈور نہ.....“ یہ کہہ کر اس نے ہنستے ہوئے ذرا دباؤ بڑھایا تو سرجی کے ڈیلے باہر آنے لگے اور انکتی ہوئی آواز میں بولے۔

”مطلب کہ سخت اذیت میں پھنس گیا ہوں۔“

سرجی نے تو ترنگ میں آ کر پولیس کو کھری کھری سنا دی تھیں مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جب میں ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں سیکیورٹی گارڈ کی جاب کر رہا تھا۔ ویک اینڈ کی رات تھی اور اس دن شدید برف پڑی تھی۔ میں گراؤنڈ فلور پر بلڈنگ کی لابی میں کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر بیٹھا۔ پاؤں پھیلائے اونگھ رہا تھا۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ اتنے میں پولیس کی کار سائرن بجاتی مین گیٹ کے سامنے آ رکی۔ دو چاق و چوبند آفیسر گاڑی سے اترے اور مرکزی دروازے کے شیشے سے اندر جھانکنے لگے۔ اسی دوران میں اٹھا اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا، وہ اندر آئے۔ گڈ ایوننگ کہا اور میں نے وجہ پوچھی تو ایک بولا۔ ”ہمیں کسی خاتون کا فون ابھی آیا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے زدوکوب کیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اپارٹمنٹ نمبر کیا ہے؟“

دوسرا آفیسر بولا۔ ”گو، فون سے کال تھی۔ ایڈریس ٹریک نہیں ہو رہا۔ اس نے بلڈنگ کا بتایا اور پھر فون کٹ گیا۔“

پہلا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کیا تم کو کسی نے شکایت لکھوائی ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ ایسی چیزیں میری ڈیوٹی میں شامل ہی نہیں ہیں۔ وہ دونوں تائیدی انداز میں سر ہلانے لگے۔

پھر ایک بولا۔ ”ہمیں کسی طرح سے اپارٹمنٹ کا پتا لگانا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔“ وہ پھر بولا۔ ”وہ بتا رہی تھی کہ بارہویں فلور پر ان کا اپارٹمنٹ ہے۔“

میں نے کہا کہ یہ تو مسئلہ حل ہو گیا۔ ہر فلور پر چودہ اپارٹمنٹس ہیں۔ ہر ایک کا دروازہ کھٹکھٹا کر معلوم کر لیتے ہیں۔ اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”ہم بلاوجہ کسی

کے دروازے پر دستک نہیں دے سکتے۔ صرف اسی اپارٹمنٹ پر جا سکتے ہیں جہاں سے کال آئی ہے۔“

میں حیران کھڑا رہ گیا۔ ایک پولیس والا کسی کے دروازے پر بغیر کسی وجہ کے جا بھی نہیں سکتا۔ یہ ہیں شہریوں کے حقوق، وہ حکومت کے نہیں، عوام کے ملازم ہوتے ہیں۔ وہ کئی وجوہات دے کر جج سے سرچ وارنٹ لیتے ہیں۔ بغیر کسی وارنٹ کے کسی دروازے پر جا ہی نہیں سکتے۔ اگر غلطی سے بھی دروازے پر دستک دے دی تو معذرت کر کر کے خود بھی ہلکان ہوں گے اور آپ کو بھی کریں گے۔

ہم نے بارہویں فلور کی لابی کا ایک ساتھ چکر لگایا۔ ہر دروازے کے پیچھے مکمل خاموشی تھی اور ہم بھی خاموشی سے نیچے لابی میں چلے آئے۔

میرے پوچھنے اور استفسار کرنے پر ایک بولا کہ ویک اینڈ پر ایسی کالز آتی رہتی ہیں۔ اکثر ڈراما ہوتا ہے۔ ڈرنک ہو کر ایک دوسرے پر چلاتے ہیں۔ عورت اکثر پولیس کی دھمکی دیتی ہے اور کبھی کبھار فون بھی کر دیتی ہے۔ مرد معافیاں مانگتا رہتا ہے اگر عورت کے فون کرنے سے پہلے ان کی صلح ہو جائے تو ٹھیک ورنہ جب ہم پہنچ گئے تو ان کی صلح بھی ان کے کسی کام نہیں آتی۔ مرد کو تو ہم پکڑ کر لے جاتے ہیں اور باقی جو کرتی ہے عدالت کرتی ہے۔

وہ چلے گئے اور میں ان سے یہ نہ پوچھ سکا کہ مرد پھر وکیل کرتا ہے یا جج۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ جاتے جاتے مجھے چارج نہ کر دیں۔

میں اپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا کہ تمنا بھابی کا فون آیا۔ کہنے لگیں کہ سمیعہ اور بچے آ رہے ہیں تو میری اور طارق کی تجویز ہے کہ وہ پہلے نیویارک ہمارے پاس آ جائیں۔ وجہ بتائی کہ اب تو گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ قندیل بھی اب صرف پری اسکول میں جائے گی۔ بعد میں وہ بھی مصروف ہو جائے گی اور تمہارے پاس ویسے بھی وقت نہیں ہوتا کہ تم انہیں امریکا لے آؤ۔ اسی بہانے ہم خوب گھوم پھر لیں گے اور آتے ہی جو Home sickmiss سب کو ہوتی ہے۔ وہ اس سے بھی بچ جائے گی۔

میں اپنی فیملی کا انتظار پچھلے کئی مہینوں سے شدت سے کر رہا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ آئیں اور پہلے چند ماہ نیویارک میں گزاریں۔ میں نے تمنا بھابی کو انکار کیا تو بولیں۔ ”تم گنوار اور اجڈ ہو۔ بعد میں نہ ان کے پاس وقت ہوگا اور نہ تمہارے پاس۔ امریکا دیکھنے کا خواب ہر ایک کو ہوتا

جنوری 2018ء
نئے سال کا پہلا شمارہ ایک نظر میں
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور مرزا امجد بیگ کا ڈیشنگ انداز
درماندہ
آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک عبرت انگیز داستان..... رشتوں کی بے بسی اور زمانے کی بے حسی کا عجب واقعہ
اک دور تھا
شیخ شاہ نصیر چراغ دہلوی کی پیش گوئی کا سفر جسے مختلف آزمائشوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہر حال میں پورا ہونا تھا..... تاریخی صفحات کا دلفریب رنگ ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے
رنگ آسمان
فرنگی حسینہ کی راہ گزر کی دشواریوں کا احوال جسے اس کے محبوب نے دھیرے دھیرے آسان بنا دیا۔ اے آر راجپوت کے خیالات کی پرواز
وقت
سانپ کی طرح بل کھاتی چال چلتے ہوئے وقت کی ایسی روداد جس کے کسی پل کا اعتبار نہیں ہوتا کہ جانے کب کہاں بدل جائے۔ حسام بٹ کے قلم کا جادو
اس کے علاوہ
تنویر ریاض - سلیم انور - ڈاکٹر شیر شاہ سید - مظہر سلیم ہاشمی - شاکر لطیف اور محمد یاسر اعوان کی دلچسپ کہانیاں آپ کی منتظر

ہے۔ ان کو گھومنے پھرنے دو۔ میں نے تو پروگرام یہ بھی بنایا ہے کہ ہم ڈزنی ورلڈ بھی جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "مگر انہیں سات جولائی سے پہلے کینیڈا میں داخل ہونا ہے۔ کیونکہ ان کا میڈیکل جو پچھلے سال کروایا تھا وہ ایک سال تک درست مانا جاتا ہے۔" میری ہر بات کا جواب اس کے پاس تھا اور وہ کہنے لگیں۔ "جو اس نے پچھلے ماہ غلطی سے سب کا میڈیکل کروالیا تھا۔ ایمبیسی والوں نے اسے بھی درست قرار دیا ہے اور ان کے پاس کینیڈا میں داخلے کا پورا ایک سال ہے۔"

میں چپ ہوگیا اور سوچنے لگا اسی دوران وہ بولیں۔ "تم کو کچھ چھٹیاں ملیں تو تم بھی ہوائی جہاز سے آجانا۔ ان سے مل بھی لینا اور پھر ہم سب مل کر کہیں گھومنے بھی جائیں گے۔"

میں نے آخری حربہ استعمال کیا۔ "ان کے پاس امریکا کا ویزا بھی تو نہیں ہے۔"

کہنے لگیں۔ "وہ تمہارا سر درد نہیں۔ میں انتظام کرلوں گی۔ تم بس اسلام آباد سے نیویارک کا ٹکٹ خریدنا۔"

میں نے کہا۔ "بھابی یہ تم زیادتی کررہی ہو۔"

وہ بھڑک کر بولیں۔ "زیادہ بکواس مت کرو۔ اتنی بڑی آفر فری میں دے رہی ہوں اور جناب کے نخرے ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ "اب فیصلہ ہو چکا ہے لہٰذا تم آرام سے چند ماہ مزید اکیلے گزارو۔"

میں فون رکھ کر سوچوں میں کھڑا تھا۔ گھر میں صرف مطیع اللہ تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ "تمنا بھابی کیا کہتا ہے؟ کوئی مصیبت ہے کیا؟"

میں نے جھلا کر کہا۔ "تمہارے مذکر مونث بھی پریشان کرتے ہیں اور تم نے شاید اسے ہماری چڑ بنا دیا ہے۔"

مطیع اللہ سر جھٹک کر بولا۔ "میں تو تمہاری دل جوئی کررہی تھی اور الٹا تم مجھ پر بگڑتی جاتی ہو۔ نیکی کا تو موسم بھی نہیں ہے۔"

میں اب بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ زمانے کو موسم بنا دیتا تھا۔ موسم کو دن اور دن کو وقت بنا دیتا تھا۔

میں نے رات کو سمیعہ کو پاکستان فون کیا۔ وہ بھی کہنے لگی کہ تمنا بھابی کے کئی فون آچکے ہیں اور میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ ندیم سے بات کرلو۔

میں بولا۔ "ادھر میں کتنی شدت سے تم لوگوں کا انتظار کررہا ہوں اور وہاں تم لوگ آپس میں کوئی نیا پروگرام بنا کر بیٹھے ہو۔"

مجھے غصے میں پا کر اس نے کہا۔ "تو ہم لوگ وہاں نہیں جاتے۔ سیدھا ٹورنٹو آجاتے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ بھی میرے پاس ہی آنا چاہتی ہے لیکن امریکا کو دیکھنے کے لیے اتنا وقت میرے پاس کبھی نہیں ہوسکتا تھا۔ جب وہ کینیڈا ایک بار آجاتے تو جب بھی ہمیں پندرہ دن کی ہی چھٹی ملتی تو ہر ایک کی طرح ہم بھی سب چھوڑ کر پاکستان کا رخ کرتے۔ بہت مشکل ہوتا ہے ہم لوگوں کے لیے کہ چھٹی ہے اور ہم پاکستان کے بجائے کسی اور ملک کی سیر کو نکل جائیں۔ وطن کی محبت اور خاندان کے افراد کی کشش ہم لوگوں کو کہیں بھی جانے نہیں دیتی۔ جو چاہت اور محبت اپنے ملک کے لیے ہوتی ہے وہ کسی اور ملک یا شہر کے لیے پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ نیویارک میں کچھ وقت گزار کر ٹورنٹو آئیں۔

دوسرے دن یہ روداد سب کے سامنے رکھی۔ مفتی بولا۔ "اکیلے جینے کا مزہ ہی اور ہے۔ جتنے دن دور ہوں گے اتنا ہی سکھ ہے۔"

مفتی کا قصور نہ تھا۔ وہ اپنی الگ دنیا بسائے بیٹھا تھا۔ جو مل گیا کھا لیا۔ ورنہ بھوکا سو گیا۔ بہت زیادہ بھوک لگی تو دو سلائس کھائے۔ اس کے علاوہ اسے بچوں کے شور، ذمہ داری، گروسری اور اس کے بقول تابعداری سے بے انتہا چڑ تھی۔ سرجی اپنی فیملی کو یاد کرتے آئے تھے۔ اس حوالے سے انہیں چند ماہ کیسے اپنے سے دور رکھ جاؤں گا۔

شہباز بولا۔ "وہ جو دو ماہ بعد اپارٹمنٹ ملنے والا ہے وہاں کیا اکیلے رہو گے؟"

شہباز سے کہا۔ "اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں ہے اور تم لوگ بھی تو اسی مہینے اپنے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہورہے ہو۔"

مفتی سمیت سب نے اس بلڈنگ میں شفٹ ہونے کا پروگرام بنا لیا تھا جس میں میرا اپارٹمنٹ تھا۔ سب ہی آخر میں اس بات سے متفق ہوگئے کہ فیملی اگر پہلے نیویارک جاتی ہے تو وہ اسے انجوائے بھی کریں گے اور میری بیوی کو ڈیرہ کی یاد بھی کم آئے گی لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ ایسا کچھ ہوجائے گا اس پردیس میں یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔

(جاری ہے)

ننھی کلی

زرین قمر

اس ننّھی سی کلی نے کِھلنے سے پہلے ہی شہرت کی بلندیوں کو چُھو لیا، وطن عزیز کا نام روشن کردیا۔ شاید اس لیے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد اسے مُرجھا جانا تھا مگر وہ کچھ اس طرح سے جدا ہوئی کہ وطن کا ہر ذرّہ غم و الم میں ڈوب گیا۔

اس نے تھوڑی سی زندگی پائی اور زندہ جاوید ہوگئی

اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، سارے بچوں کی طرح وہ بھی چھٹیاں کو انجوائے کررہی تھی مگر اس کا انداز جداگانہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں کیونکہ اسے پڑھائی سے والہانہ محبت تھی۔ وہ ہر وقت کتابوں میں کھوئی رہتی تھی۔ کورس کی کتابوں کے علاوہ وہ اپنی معلومات بڑھانے کے لیے دوسری ریفرنس بکس بھی پڑھتی تھی۔ اسی دوران اسے ایک اور شوق نے گھیر لیا۔ ملک میں بڑی تیزی سے کمپیوٹر پھیل رہا تھا۔ لوگ اسے جادوئی باکس کہتے۔ ہر

بات کا جواب مل جاتا۔ یہ کمپیوٹر اسے بھی پسند آیا تھا۔ گو کہ اس وقت تک آج جیسے تیز رفتار کمپیوٹر پاکستان پہنچے نہیں تھے۔ اس کے بابا نے اسے 486 کمپیوٹر خرید دیا.... تھا جس سے وہ صبح شام الجھی رہتی۔ اب جو یہ چھٹیاں آئیں تو اس نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے اپنے علاقے کے Aptech انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا لیکن اس وقت وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ کمپیوٹر آف تھا اور پیانو پر اس کی نازک مخروطی انگلیاں ماہرانہ انداز میں کیز دبا رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ گنگنا بھی رہی تھی قریب ہی اس کا بھائی جو عمر میں اس سے چھوٹا تھا اس کی سریلی آواز سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد
قدم قدم آباد تجھے قدم قدم آباد
سوہنی دھرتی اللہ رکھے
تیرا ہر اک ذرہ ہم کو اپنی جان سے پیارا
تیرے دم سے شان ہماری تجھ سے نام ہمارا
جب تک ہے یہ دنیا باقی ہم دیکھیں آباد
ہم دیکھیں آباد تجھے ہم دیکھیں آباد

"واہ..... واہ!" اس کے بھائی سرمد نے کہا جو سات سال کا تھا اور اس کے برابر بیٹھا داد و بھی تالیاں بجا رہا تھا جس کی عمر صرف تین سال تھی اور وہ بھائی کی تقلید میں تالیاں بجا رہا تھا۔

"آپی آپ نے تو کمال کر دیا۔ اتنا اچھا گایا ہے۔" سرمد نے پھر داد دیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

"کل تمہیں Aptech کے مائیکروسوفٹ کے ایک مقابلے میں شرکت کرنا ہے کیا تمہاری تیاری ہے؟" اس کی والدہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا جنہیں ہر وقت اپنے بچوں کی تعلیمی سرگرمیوں اور ان کی دلچسپیوں کے پورا کرنے سے غرض تھی۔

"جی میری ٹیچرز مطمئن ہیں۔ میری تیاری پوری ہے ممی۔" اس نے کہا۔

"ہاں میں جانتی ہوں جب انہوں نے مجھے میٹنگ کے لیے بلایا تھا تو بتایا تھا کہ تمہاری عمر اور تمہارے شوق کو دیکھتے ہوئے تمہیں مائیکروسوفٹ سرٹیفکیٹس کورس کے مقابلے کے لیے بھیجا جائے گا۔"

"ہاں کیونکہ میں سوفٹ ویئر ڈویلپمنٹ میں دلچسپی رکھتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اُمید ہے تم اپنی ٹیچرز اور والدین کی اُمیدوں پر پوری اترو گی۔" والدہ نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میری پوری کوشش ہو گی۔" اس نے پُراُمید لہجے میں کہا۔

دوسرے روز جب وہ مقابلے کا امتحان دے کر آئی تو بہت خوش تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے بہت اچھی پرفارمنس دی تھی اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب اسے اس مقابلے میں کامیابی کی خوش خبری ملی۔ اس روز وہ بہت خوش تھی اسے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے نہ صرف پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں کم عمر ترین مائیکروسوفٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل (MCPs) کا سٹیفکیٹ حاصل کر لیا ہے۔ اس کی فیملی کی بھی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ اخبارات اس خبر سے بھر گئے تھے۔ اس کی تصاویر نمایاں انداز میں لگائی گئی تھیں۔ ٹی وی چینلز اس کی ویڈیوز بنا کر نشر کر رہے تھے اور اس کی زندگی میں ایک نئے باب کی ابتداء ہو گئی تھی۔

فیصل آباد کی رہنے والی ارفع جسے پہلے کوئی نہ جانتا تھا یکا یک اسے گلوبل شہرت مل گئی تھی۔ فیصل آباد جسے مانچسٹر آف پاکستان بھی کہا جاتا ہے خبروں میں نمایاں ہو گیا تھا۔ ارفع خالصتاً ایک زمیندار خاندار سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے دادا چوہدری عبدالکریم رندھاوا (مرحوم) اپنی آئندہ نسلوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ارفع کے والد کرنل امجد رندھاوا پاکستانی فوج میں اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے اور اس کی والدہ مکمل طور پر ایک گھریلو خاتون تھیں جو اس کے والد کی غیر موجودگی میں گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال اور ان کے معاملات کو بھی توجہ دیتی تھیں۔

مقابلے میں کامیابی کے فوراً بعد مختلف ٹی وی چینلز پر اس کے انٹرویوز نشر کیے گئے۔ انٹرویو دیتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ رہتی۔ وہ اعتماد کے ساتھ سوالوں کے جوابات دیتی جس سے اس کے بلند حوصلوں کا پتا چلتا۔

اس دن بھی وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ اسٹوڈیو میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی جو بچپن سے اس کا خاصا تھی اور اس کی ذہانت کا پتا دیتی تھی۔ اس کی آواز میں ایک کھنک تھی کہ ایک بار بات کر کے دوبارہ بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اینکر کے سوالات کو وہ بہت غور سے سن رہی تھی۔

"آپ نے اتنی کم عمر میں اتنا بڑا اعزاز حاصل کیا ہے، ساری دنیا میں MCP میں نمبرون آئی ہیں آخر یہ سب

کیسے ہوا؟ آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ کمپیوٹر کو پسند کرتی ہیں یا اس میں دلچسپی رکھتی ہیں؟" اینکر نے پوچھا۔

"میں تب پانچ سال کی تھی اور کنڈرگارٹن میں پڑھتی تھی اور اکثر کمپیوٹر لیب کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسٹوڈنٹس کو کمپیوٹر پر کام کرتے دیکھتی تھی۔ میں اکثر کافی کافی دیر انہیں دیکھتی رہتی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ رقموں کے حساب کتاب میں ہمیں خاصا وقت لگتا ہے، اسے کمپیوٹر کے ذریعے سیکنڈز میں کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹرز میں میری دلچسپی بڑھتی گئی اور پھر میری عمر 6 سال تھی جب مجھے میرا نیا کمپیوٹر ملا اور میں نے خود ہی اپنی کاوشوں سے اسے سمجھنا اور استعمال کرنا شروع کر دیا پھر میری ٹیچرز نے بھی میری مدد کی اور جب میں اپنے فرسٹ گریڈ میں تھی تو میں نے Aptech کا انسٹی ٹیوٹ جوائن کر لیا۔" بچی نے ٹھہر ٹھہر کر نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

"آپ نے MCP سرٹیفکیشن کیوں کیا؟"

"جب میں Aptech گئی تو میری ٹیچرز جن کی نگاہ میرے شوق اور ساتھ ساتھ میری عمر پر بھی تھی انہوں نے مشورہ دیا کہ مجھے MCP کرنا چاہیے اس کی وجہ سوفٹ ویئر میں میری دلچسپی تھی۔ میں نے چار ماہ تک اس کی پریکٹس کی اور پھر اپنی گرمیوں کی چھٹیوں میں مقابلے کا امتحان دے دیا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ کو جو اعزاز حاصل ہوا ہے اس اہمیت سے آپ واقف ہیں؟"

"یہ میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ مجھے دنیا میں ایک شناخت دلائے گا اور میرے والدین کے خواب پورے کرنے میں میری مدد کرے گا، خاص طور سے میرے مرحوم دادا کے خوب جو اپنی آیندہ نسل کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ میں خدا کی بے حد شکر گزار ہوں اور اس کے بعد اپنی ٹیچرز کی جن کے بغیر میں یہ اعزاز حاصل نہیں کر سکتی تھی اور یہ تو ابھی آغاز ہے۔"

بچی کے اس جواب پر اینکر حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک نو سالہ بچی ایک بڑا اعزاز حاصل کرنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھی نہایت اعتماد کے ساتھ کہہ رہی تھی کہ یہ ابھی آغاز ہے۔ اس کے لہجے میں یقین اور آنکھوں میں اعتماد تھا اور آواز کی کھنک بتا رہی تھی کہ یہ اس کے لیے معمولی کھیل ہے۔

"آپ کی کامیابی پر آپ کے دوستوں اور فیملی کا کیا ردِعمل تھا؟"

"وہ سب بہت خوش تھے۔ میرے والدین نے مجھے گلے سے لگایا۔ دعائیں دیں۔ میرے خاندان کے لوگوں نے تعریف کی اور میری کامیابی کو سراہا۔ میرے بھائیوں نے جو مجھ سے چھوٹے ہیں مجھے مبارک باد دی۔ انہیں مجھ پر فخر ہے۔ میرے والد نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے مواقع فراہم کیے میری ضروریات پوری کیں۔ مجھے ضروری ہارڈ ویئر فراہم کیا اور بہت سے سوفٹ ویئر بھی اور سب سے اہم چیز میرے اندر اعتماد پیدا کیا۔"

"کیا آپ کبھی امریکا گئی ہیں؟ اگر نہیں تو کیا مستقبل میں جانے کا ارادہ ہے؟" اینکر نے پوچھا۔

"اب تک تو میں نے امریکا کا سفر نہیں کیا لیکن میں وہاں جانا پسند کروں گی۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو مجھے ڈزنی لینڈ دیکھنے کا بہت شوق ہے اور دوسرے میں بل گیٹس سے ملنا چاہتی ہوں یہ میری دیرینہ خواہشیں ہیں۔"

"مائیکروسوفٹ کے بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟"

"لوگ کمپیوٹرز کے بارے میں جیسا سوچتے تھے اس فکر کو مائیکروسوفٹ نے بالکل بدل دیا۔ مائیکروسوفٹ نے نئی آنے والی نسل کے لیے User friendly software کے میدان میں ایک نئی بنیاد رکھی ہے جس سے استعمال کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ اب مائیکروسوفٹ بہت شعبوں میں جس طرح آسانیاں پیدا کر رہا ہے یہ مجھے پسند ہے۔ وہ ہمارے لیے اکیڈمک ریسرچ، اسکالر شپ فراہم کر رہا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو ٹیکنالوجی فراہم کرتے ہیں جو اس سے بہت دور تھے۔ مائیکروسوفٹ نے ایسے بہت سے سوفٹ ویئر بنائے ہیں جو لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ان کے اندر کیا صلاحیتیں ہیں اور وہ انہیں کیسے استعمال کر سکتے ہیں، خود میرا بھی مائیکروسوفٹ میں ایسا ہی تجربہ ہے مجھے مائیکروسوفٹ بہت پسند ہے اور اس نے مجھے واقعی ایک بہترین پلیٹ فارم فراہم کیا ہے۔"

"کیا آپ مائیکروسوفٹ میں کبھی کام کرنا چاہیں گی؟"

"میں یقیناً مائیکروسوفٹ میں کام کرنا پسند کروں گی کیونکہ میرا تو ہمیشہ سے یہی شوق رہا ہے کہ میں سوفٹ ویئر ڈویلپمنٹ میں نئی ٹیکنالوجیز دریافت کروں۔ جب سے میں نے کمپیوٹر استعمال کرنا سیکھا ہے۔ نہ صرف یہ چاہتی ہوں کہ میں مائیکروسوفٹ میں اپنا کردار ادا کروں بلکہ میں چاہتی

ہوں کہ آج سے پانچ سال پہلے جو ٹیکنالوجی دریافت ہوئی ہے اس سے بھی جان کاری حاصل کروں اس کے علاوہ میں ریڈمنڈ میں مائیکروسوفٹ ہیڈ کوارٹرز کا دورہ بھی کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے ریڈمنڈ کیمپس جانے کے بہت خواب دیکھے ہیں اور خوابوں میں وہاں کے ورکنگ کے ماحول کو بھی دیکھا ہے، محسوس کیا ہے۔ میں ان لیبس کو بھی دیکھنا چاہوں گی جہاں مائیکروجیل اسٹوڈیو نیٹ اور مائیکروسوفٹ نیٹ کے فریم ورک پر کام ہوتا ہے۔''

''آپ کی اور کیا مصروفیات و مشاغل ہیں؟''

''میرے مشاغل میں کمپیوٹرز، گانا، مطالعہ، مصوری اور باغبانی شامل ہے۔ میں نے حال ہی میں نیشنل مقابلے میں انعام حاصل کیا ہے جو موسیقی کا مقابلہ تھا۔ اس کے علاوہ میں کتابیں اور انسائیکلو پیڈیا کے مطالعے کے ذریعے اپنی معلومات کو تازہ کرتی رہتی ہوں۔''

''کیا آپ دوسرے کم عمر لوگوں کو کوئی مشورہ دینا پسند کریں گی؟''

''ساری دنیا کے بچوں کے لیے میرا ایک پیغام ہے اگر آپ اپنی زندگی میں کچھ بڑا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر آپ اپنے خیالات کے اظہار سے شرمائیں گے تو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے اور اگر آپ میں اعتماد ہوگا تو آپ اعتماد کے ذریعے ہی اپنے خیالات کا اظہار کریں گے چنانچہ آپ کو چاہیے کہ کبھی بھی اپنے ذہن پر شرم کو قابض نہ ہونے دیں۔''

اس انٹرویو کے کچھ عرصے بعد ارفع کو ایک اور خوش خبری ملی تھی اسے بل گیٹس کی جانب سے امریکا آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ اس روز بہت خوش تھی اس نے بل گیٹس سے ملنے سے پہلے اس کے لیے ایک نظم لکھی۔ ارفع کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ وہ بہت کم عمری سے شعر کہتی تھی پھر جب وہ بل گیٹس سے ملی تو اس نے وہ نظم انہیں سنائی اور اپنی ہاتھ کی لکھائی میں لکھی ہوئی انہیں پیش کی۔

Borne on oct 1955

Programming was his only aim of life

Started programming at the age of 13

In his work he was really very keen

Extered Harward 1973

Thought more than a child could think to be

He is a very busy man

Steeps 8 hours a day below the fan

بل گیٹس نے جب یہ نظم پڑھی تو بہت خوش ہوئے اور اس چھوٹی سی ذہین بچی کو یوں داد دی کہ انہوں نے اسی وقت اپنے ہاتھ سے اپنا آٹو گراف لکھ کر اسے دیا۔

It was great meeting you

I look forward to

Seeing what you can do

Best wishes

Bill gatis

بل گیٹس نے اس سے اپنے دفتر میں ملاقات کی تھی اور یہ ملاقات دس منٹ کی تھی جس میں ارفع بہت خوش اور پُراعتماد تھی اس ملاقات کے دوران ایک موقع پر بل گیٹس نے ارفع سے پوچھا۔ ''کیا آپ سرپرائز لیتی ہیں؟''

اس نے بل گیٹس کے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے ایک اور سوال کر دیا۔ ''میں پچھلے تین دن سے دیکھ رہی ہوں کہ یہاں مائیکروسوفٹ میں خواتین بہت کم ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

اس سوال پر بل گیٹس چونکے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ ارفع کا مشاہدہ تیز تھا اور اس نے صحیح بات نوٹ کی تھی۔ بل گیٹس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''ہاں ہاں آپ یہ بات درست کہہ رہی ہیں، دراصل یہ بہت مشکل ہے کہ ہم یہاں ایسی خواتین تلاش کریں جو مائیکروسوفٹ میں کام کریں یا ٹیکنالوجی میں دلچسپی رکھتی ہوں اور کام کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہوں۔''

بل گیٹس کے جواب پر وہ مسکرائی تھی اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ ''آپ میرے ملک پاکستان آئیں میرے گاؤں آئیں میں آپ کو دکھاؤں گی کہ کتنی عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور کتنی عورتیں ٹیکنالوجی میں کام کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔'' اس نے جواب دیا تو بل گیٹس بہت متاثر ہوا۔

وہ اس کم عمری میں بھی بہت اچھی انگریزی بولتی تھی اس کا انگریزی لہجہ سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی نو آموز

ہے۔ اس کے پاس انگریزی الفاظ کا ذخیرہ بہت تھا اور اسے ہر ہر لفظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے میں مہارت تھی۔ وہ انگریزی الفاظ کا چناؤ موقع محل کے اعتبار سے کرتی تھی، یوں لگتا تھا کہ اس میں اس کی خداداد صلاحیت ہے جب کہ وہ فیصل آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں چک نمبر 4JB رام دیوالی میں پیدا ہوئی تھی اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی تھی۔ اس صلاحیت کے سلسلے میں امریکا میں اس کے وزٹ کے دوران ایک انٹرویو میں پوچھا گیا تو اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ جو چیز بڑے لوگ ایک ہفتے میں سیکھتے ہیں، وہ بچے ایک منٹ میں سیکھ لیتے ہیں۔ ان میں ذہانت اور سیکھنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی میموری ضائع نہ کریں۔ ان کے پاس ذہن ہے تو سیکھیں، اگر بڑا ریکارڈ نہیں بنا سکتے تو کوئی بات نہیں لیکن کم از کم زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اپنی انگریزی کی صلاحیت بڑھانے کے لیے میں نے زیادہ سے زیادہ انگریزی کی کتابیں پڑھیں اور خاص طور سے کارٹون فلمیں دیکھیں اور ان کی طرح بولنے کی مشق کی جس میں میرے والدین اور ٹیچرز نے میرا ساتھ دیا۔ میں زیادہ سے زیادہ انگریزی بولنے کو ترجیح دیتی تھی۔ اس طرح میری غلطیاں بھی درست ہوتی گئیں۔ تلفظ بھی ٹھیک ہوتا گیا اور اب میں آسانی سے انگریزی بول لیتی ہوں۔''

انگریزی کے ساتھ ساتھ اسے اردو پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اس کے پسندیدہ مضامین میں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو، اسلامیات اور تاریخ شامل تھے۔ وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی بہت اچھی شاعری کرتی تھی۔ وہ اکثر خیالات میں کھو جاتی اور تخیل میں سوچتی پھر اگر اسے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو اس کا حل تلاش کرتی اور اپنے خیالات کو اشعار میں ڈھال دیتی تھی۔ اس نے دس سال کی عمر میں ایک نظم لکھی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں کتنی دور کا سوچتی تھی۔

دور کہیں تنہا اک پرندہ تھا انگشت بدنداں
سوچتا تھا کہ وہ لوگ کیوں ہیں اتنے ناداں
چاہتے ہوئے بھی کہ جانا ہے اسی کے پاس
نہیں آتے ہیں وہ برے کاموں سے باز

☆

یہ دنیا اک امتحان کی ہے تیاری
اور جلد آنے کو سب کی ہے باری
اس کے سامنے حساب دینے کی
اور جنت یا دوزخ کا عذاب لینے کی

☆

اے غافل انسان تو راہ راست پر نہیں ہے
جانا ہے کہیں اور تو کہیں ہے
اپنا ذہن کھول اور سوئے منزل چل
کہ آرہا ہے سامنے تیرے اک نیا کل
(ارفع کریم)

اس نے بہت کم عمر میں عالمی شہرت حاصل کی اس کے لیے اس نے تعلیم کو بہت وقت دیا لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ زندگی کی دوسری مصروفیات اور مشاغل سے کٹ گئی ہو۔ وہ ہر محفل میں بھرپور حصہ لیتی تھی۔ اسکول کی غیر نصابی سرگرمیاں ہوں یا فیملی کی کوئی تقریب، وہ سب میں شرکت کرتی تھی اور خود کو نمایاں رکھتی تھی اسے گانے اور مصوری کا بھی شوق تھا وہ شاعری اور باغبانی بھی کرتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی شرارتیں اس کا مشغلہ تھیں۔ وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ مل کر کھیلتی اور شرارتیں کرتی تھی۔ اکثر اپنی پھوپیوں سے ملنے ان کے گھر جاتی۔ وہ ان کی بہت لاڈلی تھی۔ اس کے جانے پر وہاں رونق آجاتی تھی۔ محفلیں سجتی تھیں۔ وہ اپنے کزن کے ساتھ انجوائے کرتی۔ گیم کھیلے جاتے، مشاعرے ہوتے، گانے کے مقابلے ہوتے جن میں اس کے ساتھ اس کی پھوپیاں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتی تھی۔ اس نے کبھی پُرتکلف لباس پسند نہیں کیا۔ عام اور سادہ لباس ہی پہنتی تھی اور اس کا لباس اکثر ہلکے رنگوں کا ہوتا تھا۔ اپنے والد سے بہت قریب تھی۔ اپنی ہر ضرورت پہلے ان کو بتاتی تھی اور وہ بھی پہلی فرصت میں اس کی فرمائش پوری کرتے تھے۔ ایک موقع پر اس کی والدہ سے پوچھا گیا کہ بچوں کی تعلیم اور دیکھ بھال کی وجہ سے ان کے اپنے مشاغل تو متاثر نہیں ہوتے تو انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''ہمارے مشاغل ہمارے اپنے کوئی مشاغل نہیں ہیں حالانکہ یہاں کے آفیسرز میس میں خواتین جمع ہوتی ہیں، ان کی اپنی ایکٹی وٹیز ہوتی ہیں لیکن میں اس میں حصہ نہیں لیتی کیونکہ میری اور میرے شوہر کی نظر میں ہمارے بچوں کی تعلیم زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ امتحان میں اچھے نمبر حاصل کریں۔ اچھے گریڈ لیں اور نمایاں کامیابی حاصل کر کے

آگے بڑھیں۔اس کے لیے انہیں ہر وقت دیکھنا ہوتا ہے اور ہماری زندگی ہمارے بچوں کی ہی مصروفیات کے گرد گھومتی ہے۔''

اس جواب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ارفع کے گھر کا ماحول کیا تھا اور بچوں کی تعلیم پر کتنی توجہ تھی۔اس کے علاوہ ایک اور بات جو قابل ذکر ہے کہ ایک موقع پر اس سے پوچھا گیا کہ اگر اس کے بھائی تعلیمی میدان میں اس سے آگے نکل گئے تو وہ کیا کرے گی۔کیا وہ انہیں وہ سب کچھ سکھاتی ہے جو اسے آتا ہے تو اس نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا۔

''مجھے جو کچھ آتا ہے وہ میں انہیں ضرور سکھاؤں گی لیکن وہ کبھی میرا ریکارڈ نہیں توڑ سکیں گے کیونکہ میرا پلان ہے کہ اس بار میں نے ایک ریکارڈ بنایا ہے اگلی بار میرا چھوٹا بھائی ریکارڈ بنائے اور اس سے اگلی بار دوسرا چھوٹا بھائی اور اس کے بعد میں کوئی اور نیا ریکارڈ قائم کردوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی چمک اور لہجے کی کھنک دیکھنے والی تھی۔بچی ہوتے ہوئے بھی اس میں بلا کا اعتماد تھا۔

2 اگست 2005ء میں محترمہ فاطمہ جناح کی 113 ویں برسی کے موقع پر پاکستان کے وزیراعظم شوکت عزیز نے اس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی فیلڈ میں نمایاں کارکردگی پر فاطمہ جناح گولڈ میڈل سے نوازا اور پھر پاکستان کے صدر پرویز مشرف نے اسے پرائیڈ آف پرفارمنس کا صدارتی ایوارڈ بھی دیا اور اسی عرصے میں اس نے سلام پاکستان ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

2006ء میں ارفع کو Pakistan information technology professional forum کی طرف سے ڈنر پر مدعو کیا گیا جس میں دبئی کی اہم شخصیات اور پاکستانی سفارت خانے کی اہم شخصیات نے شرکت کی۔اس دورے کے دوران اسے بہت سے ایوارڈز دیئے گئے اور بہت سے تحائف بھی جن میں [redacted] ٹاپ بھی شامل تھا۔پھر ارفع نے ایک اور تقریب میں شرکت کی یہ Tech Ed Developers confrence تھی۔اس میں شرکت [redacted] سلونا میں ہونے والے ایک پروگرام میں [redacted] دی گئی جس میں 5000 کے قریب [redacted]rs شرکت کی [redacted] اور ان میں سے ایک وہ [redacted] ان کی نمائندگی کررہی تھی۔

جنوری 2010ء میں ارفع کو پاکستان کا برانڈ ایمبیسڈر بنایا گیا۔یہ اعزاز اسے 3G wireless Bradband Service "EVO" کے لیے Pak Tele communication company کی جانب سے دیا گیا۔

ایک غیر ملکی دورے کے دوران اس سے کئی سوالات کیے گئے جن کے جوابات اس نے کمال اعتماد سے دیئے اس موقع پر بل گیٹس کی کمپنی کا وائس پریزیڈنٹ بھی وہاں موجود تھا اور یہ انٹرویو بھی ایک شہرۂ آفاق صحافی نے انگریزی میں کیا تھا۔

''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنی کم عمر میں آپ نٹ ڈیولپر کیسے بن گئیں؟''

''دراصل اس میں میرے والدین کی کاوشوں کا زیادہ دخل ہے۔جب میں چھ سال کی ہوئی اور میں نے کمپیوٹر دیکھا تو میں حیران ہوئی کہ یہ کیا ہے اور کیسے کام کرتا ہے۔میرے والدین نے مجھے اسے سمجھنے میں مدد دی اور اس کے بعد میری ٹیچرز نے۔انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ کیسے استعمال ہوتا ہے۔ونڈوز کیا ہوتی ہیں پھر انہوں نے مجھے میرے انکل کے آفس میں یہ سہولت فراہم کی کہ میں باقاعدہ وہاں جانے لگی اور کمپیوٹر سیکھنے لگی پھر دو سال کے بعد میں یہ جان گئی کہ ونڈوز کیسے کام کرتی ہے اور سوفٹ ویئر کو کیسے Oprate کیا جاتا ہے۔اس کے بعد میں نے پریزینٹیشن بنانا سیکھیں اور میرے والدین کو احساس ہوا کہ میں اپنی عمر سے زیادہ تیزی سے چیزیں سیکھ رہی ہوں چنانچہ انہوں نے مجھے اسپیشل توجہ دی۔''

اس کے بعد صحافی نے سائمن براؤن سے سوال کیا جو مائیکروسوفٹ ڈویلپمنٹ ڈویژن کے وائس پریزیڈنٹ تھے۔

''کیا آپ ارفع کریم کو جانتے ہیں؟''

انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا [redacted] جانتا ہوں وہ دس سال کی تھی جب [redacted] ایک فلائٹ میں ہوئی تھی۔وہ کہا [redacted] سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ایک انگریزی میگ [redacted] تھی۔وہ پرویز مشرف سے [redacted] ایوارڈ سے نواز [redacted] مشہور پاکستانی کرکٹر کی کزن [redacted] ملاقات مجھے ابھی [redacted] اور میں ارفع کی ذہنی صلاحیت کا معترف

سائمن براؤن سے بات کرنے کے بعد صحافی پھر ارفع سے مخاطب ہوا تھا۔''آپ...زندگی میں کیا کرنا چاہتی ہیں؟''

''میں سیٹلائٹ انجینئرنگ کرنا چاہتی ہوں۔'' ارفع نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''سیٹلائیٹ انجینئرنگ کیوں؟''

''میں سیٹلائٹ انجینئرنگ کو ساری دنیا میں بہتر ڈویلپمنٹ کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہوں۔'' بچی نے جواب دیا تو صاف محسوس ہوا کہ صحافی اور سائمن براؤن دونوں ہی ارفع کی باتوں سے حیران تھے اور اس کی قابلیت سے متاثر بھی نظر آرہے تھے کیونکہ اسی انٹرویو کے دوران ارفع کریم نے ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس نے آنے والے وقت میں اس کے ارادوں کو آشکار کردیا تھا وہ اس کے ذہن کی اڑان پر حیران تھے۔

''میں مستقبل میں McsDDinet کرنا چاہتی ہوں اور میری کوشش ہوگی کہ میں جتنی کم عمری میں اور جتنی جلد اسے کرسکوں اتنا ہی اچھا ہے میں چاہتی ہوں کہ میں یہ کرکے ایک اور ورلڈ ریکارڈ قائم کردوں۔''

اس انٹرویو کے بعد یہ کہا گیا کہ ارفع کریم پاکستان کا دوسرا رخ ہے لیکن دراصل ارفع پاکستان کا دوسرا رخ نہیں پاکستان کا اصل چہرہ تھی۔اس نے پاکستان کی شناخت کرائی تھی اور اس کی وجہ سے ہمارے سر فخر سے بلند ہوئے تھے۔

پاکستان واپسی پر بہت سے اخبارات اور ٹی وی چینلز نے اس کے انٹرویوز لیے جن میں اس سے بہت سے سوالات کیے۔اس نے ایک ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔''میرا ارادہ ہے کہ میں پاکستان میں ایک Digicon velley بناؤں جہاں دنیا بھر سے تعلیم کے متوالے آئیں۔ وہ لوگ جو اعلیٰ تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کرسکتے وہ یہاں آئیں اور یہاں تعلیم حاصل کریں اور اس velley کا افتتاح کرنے کے لیے میں انکل پرویز مشرف اور بل گیٹس کو بلاؤں۔ یہاں پر طالب علموں کے لیے تعلیم، رہائش، میڈیکل، کھانا سب کچھ فری ہوگا۔''

اگلا سوال اس سے کیا گیا کہ کیا اب تک اس نے کوئی خاص کام کیا تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔''چک نمبر 2 رام وے دی سرگودھا روڈ کے گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں، میں نے اپنے دادا عبدالکریم رندھاوا کے نام پر ایک کمپیوٹر لیب Karim computer Learning centre کے نام سے قائم کی ہے میں جب وہاں جاتی ہوں تو اس لیب کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہوں کہ میں نے کچھ کام تو کردیا ہے۔ وہاں لڑکیاں کمپیوٹر سیکھ رہی ہیں۔''

اس سے آخری سوال کیا گیا۔''اگر آپ نے کوئی چیز پلان کی ہوئی ہے اور اس کے نتائج آپ کی توقع کے مطابق نہ ملیں تو آپ کا کیا ردِعمل ہوتا ہے؟''

''میں اگر کوئی چیز پلان کرتی ہوں تو اس میں یہ بات ضرور مدنظر رکھتی ہوں کہ یہ اللہ کے اوپر ہے کہ وہ کیا کرتا ہے

مالی وا کم پانی دینا بھر بھر مشکاں پاوے
مالک وا کم پھل پھول لانڑ الاوے یا نہ لاوے

میرا ایمان ہے ہمیں محنت کرنا چاہیے اور اس کا صلہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے اس طرح آپ کو مایوسی نہیں ہوتی۔''

بھری جوانی میں موت کا شکار

ماڈل اور ایکٹرس ماریہ خان کو 28 سال کی عمر میں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جانبر نہ ہوسکی۔ اس وقت وہ پاکستان میں ہی تھی۔اسے بچپن سے ہی اداکاری کا جنون تھا۔اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر وہ کلاس میں ہی مشہور اداکاراؤں کی نقل کرتی۔ وہ نہ صرف معروف اداکاراؤں کی اداکاری کی نقل کرتی بلکہ ان کی آواز کی بھی ہوبہو نقل کرلیتی تھی۔اس کی پہلی فلم جس نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی تھی اس فلم کا نام ''خجستاں پیچیاں'' اسے فلم کی پیش کش شہزاد رفیق نے کی تھی۔پہلی ہی فلم میں اس نے چہرے کے امپریشن اور مکالمے کی ادائیگی سے ثابت کردیا تھا کہ وہ اداکاری کے لیے ہی پیدا ہوئی ہے۔

☆☆

نیشا ملک نے صرف آٹھ ماہ قبل اداکاری شروع کی تھی۔ اس کی فلم ''بیسٹ آف لک'' بقرعید پر ریلیز ہونے والی تھی کہ ایک رات وہ پنکھے میں رسی ڈال کر پھانسی کے پھندے میں جھول گئی۔ پولیس نے ہر طرح سے تفتیش کرکے دیکھ لیا لیکن اس کی اس پُراسرار موت کا سرا مل نہ سکا۔نیشا کے گھر والے بھی اس کی موت کو خودکشی قرار دے رہے ہیں لیکن اس راز سے پردہ اٹھ نہیں پایا کہ اس نے خودکشی کی تو کیوں کی۔

ارفع کریم کو اپنے اللہ پر یقین تھا کہ وہ محنتوں کا صلہ ضرور دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے صلہ دیا اتنی کم عمر میں اسے عالمگیر شہرت ملی اور شہرت بھی ایسی کہ لوگ ایسی شہرت کی تمنا کریں وہ بہت سے لوگوں کے لیے مشعل راہ بن گئی لیکن جتنی تیزی سے زندگی میں کامیابی کی سیڑھیاں چڑھیں اتنی ہی تیزی سے زندگی کی بازی بھی ہار گئی۔

وہ 22 دسمبر 2011ء کا دن تھا جب اسے نہایت سیریس کنڈیشن میں لاہور کمبائنڈ ملٹری اسپتال لایا گیا۔ اس کی حالت کو خطرناک حد تک سیریس قرار دے دیا گیا۔ اس وقت وہ لاہور گرامر اسکول میں پیراگون کیمپس میں زیر تعلیم تھی اور اپنے اے لیول کے سیکنڈ ایئر میں تھی۔ اس کے والد کے مطابق اسے مرگی کے دورے پڑے، پھر دل کا دورہ پڑا۔ اسے انتہائی نگہداشت کے سیکشن میں رکھا گیا تھا۔

2 جنوری 2012ء کو پاکستان کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اپنی بیٹی فضا گیلانی کے ساتھ اسپتال کا دورہ کیا اور ارفع کریم کی عیادت کی اور اس کی صحت کے بارے میں معلومات لیں۔

9 جنوری 2012ء کو چیئرمین مائیکروسوفٹ بل گیٹس نے ارفع کے والدین سے رابطہ کیا اور اس کے ڈاکٹرز کو ہدایت کی کہ اس کے علاج کے سلسلے میں تمام ضروری اقدامات کیے جائیں پھر اس کے علاج کے لیے ڈاکٹرز کا ایک پینل ترتیب دیا گیا جس میں بین الاقوامی شہرت کے ڈاکٹرز بھی موجود تھے جو مقامی ڈاکٹرز کے ساتھ ہر وقت رابطے میں تھے۔ ٹیلی کانفرنس کے ذریعے وہ اس کی بیماری کی تفصیلات لے رہے تھے۔ ارفع نازک حالت میں وینٹی لیٹر پر تھی۔ اس کے والدین کو بل گیٹس نے آفر کردی تھی کہ وہ ارفع کے علاج کے سارے اخراجات ادا کریں گے۔

13 جنوری 2012ء کو اس کی حالت میں خاصی بہتری آئی تھی اور اس کے والد نے بتایا تھا کہ اسے امریکا لے جانے کی کچھ امید نظر آئی ہے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اس کی حالت کچھ دیر کے لیے بہتر ہوئی تھی۔

14 جنوری 2012ء کو سولہ سالہ ارفع نو بج کر پچاس منٹ پر لاہور کے کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ وہ اپنے مرنے سے 26 دن پہلے سے کومے میں تھی اس کی تدفین دوسرے روز کی گئی اور اسے اس کے آبائی گاؤں چک نمبر 4JB رام دیوالی فیصل آباد میں دفنایا گیا۔

15 جنوری 2012ء کو پنجاب کے چیف منسٹر شہباز شریف نے لاہور ٹیکنالوجی پارک کا نام بدل کر ارفع سوفٹ ویئر ٹیکنالوجی پارک رکھنے کا اعلان کیا

قفس تو خیر مقدر میں تھا مگر محسن!
ہوا میں شور ابھی تک میری اڑان کا ہے

ارفع کی موت پر اس کی فیملی، رشتہ دار اور علاقے کے مکینوں کے علاوہ بھی بہت لوگوں نے شرکت کی اس کی موت پر ہر کوئی اداس تھا ہر کسی کا یہی کہنا تھا کہ وہ بہت کم عمری میں اس دنیا سے چلی گئی جب کہ اس کے مستقبل کے بہت منصوبے تھے جنہیں وہ مکمل کرنا چاہتی تھی۔ اس کی والدہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ان کے چمن کا ایک پھول کم ہوگیا تھا۔ وہ جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی اپنے چمن کی آبیاری کرنا بنا لیا تھا، ارفع کے جانے کے بعد جیسے ان کی دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔

ارفع کے انتقال کے ایک ماہ بعد ہی اس کی سترہویں سالگرہ آئی جس کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کررہی تھی لیکن سالگرہ کے موقع پر وہ موجود نہیں تھی جب کہ اس کے والدین، رشتے دار اور دوست ہمیشہ کی طرح اس کی سالگرہ منانے کی تیاریاں کر کے آئے تھے۔ اس موقع پر ارفع کی والدہ نے ایک ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

''ارفع یہاں ہمارے درمیان موجود ہے۔'' ان کی آنکھوں سے نہ رکنے والی آنسوؤں کی قطار بہہ رہی تھی۔ انہوں نے مزید کہا۔ ''نہ وہ ہم سے جدا ہوئی ہے اور نہ کبھی ہوگی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ تمام رشتے دار اور اس کے فرینڈز اس کا پسندیدہ کیک لائے ہیں۔ اس کے کمرے کو سجایا ہے۔ اس کے لیے کارڈز بنا کر لائے ہیں سب کچھ تو وہی ہے۔ میں اس کو ہمیشہ زندہ رکھوں گی، انشاء اللہ تعالیٰ وہ ہمارے دل میں رہتی رہے گی۔''

روٹھ کر ہم سے کہیں دور چلے جاؤ گے تم
یہ نہ سوچا تھا کبھی اتنے یاد آؤ گے تم

ارفع کی والدہ نے روتے ہوئے بتایا۔ ''جب وہ مجھے یاد آتی ہے اور میرا دل زیادہ اداس ہوتا ہے تو میں اس کے کپڑوں سے اس کی خوشبو محسوس کرتی ہوں۔ اس نے بہت کم وقت میں بہت کامیابی حاصل کی اور ایک شعلے کی طرح بھڑک کر اپنی زندگی کم وقت میں پوری کرگئی۔''

ارفع کی پھپھو نے اس موقع پر اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا۔ ''وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی مجھے ہر موقع پر اس

رنگا رنگ سلسلوں اور دلکش تحریروں کا مرقع دسمبر 2017 کا پُرلطف شمارہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

پاکیزہ

معروف رائٹر حیا بخاری کا خوب صورت ناولٹ..... محبت لفظ ہے لیکن.....

بنت سحر کا دلگداز ناولٹ..... جو دھڑکا وہ دل تھا.....

متنوع تحریر نگار سدرۃ المنتہیٰ کا..... دل پزیر ناول..... تیری چاہ سے

معروف افسانہ نگار اور آج کی
مصروف ترین ڈراما نگار سیما مناف
کی ہماری بزم میں خوشگوار آمد.....

غزالہ عزیز کے قلم کے جوہر..... بدلتے رشتے..... ناولٹ کی صورت.....

"آپ کی کوئی نادانی یا حماقت جس پر آج بھی ہنسی آتی ہو" شائستہ زریں کا کھلکھلاتا سروے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

طیبہ عنصر مغل، بشریٰ سیال، شمائلہ دلعباد، ہالہ احمد،
غزالہ جلیل راؤ، ہما بیگ، عقیلہ حق و دیگر مایہ ناز رائٹرز کی پُرحیرت کہانیاں

اس کے علاوہ

متاثر کن مستقل سلسلے، مستند معلومات اور دلنواز شاعری کے ساتھ، ساتھ خوش ذائقہ پکوان
اور حسن کی آرائش کے آزمودہ نسخے صرف آپ جیسے پُرذوق قارئین کے لیے.....

کی یہ بات یاد آتی ہے جب اس نے کہا تھا کہ میری سترہویں برتھ ڈے آرہی ہے پھپو میں اسے مختلف انداز میں ... مناؤں گی۔ ہمیں نہیں پتا کہ اس کے منہ سے یہ بات کیوں نکلی لیکن اب جب ہم نے اس کی سترہویں سالگرہ منائی تو دوست احباب بھی آئے۔ گفٹ بھی آئے، کیک بھی بنوایا گیا لیکن صرف وہ ہی موجود نہیں تھی تو اس کے کہنے کے مطابق ہم نے سالگرہ تو مختلف انداز ہی میں منائی جس کی خبر اس نے ہمیں پہلے ہی دے دی تھی۔"

ارفع کریم کے والد جو اسے بے انتہا چاہتے تھے جس کی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بھی خواہش پوری کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے وہ بہت اداس تھے۔ "وہ بہت چھوٹی تھی شاید ڈھائی تین سال کی تب اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ وہ جو سنتی تھی فوراً اس کو دہراتی تھی اس کی دادی اسے جو چیزیں یاد کراتی تھیں وہ بہت جلد یاد کرلیتی تھی۔ اتنی سی عمر میں اسے سارے کلمے، آیت الکرسی، دعائے قنوت یاد تھیں۔" انہوں نے مزید بتایا۔ "وہ ایک مقابلے میں شرکت کے لیے جلد ہی انڈیا جانے والی تھی۔ یہ مقابلہ NASA کی طرف سے ہونے والا تھا لیکن اس کی زندگی نے اسے مہلت نہ دی لیکن میں نے اپنے آپ سے یہ وعدہ کیا ہے کہ اس نے جو خواب دیکھا تھا میرا کام اسے پورا کرنا ہے۔ اس نے اپنے اس دنیا میں آنے پر بھی ایک پیغام دیا اور جانے پر بھی ایک پیغام دیا

لڑتی رہی وہ موت سے جینے کے لیے
آخر میں وہ موت کو ناکام کر گئی

ارفع کے والد امجد کریم رندھاوا جب یہ بات کررہے تھے تو ان کے ہاتھ میں فیکس کا ایک کاغذ تھا جس پر مائیکروسوفٹ کے چیئرمین بل گیٹس کا تعزیتی پیغام درج تھا۔

"Today is the black day of my life and same for pakistan becouse i lost my princes colleague and pakistan lost her pakisani."

اس کے والد اداسی سے بولے۔ "میری خواہش تھی کہ وہ ابھی اور زندہ رہتی اور اپنی کامیابیوں سے دنیا کو حیران کرتی۔ وہ زندہ رہتی کیونکہ ابھی ہمیں اس کی ضرورت تھی لیکن اب جب وہ ہم میں نہیں ہے اللہ اسے جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔"

سالگرہ کے موقع پر اس کے دوستوں نے ٹی وی میں اس کی ویڈیو لگائی ہوئی تھی جس میں وہ اپنی سریلی آواز میں ایک قومی نغمہ گا رہی تھی کیونکہ سالگرہ میں شرکت کی۔ اس کے لیے یہی ایک صورت تھی وہ وہاں اپنے قومی نغمے کے ساتھ موجود تھی۔

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے
اس زمیں کی مٹی میں خون ہے شہیدوں کا
ارض پاک مرکز ہے قوم کی امیدوں کا

نظم و ضبط کو اپنا میر کارواں جانو
وقت کے اندھیروں میں اپنا آپ پہچانو

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے

کمرے میں ارفع کے دوستوں کی لگائی ہوئی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ غبارے لہرا لہرا کر اپنے رنگ بکھیر رہے تھے۔ کیک پر سترہ موم بتیاں سجی تھیں جن کے شعلے کپکپا رہے تھے اور کمرے میں موجود ارفع کے دوست، رشتے دار، والدین، بھائی جو پہلے اس کے نغموں پر جھوم جھوم کے داد دیتے تھے آنسو بھری جھلملاتی آنکھوں سے اداس چہروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ارفع جو ان کی زندگی کے لیے ایک پیغام تھی ایک رونق تھی اب ان میں نہیں تھی۔ اچانک اس کی اسکول کی ایک دوست آگے بڑھی۔ "ارفع ہم تمہارے خواب پورے کریں گے۔"

"ہم تمہاری جگہ اپنے ملک کا نام روشن کریں گے۔"

اس کے بھائی سرمد نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور ارفع کے والدین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ابھی پاکستان جاگ رہا تھا اس کی نئی نسل جاگ رہی تھی اس میں جذبہ تھا، کچھ نیا کر دکھانے کا۔ دنیا میں نام روشن کرنے کا۔ سب بچوں کے چہروں پر پھیلی ہوئی اداسی یکا یک اُمید میں بدل گئی ان کی آنکھوں میں بھی ارفع جیسی چمک آگئی۔

"جو کام ارفع ادھورا چھوڑ گئی میں وہ پورا کرنے میں ان کی مدد کروں گا۔" کرنل امجد رندھاوا نے زیرلب کہا اور ارفع کی والدہ مسکراتی ہوئی سالگرہ کا کیک کاٹنے آگے بڑھ گئیں۔

"اے ہے، تجھے ہوا کیا ہے؟ یہ تو کیا کرتی پھر رہی ہے؟" وہ غصیلے لہجے میں بول رہی تھیں اور ان کے سامنے بیٹھی زاہدہ خاموش، سر جھکائے نظریں زمین پر گڑائے اس طرح بیٹھی تھی کہ جیسے پتھر کی بت ہو۔

شام ہو چلی تھی۔ سورج نے بھی اپنا سفر تمام کرلیا تھا اور اب مغربی افق کی گود میں سر ڈالنے کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ آسمان پر پھیلی سرخی بھی اب دبنے لگی تھی جیسے دلہن کے چہرے کی جوت ماند پڑنے لگتی ہے۔ حویلی کی اونچی برجی پر پڑتی روشنی

زرخیز

زین مہدی

جب لڑکیوں کے لیے قلم تھا منا بھی جرم تھا۔ اس وقت ایک پردہ دار لڑکی نے، جس نے چہار دیواری سے باہر کی دنیا دیکھی بھی نہیں تھی۔ اس نے برصغیر کے اخبار و رسائل میں ایک طوفان اٹھا دیا۔ لوگ حیران و پریشان کہ ایسے ایسے نکتے۔ ایسی ایسی نظمیں، مثنوی، ایسے ایسے مضامین لکھ کون رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تک حیران کہ اس نام کے پردے میں ہے کون؟ جب کہ اسے بہت تھوڑی زندگی ملی۔ یکایک موت آئی اور اسے لے گئی۔

گزشتہ صدی کی ایک منفرد قلمکار دوشیزہ کی روداد

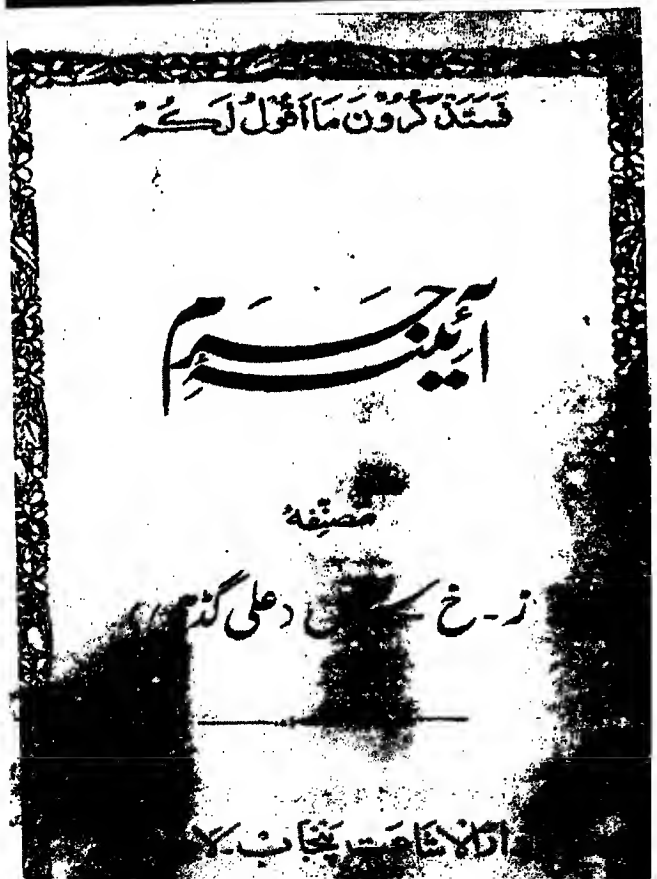

بھی اب اپنی چمک کھو رہی تھی۔ کلس کی چمک آنکھیں خیرہ کرتی ہیں لیکن ایسے وقت میں ان کا حسن گہنا جاتا ہے۔ مگر پھوپی کے حسین چہرے کی سرخی کم ہو کر نہ دے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لڑنے کے لیے کمربستہ ہو کر آئی ہیں۔ اسی لیے وہ تیز تیز بولے جا رہی تھیں۔ ''یہ کوئی شریف بہو بیٹیوں کے چلن ہیں۔ ارے ہم بھی دو قاعدہ پڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی نرے جاہل نہیں ہیں پھر بھی کبھی ایسا سوچا نہیں۔ سوچتی بھی کیسے؟ اللہ رسول کا ڈر بھی تو تھا۔ اور ایک تُو ہے۔ اللہ توبہ تُو نے ایسا سوچا بھی کیسے۔''

ان کی تیز نظریں اس کے چہرے پر تھیں مگر وہ تو ایسے گم صم بیٹھی تھی جیسے منہ میں مونگ بھرا ہو۔ اسے چپ دیکھ کر وہ پھر گرجیں۔ ''تُو نے یہ لکھا کیسے؟''

اس دور میں لڑکیوں کی پڑھائی معیوب تھی۔ لوگ بھری محفل میں غرور سے کہتے۔ ''ہمارے گھر کی بیٹیاں پڑھتی ہیں تو بس قرآن۔ یہ مواسید ہے جو لوگوں کو بہکا رہا ہے کہ لڑکیوں کو پڑھاؤ۔'' آخری جملہ سرسید کے لیے ہوتا جن سے اس دور کے وہ تمام لوگ جو عظمتِ نشاطِ ثانیہ کے اسیر تھے۔ جل بھن کر کباب ہوتے تھے۔ وہ انہیں برا بھلا ضرور کہتے۔

یہی وجہ تھی کہ لاکھ دو لاکھ میں کوئی ایک آدھ لڑکی حرف شناس بنتی۔ لڑکیوں کو بس اتنی تعلیم دی جاتی کہ وہ حرف شناس بن جائے' میاں کا خط آئے تو وہ اسے پڑھ سکے۔ کسی لڑکی کے لیے قلم پکڑ لینا جرم کے مترادف تھا۔ اس لیے کہ لوگ فوراً کہہ اٹھتے کہ لڑکی کو لکھنا آ گیا تو اس کے حرف گھر سے باہر چلے جائیں گے۔

مگر خان بہادر سر مزمل اللہ شروانی کا مزاج کچھ اور تھا۔ ان پر انگریز آقاؤں کا ملمع چڑھ گیا تھا اس لیے وہ بیٹی کو پڑھا رہے تھے، آگے بڑھا رہے تھے لیکن ابھی معاشرہ اتنا آگے بڑھا نہیں تھا کہ وہ فرنگیوں کی طرح بیٹی کو باہر نکلنے کی بھی آزادی دے دیتے۔ انہوں نے اسے بس اتنی آزادی دی تھی کہ وہ لکھ پڑھ لے۔ اور اس لکھائی پڑھائی نے خان بہادر مزمل اللہ شروانی کی بہن کو آگ بگولا کر دیا تھا۔

زاہدہ کا غصہ مشہور تھا۔ اس کو ڈانٹنا ایسا تھا جیسے کوئی شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال دے۔ لیکن ڈانٹنے والی بھی کوئی عام عورت نہ تھی کہ اسے خوف ہوتا، یہ ڈر ہوتا کہ وہ خان بہادر کی بیٹی کو ڈانٹ رہی ہے اس لیے کہ اس کی اپنی بھی ایک حیثیت تھی۔ وہ نہ صرف زاہدہ کی پھوپی تھی بلکہ اس کی ہونے والی ساس بھی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ خاموش تھی ورنہ اڑیل ٹٹو جیسی زاہدہ کو کب کوئی اس طرح سے سنا جاتا؟ اب تک تو وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ چکی ہوتی لیکن اس وقت وہ بس سر جھکائے بیٹھی زمین کو دیکھے جا رہی تھی۔ شاید وہ اس لیے بھی خاموش تھی کہ اگر یہ بات اس کے ابا جانی تک پہنچی تو وہ اپنی بہن کی ہی طرف داری کرتے۔ اس کی ہر ضد پوری کرنے کے باوجود اس معاملے میں وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرتے۔

پھوپی نے برقع اٹھایا اور آواز دی۔ ''احمد کہاروں سے کہہ دو تیار ہو جائیں۔ پردے کا انتظام کرا دو۔''

احمد نے کہاروں کو تیار رہنے کا کہہ کر پردہ والے کو آواز دی۔ ''بچے چادر پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ، بیبیاں آ رہی ہیں۔''

نوعمر لڑکے دروازے کے دونوں طرف اس طرح چادر تان کر کھڑے ہو گئے کہ ڈولی تک ایک گلی سی بن گئی۔

پھوپی اسے ڈانٹ ڈپٹ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد زاہدہ نے سر پکڑ لیا۔

''ڈر گئیں؟'' چھوٹے بھائی احمد نے طنز کیا۔

''میں ڈرنے والی نہیں ہوں۔ لکھتی رہوں گی، کیونکہ وقت کا تقاضا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس دیکھتے رہو میں کیسے نام بدل بدل کر لکھوں گی۔ قوم کو جگانے کے لیے لکھنا ضروری ہے۔''

زمانے کی چال بدل گئی تھی۔ جو عقل مند تھے وہ اس تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے۔ اپنے اطوار میں تبدیلی لا رہے تھے کیونکہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش زوروں پر ہے۔ مستقبل کی جھلک محسوس کرنے والے مسلمان امرا بھی اپنے تئیں کوشش میں مصروف تھے۔

1857 کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا۔ یہاں وہاں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بے شمار جاگیر دار عتاب میں آ چکے تھے۔ عتاب میں آ کر سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے تھے اور ان کی عورتیں بچے ادھر اُدھر چھپتے پھر رہے تھے۔ ایک عجیب سا ماحول تھا۔ ایسے میں کسی کا مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل ترتیب دینا آسان نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ دنوں پہلے جب 1875 میں سرسید احمد نے مسلمانوں کو آگے لانے کے لیے تعلیمی سرگرمی دکھائی اور محمڈن اینگلو کالج کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کو تعلیم کی جانب کھینچا تو لوگوں کے منہ بن گئے۔ طعنے تشنیع سے استقبال کیا گیا مگر وہ رکے نہیں' برصغیر کے کونے کونے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد شروع کر دیا۔ اس کام میں سرسید کے ساتھ ایک نام مسلسل سنائی دے رہا تھا' وہ تھا خان بہادر سر مزمل اللہ شروانی کا نام۔ نواب زادہ ہوتے ہوئے بھی وہ عام آدمی کی طرح سرسید احمد کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے۔ انہوں نے دور و

نزدیک کے تمام رؤسا کو نجی طور پر بھی خط لکھ کر مسلمانوں کی زبوں حالی دور کرنے کی گزارش کی تھی لیکن یہ کوشش پہلی نہیں تھی۔ اس سے برسوں پہلے بھی ایسی کوشش ہو چکی تھی۔

علی گڑھ سے دور بہت دور صوبہ بنگالہ ہے۔ وہاں مسلمانوں کی کثیر تعداد بستی ہے لیکن ان پر راج کرنے والے ہندو تھے جو مسلمانوں کو پیر کی دھول سمجھتے تھے۔ جب کہ اسی بنگال میں حاجی محسن بھی تھے جنہوں نے اپنی پوری جایداد مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔ 1732 میں حاجی فیض اللہ اور زینب خانم کے گھر پیدا ہونے والے محسن نے ابتدا سے ہی فقیرانہ طرز زندگی اپنا لی تھی۔ ان کے لیے والدین کا گھر موجود تھا مگر گھر میں سونا بھی پسند نہ کرتے۔ انہوں نے شب بسری کے لیے اپنے بنائے ہوئے ہگلی امام بارگاہ (ہگلی، مغربی بنگال۔ انڈیا) میں رہائش رکھی۔ خود روکھی سوکھی کھاتے مگر غربا کی خوب خوب امداد کرتے۔ اسی وجہ سے وہ تاریخ میں ''دان بیر'' (بہت زیادہ بانٹنے والا) کے نام سے پہچانے گئے۔

ایک دن انہوں نے ہگلی اسٹیٹ کے دیوان کو بلا کر کہا۔ ''یہ لو حساب کتاب کی پوتھی۔ میں کسی کام سے جا رہا ہوں۔''

اور پھر ایسے غائب ہوئے کہ کئی سال تک کسی کو خبر نہ ملی کہ وہ کہاں ہیں۔ چاند سورج کا کام ہے اترنا اور چڑھنا۔ وہ اترتے چڑھتے رہے۔ دن گزرتا رہا دن ہفتے میں اور ہفتہ سال میں بدلتا رہا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی کہ وہ گئے تو آخر گئے کہاں کہتے ہیں نا، نگاہ اوجھل تو پہاڑ اوجھل۔ لوگ بھولنے لگے تھے کہ خبر آ گئی۔ وہ مکہ اور مدینہ میں دیکھے گئے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ اب تو جایداد رہی نہیں۔ کھانے کے لالے پڑ رہے تھے اسی لیے وہ یہاں سے بھاگ لیے ہیں۔ لوگوں کی نظروں میں ان کا ملک سے باہر جانا فرار کہلایا لیکن وہ تو حج کے لیے گئے تھے۔ حج سے فارغ ہو کر کربلا اور نجف کی زیارت کو نکل گئے۔ اس وقت رسل و رسائل کی بہت زیادہ کمی تھی۔ نزدیکی علاقوں کے لیے بیل گاڑی اور ڈولی استعمال ہوتی تھی۔ دور دراز کے سفر میں اونٹ' خچر' گھوڑے کام میں آتے تھے۔ اس وقت نہ تو ریل تھی اور نہ ہوائی جہاز۔ ابھی اس قسم کی سواریاں ابتدائی مراحل میں تھیں۔ بس ایک گھوڑا تھا جو لوگوں کو دور دراز کے شہر لے جاتا تھا یا پھر خچر کو آزمایا جاتا تھا۔ وہ بھی خچر پر سوار ہو کر ان مقدس مقامات کی زیارت کر آئے۔ وطن پہنچے تو ان کی بہن منی جان نے اپنی تمام جایداد ان کے نام کر دی۔ منی جان کے انتقال کے

زرخش کی شائع شدہ تخلیقات

اخبار النسا خواتین کا پہلا اخبار تھا جو 1885 میں مولف فرہنگ آصفیہ نے شروع کیا۔ اس کے بعد عورتوں کے لیے جو جریدہ سامنے آیا اس کا نام ''تہذیب نسواں'' ہے۔ اس میں زرخش کی 5 تخلیقات شائع ہوئیں۔

اپریل 12 اپریل 1913
ماہ مبارک کے مناظر 8 جون 1919
خدا 21 جنوری 1920
بی بی آمنہ کا بستر مرگ 20 ستمبر 1920
واقعہ فاجیہ 25 جنوری 1921

بعد انہوں نے ان کی دولت کو پھر سے عوامی خدمت کے لیے خاص کر تعلیم کی ترویج کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا اور مدرسہ عالیہ جیسا ایک اہم ادارہ بنا دیا جس کی شاخیں ہگلی، ڈھاکا، کلکتہ، پٹنہ کے علاوہ بھی کئی شہروں میں قائم ہوئیں۔ وہاں حدیث و فقہ کی تعلیم آج تک دی جا رہی ہے لیکن ان مدرسوں میں کسی ایک فرقہ کی تعلیم دینا منع تھا۔ ہر فقہ کی تعلیم دی جاتی اور اختلافی باتوں سے گریز کیا جاتا (یہ روایت آج تک قائم ہے)۔ حاجی محسن اور سرسید کے لائین آف ایکشن میں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ سرسید مغربی تعلیم کو اہمیت دیتے تھے اور حاجی محسن اسلامی۔ حاجی محسن کا مشن پہلے سے ہی راستہ ہموار کر چکا تھا اس لیے سرسید کی پکار پر بنگال کے مسلمان روسا نے فوراً لبیک کہا لیکن وہاں مسلمان رؤسا کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کو خوب نوازا تھا اس لیے بڑی بڑی جایداد ہندوؤں کے پاس تھی۔ آٹے میں نمک کے برابر مسلم روسا تھے۔ انہوں نے ہی سرسید کو بنگال میں بھی تعلیم عام کرنے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں بنگال کے مسلمانوں نے 1906 میں ایک کنونشن کا انعقاد کیا۔ یہ کنونشن ڈھاکا میں ہوا تھا جس کے روح رواں تھے نواب آف ڈھاکا سر سلیم اللہ خان۔ خان بہادر غلام مصطفیٰ چودھری آف سونم گنج' کومیلا مشرقی بنگال۔ سر امیر علی بیرسٹر آف کلکتہ۔ وقار الملک (میرٹھ۔ یو پی) سر نبی اللہ (کارا۔ الہ آباد۔ یو پی) ان کی کوشش سے ایک نئی جماعت برائے مسلمانانِ ہند بن گئی لیکن اب اسے چلانے کے لیے سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اس کنونشن میں شامل کیا گیا۔ جن میں بنگال کے حسین شہید سہروردی۔ اے کے فضل

الحق۔ محمد علی بوگرا۔ خواجہ ناظم الدین کے علاوہ دیگر حصوں کے مسلمان رہنما سر فیروز خان نون (مغربی پنجاب)۔ چودھری خلیق الزمان (چنار۔ مرزا پور۔ اتر پردیش) نواب زادہ لیاقت علی خان (کرنال۔ مغربی پنجاب) کو بھی اس نئی پارٹی میں عہدہ دیا گیا۔ گویا اب مسلمانوں کی سیاست کا دور چل پڑا تھا۔ اس کنونشن میں خان بہادر مزمل اللہ شروانی بھی شریک تھے۔ وہ مسلمانوں کی زبوں حالی سے پریشان تو تھے لیکن حکومت انگلشیہ کو للکارنے پر آمادہ نہ تھے اس لیے سیاست سے دور ہی رہے۔

مسلم لیگ بن چکی تھی۔ مسلمان اپنی سیاسی پارٹی کو آگے بڑھانے میں کوشاں تھے لیکن زیادہ تر مسلمان رؤسا خود کو سیاست سے دور رکھنے کی کوشش میں تھے۔ سر مزمل اللہ بھی سیاست میں حصہ نہیں لے رہے تھے لیکن ان کی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ تھی۔ اس لیے صرف تعلیمی پروگراموں میں حصہ لیتے مگر امداد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ انہی میں سر مزمل اللہ شروانی کی بیٹی تھی' زاہدہ بیگم جو زبانی طور پر اپنی پھوپی کے بیٹے سے منسوب تھی۔

وہ 1894 میں پیدا ہوئی تھی۔ 8 دسمبر 1894 کو بھیکم پور کی اسی حویلی میں جو ظفر منزل کہلاتی تھی۔ اس وقت اس کی بڑی بہن احمدی بیگم ڈیڑھ سال کی تھی۔ احمدی بیگم سے پہلے ایک بیٹا ہوا تھا جو پیدا ہوتے ہی راہی ملک عدم ہو گیا تھا۔ گویا اب یہی دو بہنیں تھیں۔ وہ دونوں' وقت کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ حجازی بیگم بیٹیوں کا خوب خیال رکھتیں' چھوٹی ہونے کی وجہ سے زاہدہ کا خیال زیادہ رکھتیں۔

زاہدہ کے بعد ایک بیٹا ہوا جس کا نام انیس خان رکھا گیا۔ انیس کے بعد بھی زاہدہ کی اہمیت کم نہ ہوئی اس لیے کہ وہ نہ صرف من موہنی تھی بلکہ اس کی زبان سے ادا ہونے والے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بھی من موہ لیتے تھے لیکن ابھی وہ اس سے دل بھر کر کھیل بھی نہ پائیں تھی کہ وہ حادثہء جانکاہ رونما ہو گیا۔

زاہدہ ابھی ڈھائی تین سال کی تھی کہ حجازی بیگم پھر امید سے ہو گئیں۔ گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور لوگ نئے [illegible] کی آمد کی راہ دیکھنے لگے۔ یہ ظفر منزل کا امتیاز تھا کہ یہاں [illegible] اور غمی کھل کر منائی جاتی تھی۔ لوگ اسی [illegible] سے زچگی کا انتظار کر رہے تھے اور وقت تھا کہ بہت دھیرے [illegible] سے گزر رہا تھا۔ ہر کوئی جھولی بھر [illegible] اور حجازی [illegible] سے کھلی پڑتیں۔ بالآخر آس اور امید کے [illegible] زچگی کا وقت آ گیا۔

علاقے کی مشہور اور تجربے کار دائیہ کو بلایا گیا۔ اس [illegible] کوشش شروع کر دی لیکن قسمت کے لکھے کو کون ٹالے۔ 17 نومبر 1897 کو مردہ بیٹے کی پیدائش کے ساتھ حجازی بیگم نے بھی دنیا سے ناتا توڑ لیا۔ ماں کے انتقال کے بعد زاہدہ کی دیکھ بھال کی ذمے داری انا بوا پر آ گئی لیکن وہ اس سانحے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی تھی اور ماں کی کمی پوری کرنے کے لیے باپ کے اور قریب آ گئی تھی۔ خان بہادر مزمل اللہ بھی اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

ابھی عمر میں وہ بہت چھوٹی تھی لیکن خوب پٹر پٹر بولتی۔ اس کی باتیں سن کر سب دنگ رہ جاتے۔ اتنی سی عمر میں اس کے جملے اور اس کا تجزیہ اتنا اعلیٰ ہوتا کہ سننے والا سوچ میں پڑ جاتا۔ لوگ سوچتے کہ یہ بات کسی بڑے نے سکھائی ہو گی۔ خاندان میں پردے کا سخت رواج تھا اس لیے وہ مردانے میں تو آتی نہیں تھی لیکن اس کے جملے دوسروں کی زبان پر سفر کرتے ہوئے باہر بھی آ جاتے تھے۔ اس کی بڑی بہن احمدی اور چھوٹا بھائی احمد اللہ بھی زاہدہ خاتون کی عقل کے آگے مات کھا جاتے تھے۔ زاہدہ خاتون کی رسم بسم اللہ علی گڑھ کے مولوی حافظ احمد علی نے کی تھی لیکن ''آمین'' کے بعد خان بہادر مزمل اللہ نے ایک نئی بات کہہ دی۔ انہوں نے کہا۔ ''اب میری بیٹی فارسی بھی پڑھے گی۔''

اس دور میں فارسی ہی دفتری زبان تھی۔ لڑکیوں کو دفتری زبان پڑھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سب کے سب حیرت میں ڈوب گئے کہ یہ مزمل اللہ کو ہوا کیا ہے۔ بیٹی کو فارسی پڑھائے گا۔ کیا اسے درباری بنائے گا؟ کہیں نوکری کرائے گا؟

لوگوں کی باتیں وہ سنتے رہے لیکن اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔ انہوں نے فارسی پڑھانے والے کی تلاش شروع کر دی۔ جس وقت رسم بسم اللہ ہوئی تھی اس وقت زاہدہ کی عمر چار سال تھی اس لیے اسے مولوی صاحب کے سامنے بٹھا دیا گیا تھا مگر اب وہ نو برس کی ہو رہی تھی اسے کسی غیر مرد کے سامنے کیسے لایا جاتا، یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا۔ اب تک زاہدہ بیگم کا تعلیمی سلسلہ والدہ محمد شفیع کے مرہون منت تھا۔ انہیں اس کام کے [illegible] اسے بلایا گیا تھا۔ وہ نہ صرف زاہدہ بیگم کو حروف شناسی [illegible] احکام اور [illegible] پڑھاتیں بلکہ سینا پیرونا بھی سکھاتی [illegible] وہ ملا [illegible] سے بہت کچھ پڑھنا سیکھ گئی تھی کہ [illegible] اور مزمل [illegible] کا شوشا چھوڑ دیا۔

خان [illegible] بڑی شد و مد سے تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ اپنے دوستوں سے بھی اس مسئلے پر بات کرتے کہ

کوئی انہیں فارسی کی کسی معلمہ کا پتا بتا دے۔ اسی دوران ان کا جانا بھوپال ہوا۔ دکن کے بعد بھوپال وہ دوسری بڑی ریاست تھی جس کے حکمراں مسلمان تھے۔ جہاں اسلامی روایت کی پابندی کی جا رہی تھی۔ اسی بھوپال میں آغا کمال الدین سنجر کی بہن رخشندہ خاتون بھی رہ رہی تھیں۔ ان کا نام سامنے آیا۔ انہوں نے اپنے ذرائع سے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تہران کی ایک تعلیم یافتہ' علم و ادب کی دلدادہ خاتون ہیں اور ایرانی حکمران کے عتاب کا شکار ہو کر ہند آ گئی ہیں۔ ان کے بارے میں چھوٹی بڑی معلومات جمع کرنے کے بعد وہ ان کے ہاں پہنچ گئے اور ان کی خدمت حاصل کر لی۔

رخشندہ خاتون کی فارسی ادب پر دسترس تھی۔ وہ شاعری سے بھی شغف رکھتی تھیں۔ شاید یہ انہی کا اثر تھا کہ زاہدہ کو بھی شاعری کی سمجھ آنے لگی۔ ابھی فارسی پر اتنی دسترس نہیں تھی کہ وہ فارسی میں کچھ کہہ سکتی اس لیے اس نے اردو میں اشعار کہنے کی کوشش شروع کر دی اور صرف دس سال کی عمر میں جو چند اشعار کہے وہ قابل تعریف ہیں۔ وہ کہتی ہے:

ایسی بنوں میں شاعرہ جیسی کوئی نہ ہو
سارا جہان نظم میری دیکھتا رہے
میں شاعری میں اتنی ہوں مشہور کبریا
سورج کی طرح نام چمکتا رہے میرا

رخشندہ خاتون تھیں تو قابل۔ ان کا اثر پور پور سے جھانکنے لگا۔ حالانکہ وہ ان سے پہلے مولوی محمد یعقوب اسرائیلی سے سبق لیتی تھی۔ وہ بھی قابل تھے۔ ان کے ذمے تھا کہ وہ حساب کے ساتھ صرف و نحو بھی سکھائیں۔ سو انہوں نے دلجوئی سے اسے سکھایا تھا۔ صرف و نحو آ جائے تو شاعری کی بھی سمجھ آ جاتی ہے۔ اسی کا ثمر تھا کہ وہ شاعری کو سمجھنے لگی تھی۔ وزن کی پہچان بخوبی کر لیتی تھی۔ فارسی اور عربی کی شاعری کو بھی وہ پڑھنے لگی تھی۔ اس طرح اس کا مطالعہ بڑھتا جا رہا تھا۔

زاہدہ کو عربی قوائد میں طاق کرنے والے مولوی سید احمد ولایتی تھے۔ انہوں نے ہی اسے حدیث اور قرانی تراجم کی تعلیم بھی دی تھی۔ وہ زاہدہ کے بھائی کو پڑھانے کے لیے رکھے گئے تھے لیکن ان کا اصل فائدہ زاہدہ نے اٹھایا تھا۔ وہ ان کے دیے گئے سبق کو ذہن میں نقش کرتی رہی تھی۔ وہ عربی کسی اہل زبان کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ عربی کے ذخیرہ الفاظ کو بڑھانے کے لیے وہ عربی شاعری بھی پڑھنے لگی تھی۔ فارسی میں تو طاق تھی ہی۔ اساتذہ کے کلام نے اس کی طبیعت میں بھی جوار بھاٹا پیدا کرنا شروع کر دیا۔ اس پر رخشندہ خاتون کی صحبت۔

عالیہ ڈانا ہانگٹن 16 جنوری 1979 کو بروکلین نیویارک میں پیدا ہوئی تھی۔ جب وہ صرف دس سال کی تھی تو اس نے ایک کنسرٹ میں اپنی گلوکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب وہ صرف پانچ سال کی تھی تو اس کی دادی نے محسوس کر لیا تھا کہ عالیہ میں گانے کی صلاحیت ہے۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتیں۔ برتھ ڈے پارٹیز میں عالیہ سے گانے سنے جاتے۔ کبھی کبھی کوئی اسکول بھی اسے اپنے فنکشن میں بلا لیا کرتا۔ اس طرح اس کی آواز سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اسی دوران اس کی پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس نے ڈیٹرائیٹ کے ایک اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا قد تھوڑا چھوٹا تھا۔ اسی لیے اس کے ساتھی طالب علم اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن اس نے اپنی آواز کا جادو جگا کر اپنی اس کمی کو پورا کر لیا تھا۔ اب سب اس کے مداح اور گرویدہ تھے۔ اس کے کیریئر کو بنانے میں اس کی فیملی نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ اس کا باپ ہی اس کا مینیجر تھا۔ وہی معاہدے کیا کرتا۔ جب وہ صرف بارہ برس کی تھی تو اس کا پہلا البم ریلیز ہوا تھا۔ صرف امریکا میں اس البم کی تیس لاکھ کاپیاں فروخت ہوئی تھیں۔ اس کا دوسرا البم one in a million تھا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ اس کا تیسرا... البم عالیہ تھا۔ یہ اس کا آخری البم ثابت ہوا۔ اس نے موسیقی کا معتبر ایوارڈ گریمی ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔ اس کی موت بہت اچانک ہوئی۔ وہ اپنے چوتھے البم کی ریکارڈنگ کے لیے جاری تھی کہ بہاماس جزیرے کے قریب اس کا جہاز کریش ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 22 سال تھی۔ یہ حادثہ اگست 2001ء میں ہوا تھا۔

☆☆

بلال خان ایک معروف ٹی وی ایکٹر 11 اگست 2010ء کو موت کی گود میں جا سویا۔ 12 اگست کو اس کی سالگرہ تھی۔ وہ ڈرامے کے سیٹ پر گیس کے اخراج سے حادثے کا شکار ہوا۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔

☆☆

رخشندہ خاتون کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ ذہن کو وسعت ملتی جارہی تھی۔ وہ اتنی سی عمر میں بڑی بڑی باتیں سوچنے لگی تھی۔ ادھر خان بہادر نے بیٹے کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے استاد سے انگریزی پڑھنے کے بعد اپنی بہن کو بھی پڑھایا کرے۔ اس طرح زاہدہ انگریزی بھی سیکھنے لگی۔ بھائی کی محنت اور خود اس کی دلچسپی کہ وہ انگریزی میں بھی طاق ہوگئی اور انگریزی کتب بھی پڑھنے لگی۔ فارسی اور عربی ادب تو وہ پڑھتی ہی تھی اب انگریزی ادب سے بھی گوہر تلاش کرنے لگی۔

کتب ذہن کو وسعت عطا کرتی ہے۔ اس کی سوچ بھی وسیع ہورہی تھی۔ وہ دور ایسا تھا کہ لڑکیوں کو سر اٹھا کر چلنے، زور سے ہنسنے پر بھی پابندی تھی مگر اس کے دادا جی نرالے تھے۔ وہ ہنستی مگر اتنی دبی آواز سے کہ پاس والے بھی اس مترنم آواز سے محروم رہ جاتے مگر جب اکیلی ہوتی تو اس کی حرکتیں دیکھنے والی ہوتیں۔ وہ منہ میں دوپٹا ڈال کر ہنستی اور خوب ہنستی۔ حالانکہ وہ اب بارہ سال کی ہوچکی تھی۔ یہ عمر اس دور میں لڑکیوں کے لیے بہت بھاری تھا کیونکہ ان پر پابندیاں بہت سخت کردی جاتی تھیں۔ اس پر بھی پابندیوں کا بوجھ لادا جارہا تھا جسے وہ قبول کرنے پر مجبور تھی۔ مگر کیا کرتی کہ اس کے اندر ایک اور ہی زاہدہ سانس لے رہی تھی جوان پابندیوں میں رہ کر بھی کچھ کر دکھانے کا سوچتی۔ وہ چاہتی تھی کہ ذہن میں ابلتے خدشات کو الفاظ کا پیرہن نہ دے مگر کیا کرتی کہ اسے خود پر اختیار نہ تھا۔ جب وہ اپنے آس پاس دیکھتی تو عورت ذات کو سسکتے کراہتے پاتی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ لڑکی کے روپ میں جنم لینے پر اسے تعصبات سے پنجہ آزمائی کرنی ضروری ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں عورت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ عورتوں کے ساتھ کس طرح تعصب برتا جاتا ہے اس کا شعور اسے آچکا تھا۔ وہ ان خواتین کے بارے میں جن کی سماجی سطح پر ناانصافی ہوئی ہے ان کا تفصیل سے وہ اپنے روزنامچے میں ذکر کرتی رہی تھی۔ اس سلسلہ میں اس نے کچھ بعد ایک طویل نظم لکھی تھی ”آئینہ جرم“ جو کافی مشہور ہوئی تھی اور بہت سارے رسائل میں چھپی تھی۔ وہ فکری طور پر عورتوں کو اوپر لانا چاہ رہی تھی لیکن اس کی سوچ میں بغاوت کا عنصر کہیں نہیں تھا، وہ ان پابندیوں سے بغاوت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے کچھ حدود مقرر کردیئے ہیں جو عورتوں کے لیے حفاظت کی دیوار ہیں۔ ایک حفاظتی حصار ہے مگر اسے غلط انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔ وہ ان سے، اس مردوں والے معاشرے سے ٹکرا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے وہ اسی حصار میں رہتے ہوئے کچھ کر دکھانا چاہتی تھی۔ اسی دوران اس پر ایک نیا خبط سوار ہوا۔ اس وقت حویلی میں کئی خاندان بود باش رکھتے تھے۔ ان رشتے داروں میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ اس نے حویلی کی تمام لڑکیوں کو جمع کیا اور ایک نیا پروگرام رکھا۔ اس پروگرام کا اہم نکتہ یہ تھا کہ وہ سب ایسا کچھ کر دکھائیں کہ لوگ حیران ہو جائیں۔ پھیرو پنکھ پھیلانے کو تیار تھے مگر آزاد نہیں تھے۔ قفس کا دروازہ بند تھا۔ معاشرتی پابندیوں کی سلاخیں راہ میں حائل تھیں۔ وہ بس اپنے حد میں رہ جاتیں۔ ایسے وقت میں اس نے سب کو جمع کر کے کہا۔ ”ہم نے سوچا ہے۔ ایسا کچھ کریں جس پر ہمارے بزرگ بھی اعتراض نہ کریں اور ہم ایسا کچھ کر جائیں جو لوگوں کے لیے انوکھا ہو۔ تو اے میری بہنو ہم نے سوچا ہے کہ ایک ایسی انجمن بنائی جائے جس میں ہم سب شریک ہوں اور وہ انجمن کچھ ایسا کر دکھائے کہ لوگ مثالیں دیں۔ اس کے لیے میں نے سوچا ہے کہ ایک انجمن کی بنیاد رکھی جائے جو ہم سب کی آواز ہو۔ انجمن کا نام ہوگا۔ ”انجمن معین النسواں“۔

ساری بہنوں نے اس بات کو سراہا۔ اس طرح سے وہ بھی کچھ کر دکھا سکتی تھیں کیونکہ وہ بھی تو دبی کچلی خواہشات رکھنے والیاں تھیں۔ سب کی سب اس انجمن کی ممبر بننے پر تیار ہو گئیں۔ اس انجمن میں جتنی بھی لڑکیاں تھیں سب کو عہدے دار بنایا گیا۔ کل ملا کر آٹھ ممبر، آٹھ عہدے دار۔ ان میں بڑی بہن احمدی بیگم تھیں۔ پھوپی زاد بہنوں میں اصیہ بیگم۔ مونسہ بیگم کے علاوہ بھائیوں کو ملا کر کل 8 افراد شامل تھے۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد یہ تھے۔

1۔ نہایت مفید اور ضروری کاموں میں فرقہ نسواں کی شرکت اور اس کی امداد کرنا۔

2: تبادلہ خیالات۔

3: اردو معلیٰ کی خدمت جو اسپیچ لیکچر کے ذریعہ کی جاتی ہے اور سب لیکچر سیکریٹری کے پاس جمع ہوں گے۔

4: مستورات چھوٹے چھوٹے جلسوں میں شریک ہو کر بڑے جلسے کی تیاری کریں۔

5: بی بیوں کو ممبر پر سپیڈ یعنی شپ کے فرائض سکھانا۔

6: مستعدی اور گرم جوشی کی عادت ڈلوانا۔

7: قومی کاموں میں حصہ لینے کا شوق دلانا۔

8: لائق اور پُرجوش کارکنوں کو شہرت دلا کر انہیں قومی کاموں کے لیے ترغیب دینا۔

پہلی میٹنگ جسے اس نے جلسہ قرار دیا تھا اس کا دعوت نامہ تمام ممبران کو بھیج دیا گیا۔ وہ دور ایسا تو تھا نہیں کہ لڑکیاں پرس اٹھاتیں اور چلی آتیں۔ آنے جانے کے لیے ڈولی کہار اور پردے کا انتظام لازمی تھا۔ پھر ساتھ جانے کے لیے گھر کے کسی مرد کا ساتھ بھی ضروری تھا۔ یعنی کہ کہیں جانے سے قبل تیاری ضروری تھی۔ میٹنگ ہنگامی بنیاد پر بلائی گئی تھی اس لیے رخنہ آگیا۔ ان ممبران کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ وہ چاہ کر بھی نہ آسکیں۔ اس ”جلسہ“ میں کل دو افراد شریک تھے ایک وہ خود اور دوسری احمدی۔ وہ اسی کو اپنی کامیابی سمجھنے لگی کہ انجمن کے ایک چوتھائی میٹنگ میں شریک ہوئی یعنی آٹھ ممبران میں دو۔

وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن قسمت اسے ہر گام پر ٹھکرانے پر تلی تھی۔ وادھیال کی طرح ننھیال میں بھی وہ مقبول تھی۔ اس کے نانا نانی اسے بہت چاہتے تھے۔ وہ خود بھی انہیں بہت قریب سمجھتی تھی۔ 1911 میں اس پر غم کا ایک کوہ گراں سا گرا۔ وہ نانی جو اسے بہت عزیز تھیں یکایک دنیا سے منہ موڑ گئیں۔ ابھی وہ ان کا سوگ منا ہی رہی تھی کہ دو سال بعد اس کے ضعیف نانا حاجی محمد کریم اللہ خان بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس بارے میں اس نے اپنے روزنامچہ میں لکھا۔ ”میری آنکھیں خشک ہیں مگر دل ہر وقت خون روتا ہے۔ اور ننھیال کی حویلی کا چپہ چپہ حسرت کے ساتھ آنکھوں میں گھوما کرتا ہے۔ جس میں پہلے نانا نانی اور پھر خالہ کے زیر سایہ ہزاروں مسرت پاش لیل و نہار بسر کیے ہیں۔“

ماں کی یاد تو ذرا بھی نہیں تھی کیونکہ وہ اس عمر میں اسے چھوڑ گئیں جب وہ ہوش مند نہ تھی اس لیے ان کی یاد کبھی دل دکھاتی ہی نہیں تھی مگر نانا نانی اور خالہ کی جدائی نے دل میں درد کے سوتے جگا دیے تھے۔ وہ انہیں یاد کرتی اور روتی رہتی تھی۔ اب اس کی شاعری میں بھی درد گھر آیا تھا ”ہمارے بعد“ ”عید کا چاند“۔ ”آخری شعاع“ جیسی غمناک نظمیں ثبوت ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اب غم واندوہ نے اس کے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔ پھر بھی وہ مسلمانان ہند کے مسائل سے آنکھیں چرا نہیں رہی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کا ایک مسئلہ سب کی توجہ مبذول کیے ہوئے تھا۔ سرسید کا محمڈن اینگلو اردو اورینٹل کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے سب کوشش میں تھے۔ اس سلسلہ میں اس نے بھی اپنا حصہ ڈالنا شروع کردیا۔ اس نے اپنی جانب سے چندہ تو دیا ہی ساتھ ہی ساتھ ماہنامہ خاتون علی گڑھ میں ایک منظوم اپیل بھی شائع کرائی۔ جسے بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے کئی دیگر اخبارات و رسائل نے بھی اپنے ہاں جگہ دی۔

طاہرہ واسطی 1944ء میں سرگودھا میں پیدا ہوئیں۔ وہ جتنا اچھا لکھتی تھیں اتنی ہی اچھی اداکاری بھی کرتی تھیں۔ شمع، آخری چٹان، افشاں، ولدل، فشار، جیب کترا، جانگلوس، کشکول، شاہین، رات، ٹیپو سلطان، ہرجائی، دل دیا دہلیز، ممتا، مورت، دوراہا، ہرجائی، چاند گرہن، خلیج، غرناطہ، تیرہ ہیر (پشتو)، شام سے پہلے، اس کی بیوی، ہیر وارث شاہ جیسے مشہور ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ 11 مارچ 2012ء کو انہوں نے طبعی موت کو گلے لگایا۔

☆☆

فوزیہ عظیم یکم مارچ 1990ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئی۔ 2013ء میں وہ پاکستانی آئیڈیل میں آڈیشن دے کر مشہور ہوئی۔ انٹرنیٹ پر جسے سب سے زیادہ تلاش کیا گیا ان ٹاپ ٹین میں سے وہ ایک تھی۔ اس نے سوشل میڈیا کے ذریعے شہرت کی بلندی حاصل کی۔ فیس بک اور ٹیوٹر پر وہ ایسے مزاحیہ جملے لکھتی جو نوجوانوں میں فوراً مقبول ہو جاتے۔ اس کی سب سے شہرت یافتہ وہ پوسٹ تھی جو اس نے مفتی عبدالقوی کے ساتھ ایک ہوٹل میں بنائی جس نے پورے پاکستان میں ہلچل مچا دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہی پوسٹ 15 جولائی 2016ء کو اس کے قتل کا محرک بنا۔ اس کے بھائی وسیم عظیم نے قتل کا الزام اپنے سر لیا۔ وہ قندیل بلوچ کے نام سے مشہور تھی۔

☆☆

کنال سنگھ 29 ستمبر 1973ء کو بھارتی صوبہ ہریانہ میں پیدا ہوا۔ اسے پہلا بڑا رول 1999ء میں فلم ”کدھر دمی نم“ میں ملا۔ اس کے مقابل میں سونالی باندرے تھی۔ اس فلم کی کامیابی نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا لیکن بعد کی فلمیں ایک کے بعد ایک ناکام ہوتی گئیں جن میں ”پیسا واکم پیسم“ (2008)، ”نینیلم کدھائی“ (2007) شامل ہے۔ لیکن ”پاروائی اوندرے پدھم“ (2001)، ”پنا گئی دیم“ (2003ء)، ”دیوتھائی کندین“ (2005ء) نے خوب کامیابی حاصل کی۔ 2000ء میں اس کی فلم ”دل ہی دل“ میں جو کدھلر دھیم کا اردو ورژن تھا، ہٹ ثابت ہوئی۔ 7 فروری 2008ء کو اس کی لاش اس کے فلیٹ میں پنکھے سے جھولتی ہوئی ملی۔

☆☆

اسی دوران بنگال کی تقسیم کا معاملہ تنسیخ کی زد میں آیا تو... اس نے اس معاملے کو بھی نظم کیا:

لارڈ کرزن نے جو بنگال کو تقسیم کیا
اس سے ہم سادہ دلوں کو تھی مسرت کیسی
مٹ گئی آن میں وہ حرف تمنا کی طرح
بل تک آیا نہ جبینوں پہ شکایت کیسی

یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ لوگ نقل کر کر کے ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ اس نے ادبی انداز میں آواز اٹھانے کے ساتھ عملی کام کی جانب بھی توجہ دے رہی تھی۔ بھیکم پور اور دتاولی کی لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے اپنی انجمن کے تحت ایک فنڈ قائم کیا۔ اس فنڈ سے اس نے شروانی اسکول قائم کیا۔ معلم کا تقرر کیا۔ معلم کو پابند کیا کہ وہ لڑکیوں کو تعلیم دے۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں وہ ہمیشہ سے حساس تھی۔ ہمیہ خاتون کو لکھے ایک خط میں یہ بات آشکار ہے۔ ".....حیران صاحب نے سرمایہ لیگ میں ایک اور شگوفہ چھوڑا ہے کہ مردانہ چندے میں شامل ہو کر (میری معرفت) ترکی جائے۔ افسوس مردوں کی کوئی بات جھگڑے اور نفسانیت سے خالی ہوتی ہی نہیں۔ ایک تو لڑکیوں کی حق تلفی ہوئی کہ تقریباً مردانہ کاموں میں ہی سرمایہ صرف ہوا۔ دوسرے ستم یہ کہ لڑکیوں کی معرفت نہ جائے۔"

لڑکیوں کے حقوق کے لیے وہ بہت حساس تھی۔ اور اپنے حدود میں رہتے ہوئے وہ بہت کچھ کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ کئی پروگرام بنائے ہوئے تھی کہ برصغیر کا سیاسی افق بالکل بدلنے لگا وہی لوگ جو کل بغلگیر ہوا کرتے تھے اب دور دور نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ کوئی ہندو کسی مسلمان سے راہ و رسم تک نہیں رکھے گا۔ مسلمانوں میں اعتماد پیدا ہونے لگا تھا۔ اس موقع پر اس نے کئی نظمیں لکھیں جو عوام نے پسند کیں لیکن ایک بات پوری طرح آڑے آرہی تھی۔ وہ اپنے والد سے بہت پیار کرتی تھی لیکن ان کے خیالات سے وہ کبھی بھی متفق نہ ہو سکی۔ والد کو انگریز حکومت کی جانب سے "سر" کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ انگریزوں کے حق میں تھے جب کہ زاہدہ خاتون انگریزوں کی مخالف تھی۔ دونوں باپ بیٹی دو الگ راستوں پر چلنے والے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے اب کھل کر میدان میں آچکی تھی لیکن زاہدہ اپنی شناخت ہنوز چھپائے رہی۔ وہ دانستہ اپنا نام استعمال نہیں کرتی۔ اس دور کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اپنا نام نہیں دے سکتی تھی۔ خود اس کے گھر والوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ زخ ش کے نام سے کون لکھ رہا ہے۔ اس بارے میں اپنی سہیلی (خواجہ حسن نظامی کی بیگم) لیلیٰ خواجہ بانو کو خط میں لکھتی ہے۔ "لیلیٰ غور تو کرو اگر میں نے اپنے نام سے مضمون نگاری شروع کی ہوتی تو کس قدر غضب ہو جاتا۔ اگر میرے والد کے کان تک میں یہ بھنک پڑ جاتی کہ کسی غیر مرد نے مجھے کسی غیر مرد کے پیچھے گالیاں دی ہیں تو واللہ میرے لیے قیامت صغرا کا سامنا ہو۔ مضمون لکھنا تو کیا ہو۔ دنیا بھر کا کوئی اخبار میرے ہاتھوں میں نہ دیا جائے۔ اور تو کیا اپنا خاندان علیحدہ مجھے زندگی سے بے زار کر دے۔ خدا کا ہزار شکر ہے کہ معاملہ خیریت سے گزر گیا ورنہ یہ دنیا میرے لیے اندھیر ہو جاتی۔"

چھوٹی عمر کے خواب بھی چھوٹے ہوتے ہیں لیکن وہ اس عمر میں بھی بڑے بڑے خواب دیکھنے لگی تھی۔ جبکہ اس کی دنیا اپنی حویلی تک محدود تھی لیکن وہ اخبارات اور کتب بینی کا شغف بھی رکھتی تھی اسی وجہ سے باہر کی دنیا اجنبی نہیں تھی۔ چھوٹی بڑی خبروں سے آگاہ رہتی تھی۔ اسے جب یہ خبر ملی کہ کچھ شر پسندوں نے کانپور شہر کی ایک مسجد کے وضو خانے کو منہدم کر دیا ہے اور ان کا ساتھ انگریز حکومت بھی دے رہی ہے تو اس کا دل غم و غصے سے بھر اٹھا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو ہوش میں لانے کے لیے قلم اٹھا لیا۔ ایک طویل نظم لکھی اور اسے چھپنے کے لیے بھیج دیا۔

نظم چھپتے ہی مقبول ہو گئی۔ لوگ اس نظم کو محفلوں جلسوں میں پڑھ کر ملت کو بیدار کرنے لگے۔ اس وقت خود مدیر کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ نظم ایک چھوٹی سی بچی نے لکھی ہے۔ اس نے کانپور کی مسجد کا سانحہ دل پر لیا تھا۔ ایک کے بعد ایک کئی نظمیں لکھیں اور اسے شائع کرنے کے لیے بھیج دیا۔ خیالات میں پختگی تھی اور فن شاعری پر بھی گرفت مضبوط تھی اس لیے اس کی ایک بھی نظم مسترد نہ ہوتی۔ لوگ اسے نہ صرف دلچسپی سے پڑھتے بلکہ اسے جلسوں میں بھی پیش کیا جاتا۔ یوں بھی یہ دیکھنے میں آرہا تھا کہ ہند کے مسلمانوں میں بیداری آتی جا رہی ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے آواز بھی بلند کرنے لگے ہیں۔ وہ خود بھی ہند کے بدلتے ہوئے سیاسی ماحول پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ گو کہ ابھی صغیر سنی کا دور تھا لیکن خیالات اتنی اونچی پرواز پر تھے کہ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ نظمیں ایک چھوٹی سی بچی لکھ رہی ہے۔

زاہدہ اپنے اس مشغلہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اپنے پُرآشوب ایام حیات کے متعدد مناظر یکے بعد دیگرے سرعت برق کے ساتھ گزر گئے۔ سب سے پیشتر مجھے خیال آیا ٹھیک انیس سال قبل جب ایک معمولی وجود نے اس خارزار ہستی میں قدم رکھا تو اس کے ساتھ ہی ایک غیر معمولی ہستی نے بھی جنم لے لیا۔ یہ غیر معمولی وجود ایک قسم کی تشنگی تھی۔

یہی تشنگی اسے بے چین رکھتی۔ گھر میں ہر قسم کے اخبارات و رسائل آتے تھے اور یہی رسائل اس کی رہنمائی کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 1912 میں جب کانپور کی مسجد کا بلوا ہوا تو اس نے اس معاملے کو بہت سنجیدگی سے لیا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے عملی قدم اٹھانے کا بھی فیصلہ کیا۔ مگر وہ لڑکی تھی۔ اس دور میں سانس لے رہی تھی جب لڑکیوں کو جھروکے تک جانا تو دور کی بات ہے۔ زور سے بات کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ایسے ماحول میں وہ کیا کر سکتی تھی؟ پھر بھی اس نے اس بارے میں پہلا کام یہ کیا کہ اخبار و رسائل میں مراسلے لکھنے نظموں سے لوگوں کو اس جانب توجہ دینے پر ابھارنے کی کوشش کی۔ "زمیندار" جیسے بڑے اخبار میں بھی اس کی نظمیں چھپ رہی تھیں۔ الہلال میں اسے جگہ مل رہی تھی۔ ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی نظموں کی دھوم مچ رہی تھی۔ اور لوگوں کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ نظمیں ایک کمسن سی لڑکی کہہ رہی ہے۔ شاید اس وقت تک زمیندار کے مدیران بھی اس بات سے واقف نہ تھے کہ جس نظم کو یہ چھاپ رہے ہیں وہ ایک کم عمر لڑکی کی کاوش ہے۔ نظم آپ بھی ملاحظہ کریں۔

عید کی خوشی میں غمزدہ کانپور کی یاد
حسرت فزا ہے اے مہ نو تیرا نور آج
ہے سنگ غم سے شیشہ دل چور چور آج
جنگِ طرابلس نے کل آرام دل لیا
جاں لے رہا ہے معرکہ کانپور آج
یاد آتے ہیں پولیس کے چھپائے ہوئے شہید
جن کے نہیں جہاں میں نشانِ قبور آج

یہ خاصی طویل نظم تھی جسے "زمیندار" نے بڑے اہتمام سے لگایا تھا۔ دیگر اخباروں میں بھی وہ اسی طرح کے پُرجوش مراسلے اور نظمیں لکھنے لگی تھی لیکن اسے شہرت کی تمنا تو تھی نہیں پھر اس دور میں کسی لڑکی کا اس طرح بیباکانہ انداز میں شاعری کرنا معیوب بھی تھا اس لیے وہ اپنے نام کی بجائے نام کا مخفف لکھتی "زخ ش" یعنی زاہدہ خاتون شروانی کا مخفف۔ اس کی تحریریں پڑھنے والے یہی سمجھتے کہ وہ کوئی پختہ عمر کی خاتون ہے۔ لوگوں میں تجسس ہوا ہوتا جا رہا تھا کہ یہ لکھنے والی کون ہے۔ اس وقت علی گڑھ ادب اور سیا[illegible] اس لیے وہاں اس کی [illegible] زیادہ ہی [illegible] لکھنے والی [illegible]؟ [illegible] لوگوں کا خیال تھا [illegible] لکھ رہا ہے۔ اس بات کا ذکر وہ اپنے ایک [illegible]

معمولی وجود ایک قسم کی تشنگی تھی۔

یہی تشنگی اسے بے چین رکھتی۔ گھر میں ہر قسم کے اخبارات و رسائل آتے تھے اور یہی رسائل اس کی رہنمائی کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 1912 میں جب کانپور کی مسجد کا بلوا ہوا تو اس نے اس معاملے کو بہت سنجیدگی سے لیا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے عملی قدم اٹھانے کا بھی فیصلہ کیا۔ مگر وہ لڑکی تھی۔ اس دور میں سانس لے رہی تھی جب لڑکیوں کو جھروکے تک جانا تو دور کی بات ہے۔ زور سے بات کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ایسے ماحول میں وہ کیا کر سکتی تھی؟ پھر بھی اس نے اس بارے میں پہلا کام یہ کیا کہ اخبار و رسائل میں مراسلے لکھنے نظموں سے لوگوں کو اس جانب توجہ دینے پر ابھارنے کی کوشش کی۔ "زمیندار" جیسے بڑے اخبار میں بھی اس کی نظمیں چھپ رہی تھیں۔ الہلال میں اسے جگہ مل رہی تھی۔ ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی نظموں کی دھوم مچ رہی تھی۔ اور لوگوں کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ نظمیں ایک کمسن سی لڑکی کہہ رہی ہے۔ شاید اس وقت تک زمیندار کے مدیران بھی اس بات سے واقف نہ تھے کہ جس نظم کو یہ چھاپ رہے ہیں وہ ایک کم عمر لڑکی کی کاوش ہے۔ نظم آپ بھی ملاحظہ کریں۔

عید کی خوشی میں غمزدہ کانپور کی یاد
حسرت فزا ہے اے مہ نو تیرا نور آج
ہے سنگ غم سے شیشہ دل چور چور آج
جنگِ طرابلس نے کل آرام دل لیا
جاں لے رہا ہے معرکہ کانپور آج
یاد آتے ہیں پولیس کے چھپائے ہوئے شہید
جن کے نہیں جہاں میں نشانِ قبور آج

یہ خاصی طویل نظم تھی جسے "زمیندار" نے بڑے اہتمام سے لگایا تھا۔ دیگر اخباروں میں بھی وہ اسی طرح کے پُرجوش مراسلے اور نظمیں لکھنے لگی تھی لیکن اسے شہرت کی تمنا تو تھی نہیں پھر اس دور میں کسی لڑکی کا اس طرح بیباکانہ انداز میں شاعری کرنا معیوب بھی تھا اس لیے وہ اپنے نام کی بجائے نام کا مخفف لکھتی "زخ ش" یعنی زاہدہ خاتون شروانی کا مخفف۔ اس کی تحریریں پڑھنے والے یہی سمجھتے کہ وہ کوئی پختہ عمر کی خاتون ہے۔ لوگوں میں تجسس ہوا ہوتا جا رہا تھا کہ یہ لکھنے والی کون ہے۔ اس وقت علی گڑھ ادب اور سیا[illegible] اس لیے وہاں اس کی [illegible] زیادہ ہی [illegible] لکھنے والی [illegible]؟ [illegible] لوگوں کا خیال تھا [illegible] لکھ رہا ہے۔ اس بات کا ذکر وہ اپنے ایک [illegible]

خاتون علی گڑھ میں شائع شدہ تخلیقات

اس رسالے میں بھی پانچ نظمیں ملی ہیں۔ اس میں مثنوی شہر آشوب اسلام بھی شامل ہے اور ایک کہانی "کیا فریادِ مظلومہ میں کوئی اثر نہیں"

"پردہ نشیں" آگرہ کے شماروں میں کل بارہ تحریریں شائع ہوئیں۔

1۔ "اپیل" شمارہ 18 مارچ 1913
2۔ تتلی تاریخ مٹی ہوئی ہے
3۔ ہے ہے شہ یونان 14 اپریل 1913
4۔ شادی اگست 1913
5۔ سہرا دس اپریل 1914
6۔ ارمغان 22 مئی 1914
7۔ آہ گوکھلے 14 اپریل 1915
8۔ وائے حالی 15 نومبر 1915
9۔ رخصتِ بلبل 15 نومبر 1915
10۔ تصادم رواج و شرع 3 جنوری 1916
11۔ حادثہ ہائلہ 1916
12۔ ہائے شبلی 13 اپریل 1918

ان کے علاوہ ایک اہم تحریر "میرا آخری مضمون" بھی شائع ہوا تھا۔

".....ایک اور مشکل بھی پیش آرہی ہے۔ حیران شروانی کہتے ہیں کہ زخ ش کے مضامین نے علی گڑھ میں سب کی توجہ مبذول کر لی ہے۔ خصوصاً پتا لگانے میں کوشاں ہیں کہ یہ آخر کون ہے۔ ہر ایک سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ نواب مزمل اللہ کی صاحبزادیوں کی تعلیمی قابلیت کیا ہے۔"

علی گڑھ میں تجسس فزوں تر ہو رہا تھا کہ یہ کون قلمکار ہے جو اس بے باکی سے حالات کی منظر کشی کر رہا ہے، پھر لوگوں نے منفی تنقید بھی شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر اس نے "شریف بی بی" لاہور میں ایک نظم بھیجی بعنوان "الوداع" نظم میں اس نے کہا کہ وہ اب ادب کی دنیا سے باہر [illegible] اس کی نگارشات کا سلسلہ بند ہونے والا ہے۔ [illegible] کی نظمیں ہند کے ایک دو نہیں پچاسوں اخبار و رسائل میں [illegible] ہوتی رہی تھیں۔ یہ تمام نگارشات زخ ش کے نام سے چھپ رہی تھیں۔ ہر نظم ہر مرسلے میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا تذکرہ

ہوتا اس لیے لوگ دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ وہ نہ صرف ان مسائل کو اجاگر کرتی بلکہ ان سے مقابلے کی دعوت بھی دیتی تھی۔ اس کے والد ایک مشہور شخصیت تھے اس لیے انہیں خوف بھی تھا کہ کہیں ان کے والد پر بات نہ آجائے اس لیے وہ قلم کو روک رہی تھی لیکن اس کے اس فیصلے پر قارئین کے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ ہر اخبار و رسائل میں التجا چھپنے لگی کہ ”نامعلوم محترمہ لکھتی رہیں۔“ ہر خط میں اس کی معرکتہ الآرا مثنوی ”عالمِ خواب“ کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ اس مثنوی میں کل 70 اشعار تھے۔ اس مثنوی میں اس نے سلطنت عثمانیہ کا درد بھرا نوحہ لکھا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے اسیروں کی زبانی قید کے مناظر اس انداز میں لکھے تھے کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ اطالوی فوجی افسر کا اسلام کے خلاف بولنا اور پھر اسیر سپاہی کا جواب دینا ملاحظہ ہو

کہا کرنل کے انہوں نے خموش رہ کافر
جو خیر چاہے تو بس آگے نہ کچھ کہہ کافر
اطالوی بھی عدوئے شہ بشر نکلے
خدا کی شان ہے لو چیونٹیوں کے پر نکلے
غبیث اسم شہ پاک اور تیرا منہ
صحابہء شہ لولاک اور تیرا منہ
نہیں ہے یاد تمہیں اپنی ذلت و توہین
تمہارے حلق تھے اور خنجر صلاح الدین

اس مثنوی نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہی نہیں اس نے قلمی جہاد کے ساتھ ایک اور جہاد چھیڑ دیا تھا۔ اس نے خاندان کے افراد کو ابھارا کہ وہ جہادِ عثمانیہ کے لیے امداد جمع کریں۔ اس نے ایک ایک کزنز کو خط لکھ لکھ کر التجا کی کہ ایسا پہلی بار ہوا ہے جب جہاد کا فتویٰ جاری ہوا ہے۔ اب تک کفار سے جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں وہ سب اور تھیں لیکن اس بار خود کفار مسلمانوں پر چڑھ آئے ہیں اور مسلمان ہونے کے جرم میں کیا بچے بوڑھے کیا عورتیں اور کیا بیمار سب کو بے دردی سے شہید کیا گیا ہے۔ اس لیے دنیا کے ہر خطے کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان کی امداد کریں۔ آنہ دو آنہ جس سے جو ہو سکے جمع کرانے بطور امداد انہیں روانہ کرتے۔ تمام بھائی بہنوں نے مل کر امدادی رقوم جمع کیں اور اب فیصلہ ہوا کہ اسے پہنچایا کیسے جائے؟

5 نومبر 1912 کو وہ اپنے خط میں لکھتی ہے۔ ”بہن آج ہمارے ہاں جوشِ اسلام کا عجب منظر نظر آرہا ہے۔ ابھی ابھی بہن فاطمہ کے دو خطوط اور سیکریٹری صاحبہ کا خط موصول ہوا ہے کہ خدا کے واسطے مسلمان مریضوں کو گلنے سڑنے سے بچاؤ۔ ان میں سے دو خطوط برائے مطالعہ ملفوف کرتی ہوں۔ ان خطوط سے تمہیں معلوم ہوگا کہ انہوں نے بذریعہ تار ہم سے 6 نومبر تک مالی امداد طلب کی ہے۔ یہ کس قدر دشوار کام تھا مگر ہم نے بتوکل بخدا یہ کام شروع کیا تھا۔ گھر میں ایسا کوئی چھوٹا بڑا نہ تھا جس نے اپنی حیثیت اور اُمید سے زیادہ چندہ نہ دیا ہو۔ قابلِ ذکر رقوم یہ ہیں (رقم کی تفصیل) خاکسار نے ایک طلائی نتھ اور دو روپے بابت منت طرابلس فنڈ کو دیے۔ آپا جان نے دو سونے کے چھلے دیے۔ علاوہ ازیں ہم والد کی اجازت سے معقول رقم علیحدہ دیں گے۔ ہاں یہ لکھنا بھول گئی کہ تمہاری طرف سے پانچ روپیا اور چھنو کی طرف سے دو روپیا لکھ لیا ہے۔ امید ہے یہ رقم تم جلد بھیج دو گی۔ اگر توفیق ہو تو بل من مزید کے سوال کو رد نہ کرنا، نہ تم نہ مونسہ۔ سب سے آخر میں التماس ہے کہ دتاولی کے غربا سے تم چندہ جمع کرو گی۔ دیکھو ہمارے ڈھائی آدمیوں نے آناً فاناً کیسی ہمت دکھائی۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ اب کی بار عید نہ منائیں اور وسیع پیمانے پر کام کریں۔ میں نے اس بار زمیندار میں ایک اپیل چھپوائی ہے۔“

اس خط سے اس بچی کی مسلمانوں کے لیے جذبہ ہمدردی کا پتا چلتا ہے۔ وہ اپنی عمر سے بڑھ کر کام کر رہی تھی۔ اور یہ سارا کام ہو رہا تھا اس کی انجمن کے نام پر جس کے صرف آٹھ ممبر تھے۔ اسی دوران اس نے انجمن کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ یہ نام ایسا کچھ بنا نہیں رہا کہ انجمن کن لوگوں کی ہے اس لیے اس کا نام تبدیل کر کے کوئی ایسا نام تجویز کیا جائے جس سے ثابت ہو کہ یہ کن لوگوں کی انجمن ہے۔ اس سلسلہ میں میری تجویز ہے کہ اس کا نام ”ینگ شیروانیز ہو۔“ اس کی اس تجویز کو کسی نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور مذاق اڑانے لگے۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک خط اپنی کزن کو لکھا۔ ”اب میں آپ لوگوں سے استفسار کرتی ہوں خاص کر کے برادر کرم مولوی انس خان صاحب سے۔ آپ لوگوں کی رائے ہے کہ اردو نام کو انگریزی پر ترجیح ہے بلکہ برادر ممدوح الصدر نے فارسی کو بھی انگریزی سے بہتر گردانا ہے۔ خوب۔ آپ معاف کریں مجھے۔ آپ کی اس رہبانیت رہانیت سے مجھے اختلاف عظیم ہے۔“

لوگ شور مچاتے رہے لیکن انجمن کا نام بدل دیا گیا اور یوں یہ نام ”ینگ شیروانیہ“ ہوگیا۔ وہ اس نئے نام سے کام کرنے لگی۔ کام بھی کیا تھا بس منصوبہ سازی۔ اس کی آنکھیں بڑے بڑے خواب دیکھتیں۔

خواب وہی دیکھتے ہیں جن کی خواہشیں دل میں رہ جاتی ہوں۔ اس معاملے میں وہ بہت آگے تھی۔ آسودہ حال ضرور تھی لیکن حسرتیں بھی اتنی ہی تھیں۔ وہ کچھ ایسا کرنا چاہتی تھی جو اب

تک کسی نے کیا نہ ہو۔

اس نے خود کو بہت حد تک چھپائے رکھا تھا مگر پھر بھی خاندان کے لوگ اندازہ لگا چکے تھے کہ یہ تحریریں نظمیں زاہدہ لکھ رہی ہے۔ اس بات پر خاندان کے کئی افراد ناراض ہوئے جن میں سرفہرست اس کی پھوپی تھیں۔

زاہدہ کی زندگی حکیم پور کی آبائی حویلی نئی قیام گاہ ظفر منزل اور بوڑھ گاؤں میں نانا حاجی کریم اللہ کی حویلی تک محدود تھی۔ گھر کی چاردیواری میں محدود اس باشعور لڑکی کی زندگی شدید تنہائی کا شکار تھی۔ وہ علمی اور ادبی مشاغل سے اس تنہائی کا مداوا کر رہی تھی۔ بیسہ خاتون اور لیلیٰ خواجہ بانو کو طویل طویل خطوط لکھنا اس تنہائی کا مداوا کہا جاسکتا ہے۔ اپنی تنہائی کا ذکر اس نے بیسہ کو لکھے اپنے ایک خط میں بھی کیا۔ ”ابو یا اور ہر دو برادران بمقام کڑوا مصروف شکار ہیں۔ اور ہم دو بہنیں اس صید مظلوم کی طرح ہیں جو دردِ دام ماند ہا باشد۔ صیاد رفتہ باشد۔ تنہا پڑے گھبرا رہے ہیں۔ سب اعزاء ماشاءاللہ اپنے رفقا کے ساتھ لطف زیست اٹھا رہے ہیں۔ اور ہم تنہائی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ شکر ہے کہ ہم دو بہنیں ہیں اگر ایک ہوتی تو کب کا مر کر قبرستان پہنچ چکی ہوتی۔“

ان کی تنہائی کے مشاغل میں حصہ دار گنتی کے تھے۔ بڑی بہن احمدی خاتون نگہت، بھائی احمد اللہ خان حیران شروانی، پھوپی زاد بہن اور سہیلی بیسہ خاتون، پھوپی زاد بھائی انس خان ابد جن سے وہ منسوب بھی تھی۔ ان ہی کے درمیان اسے زندگی تلاشنا تھی۔ وہ انہی گنتی کے لوگوں میں خود کو محصور کیے ہوئے تھی۔ ادبی دنیا سجائے ہوئے تھی۔ کہنے کو وہ سب بھی ادبی مشاغل اپنائے ہوئے تھے لیکن زاہدہ کی پرواز فکر سب سے اونچی تھی۔ احمدی خاتون اور احمد اللہ بھی شاعری کرتے تھے لیکن ان کی شاعری میں وہ گہرائی نہ تھی جو فکر کی گہرائی زاہدہ کی تحریر میں تھی۔ وہ ان سب کے ساتھ زندگی کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ ایک بڑا دھچکا اسے اس وقت لگا جب اس کا چھوٹا بھائی احمد خان حیران شروانی بخار کی لپیٹ میں آگیا۔ حکیم کو بلوایا گیا۔ علاج شروع ہوا لیکن بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک کئی حکیم بدلے گئے لیکن جب افاقہ نہ ہوا تو علی گڑھ کے انگریزی دوا دینے والے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے دیکھتے ہی تشخیص کر دی کہ اسے ٹائیفڈ ہے جو بگڑ چکا ہے۔ اب اسے ہی مرض کو سنبھالنا تھا۔ اس نے علاج شروع کر دیا لیکن بخار کم ہو کر نہ دیا اور تیسرے دن 19 اپریل 1916 کو احمد کی سانس اکھڑ گئی۔

احمد اللہ خان اس کا بھائی نہیں دوست بھی تھا۔ وہی اس کے لیے باہر کی دنیا کا خبر گیر تھا۔ رسالے اور اخبارات تک رسائی میں وہی مددگار تھا۔ وہی پوسٹ آفس کے کام نمٹاتا تھا۔ اس کی موت نے زاہدہ کی دنیا اندھیر کر دی۔ اس کی جدائی میں زاہدہ نے کئی نوحے لکھے، کئی تحریروں میں اس کا ذکر اس پیرائے میں کیا کہ اب شاید ہی میں کچھ لکھ سکوں۔ ایک مضمون میں وہ لکھتی ہے۔ ”ہماری عمروں کا بڑا حصہ تنہائی میں ہی گزرا۔ مگر در اصل میں صرف اس مرتبہ اپنے تئیں تنہا ہوں۔ وہ بھولی صورت روز بروز آنکھوں کے سامنے زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ اب تو وفورِ غم سے بعض اوقات چلا اٹھتی ہوں، کہ اے پیاری صورت دل سے نکل جا۔

جو میں ایسا جانتی پیت کرے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پیت کرے نہ کوئے

بھائی کی موت کا ایک اثر یہ ہوا کہ وہ قنوطیت پسند ہو گئی۔ اپنے خطوط میں نام سے پہلے ”حسرت و ناتمام، برادر گم کردہ، حقیقی معنوں میں بے دل“ لکھنے لگی۔ ایسے کڑے وقت میں اس کی دلجوئی کے لیے بیسہ خان اس کے ہاں آگئی۔ وہ اور احمدی خاتون اسے زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی رہتی۔ منسوب ہونے کی وجہ سے پہلے انس خان ابد حویلی میں کم کم ہی آیا کرتا لیکن اس کی بگڑتی ہوئی حالت کا جان کر وہ خود بھی وہیں ٹھہر گیا تھا۔ ان دونوں میں پردہ تو نہ تھا لیکن ایسی کوئی قربت بھی نہ تھی۔ ایک حجاب کا پردہ تھا جو دونوں کو روبرو بیٹھنے میں مانع تھا۔ آمنا سامنا ہو جاتا تو اک مسکراہٹ ہونٹوں پر مچل اٹھتی۔ اسے دوبارہ سے زندگی کی ہماہمی میں کھینچنے کے لیے ابد اکثر ایک دو جملے بول دیا کرتا تھا۔ جسے سن کر وہ کبھی پھیکی سی ہنسی ہنس دیتی اور کبھی سر کو جھکا لیتی۔

کچھ وقت گزرا تو زاہدہ کو خیال آیا کہ وہ ابد کے کلام کا جائزہ لے کر اسے مجموعہ کی شکل دے دے۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ احمد خان کو زندگی نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ اپنا کلام مرتب کرتا پھر شروانی خاندان کی روایت تھی کہ جو مر جاتا اس کے تمام اسباب، تمام چیزیں ایک کمرے میں رکھ کر مقفل کر دیا جاتا تھا۔ اس بارے میں وہ لکھتی ہے۔ ”ہمارے یہاں کیسی بری رسم ہے کہ مردے کا منحوس اسباب حقیقی مصرف یعنی خیرات کی بجائے اینٹ پتھر کی دیواروں میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ اگر خدا نے موقعہ دیا تو اپنے کثیر المقدار سامان کو (جس سے میں ہمیشہ بیزار رہتی ہوں) اپنے ہاتھ سے یا وصیت کے ذریعہ ٹھکانے لگا دوں گی۔“

اس نے کسی نہ کسی طرح بھائی کے کاغذات کی تلاشی لی

اور جتنا کچھ مل سکا سب جمع کیا۔ ویسے بھی وہ شاعری میں بھائی کی مشیر تھی اور اکثر نوک پلک درست کرتی رہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کلام کو جمع کرنے کے بعد وہ اسے شائع ضرور کرائے گی۔ اس سلسلہ میں اس نے مشاورت کے لیے ابد کو بلا لیا۔ دونوں بہنیں اور ابد مل کر بیٹھے اور اشعار کا انتخاب کرنے لگے۔ حیران کی ایک مسدس ان کو بہت زیادہ پسند آئی تھی۔ وہ اس زمانے کے لحاظ سے قومی اعتبار کی تھی۔ اسے باہم مشورہ کے بعد طے کیا گیا کہ اس مسدس کو اکبرالہ آبادی سے تصحیح کرا کر شائع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ابد کی خدمت حاصل کی گئی اور وہ اسے لے کر اکبرالہ آبادی کے پاس پہنچا۔ انہوں نے نظر ثانی کے بعد کہہ دیا کہ یہ قارئین تک پہنچنا ضروری ہے۔ وقت کی ضرورت ہے۔

اکبرالہ آبادی کی حوصلہ افزائی کے بعد دونوں بہنوں اور ابد میں مشورے ہونے لگے کہ کس طرح اسے چھپوایا جائے۔

ابھی مشاورت جاری تھی کہ ایک اور سانحہ پیش آ گیا جو زاہدہ کی زندگی میں طوفان لے آیا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا لیکن قسمت کے آگے کس کی چلی ہے؟ ابدان کے ہاں سے گھر آیا تو اسے بھی بخار آ گیا۔ بخار آنا ایسی کوئی اہم بات نہ تھی۔ حکیم سے دوا لے کر وہ آرام کرنے لگا۔ ایک دن دو دن کر کے وقت گزرتا رہا اور پھر وہ بھی اسی طرح بخار کا شکار ہو کر نومبر 1918 میں منوں مٹی کے بوجھ تلے جا سویا۔

ان دنوں زاہدہ بھی بستر علالت پر تھی اس لیے یہ خبر اس سے پوشیدہ رکھی گئی۔ کسی نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا۔ جب وہ بستر علالت سے اٹھی تو اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا۔ بھائی کا غم کچھ کچھ ہلکا ہو چکا تھا۔ اب وہ دوبارہ سے زندگی کو ہنگامہ میں گزارنا چاہتی تھی کہ دہلی سے لیلیٰ خواجہ کا خط آ گیا اور وہ پھر سے مزید الجھ گئی۔ وہ خبر جو اس سے چھپائی گئی تھی اسے سنائی دے گئی۔ لیلیٰ نے صرف خبر کی تصدیق چاہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ خبر اس سے چھپائی گئی ہے۔ لیلیٰ کا خط آتے ہی اس نے ایک ایک سے ابد کی خیریت پوچھی سب نے آنکھیں پھیر کر بس اتنا کہا۔ ''وہ صحتیاب ہو چکا ہے۔''

آنکھیں ملا کر بات نہ کرنا اسے شک میں مبتلا کر گیا اور پھر اس نے اپنی دودھ پلائی (انا) کی بیٹی کو اپنی جان کی قسم دے کر پوچھا تو اس نے سچ کی تصدیق کر دی۔ وہ یہ خبر سنتے ہی کھڑے قد سے گر گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی دنیا تاریک ہو گئی ہے۔

پانی کے چھینٹے ڈال کر اسے ہوش میں لایا گیا۔ وہ پورا دن اس نے کمرے میں بند ہو کر گزارا پھر اگلا دن بھی ایسے ہی گزر گیا اور پھر اگلا دن بھی۔

شام کو اندھیرا پھیلتے ہی اس نے کاغذ قلم سنبھال لیا اور ابیہ کو خط کے ذریعہ اپنی دلی کیفیت سے آگاہ کیا۔ ''ہائے وہ کیا دو لفظ تھے جنہوں نے میری حالت میں دیکھتے ہی دیکھتے زمین و آسمان کا فرق کر دیا۔ مجھے عالم ہوش و حواس سے نکال کر صحرائے خود فراموشی میں پھینک دیا۔ اس واقعہ کو تین دن ہو چکے ہیں۔ اور آج چودہ نومبر ہے۔ ان تین دنوں سے پہلے میں مکمل تندرست تھی۔ مگر آج ہر بیماری نے گھیر لیا ہے۔''

وہ بالکل ٹوٹ کے رہ گئی تھی۔ خود کو جتنا سنبھالنے کی کوشش کرتی اتنا ہی ٹوٹتی جاتی۔ پہلے نانا نانی کا غم پھر بھائی کی جدائی اور اب وہ شخص جو زندگی کا ہمسفر بننے والا تھا اس کا یوں چپ چاپ چلے جانا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کس لیے زندہ رہے گی۔ شروانی خاندان کی عجب ریت تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کو خاندان سے باہر نہیں بیاہتے اور خاندان میں اس کی جوڑ کا کوئی رہا نہیں۔ ایک دو کیا دس پندرہ سال بھی چھوٹا یا بڑا نہ تھا جس کے ساتھ اس کی نسبت ٹھہرا دی جاتی۔ دور تک اس کی نگاہوں میں صحرا تھے۔ بے آب و گیاہ صحرا۔ وہ اب اس تندہی سے لکھتی بھی نہیں تھی۔ بس چند جملے لکھے اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ یہی اس کا معمول بن چکا تھا۔ ہمہ وقت سوچنا اور کھوئے کھوئے رہنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ گھر کا ہر فرد اسے سمجھاتا لیکن وہ مان کر نہ دیتی۔ گھڑی بھر کے لیے کسی کام میں دلچسپی لیتی اور پھر ایک جانب بیٹھ جاتی۔ وہ شاید گزرے وقت کو ذہن کی کینوس پر منقش کر کے اسے دیکھا کرتی تھی۔ اسے وہ باتیں وہ مناظر یاد آتے ہوں گے جو ابد سے جڑے تھے۔ ابد علی گڑھ لکھنو دلی تک ہو آیا تھا۔ اسے باہر کے ماحول کا مکمل پتا تھا۔ اسی لیے وہ کبھی کبھی سلام کرنے کے بہانے نزدیک آتا اور کوئی ایک جملہ کہہ کر پلٹ جاتا کہ کہیں کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اور وہ اس جملے پر کبھی مسکرا دیتی اور کبھی سر جھکا دیتی۔ کبھی عنصیلی نظروں سے اسے دیکھتی تو کبھی سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر چہرہ گھما لیتی۔ اسی بات کا تذکرہ تو اس نے ابیہ کو لکھے خط میں کیا تھا۔

''مجھے کہہ دینے میں باک نہیں ہے کہ میں خود بھی اس سے قلبی محبت رکھتی تھی۔ علاوہ ازیں اوائل عمر سے میں نے اس کی کتاب زیست کا مطالعہ ایک خاص اور گہری نظر سے کیا تھا۔ ہاں میں صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ میں نے چشم تصور سے زمانہ استقبال میں اس کی زندگی سے اپنی زندگی کو وابستہ

دیکھا تھا۔ ان سب پر طرہ یہ کہ خود اس کی طرف سے میری بابت جس متجاز الحد مہر و وفا کا اظہار ہوا وہ میرے متاثر کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ تھا۔ ان تمام امور پر غور کیا جائے تو میری محبت ایک نیچرل بات ثابت ہوگی۔ مگر آہ... آج میں اس محبت کا کیا انجام دیکھ رہی ہوں۔ یہ کیسی خبر ہے جو میرے کانوں کو سنائی گئی ہے۔ کیا سالہا سال تک دیکھے جانے والے خواب کی تعبیر آناً فاناً برعکس ثابت ہوگی۔"

اب ذرا اس پُرآشوب دور پر غور کریں اور زاہدہ کی ہمت و حوصلہ دیکھیں کہ کس بے باکی سے اس نے اعتراف کر لیا کیونکہ محبت جذبہ ہی ایسا ہے جو حوصلہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی باتیں اسے آج رلا رہی تھیں۔ رہ رہ کر اسے ابد کی شریر آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ چاہ کر بھی پرانی باتوں کو بھلا نہ پا رہی تھی۔ اسے دکھ تھا تو یہ کہ انیس خان ابد سے وہ گھلنے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی تھی۔ جب جب اسے چھیڑتا تو وہ اسے جواب کیوں نہیں دیتی تھی اور آج پچھتا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اب اور کیوں زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ ایک کے بعد ایک حکیم کو بلایا جاتا۔ وہ دوا دیتا مگر زاہدہ چپکے سے ان کی دی ہوئی پڑیا کھول کر دیکھتی اور پھر اسے نالی میں بہا دیتی۔ وہ خود مرنے پر تل گئی تھی۔ ایسے بھی اب کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ 19 اکتوبر کے روزنامچہ (ڈائری) میں لکھتی ہے۔ "اکتوبر کے آغاز سے دوپہر میں سونے کی جگہ مطالعہ میں کٹتی ہے۔ قوت سے زیادہ کام کرنے کی وجہ یہ ہے کہ روح ہر وقت دل کو جواں مرگی کا یقین دلاتی رہتی ہے اور دل ہر وقت دماغ کو اس خیال سے معمور رکھتا ہے جو کرنا ہے کر لو تھوڑی مہلت ہے۔"

اس روز نامچہ میں مزید لکھا کہ وہ موت سے نہیں ڈرتی۔ اپنی سچی قومی محبت اور حضرت محمدؐ سے عشق کی بنا پر اپنی بخشائش کا یقین ہے۔ اکتوبر 1921 کے روزنامچہ سے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہے۔ جنوری 1922 تک اس پر بیماری اور پریشانی کا غلبہ رہا۔ وہ زندہ رہ کر بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن نقاہت ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹروں سے وہ ہی نہیں۔ عزیز از جان ابویا بھی مایوس ہو چلے تھے۔ انہوں نے ٹھان لیا تھا کہ اب ڈاکٹروں کی بجائے حکما سے علاج کرائیں گے اور انہوں نے دہلی سے حکیم بھورے (حکیم کبریا خان) کو بلا لیا۔ انہوں نے بھی اپنی کوشش شروع کر دی لیکن کہتے ہیں نا کہ سب سے خطرناک مرض ناامیدی ہے۔ وہ بھی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی شاید اسی لیے کوئی دوا اثر نہیں کر رہی تھی۔ طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ قدرت ایک اور کھیل بھی دکھا رہی تھی۔ ادھر زخ ش بستر مرگ پر تھی اور ادھر بڑی بہنا احمدی بیگم نکہت کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔ اسے جب بھی ہوش آتا تو وہ آنکھیں کھولتے ہی پوچھتی۔ "باجی کے ہاں سے کوئی خبر آئی؟"

کافی انتظار کے بعد خبر آہی گئی کہ احمدی کو لڑکی ہوئی ہے۔ جیسے ہی یہ خبر آئی ایسا لگا کہ کسی نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ پیار کرنے والا باپ جو ہر تھوڑی دیر بعد اندر آتا تھا اور وہ کسی طور خان بہادر نہیں ایک مجبور باپ لگتا تھا، جو بار بار ایک ہی سوال کرتا کہ اب طبیعت کیسی ہے۔ اس بار جیسے ہی اندر آیا خان بہادر عزل اللہ کا دل باغ باغ ہو گیا۔ بیٹی نے تکیہ سے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "ابویا آپ نے سنا... لڑکی... لڑکی ہوئی ہے۔"

پھر نقاہت نے غلبہ پا لیا۔ بار بار یہی ہو رہا تھا کہ گھڑی بھر کو آنکھ کھولتی کوئی بات کہتی اور پھر ہوش جاتا رہتا۔ ایک بار ہوش آیا تو نوکرانیوں سے پوچھا۔ "مولود کے لیے جو سامان تیار کیا ہے وہ بھجوایا یا نہیں؟"

اس نے بیماری کے طول پکڑنے سے پہلے ہی نومولود کے لیے سارا سامان تیار کر لیا تھا۔ ایک عورت کو اس کا نگراں بنا رکھا تھا جس کے ذمے تھا کہ یہ سارا سامان بہن کے ہاں پہنچا دیا جائے۔ اس عورت نے فوراً کہا کہ جی ہاں سارا سامان پہنچا دیا گیا ہے۔ تب اس نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا کہ باجی کو خبر کر دو کہ ننھی کو دیکھنے کے لیے دل مچل رہا ہے لیکن کیا کروں کہ ضعف نے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ پھر اس نے تمام ملازماؤں کو جمع کیا اور تاکید کی کہ میرے کاغذات کا ایک پرچہ بھی اِدھر اُدھر نہ ہو۔ سب کی حفاظت کرنا۔ کچھ بھی ضائع نہ ہو۔ اور پھر غنودگی میں چلی گئی۔

بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور نقاہت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ اپنے اندر اتنی قوت بھی نہیں پا رہی تھی کہ بغیر کسی کے سہارا کے وہ تکیہ سے سر بھی اٹھا سکے۔ موت و حیات کی کشمکش میں تیس اور اکتیس جنوری کی راتیں گزر گئیں اور یکم فروری آ گئی۔ اس روز بخار اس شدت کا تھا کہ ایک سو چھ پر جا پہنچا تھا۔ وہ رات ظفر منزل پر بہت بھاری تھی۔ ہر کوئی جاگ رہا تھا۔ ہر لب پر دعا تھی لیکن قسمت میں جو لکھا تھا وہ کیسے پورا نہ ہوتا۔ بالآخر تین فروری 1922 بروز جمعرات اس نے آخری ہچکی لی اور سر تکیہ سے ڈھلک گیا۔ پورے برصغیر میں اپنے علمیت کی دھاک بٹھا دینے والی زاہدہ خاتون بہت کچھ علمی اثاثہ چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ پردہ نشین قلم کار ہمیشہ کے لیے دنیا سے پردہ کر گئی۔

بے وقت، بے موقع اور حادثاتی طور پر انتقال کرنے والے فنکاروں میں گرودت کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے۔ گرودت کو ہندوستانی سینما میں امتیازی مقام حاصل ہے۔ انہیں بولی ووڈ کے معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی "پیاسا" اور "کاغذ کے پھول" جیسی یادگار فلمیں، سینما کا مطالعہ اور سینما سے محبت کرنے والوں کے لیے درسی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔

1925ء میں ان کی ولادت ہوئی اور 1964ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بہت ہی کم سنی میں، صرف 39 سال کی عمر میں انہوں نے خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

اس عظیم فلم میکر کے نجی خطوط کتابی شکل میں آج سے کوئی گیارہ سال پہلے شائع ہوئے تھے۔ نسرین منی کبیر نامی مصنفہ اور ڈاکومنٹری فلم میکر نے یہ خوبصورت کتاب مرتب کی ہے۔ انگریزی زبان کی اس کتاب میں گرودت کے اپنی بیوی گیتا دت کو تحریر کردہ 33 خطوط 1951ء سے اکتوبر 1962ء کے دوران تحریر کیے گئے تھے۔

یہ خطوط گرودت جیسے بے حد حساس فلم میکر کے اندرونی کردار کی کمال کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ گرودت اور گیتا دت کے تعلقات میں اونچ نیچ آتی رہی لیکن ان خطوط سے ایک بات عیاں نظر آتی ہے کہ دونوں کی ایک دوسرے سے محبت لازوال تھی۔

دونوں کی پہلی ملاقات
تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے
کی ریکارڈنگ کے دوران ہوئی تھی۔ گرودت پہلی ہی

اپنے دور کے ایک سپر اسٹار کی روداد عشق

عشق گزیدہ

وہ عشق پیشہ بے خطر آتشِ عشق میں کود پڑتا تھا۔ اس کی عاشق مزاجی اسے کئی در پہ لے گئی پھر وہ سنجیدہ ہوا تو عشق کا روگ اسے لے ڈوبا۔

عدنان انور

نظر میں گیتا رائے کی محبت میں گرفتار ہوگئے تھے۔ یہ خط پڑھیں۔

21 اگست

شام کو گھر واپس لوٹا تو تمہارا خط ملا، مجھے کم و بیش اُمید تو تھی ہی کہ تم خط لکھوگی۔ کیا تمہیں اب بھی احساس نہیں ہوا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ میں تم سے بیزار ہونے لگا ہوتا تو تمہیں شادی کے لیے جلدی کرنے پر اصرار کیوں کرتا رہتا؟ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ تم مجھے ابھی تک سمجھ نہیں سکی ہو۔

اور کیا لکھوں؟ اگر میں تمہیں لکھوں کہ جلد آجاؤ تو بھی تم آنہیں سکوگی۔ تمہارے بھی متعدد بندھن ہیں جنہیں تم توڑ نہیں سکتیں۔ اس لیے تمہیں کچھ بھی کہنا فضول ہے۔ تم مجھ سے بار بار کیوں دریافت کرتی ہو کہ میں دوسری کسی عورت سے پیار کرتا ہوں یا نہیں؟ تم واقف ہو کہ میں تمہیں پیار کرتا ہوں۔ اسی لیے تو تم مجھے دو سال انتظار کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہو۔

مجھے صرف دو امور پیارے ہیں۔ ایک میرا کام اور دوسرا تم۔ لیکن کام کرنے سے مجھے جو اطمینان حاصل ہوتا ہے ایسا اطمینان تم مجھے نہیں دیتیں۔ شاید اسی لیے میں دکھی ہوں۔ تمہیں میرے سکھ کی ذرہ برابر پروا ہوتی تو تم میری بات کیوں نہیں مانتیں؟ تمہیں میری خوشی کی پروا ہے تو پھر تم مجھے خوش رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ کیا اس کا جواب دے سکتی ہو تم؟ تم تو کہوگی کہ ''میں کیا کرسکتی ہوں؟ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔'' تو پھر رہنے دو۔ تم مجھ سے نہ پوچھو کہ میں دکھی کیوں ہوں؟ زندگی یوں ہی بیتتی رہے گی۔ بس کام کرتے رہو اس لیے تو میں اتنا کام کرتا ہوں۔ پھر بستر پر دراز ہوتا ہوں تو تھک کر اتنا چور چور ہوجاتا ہوں کہ ان سارے امور کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔

بس اور کیا لکھوں؟

درج بالا خط گرودت کی پہلی فلم ''بازی'' کی ممبئی کے سوستک سنیما میں ریلیز (5 جون 1951) سے دو ماہ قبل تحریر کیا گیا تھا۔ اس وقت گرودت ''جال'' تیار کر رہے تھے۔ گیتا رائے اس وقت 21 سالہ کامیاب پلے بیک سنگر تھی۔ گیتا رائے پر اپنے گھرانے کی ذمہ داری تھی۔ خط میں گیتا رائے کی لاچاری کی جو بات لکھی وہ یہ ہے۔

26 اکتوبر 1951ء

گیتو!

تمہارے دونوں خط ملے۔ پہلا خط پڑھ کر میں ناراض ہوگیا۔ کیونکہ وہ بہت مختصر تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ تمہیں

> ہاکسز! گرودت نے اپنا فلمی کیریئر ہدایت کار شیرودم بڑھیکر کے ساتھ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر شروع کیا۔ بعد میں انہی کی ایک فلم ''لکھارانی'' میں ہیرو کا کردار کیا مگر یہ فلم بری طرح ناکام ہوگئی۔ انہوں نے شیرودم بڑھیکر کے ساتھ 1950ء تک کا زمانہ گزارا۔ دیو آنند کی دوسری فلم ''بازی'' سے انہوں نے بطور ہدایت کار کامیابی کی منزل کی طرف قدم بڑھایا۔ ''بازی'' کی کامیابی کے بعد دیو آنند نے اپنی فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' اور ''جال'' کی ہدایت کاری بھی گرودت سے کروائی۔ ان فلموں کی کامیابی کے بعد گرودت نے اپنا ذاتی ادارہ بنا کر فلمیں بنانا شروع کردیں۔
>
> ☆☆☆
>
> جب ''صاحب بی بی اور غلام'' کی کامیابی پر منعقد ہونے والی تقریب میں وحیدہ رحمن گرودت کو چھوڑ کر کسی اور فلمساز کے ساتھ چلی گئی تو گرودت کو اس کی اس حرکت پر بڑا دکھ ہوا۔ بعد میں جب اس نے وحیدہ رحمن سے شکایت کی تو اس نے جواب دیا۔ ''میں تو آپ کو اپنا بزرگ مانتی ہوں اور کچھ نہیں۔'' یہ سن کر گرودت کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے گھر جانا چھوڑ دیا اور آخرکار اپنے فلیٹ میں خودکشی کرلی۔

زبردستی تحریر کرنا پڑا ہے۔

تمہارے جانے کے بعد تمہارے بھائی آئے تھے لیکن میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ انہوں نے 8 نومبر کا دن سگائی کے لیے طے کیا ہے۔ مزید تفصیل کی مجھے کوئی خبر نہیں۔ میں ان دنوں بہت دکھی رہا ہوں۔ کبھی کبھی دل کہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں۔ ایک تو تمہارے جانے سے میرا من بہت اداس ہوگیا تھا۔ مزید براں چھوٹے امور بڑی مصیبتیں بن کر آتے ہیں۔ آج اچانک مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ گانٹھ میں پیسا ہونا بہت ضروری ہے۔ اور پیسا نہ ہو تو انسان کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ چند دنوں سے میری حالت عجیب و غریب ہوگئی ہے۔ میں تمہیں تفصیل سے تحریر کروں تو تمہیں ہنسی آئے گی اور..... جانے دو یہ بات۔ تمہیں میرے مسائل سے کیا؟

تم بہت اچھی ہو۔ متعدد مرتبہ سوچتا ہوں کہ میں تمہارے لائق ہوں یا نہیں؟ اور یہ بھی سوچتا ہوں کہ مجھ سے محبت کرکے

تمہیں کیا ملا؟ اور کیا میں تمہیں ساری زندگی خوش رکھ سکوں گا؟ کبھی کبھی میں خود سمجھ نہیں پاتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ واقعی تم ایک پاگل کے پیار میں مبتلا ہوگئی ہو۔

تم مجھ سے بہت ساری امیدیں رکھتی ہو، لیکن میں تمہیں خوش رکھتا ہوں یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ مجھ میں جتنی اچھائی ہے، اتنی ہی برائی بھی ہے۔ اور تم مجھے پیار کرتی ہو تو ہمیشہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرنا اور میری برائیوں کو معاف کردینا۔ میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا ہوں یا نہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔

تم ہر ماہ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ جاتی ہو۔ کیا معلوم کسی دن ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔ زیادہ کیا لکھوں؟ اگر ہوسکے تو سوتے وقت مجھے ایک دفعہ یاد کرنا۔ پیار کے ساتھ۔

تمہارا گرودت

''پیسا ہونا بہت ضروری ہے۔ پیسا نہ ہو تو انسان کی کوئی قدر نہیں کرتا۔'' اس خط میں تحریر کردہ ان جملوں کا استعمال گرودت نے ''پیاسا'' میں بطور مکالمہ بھی کیا تھا۔ شاعر درجے کا یہ مکالمہ بولتا ہے۔ درجے کا کردار گرودت نے ہی ادا کیا تھا۔

25 جون 1952ء

مجھے محسوس ہو رہا ہے تم مجھ سے بیزار ہوگئی ہو۔ تمہیں عنایت کرنے جیسا میرے پاس کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ تم ایک ایسے پاگل کے پیار میں ہو، جو خوابوں کی دنیا میں جیتا ہے۔ متعدد مرتبہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتا کہ خواب کون سا ہے اور حقیقت کیا ہے۔ ایک روز تم مجھ سے اتنی پریشان ہوجاؤ گی کہ تم میرا منہ بھی کبھی نہیں دیکھوگی۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے آپ کو نہیں پہچانتا اور تمہیں بھی نہیں پہچانتا۔ زندگی صرف بے معنی جدوجہد ہے جو کبھی بھی امن و سکون پر منتج نہیں ہوتی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے لیکن تم مجھے دستیاب نہیں ہوتیں۔ تمہیں حاصل کرلوں، پھر بھی میں خوش نہیں رہنے والا۔ پاگل کی مانند سکھ حاصل کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بھٹک رہا ہوں۔ لیکن کہیں چین و سکون میسر نہیں ہوتا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میرے جیسا آدمی مرجائے، یہی اچھا ہے، مجھے اس طرح مرجانا چاہیے کہ پھر کبھی بھی پیدا ہی نہ ہو پاؤں۔

جن خطوط کی ابتدا ''ڈیئرسٹ گیتا'' یا ''ڈیئرسٹ گیتو'' جیسے القاب سے نہ ہو، اس کے معنی یہ ہیں کہ دونوں کے درمیان کوئی ٹینشن جاری تھی۔ اس قسم کے خطوط سے غصہ کے ساتھ ساتھ ناامیدی جھلکتی ہے۔

گرودت اور گیتا رائے نے آخرکار 26 مئی 1953ء کو ممبئی میں شادی کرلی۔ اور گیتا رائے، گیتا گرودت ہوگئی۔ 1951ء سے 1964ء تک صرف 13 سال کی کارکردگی میں گرودت نے تقریباً تمام اقسام کی فلمیں بنائیں۔ کرائم، تھرلر (بازی، جال، سی آئی ڈی) کاسٹیوم ڈراما (باز) مسلم سوشل ڈراما (چودھویں کا چاند) طنز و مزاح (آر پار، مسٹر اینڈ مسز پچپن)، سوشل میلوڈراما (پیاسا، کاغذ کے پھول، صاحب بیوی غلام)۔

کھنڈالا 28 اکتوبر 1955ء

ڈیئرسٹ!

اُمید کرتا ہوں کہ تمہارا غصہ اتر گیا ہوگا۔ کل شام یہاں پہنچ کر میں نے فوراً تمہیں ٹیلی گرام کیا تھا۔ کسی ہوٹل میں کمرا نہیں ملا۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک چھوٹا سا بنگلا کرائے پر مل گیا۔ بہت خوبصورت ہے۔ جگہ بھی پُرسکون ہے۔ بہت کمرے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ تم اور بابا یہاں آئیں اور تھوڑا وقت میرے ساتھ رہیں۔

تم آؤ تو گھر سے تھوڑے برتن لیتی آنا۔ نارائن یا کوئی اور نوکر کو ساتھ لیتی آؤ تو بہتر ہے۔ ساتھ ایک اسٹولا نا۔ تمہیں اور بابا کو یہاں مزہ آئے گا۔ تبدیلی محسوس کروگی۔

دوسری بات یہاں کا ایک عمدہ پلاٹ ہے۔ ساڑھے سات ایکڑ (4840 مربع گز زمین) کا جو صرف 6 ہزار روپے میں فروخت ہو رہا ہے۔ لونا والا سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔ مگر مرکزی سڑک پر ہے۔ اس زمین پر چاول کی فصل کاشت کی جاسکتی ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟ تم یہاں آؤ تو میں تمہیں جگہ دکھادوں۔ تم پلاٹ دیکھو اور اپنی رائے دو۔ یہاں ختم کرتا ہوں۔ تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔ تمہیں اور بابا کو پیار۔

تمہارا گرودت

کھنڈالا کا یہ پلاٹ گرودت نے آخرکار خرید لیا تھا۔ بابا یعنی اس کا بڑا بیٹا ترون..... چھوٹے بیٹے کا نام ارون ہے۔

26 دسمبر 1952ء

ڈیئرسٹ!

میں جانتا ہوں کہ تم مجھ پر بہت غصہ ہوئی ہو۔ اور تم بابا کو لے کر لوکھی کے پاس چلی گئی ہو۔ کل شب جو کچھ ہوا اس کے لیے معذرت۔ تمہیں، مجھے اتنی سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے تھا۔ تم جانتی ہو کہ میری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ انیل بسواس کے لیے میرے جذبات کیا ہیں، یہ تم بھی جانتی ہو۔ لیکن میں ایک بات نہیں سمجھ پاتا، مجھے اور بابا کو چھوڑ کر تمہیں رات کو گھر چھوڑ کر

کیوں جانا پڑا؟ تم اب کمسن نہیں رہی ہو۔

تمہارے بغیر مجھے بہت اکیلا پن لگتا ہے۔ پلیز بابا کو لے کر واپس آجاؤ۔ مجھے خبر ہے کہ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔ تم چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھر چھوڑ کر کیوں چلی جاتی ہو؟ یہ صرف میرا گھر نہیں ہے، یہ گھر تمہارا بھی ہے۔ جتنی جلد ہو سکے واپس آجاؤ۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔ شام کو ہم پکچر دیکھنے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم پرسکون ہو کر سوچو گی اور گھر واپس آجاؤ گی۔ پلیز آجاؤ۔

تمہارا گرودت

دارجلنگ 14 نومبر 1957ء

ڈیئر سٹ گیتا!

آج میں یہاں صرف ایک دن کے لیے آیا ہوں۔ دارجلنگ دیکھنے کے لیے۔ کل کلکتہ واپس چلا جاؤں گا۔

زندگی نے ہمیں ایک دوسرے سے اتنا الگ کر دیا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں خط میں کیا لکھوں؟ میرے متعلق اور میرے کام کے متعلق تمہارے غلط رویے کے باعث آج تک میری جو ناموری و نیک نامی مرتب ہوئی تھی وہ مٹی میں مل گئی ہے۔ اگرچہ میں تمہیں قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ ان سارے معاملات میں انسان کتنا ہی جھگڑا کیوں نہ کرے، آخر کار تو اس کی شکست ہی ہوتی ہے۔ امید رکھتا ہوں کہ میں یہ جو کچھ تحریر کر رہا ہوں، تم اس کے غلط معنی نہیں نکالو گی۔

خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے۔ میری زندگی میں تمہارا ایک فیصلہ کن مقام ہے اور اس امر کا میں احترام کرتا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ تم اپنی ذات کو اور مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔ اپنی اور بچوں کی صحت کا خیال رکھنا۔ تمہیں، ترون اور ارون کو پیار اور بوسے۔

تمہارا گرودت

یہ خط ''پیاسا'' کی ریلیز کے کئی ماہ بعد لکھا گیا تھا۔ گرودت نے وحیدہ رحمٰن کو ''تلاش'' کیا تھا اور اسے اپنے ہوم پروڈکشن ''سی آئی ڈی'' میں متعارف کروایا تھا۔ گرودت اور وحیدہ رحمٰن کے درمیان قربت میں اضافہ ہونے کی افواہیں پھیل رہی تھیں جس کی وجہ سے شوہر بیوی کے مابین جھگڑا بڑھ رہا تھا۔

کلکتہ 28 جولائی 1958ء

ڈیئر سٹ!

میں تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ کام اتنا سارا رہتا ہے کہ وقت کہاں گزر جاتا ہے، پتا ہی نہیں چلتا۔

تم شاید مطمئن نہیں ہو گی لیکن ایک بات سمجھ لو کہ ہمارے

وحید مراد کی پُراسرار موت

وحید مراد کی موت کے اسرار کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی کسی ''حادثے'' کا شکار ہو کر دنیا چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ وہ کراچی میں ڈیفنس سوسائٹی کی جس کوٹھی میں مردہ حالت میں پائے گئے، وہ ان کی منہ بولی بہن ممتاز اور ان کے شوہر ریٹائرڈ کرنل ایوب کی ملکیت تھی۔ اس بات سے انکار نہیں کہ وہ ان دنوں بہت خراب وخستہ حال میں تھے۔ بے حد ڈپریشن کا شکار تھے مگر جس طرح ان کی موت کی کہانی سنائی گئی اور جس طرح ان کی میت خاموشی کے ساتھ ان کے چچا کے پاس لاہور بھجوائی گئی ان سے ان شکوک وشبہات کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ وہ حقیقی موت نہیں مرے۔ وہ مرے نہیں، انہیں مارا گیا ہے۔

وحید مراد کی موت کو اس لیے پُراسرار قرار دیا گیا کہ مرحوم کے دوست قادر موسانی اور ان کی منہ بولی بہن ممتاز کے بیانات میں واضح تضادات نظر آتے ہیں۔ قادر موسانی کا کہنا ہے کہ ''جب میں وحید مراد کے کمرے میں گیا تو وحید مراد بجلی کے سوئچ بورڈ کے نیچے دیوار کے سہارے گرا ہوا تھا اور وہ فوت ہو چکا تھا۔''

جبکہ وحید مراد کی منہ بولی بہن ممتاز نے لاہور پہنچ کر اخبارات کو دو متضاد بیان دیے۔ ایک بیان میں وہ کہتی ہیں۔ ''جب میرا نوکر وحید بھائی کو جگانے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا وحید مراد اپنے بستر کے نیچے گرے پڑے ہیں اور فوت ہو چکے ہیں۔''

جبکہ ایک اور بیان میں موصوفہ نے کہا۔ ''جب ہمارا نوکر وحید بھائی کے کمرے میں گیا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے نہ کسی نے دروازہ کھولا نہ کوئی آواز آئی۔ اس نے آکر مجھے یہ بات بتائی۔ تب ہم دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وحید بھائی اپنے بستر کے نیچے پڑے ہیں اور وہ مردہ حالت میں تھے۔''

پھر جس خاموشی کے ساتھ وحید مراد کی میت لاہور بھیجی گئی اس سے یہ موت اور پُراسرار ہو گئی۔ یہ معما آج تک حل نہیں ہوا کہ اس کی موت کی اصل وجہ کیا تھی۔

درمیان خواہ کتنے ہی جھگڑے کیوں نہ ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو کتنا ہی دکھی کیوں نہ کریں، تم ہمیشہ میرے دل پر چھائی رہتی ہو۔ تمہیں مجھ سے بہت زیادہ اچھا جیون ساتھی ملا ہوتا۔ میں تمہیں سکھی رکھنے میں ناکام ہوا ہوں، تو پلیز مجھے معاف کر دینا۔

آج میں جس پوزیشن میں ہوں وہاں تک پہنچنے کے لیے میں نے ساری زندگی بے حد جدوجہد کی۔ اس جدوجہد میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو میں بہت سنجیدگی سے لے بیٹھا۔ اب اس مرحلے پر مجھے ذرا اطمینان محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن پھر کوئی چھوٹی بڑی بات ہو گئی تو دل پھر بوجھل ہو جائے گا۔

کبھی کبھی میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ سب PREMATURE تھا۔ میں قبل از وقت ہی ناکام ہو چکا۔ میں نے کمانا قبل از وقت شروع کر دیا۔ پہلی فلم کم عمری میں بنائی اور کامیابی بھی جلد مل گئی۔ لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ میں میچور ہو رہا ہوں۔ زندگی میں، میں نے نہ جانے کتنی دھوپ چھاؤں دیکھ لی ہے۔ اتنے کم برسوں میں، میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ معلوم نہیں، لیکن.....

زیادہ اور کیا لکھوں۔ جلد واپس لوٹنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن آنے سے قبل میرا کام ختم ہو جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔

ڈارلنگ! خواہ کچھ بھی ہو۔ ایک بات یاد رکھنا، تم میرا ہی ایک حصہ ہو، اور ہمیشہ میرا ہی حصہ بنی رہو گی۔ تمہیں شاید نہیں معلوم کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ میں جب نہ ہوں گا، اس وقت اس کا احساس ہو گا۔

یہ خط مجھے یہیں ختم کرنے دو۔

تمہیں، ترون اور ارون کو پیار اور بوسے۔

تمہارا گرودت

گرودت صرف سولہ سال کے تھے۔ اس وقت انہوں نے کلکتہ میں بطور ٹیلی فون آپریٹر کام کیا تھا، جو ان کی اوّلین ملازمت تھی۔ ان کی اوّلین فلم ''بازی'' تھی جو 1951ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس وقت وہ 26 سال کے تھے۔ درج بالا خط میں ان دونوں امور کا ذکر کیا گیا ہے۔

1961ء میں گرودت اور گیتا دت ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔ پھر دونوں کو محسوس ہوا کہ ازدواجی زندگی کو پھر ایک بار موقع دینا چاہیے اس لیے دونوں نے پھر ایک ساتھ رہنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ گیتا دت کو تحریر ہونے والے خطوط کم ہونے لگے اور پھر بالکل بند ہو گئے۔ دونوں کے مابین فاصلہ بڑھتا ہی گیا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تعلق منقطع ہونے کی وجہ وحیدہ رحمٰن تھیں۔

اس مرحلے پر گیتا دت نے بھی شراب نوشی شروع کر دی۔ گرودت اور وحیدہ رحمٰن کے تعلقات پر فلمی صحافت نے خوب کہانیاں گڑھیں۔ اگرچہ وحیدہ رحمٰن کے ساتھ پیار کا تعلق بھی زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہا۔ ''صاحب بی بی اور غلام'' کی تیاری کے دوران ہی گرودت نے خودکشی کی ایک ناکام کوشش کی تھی۔ 1962ء میں یہ فلم ریلیز ہوئی اور گرودت، وحیدہ رحمٰن کے رشتے پر بھی فل اسٹاپ لگ گیا تھا۔

بیٹی نینا کے پیدا ہونے کے فوراً بعد ظاہر ہو گیا تھا کہ گرودت اور گیتا دت کی ازدواجی زندگی میں اتنی گہری کھائی وجود میں آچکی ہے کہ اتفاق رائے یا سمجھوتے کا اب کوئی امکان نہ تھا۔ 1963ء کے اواخر گرودت نے گھر چھوڑ دیا اور اکیلے رہنے لگے۔

ایک سال بعد 10 اکتوبر کو گیتا دت کو پتا نہیں کیوں کچھ عجیب وغریب احساس ہوا۔ جیسے انہیں کچھ ناگوار بشارت ہو رہی تھی۔ اگلی شب کو ہی شوہر، بیوی کے مابین شدید جھگڑا ہو گیا تھا۔ گرودت بچوں سے مل سکے یا نہیں، اس معاملے پر دسویں کی صبح کو فوراً گیتا نے گرودت کے باورچی رتن کو فون کیا، رتن نے فوراً کہا کہ صاحب تو اپنے بیڈروم میں سوئے ہوئے ہیں۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ گیتا دت نے کہا۔ ''تم کچھ بھی کر کے بیڈروم کا دروازہ کھولو۔ اسے توڑنا پڑے تو توڑ دو۔''

دروازہ آخر کار کھلا اور ناگوار حقیقت باہر آئی۔ بستر پر گرودت کا صرف جسم تھا۔ طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا تھا۔ انہوں نے نیند کی گولیاں زیادہ مقدار میں کھالی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر صرف 39 برس تھی۔

گیتا دت کبھی شوہر کی موت کے صدمے سے باہر نہ آسکیں۔ ان کی زندگی کا سارا رس جیسے حالات نے نیبو کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی گائیکی کی ساکھ بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ جلد ہی جدوجہد کے سال شروع ہو گئے۔ دوبارہ شادی کر کے زندگی بسانے اور سنوارنے کی انہیں متعدد آفرز موصول ہوئیں لیکن ان کے لیے اب یہ بات ممکن نہیں تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ گرودت اور گیتا دت خود اپنی تباہی وبربادی کا سبب تھے لیکن گیتا دت کو ہمیشہ اس بات کا اطمینان رہا کہ ان کا جیون ساتھی انہیں آخری سانس تک بہت چاہتا تھا۔

گرودت کی خودکشی کے 8 سال بعد 20 جولائی 1972ء کو گیتا دت بھی اس وارفانی سے کوچ کر گئیں اور پیار کے پاگل پن کی ایک کہانی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

قسط نمبر: 12

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا منیج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آ گیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آ گیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلو خلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آ گیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی افواہ کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوا لیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا ہوں۔ بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آ گئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں... کالیا کے ساتھ باہر آ گیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہو گیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہو گیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اندر سے زنیرہ پستول تھامنے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ تھیں جو کمر کی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ تبھی باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آ گئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا، ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا تو فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار انگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجو کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھانے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں کیونکہ لیاری کا بچہ بچہ ٹی ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہو گا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

یہ خبر پڑھتے ہی میں اپنی جگہ سن ہو کے رہ گیا تھا۔ میری نظریں اس چیختی چنگھاڑتی خبر پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میں جواب تک اپنے دشمنوں کو انہی کی زبان میں جواب دینے کا انداز اپنائے ہوئے تھا، اب وہی انداز دشمن بھی اختیار کرنے لگے تھے۔ میں اب تک انہیں ہتھیاروں سے زیادہ دماغی چالوں سے ہرائے ہوئے تھا، اب یہی آخر الذکر

ہتھیار کا استعمال دشمن بھی کرنے لگے تھے۔ گویا میرا ہی ہتھیار مجھ پر آزمایا جا رہا تھا۔ یہ میرے لیے تشویش ناک بات ہو سکتی تھی لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں کہ میں ہار ہی مان لیتا۔

”ابے لے جگری! یہ تو ہمارے لیے بڑی خبر آ گئی ہے۔“ کالیا نے فکر بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں کالیا! لیکن ہم بھی اس خبر کو دشمنوں کے لیے بری خبر بنا دیں گے۔“ میں نے عزمِ مصمم سے کہا۔ ”لیکن پہلے خورشید خاں المعروف منے میاں سے مل کر حقیقت حال کا جاننا ضروری ہے۔ تب ہی آگے کچھ سوچا جا سکتا ہے۔“

”تو پھر ویر کس بات کی ہے، جگری! ابھی چل کر اس دو غلے آدمی کی خبر لیتے ہیں۔ دیکھو تو ذرا اسے ایک طرف ہم ان کی خاطر اپنی جانوں پر کھیل رہے ہیں اور دوسری طرف یہ ہمارے دشمنوں سے ساز باز کرتے ہوئے ہماری جان توڑ محنتوں پر یوں پانی پھیر رہے ہیں۔ میں تو جاتے ہی اس کی پہلے گردن ناپوں گا۔ اس نے ضرور اس جاگیردار سے پیسے لے کر ہی یہ مک مکا کیا ہو گا۔“ کالیا غصے سے بولا۔

”نہیں کالیا! ایسے نہیں کہتے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے اور خورشید خاں اور اس کا خاندان بھی بدنصیبی کی ایسی اجتماعی قبر میں زندہ دفن کر دیئے گئے ہیں جہاں وہ اپنے ناکردہ گناہوں کی خوف زدہ سی فضاء میں سانس لے رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ انہیں ضرور ڈرا دھمکا کر ولیعت (خون بہا) لینے پر مجبور کیا گیا ہو گا۔“

”تمہاری بات میں کوئی مغالطہ نہیں ہے نومی!“ اس بار زنیرہ نے کہا۔ ”یہ تو تمہاری اپنی عام زندگی کا تجربہ ہے جو غلط نہیں، میری تو اپنی پیشہ وارانہ زندگی ساری اسی میں گزری ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ظالم اور جابر گروہ اسی طرح مظلوموں پر حاوی ہوتے رہتے ہیں۔“

”لیکن پھر بھی خورشید خاں نے یہ بالکل غلط کیا ہے جبکہ وہ جانتا بھی تھا کہ نومی اپنی جان جوکھم میں ڈالے یہ جنگ لڑ رہا تھا بلکہ اتنی مشکلوں کے بعد کامیابی بھی ملی تھی۔“ کالیا بولا۔ اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”میرے یار جگری! ہم کب کہہ رہے ہیں کہ اس نے صحیح کیا ہے؟ میں خورشید خاں سے آج ہی ایک ملاقات کروں گا۔ مل کر ہی پتا چلے گا اصل بات کا۔“ کالیا کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ ہماری طرح اس کا بھی ”اندر“ غبار آلودہ ہو گیا تھا۔ ایسے میں زنیرہ نے کچھ سوچتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کے دوبارہ کہا۔

”نومی! فرض کرو اگر یہی بات ہوئی، جس کا تمہیں اور مجھے بھی کافی حد تک اندازہ ہے تو ہمیں سوچنا ہو گا کہ اس سلسلے میں ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟“

میں نے جواب میں اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ”میں خورشید خاں سے مل لوں پہلے، تب ہی کچھ ذہن میں آئندہ کا لائحہ عمل آ سکتا ہے۔“

اس کے بعد میں اور کالیا وہاں سے رخصت ہوئے اور ولیسپا پر سوار ہو کر اپنے گھر بلکہ اپنے محلے کی جانب روانہ ہو گیا، کیونکہ تازہ صورتِ حال کے پیشِ نگاہ فہیم اور میں استاد بھانا کے اڈے پر رہنے لگے تھے جبکہ بہن عاصمہ ایڈووکیٹ زنیرہ کے ہاں تھی۔

اپنے مکان اور محلہ چھوڑنے کے سلسلے میں حاجی صاحب کو میں پہلے ہی بتا چکا تھا وہ بھی میری مجبوریوں کو سمجھے ہوئے تھے، میں سیدھا ان ہی کے ہاں پہنچا تو ان کے پرانے ملازم اسلم موکا نے بتایا کہ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔

”کب گئے؟ خیریت تو تھی ناں؟“ میں نے پوچھا۔

”خیریت ہی تھی نومی بھائی۔“ اسلم بولا۔ ”کسی عزیز کی شادی میں گئے ہیں پنجاب۔ گھر کے کچھ افراد تو ساتھ ہی چلے گئے تھے، چھوٹی بیٹا کے امتحانات چل رہے تھے آج ہی آخری پیپر دے کر آئی ہیں، انشاء اللہ کل صبح والی ٹرین سے میں انہیں اور خالہ آپا کو لے کر میں بھی پنجاب روانہ ہو جاؤں گا۔“

”ہمم! یہ بتاؤ اسلم بھائی کہ حاجی صاحب کو پنجاب گئے کتنے روز ہوئے ہیں؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”آج چوتھا دن ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ، مجھے دراصل منے میاں سے بھی ملنا ہے۔ کیا وہ حالیہ دنوں میں حاجی صاحب سے ملنے آئے تھے؟“

”آپ خورشید خاں کی بات کر رہے ہیں ناں؟“

”ہاں..... ہاں! میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔ وہی منے میاں۔“

اسلم نے ایک نظر کالیا پر ڈالی۔ چہرے سے یہی لگا مجھے جیسے وہ کوئی اہم انکشاف کرنا چاہتا ہو مگر کالیا کی موجودگی سے وہ کسی الجھن کا شکار ہو، میں نے اس کی یہ مشکل بھانپتے ہی کہا۔

”یہ میرا دوست ہے، اس کی فکر نہ کرو، تم کچھ بتا رہے

تھے؟" میرے لہجے میں بے چینی سی عجلت در آئی تھی۔ اسلم موکا نے حلق سے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔

"آپ کو شاید اسی لیے معلوم نہیں کہ آپ کچھ عرصے کے لیے محلے کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔" حسبِ عادت وہ اصل بات کرنے سے پہلے سسپنس پھیلاتے ہوئے بولا۔ میں ہونٹ بھینچے بے چین دل کے ساتھ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ کب وہ اصل بات اگلتا ہے اور کب ہم اس کے انکشاف سے فیض یاب ہوتے ہیں جبکہ کالیا بھی اپنی جگہ کھڑے کھڑے کسمسا رہا تھا۔

"آپ لوگ اندر بیٹھیں ناں نومی بھائی!" اسلم موکا ایک بار پھر اصل بات سے ہٹتے ہوئے اچانک بولا۔

"اسلم میاں! میں تمہارے منہ سے کچھ سننا چاہ رہا ہوں، اس سے پہلے کہ میں کچھ اگل دوں۔" میں نے تقریباً بھنائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ میرے تپے ہوئے لہجے پر فوراً بولا۔

"جج..... جی! نومی بھائی وہی تو بتا رہا ہوں۔"

"تو بتاؤ ناں!" اس بار کالیا بھی چپ نہ رہ سکا۔ اسلم موکا نے اس کی طرف ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھا پھر مجھ سے بولا۔

"وہ نومی بھائی! بات دراصل یہ ہے کہ....."

"ابے لے..... ابھی اصل بات رہتی ہے۔" کالیا زیرلب بڑبڑایا۔

"اس نے کچھ کہا؟" اسلم نے کالیا کے بڑبڑانے پر اس کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں کچھ نہیں کہا، اسے یوں ہی بڑبڑانے کی عادت ہے تم منے میاں کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں! منے میاں تو اپنے کنبے سمیت کب کا یہ محلہ اور گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔" اسلم موکا نے بالآخر انکشاف کر ہی ڈالا۔ میں بری طرح چونکا۔

"کیا؟ کب کیسے؟ کیوں گئے وہ؟" میرے منہ سے جیسے چوٹ کھائے ہوئے الفاظ برآمد ہوئے تھے۔

"بس جی اچانک ہی انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا یہاں سے ہجرت کرنے کا۔ بیٹی والے خوفناک واقعہ کے بعد بے چارے منے میاں کی تو کمر ہی ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ جانے کب اور جیسے تیسے مکان کا سودا کیا، حاجی صاحب کو بھی بس رسماً ہی اس وقت بتانے آئے تھے جب بوریا بستر باندھ چکے تھے۔"

"کچھ بتایا تو ہوگا کہ کیوں اور کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے درمیان میں پوچھا تو اسلم نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"گول مول سا ہی جواب دیا تھا کہہ رہے تھے کہ ابھی تو ایک عزیز کے ہاں ٹھہریں گے۔ اس کے بعد ہی کہیں اور ٹھکانا تلاش کرلیں گے۔ حالانکہ حاجی صاحب نے پریشان ہو کے پوچھا بھی تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی؟ مگر منے میاں نے کچھ نہیں بتایا، وہ جلدی میں بھی تھے۔ اسی لیے اپنے حاجی صاحب بھی انہیں تھوڑی دیر کے لیے بھی نہ روک سکے، بعد میں اڑتے اڑتے کچھ باتوں کا علم ہوا کہ منے میاں یہ محلہ ہی نہیں بلکہ شہر بھی چھوڑنے کا قصد کیے ہوئے تھے بلکہ حقیقت بھی یہی ہے، جس پر سارے لوگ متفق ہیں کہ منے میاں یہ شہر چھوڑ کر ہی جا چکے ہیں۔"

اسلم موکا کی ہر اگلی بات میرے لیے اس وقت انکشاف کا درجہ رکھے ہوئے تھی اور میری پریشانی میں اضافے کا سبب بھی۔ میں نے لمحہ بھر کو اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا۔

"یعنی ان کا کوئی اتہ پتا نہیں ہے۔ ان سے ملنا ہو تو بھی نہیں ملا جا سکتا؟" مجھے اپنا یہ سوال بچکانہ تو محسوس ہوا تھا لیکن شاید میں اس وقت ذہنی اضطراب میں مبتلا تھا یا پھر شاید کوئی اسلم موکا ہی کچھ ایسا بتا دے جو بتانا بھول گیا ہو۔

"کیسے ملا جا سکتا ہے؟ جب کہ وہ کچھ بتا کر ہی نہیں گئے کسی کو؟" اسلم بولا۔ "حاجی صاحب سمیت سب کا ہی یہی خیال تھا کہ منے میاں کسی کو شاید اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بتانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ بس بددل سے ہو گئے تھے وہ۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں یا حاجی صاحب کو منے میاں کے متعلق اور بھی کسی تازہ حقیقت کے بارے میں علم ہے۔" میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"تازہ حقیقت؟ کیسی تازہ حقیقت نعمان صاحب؟" اسلم الجھن آمیز سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"یہی کہ انہوں نے ان لوگوں کے ساتھ صلح کرلی ہے جن لوگوں نے ان کی بدنصیب بیٹی ثوبیہ کے ساتھ برا کیا تھا۔"

"آپ کا مطلب اس جاگیردار کے بیٹے عزیر خان سے تو نہیں۔"

"ہاں وہی۔" میں نے فوراً اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"ایسا تو کچھ نہیں کہا انہوں نے، ویسے خیریت تو ہے ناں؟ کہیں وہی تو وجہ نہیں ان کے اس طرح اچانک یہاں سے ہجرت کرنے کی۔"

اسلم موکا بھی ایک زیرک دماغ ہی شخص تھا، فوراً معاملے کی اس تہہ تک پہنچ گیا جہاں میں پہنچ چکا تھا۔

"حاجی صاحب کب تک لوٹ آئیں گے پنجاب سے؟" میں نے اس کے سوال کو دانستہ سرف نظر کرتے ہوئے پوچھا۔

"کم از کم دو ہفتے تو لگ ہی جائیں گے ان کی واپسی میں، آخر کو قریبی رشتے دار کی شادی ہے۔" اسلم نے جواب دیا اور پھر میں اس کا شکریہ ادا کر کے پلٹ گیا۔

اس بار میں نے اسکوٹر کالیا کے حوالے کردی کیونکہ مجھے ہی نہیں کالیا کو بھی ڈر تھا کہ کہیں اسکوٹر اور میرا تیزی سے دوڑتے ہوئے ذہن کا تصادم ہی نہ ہو جائے۔

"یہ ایک نئی پھنیگ پڑنے لگی ہے جگری!" کالیا نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی یار! یہ بہت برا ہوگیا، ہماری تو ساری بھاگا دوڑی اور محنت پر ہی پانی پھر گیا۔" میں نے کہا۔ کالیا مزید اسی طرح کا تبصرہ کرنا چاہتا تھا شاید لیکن میری بات اور لہجے سے مترشح تشویش کو بھانپ کر اس نے گویا ازراہِ تشفی مجھ سے کہا۔

"ابے لے جگری! تُو تو اپنا دل ہی چھوٹا کر کے بیٹھ گیا۔ پریشان نہ ہو اڈے پر چل کر ایک گرما گرم چائے پیتے ہیں اور آرام سے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

شام کی ملگجاہٹ جانے کب رات کی سیاہ زلفوں میں الجھ چکی تھی۔ سڑک پر ٹریفک جام تھا مگر کالیا تو "ہائیک ماسٹر" تھا۔ وہ ان پھنسی ہوئی گاڑیوں سے ویسپا اسکوٹر نکالتا ہوا چھلاوے کی طرح نکلتا چلا گیا۔ پھر ایک جگہ پر جب ہائیک کا راستہ بھی نہ بچا تو اس نے اسکوٹر ایک تنگ سی تاریک گلی میں گھسا دی۔ وہ شاید یہاں سے شارٹ کٹ مارنا چاہتا تھا۔ گلی کی حالت ناگفتہ ہو رہی تھی۔ جا بجا کھڈے تو تھے ہی بلکہ ڈرینج کا پانی بھی گٹروں سے ابلا پڑا ہوا تھا۔ چند گھروں کی پیشانی پر بلب لگے تھے جن کی بیمار سی روشنی گلی کی تاریکی کے سینے میں کھرورے خنجر کی طرح پیوست ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

اچانک اسکوٹر کو ایک جھٹکا لگا۔

"ابے لے!" کالیا کے حلق سے برآمد ہوتے یہ بے اختیار الفاظ اس وقت میرے کانوں سے ٹکرائے تھے جب میں اسکوٹر کو ایک زبردست جھٹکا لگنے کے باعث اس کے سر کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا سیدھا گدلے پانی کے تالاب میں گرا، شکر تھا کہ میرا سر پھٹنے سے بچ گیا، تاہم ایک رخ پر گرنے کے باعث میرے دائیں کاندھے اور کنپٹی والی جگہ پر چوٹ آئی تھی۔

اسکوٹر کا اگلا ٹائر سیوریج کے پانی میں چھپے کسی کھلے مین ہول میں جا پڑا تھا جس کے باعث اس کا اگلا ٹائر اندر جا پڑا تھا اور پیچھے سے میں اُچھلا تھا۔ کالیا بھی گر پڑا تھا۔ اسکوٹر کا انجن زور سے غرا کر بند ہوگیا تھا اور وہ وہیں پھنس کر رہ گیا تھا۔ البتہ اس کا پچھلا حصہ اُفقی حالت میں اوپر کو اٹھا رہ گیا تھا مگر تھوڑی دیر بعد وہ بھی گر پڑا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم دونوں خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گندے پانی سے کپڑے خراب ہو چکے تھے۔

"جگری! تو ٹھیک تو ہے ناں؟" کالیا جس کی اپنی حالتِ زار نا گفتہ تھی مجھ سے ازراہِ تشویش بولا۔

"میں ٹھیک ہوں یار! شکر ہے کوئی بڑی ٹوٹنے سے بچ گئی۔" میں نے اپنا دایاں کندھا سہلاتے اور ہولے سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"سالوں نے خبرداری کے طور پر کوئی کھوکھا بھی نہیں رکھا تھا کہ آتے جاتے لوگوں کو معلوم تو ہو سکے گدلے تالاب کے نیچے کھلا مین ہول بھی ہے۔"

"چل چھوڑ یار! جان بچی لاکھوں پائے اب ان لوگوں کو کیا کوسنا۔ تو اسکوٹر سنبھال۔" میں نے اس سے کہا۔

"جگری! لگتا ہے تجھے زیادہ چوٹ آئی ہے۔" کالیا پھر فکرمند ہوگیا۔ "تو ہوا میں اُڑتا گرا ہے۔"

"کہا نا میں ٹھیک ہوں، تجھے تو چوٹ نہیں آئی زیادہ؟" میں نے اس کی خیریت دریافت کی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔" کہتا ہوا کالیا اسکوٹر کو سنبھالنے کے لیے لپکا اسی وقت کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس سے سیلی سیلی تاریک گلی ایک دم روشنی میں نہا گئی۔

ہم دونوں گٹر میں پھنسی ہوئی اسکوٹر کو نکالنے میں مصروف تھے۔ کار کی تیز ہیڈ لائٹس ہم پر پڑی تو ہماری بھی غیر ارادی طور پر نظریں اس طرف کو اٹھ گئیں۔ ہماری آنکھیں

چندھیا گئیں جس کے باعث میں کچھ دیکھ نہیں پایا۔ میں نے اس کی طرف سے دھیان ہٹادیا اور اسکوٹر کے ساتھ لگ گیا مگر میں نے دیکھا کہ کالیا کی نظریں ہنوز گاڑی کی طرف ہی اٹھی ہوئی تھیں۔

"یہ رک کیوں گئی ہے؟" معاً کالیا نے خوفکلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ اسی کار کی طرف تھا اور دوسرے ہی لمحے کالیا نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور اسکوٹر کو چھوڑ کر اس نے مجھے دبوچا اور ساتھ ہی مجھ سمیت ایک طرف کو لپکا۔ لگتا یہی تھا کہ اس نے کسی خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب تلے اوپر دو تین فائر ہوئے تھے۔ ہم دونوں ہی چھپاکے سے گدلے پانی میں گرے۔

"نومی بھاگ۔" کالیا چیخا۔ اس نے مجھے ہنوز سہارا رکھا تھا۔ میں نے بھی اپنے حواسوں کو مجتمع کیا یوں کالیا اور میں ایک دوسرے کو سہارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اس طرف تاریکی میں۔" کالیا نے کہا۔ وہ کار کی تیز ہیڈ لائٹس کی زد سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ تین گولیاں چلنے کے بعد دو مزید گولیاں ہم پر داغی گئیں۔ تب تک ہم ہیڈ لائٹس سے نکل کر ڈارک پوائنٹ میں آچکے تھے۔ مزید تین فائر ہوئے۔ یہ اندازے سے جھونکے گئے تھے کہ ان میں اسے ایک بھولی بھٹکی گولی کا نشانِ بے خطا ثابت نہ ہوا، کیونکہ اسی وقت میں نے کالیا کی کراہتی ہوئی چیخ سنی تھی۔ وہ چھپاک سے کیچڑ زدہ پانی میں گرا، کالیا کی کراہ آمیز چیخ پر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں بہ سرعت اسے سنبھالا دینے کے لیے جھکا۔ تب ہی میں نے دو آدمیوں کو کار کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح کہ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ ہم کس سمت میں ہو سکتے تھے، یقیناً یہ اندازہ انہوں نے کالیا کی چیخ پر لگایا ہوگا۔ میں نے کالیا کو اٹھایا اور اسے سہارا دیا۔ کیچڑ زدہ پانی سے ہم دونوں ہی لت پت ہو رہے تھے۔ گندے پانی کی زہریلی سڑاند نتھنوں میں گھسے جا رہی تھی اور دماغ بری طرح جھنجلا گیا تھا۔ اچانک پے در پے پھر فائر ہوئے، اس بار کالیا کے ساتھ میرے حلق سے بھی چیخ خارج ہوگئی۔ ایک گولی مجھے دائیں کندھے پر دوسری گولی بائیں پہلو پر لگی تھی۔ کالیا کا کچھ پتا نہ تھا کہ اس بے چارے کے دوسری گولی جسم کے کس حصے میں پیوست ہوئی تھی۔ دوسری بار اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی تھی، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوسری گولی اس کے جسم میں کسی نازک مقام پر لگی تھی۔ میرا اپنا حال بھی یہی تھا کہ میں بس اب گیا کہ تب گیا۔ میری آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھانے لگا تھا اور حواس مختل پڑنے لگے تھے۔ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی تھی اور اسی وقت کوئی میرے اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "نہیں نومی! تمہیں سنبھلنا ہے، ورنہ آج کالیا اور تمہاری کہانی ختم۔"

کبھی کبھی انسان کی قوتِ ارادی بھی جادو اثر ثابت ہوتی ہے۔ اس میں یقینی طور پر ایک جذبے اور عزم کی پختگی کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اسی سبب اتنا زخمی ہونے کے باوجود میں نے ہونٹ بھینچے ہوئے خود کو سنبھالا سر کو دو تین بار جھٹکا۔ اس اثناء میں اطراف کے گھروں کے دروازے بھی کھل چکے تھے۔ گولیوں کے دھماکوں کی آوازیں سن کر لوگ اندر دبکنے کی بجائے، دروازے تھوڑا وا کیے صورتِ حال کا جائزہ لینے لگے تھے۔

سر کو جھٹکے دینے کے باعث میری آنکھوں سے اندھیارے چھٹے تو میں نے کوئی حرکت کرنے سے قبل ان دونوں حملہ آوروں کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں اسلحہ تھما ہوا تھا۔ وہ اسی طرف ہی آرہے تھے، گدلے پانی کی وجہ سے انہیں بھی دوڑنے میں وقت تو ہو رہی تھی لیکن میں ان سے بچنے کے لیے حرکت کرنے سے بالکل ہی قاصر تھا۔ میرے کندھے اور خاص کر پہلو والے زخم نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا، اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر میں فقط یہی کر سکا تھا کہ خود کو بے ہوش ہونے سے بچا رکھا تھا مگر کب تک؟ غشی مجھ پر جوں کی توں طاری تھی اور میں کسی وقت بھی دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونے والا تھا جبکہ کالیا اس حال کو پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ اس کی طرف سے مجھے کوئی جنبش تک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

پے در پے گولیوں کے دھماکوں کے باوجود گلی میں سناٹا طاری تھا۔ یا تو آبادی یہاں کی محدود تھی یا پھر خوف زدہ لوگوں نے گھر کے اندر ہی دبکے رہنے میں عافیت سمجھی ہوگی جو کچھ بھی تھا یہ بات ہمارے خلاف اور موت کے ان دونوں ہرکاروں کے حق میں جاتی تھی۔

"جج..... جگری! ایسے ہی پڑا رہے۔"

معاً میرے کانوں سے کالیا کی کمزور اور خفیف سی آواز ٹکرائی۔ میرے دہتے وجود کی مایوس کن تاریکیوں میں کالیا کے ان الفاظ نے جیسے پل کے پل میرے اندر ویسی ہی ہمت دوبارہ جگا دی تھی جیسے بجھتے ہوئے چراغ کی لو ایک آخری بار زور سے ٹمٹماتی ہے۔

کالیا نے بھی شاید میری طرح اس قدر زخمی ہونے کے باوجود اپنی ہمت کو چار و ناچار سہی قائم کر رکھا تھا۔ اس کی آواز چاہے جتنی بھی کمزور سہی اس میں مجھے ایک احساس جھلکتا محسوس ہوا تھا۔ ایسا احساس جس کی قوت ہر اس جذبے سے بڑھ کر تھی جو مایوسی اور ناامیدوں کے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے، کالیا کی آواز سنتے ہی میں جیسے دوبارہ روشنی کی جانب کھنچا چلا آیا، عجیب کمال تھا میرے یار کالیا میں بھی میرے ڈوبتے ذہن اور ساتھ چھوڑتے حواسوں نے دوسری بار حوصلہ پکڑا تھا۔

میں کیچڑ زدہ زمین پر پہلو کے بل پڑا تھا، اس طرح کہ کالیا میرے بالمقابل ہی پشت کے بل ذرا بائیں پہلو پر جھکا ہوا گرا پڑا تھا۔ بظاہر ہم دونوں کی نظر آتی حالت قابلِ رحم ہی تھی، کار کی ہیڈ لائٹس کے روشن دائرے، ہم سے دو تین گز کے فاصلے پر ہی جیسے ہماری طرح بے حال دھرے پڑے تھے۔

دونوں سائے موت بن کر ہمارے بالکل نزدیک آگئے۔ اب ان کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے ہاتھ میں پستولیں صاف نظر آرہی تھیں۔ ہم پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ میں نے ایک آنکھ کی جھری بنا کر موت کے ان سفاک ہرکاروں کو دیکھنے کی سعی چاہی، موت ہم سے گز کے فاصلے پر ہی نہیں بلکہ چند انچ کی دوری پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو، کہاں جاؤ گے اب بچ کر..... بہت ستایا ہمیں تم دونوں شیطانوں نے۔ (بالخصوص سیٹھ ستار کا یہ پسندیدہ جملہ تھا) لیکن اب بس، تمام ہوئی تمہاری یہ حیاتِ درماندہ۔

ایک آواز میری ڈوبتی سماعتوں میں پڑی۔

"یہ دوسرا کون ہے؟"

"اس کا ساتھی لگتا ہے شاید، ہمارا شکار تو یہ رہا۔" دوسرے ہرکارے نے کہتے ہوئے میرے چہرے پر اچھی طرح روشنی پھینکی۔ آخر الذکر کی آواز نے میرا ذہن سننا کر رکھ دیا، میرے خوابوں خیالوں میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ میں اس خبیث شخص کی آواز اتنی جلد موت کی صورت سن پاؤں گا۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔

"دونوں مر چکے ہیں شاید لیکن پھر بھی ان کے سروں میں گولی اتار کے تسلی کرنا ضروری ہے۔" اوّل الذکر نے سفاکانہ لہجے میں کہا اور پھر میری ایک آنکھ کی ادھ کھلی جھری نے ان دونوں سایوں کے پستول والے ہاتھ بلند ہوتے دیکھے۔ تب ہی میرے قریب پڑے کالیا کے بے سدھ جسم میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت ہوئی۔ یہ شاید اس نے اب

پروین بابی بھارت کی وہ پہلی اداکارہ ہے جس کی تصویر ٹائم میگزین نے سرورق پر لگائی۔ اس نے 4 اپریل 1949ء کو متبوضہ جونا گڑھ (صوبہ سوراسٹرا انڈیا) میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم ماؤنٹ کارمل ہائی اسکول احمد آباد (گجرات) سے حاصل کی اور پھر سینٹ زاویئر کالج احمد آباد سے بی اے کیا۔ اس کے والد ولی محمد خان بابی (انتقال 1959ء) نواب آف جونا گڑھ کے دیوان تھے۔ پروین والدین کی شادی کے 14 سال بعد پیدا ہوئی تھی اور اکلوتی رہی۔ پروین نے شادی نہیں کی تھی لیکن افواہ سنی گئی کہ اس کے تعلقات مہیش بھٹ، کبیر بیدی اور ڈینی ڈونزنگیا سے تھے۔ 30 جولائی 1983ء کو اس نے بھارت چھوڑ دیا جب کہ وہ اس کے عروج کا دور تھا۔ اس نے ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے بہت سے ممالک کا دورہ کیا لیکن زیادہ وقت کیلی فورنیا امریکا میں گزارا۔ 7 اپریل 1984ء کو اسے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر گرفتار کرلیا گیا کیونکہ وہ اپنے شناختی کاغذات پیش نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے ہتھکڑی لگا کر پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ یہ خبر انڈین کونسل جنرل کو ملی تو وہ اس کی مدد کے لیے خود پہنچ گئے۔ نومبر 1989ء کو وہ واپس بمبئی آگئی۔ یہاں آنے کے بعد اس نے بیان دیا کہ ایتابھ بچن، بل کلنٹن، روبرٹ ریڈ فورڈ، پرنس چارلس، الگور، امریکی حکومت، برطانوی حکومت، فرانسیسی حکومت، رومن کیتھولک چرچ، سی آئی اے، سی بی آئی، کے جی بی اور موساد مل کر مجھے ماردیں گے، وہ سب میری تلاش میں ہیں۔ 1989ء میں ہی اس نے ایک بڑے اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ایتابھ بچن ایک عالمی دہشت گرد ہے۔ اس نے مجھے اغواء کرا کے ایک جزیرے پر رکھا جہاں میرے کان کے نیچے ایک ٹرانسمیٹر چپ لگا دی گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کروئی تھی کہ وہ شیزوفرینیا کی مریضہ ہے۔ 22 جنوری 2005ء کو فلیٹ کی یونین والوں نے پولیس کو خبر دی کہ پروین بابی کے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ باہر کئی دن سے دودھ کی بوتلیں اور اخبارات پڑے ہیں۔ پولیس نے آکر دروازہ توڑا تو اندر اس کی لاش پڑی تھی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس نے تین دن سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے لیکن معدے میں الکوحل کی تھوڑی سی مقدار ملی ہے۔

تیک خاموشی سے پڑے اپنے ریختہ وجود کی طاقت کو مجتمع کرنے کے بعد ہی ان پر آزمائی تھی۔ کالیا کا یہ آخری وار..... ایک پیٹھ دوکاج کے مصداق ہی ثابت ہوا تھا جس نے میرے ٹوٹے وجود کے اندر کوہِ شکن حوصلوں کی بجلی بھر دی تھی۔

کالیا کی اسی ٹانگ نے بہ سرعت اور ضرب کاری کی صورت حرکت کی تھی جو آخر الذکر کے ساتھ اور کالیا کے قریب کھڑے شخص کے پہلو پر اس زور کی پڑی تھی کہ بس مذکورہ ہرکارے کے اچھلنے کی ایک ذرا ہی کسر باقی رہ گئی تھی۔ وہ تھرک کر اپنے ساتھی ہرکارے سے جا ٹکرایا تھا۔ کچھ اس طور کہ دونوں ہی اپنا توازن کھو بیٹھے، یہی وہ موقع تھا جب میرے اندر کے کھولتے ابلتے آتش فشانی جذبے نے لاوا اُگلا۔ اک انداز طوفانِ بلاخیز کی صورت میں تڑپا اور لیٹے لیٹے اپنے وجود کا رخ ان کی طرف موڑ کر ایک کی ٹانگوں سے جا لپٹا، بس اتنی ہی سکت کر پایا تھا میں کہ وہ نیچے آ رہا، پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ سفاک دشمن کو کرتے دیکھ کر ہمت سوا ہوئی تو میں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل پر فقط گھسٹتے ہی اس جنونیوں کے سے انداز میں اس پر جا چڑھا کیونکہ یہ میرا شکار تھا لیکن مجرم یہ گودی پر کام کرنے والے اس غریب محنت کش نوجوان..... غفورے کا تھا جس کے بوڑھے مزدور باپ نے میری عین اس وقت جان بچائی تھی جب بن رائد کے سفاک چیلے راکا نے کنٹینر کی دیوار سے ایک بھاری بکس کھسکا کر میرے اوپر گرایا تھا مگر نتیجے میں غفورے کے باپ نے مجھے بچانے کی خاطر دھکا دے کر خود اس کی جاں کش زد میں آ کے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

شاید یہی وہ جوشِ غیض و غضب آمیختہ جذبہ تھا جس نے میرے ریختہ وجود کے ردم ردم میں نفرت و انتقام کی آگ ایک آتش فشانی طاقت میں بدل دی تھی۔ ہاں وہ راکا ہی تھا۔ میں نے کیچڑ سے اسی طرح رینگتے ہوئے تڑپ کر اس کے سینے پر رسائی حاصل کی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی لیکن جلد ہی مجھے اس تکلیف دہ اور اذیت ناک حقیقت کا بھی احساس ہو گیا کہ میری ٹوٹتی ابھرتی طاقت میں دم نہیں سما پا رہا تھا جس کی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے میں اس خبیث اور درندہ صفت انسان راکا کی موٹی بیل جیسی گردن دبوچ ڈالتا، یہ کام میں نے انگلیوں سے لینے کی سعی چاہی تھی کہ وہ تڑپ کر بس میری گرفت سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر میرے وجود کی دم توڑتی طاقت میں غیظ جنوں کی برق دوڑی اور میں نے اپنا منہ اس کی گردن پر کیا، تب تک وہ اپنی گردن میرے ہاتھوں کی گرفت سے با آسانی چھڑا چکا تھا مگر میرے دانت اسے پھاڑ کھانے کے لیے اس کی گردن تک پہنچ چکے تھے۔ وہی میں نے گاڑ دیئے۔

راکا کی مجھے کریہہ ناک خرخراہٹیں سنائی دیں اور اگلے ہی لمحے میرے حلق سے کرب انگیز چیخ خارج ہو گئی، نتیجے میں اس کی گردن میرے خون آلودہ دہن کی گرفت سے نکل گئی۔ اس نے میرے زخمی پہلو پر نجانے کیسے موقع پاتے ہی اپنی ایک ٹانگ کے گھٹنے کی ضرب لگا دی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب میری تمام حسیات ساتھ چھوڑ رہی تھیں، میری ڈوبتی سماعتوں میں پولیس سائرن کی آواز پڑی، نہیں جانتا تھا میں کہ کالیا کے ساتھ کیا ہوا تھا کیونکہ میں ہوش و خرد کی دنیا سے بے گانہ ہو گیا۔

☆.....☆

پتا نہیں آنکھ کھلی تھی میری یا مجھے ہوش آ گیا تھا کہ میں نے سب سے پہلے اپنے اوپر جھکا ہوا ایک نرم و نازک چہرہ دیکھا۔ یہ جانا پہچانا اور آشنا چہرہ تھا جسے دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون نصیب ہوا تھا۔ یہ چہرہ جس قدر میرا شناسا تھا اسی قدر میرے لیے غیر متوقع بھی یا پھر شاید یہ حسنِ اتفاق کا شاخسانہ تھا اور مجھے بھی اس نازک وقت میں ایسے ہی چہرے کی تو ضرورت تھی جو میرا غم بانٹتا، ایسے میں یہی چہرے تو اپنے پن کا احساس دلاتے ہیں، غم دوراں سے غم زندگی کو بھلانے کا سبب بنتے ہیں۔

یہی وہ چہرے ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر زندگی کی تابندگی کا احساس ہوتا ہے جینے کی دل میں ایک نئی امنگ پیدا ہوتی ہے، دل کرتا ہے کہ قسمت کے ان کٹھور رویوں کے باوجود زندگی جی جائے، کسی کے سنگ زندگی گزاری جائے۔ اب تک کے حالات و گرگوں کی کچھ ایسی کشاکشی طاری رہی تھی میرے نصیب کے آسمان پر کہ میں اس تارے کو فراموش ہی کر چکا تھا جو مجھے میری حیات درماندہ کے تپتے ریگ زار میں نخلِ اُمید کی طرح تھا، زندگی کی دھوپ میں چھاؤں جیسا تھا وہ شخص اور وہ میرے سامنے تھا۔ فوزیہ میرے سامنے تھی۔ میری آنکھوں کے قریب، میرے جسم و جاں کے بے حد پاس وہ وہیل چیئر پر تھی اور میں بیڈ پر وہ میرے قریب تھی اور اس کا گلِ نوبہار چہرہ میرے سامنے میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ وہ کرسی سے ذرا آگے کو جھک آئی تھی۔ مجھے آنکھیں کھولتا دیکھ کر اس کے گالوں کے شفق رنگ گہرے ہو گئے۔ سیاہ غزالی آنکھوں میں جدائیوں کے دیپ شکوؤں کی صورت روشن تھے تو ان میں پیار کی شمعیں بھی فروزاں محسوس ہوتی تھیں۔

اتنی کٹھنائیوں کے بعد فوزیہ کا یوں اچانک اور غیر متوقع قرب میرے اندر کی ساری کدورتیں اور تکان دور کر گیا تھا۔ محبت کی میٹھی میٹھی آنچ نے گویا میری پریشانیوں اور اب تک کے اعصاب شکن لمحات کے بار گراں کو یکا یک جیسے بھاپ بنا کے اڑا دیا، یوں میں اس کی سنگت میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

"شکر ہے خدا کا..... آ..... آپ کو ہوش آ گیا۔" اس کی نرم اور میٹھی آواز مدھر ہاں ہوئی۔

اسے دیکھ کر اس کی آواز سن کر ایک لمحہ بے اختیاری تھا جو مجھ پر طاری ہونے لگا تھا، اس سے ہمکلام ہونے کی چاہ میں جب میں نے بولنے کی کوشش چاہی تو مجھے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے، خشک ہونٹوں نے اک ذرا سی جنبش سے بھی انکار کر دیا۔ آواز جیسے میرے سینے کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ بے بسی کی ایک نقاہت بھری لہر تھی جس نے مجھے رنجور کر دیا۔

"کیا میں بولنے سے بھی قاصر تھا؟" تب ہی میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں تو حرکت کرنے سے بھی قاصر تھا، تب ہی میں نے گردشی نظروں سے جہاں تک دیکھ سکتا تھا، فوزیہ کے چہرے سے نظریں ہٹا کر خاموش نگاہوں سے تھوڑا جائزہ لیا۔

وہ مجھے کسی اسپتال کا پرائیویٹ روم ہی لگا تھا۔ میں سفید رنگ کے صاف ستھرے بستر پر دراز تھا۔ سینے تک سرخ رنگ کا لحاف پڑا تھا۔ میرے دائیں بائیں دو عدد ڈرپ اسٹینڈ رکھے ہوئے تھے۔ ان سے جھولتی ڈرپز کی نلکیاں ایک میرے سیدھے ہاتھ اور دوسری بائیں ہاتھ کی طرف جاتی لحاف کے اندر غائب ہو رہی تھیں۔ جسم کو مقدور بھر جنبش دینے پر مجھے درد اور ٹیس کا احساس ہوا، حواسوں نے یارا کیا تو سب کچھ بتدریج یاد آتا چلا گیا۔ تب ہی مجھے کالیا کی فکر ہوئی اور میں بے چین ہو گیا۔

"آ..... آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے انشا اللہ، پریشان نہ ہوں۔" فوزیہ کی بدستور تکتی ہوئی نگاہوں نے شاید میرے چہرے پر لکیروں کا جال سا بنتا دیکھ لیا تھا۔ وہ سبب بن رہی تھی میرے حوصلے کا اور یہی انداز وہ اختیار کیے ہوئے تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی مجھے بھی اسے اتنا قریب پا کر اتنا پاس دیکھ کر قرار سا شامل رہا تھا مگر مجھے کالیا کی فکر ہونے لگی۔

میں نے ایک بار پھر بولنے کی سعی چاہتے ہوئے اس بار پہلے اپنے خشک ہونٹوں کو زبان پھیر کر تر کیا تھا اور بس پھر یہی کر سکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی جو تھوڑے بہت حواس مستعار ملے تھے وہ چھننے لگے تھے، ممکن تھا میں مسکن آور دواؤں کے زیر اثر تھا۔ یا پھر نقاہت اور کمزوری اس کی وجہ تھی کہ ایک بار پھر میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔

دوبارہ ہوش آنے پر میری نظریں دھندلائی ہوئی تھیں۔ میں نے دو ایک بار آنکھیں کھول بند کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ کچھ دیکھنے کے قابل ہو سکوں مگر دھندلاہٹ بدستور آنکھوں کے سامنے طاری رہی۔ اسی دھندلاہٹ میں مجھے سامنے ایک متحرک سا سایہ تھرکتا دکھائی دیا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ وہ فوزیہ ہو گی مگر نہیں، وہ سایہ فوزیہ جیسی نرم و نازک لڑکی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو کوئی بھاری بھرکم اور بڑے قد و کاٹھ کا کوئی آدمی تھا۔ اس کے شانے بھی چوڑے تھے اور اس نے شاید فل کوٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔

میں نے اسے دیکھنے اور پہچاننے کی اپنی سی کوشش جاری رکھتے ہوئے اپنی آنکھوں کو کھول میچ کرنے لگا تو کچھ دھندلاہٹ چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن اب بھی میں واضح طور پر اس سائے کو پہچاننے سے قاصر تھا۔

تب ہی میں نے اس کے ہاتھوں کو بلند ہوتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں کچھ تھا، ہاں! مجھے سرنج سی نظر آ رہی تھی۔ وہ میرے بیڈ کے بالکل قریب آ چکا تھا۔ میں سمجھ گیا وہ ڈاکٹر تھا، میں اس سے اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی آواز میری دبی دبی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"نعمان! تمہیں میں نے بارہا سمجھایا بلکہ مواقع بھی دیئے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو، اس سے ہٹ جاؤ۔ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں مگر تم!" اس نے یہ کہتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور میں اس آواز کو سنتے ہی یک لخت میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

"پردہ نشیں..... شاہ میر..... پردہ نشیں..... شاہ میر.....!"

ایک ہی گردان میرے اندر دھاڑیں مارنے لگی۔

"نعمان! تم شاید یہ سمجھے تھے کہ اپنے کتنی کے چند دشمنوں پر غلبہ پا لینے کے بعد تم مجھے بھی کوئی گزند پہنچا دو گے تو یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں تھی۔"

وہ بولے جا رہا تھا اور میرا سارا وجود چیختے ہوئے

ستاٹوں کی زد میں تھا۔ میرے ازلی دشمن کا یوں ایسی حالت میں مجھ سے سامنا ہوگا کہ میں خود بے بس اور صاحب فراش تھا اس کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اپنے آپ سے معذرت کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس وقت خود میری مثال ایسے چوہے کی سی تھی جس نے زہر کی گولی بھی کھا رکھی ہو اور وہ چوہے دان میں بھی پھنسا ہوا بیمار حالت میں پڑا اینٹھ رہا ہو۔

"تم اپنے ہی نہیں، اپنے چھوٹے بھائی فہیم کے بھی دشمن ثابت ہوئے اور بالآخر تمہیں آخری عبرت ناک سبق دینے کے لیے مجھے اسے دونوں ٹانگوں سے معذور کرنا پڑا۔ جس کا تم پر کوئی خاطر خواہ اثر ہونے کی بجائے الٹا اثر یہ ہوا کہ تم نے میری جڑوں میں گھسنے کی کوشش کر ڈالی۔"

اس کی بھاری کھرکھراتی آواز مجھے کسی اژدہے کی اس پھنکار سے مشابہ محسوس ہونے لگی۔ جس نے شکار تاڑ لیا ہو اور اب وہ اس پر اپنی دہشت طاری کر کے اسے خوف سے مجسم ساکت کرنے کے بعد فیصلہ کن حملہ کے لیے تیار ہو۔

اس آواز کو میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا، جسے میں نے اب تک صرف فون پر ہی سنا تھا۔ کوئی اور "آزاد" موقع ہوتا تو اپنے بھائی کی معذوری سے متعلق اس خبیث کے سفاک اعتراف پر میں اس کا گلا ہی دبوچ ڈالتا لیکن میں اس وقت بے بسی کے مارے صبر کے گھونٹ ہی بھر کے رہ گیا لیکن ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ میں خود اس وقت اس جلاد صفت آدمی کے رحم وکرم پر تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے فوزیہ کا مسکراتا چہرہ دیکھا تھا اس کی مدھر ہاں آواز کو سنا تھا اور اب یہ اچانک میرا سب سے بڑا دشمن مجھ پر حاوی نظر آرہا تھا؟ آخر یہ کیا ماجرا تھا جبکہ جگہ بھی وہی تھی اور کمرا بھی وہی حتیٰ کہ بیڈ بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ میں نے پہلی بار بے ہوش ہونے کے بعد خود کو اس پر صاحب فراش پایا تھا، تو پھر یہ فوزیہ مجھے سفاک دشمن کے حوالے کر کے کدھر چلی گئی تھی؟

"خیر! اب کیا فائدہ ان باتوں کا تمہاری کہانی اب میں ختم ہی کرنے والا ہوں۔" وہ پھر بولا اور میں نے اسے تھوڑا اور قریب آتے محسوس کیا۔

"تم بہت خطرناک حد تک میرے قریب پہنچ چکے ہو۔ تمہیں اب ختم ہی ہو جانا چاہیے۔" اس کی سانپ کی طرح پھنکارتی آواز جاری تھی اور میرا رواں رواں اللہ سے مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ اس کے سوا کون میری ان یار و مددگار گھڑیوں میں مدد کر سکتا تھا۔ کالیا کا تو پہلے ہی کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ آخری بار جب ہم دونوں زخمی حالت میں پڑے تھے تو میرے کانوں نے پولیس سائرن کی آواز سنی تھی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

"میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک ڈراپ کے چند قطرے ٹپکا دیئے ہیں۔" اس کی زہر میں بجھی آواز دوبارہ ابھری۔ "اس کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میں ہر کام میں حفظِ ماتقدم کا پہلو رکھتا ہوں، تم مجھے پہچان نہ پاؤ اور اگر تمہاری موت کا وقت تھوڑا طویل ہو جائے تو تم کسی کو بتا نہ سکو میرے بارے میں یوں بھی ایسی بے بسی والی موت تمہارے شایانِ شان ہی ہوگی۔ میرے ہاتھ میں جو سرنج ہے اس میں صرف ہاف سی سی سائنائیڈ زہر کی مقدار جو سرنج الاثر ہے، اسے تو صرف سونگھ لینے سے ہی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ بہت دھیرے دھیرے تمہاری ڈرپ کے ذریعے خون میں شامل ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھر میری دھندلاتی آنکھوں نے اس کے سرنج والے ہاتھ کو اس نلکی کی طرف بڑھتے دیکھا جس سے منسلک سوئی میری نس میں پہلے سے ہی لگی ہوئی تھی، میں اپنے بچاؤ کے لیے حلق اور منہ پھاڑ کے چیخنا چاہتا تھا، کسی نرس یا ڈاکٹر کو مدد کے لیے پکارنا چاہتا تھا لیکن میری تو جیسے پورے وجود کی طاقت ہی سلب ہو چکی تھی۔ مجھے اپنی موت..... یقینی موت..... صرف چند انچ کے فاصلے پر نظر آنے لگی تھی۔

میں نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ میں یوں بے بسی کے اندھیاروں میں اور وہ بھی ایسے ازلی دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں گا جسے ختم کرنا میری زندگی کا اہم مقصد بن کر رہ گیا تھا۔ میں نے ہلنے جلنے کی بھی کوشش چاہی تھی اور شاید فقط جسم کا کچھ ہی حصہ ہلا بھی پایا ہوں مگر وہ سکت نہ تھی کہ میں اپنے دفاع کے لیے کچھ کر سکتا۔

"انکل! آپ یہاں ہیں؟ پاپا آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔"

یہ مترنم سی شناسا آواز جیسے میرے لیے مژدہ جانفزاء ثابت ہوئی جس نے مجھے چونکا دیا تھا اور جس نے مسرت کی لہریں اور زندگی کی امیدیں میرے اندر ایک دم ہی بیدار کر دی تھیں۔

یہ فوزیہ کی آواز تھی مگر "انکل" اس نے کیا کہا تھا؟ یہ میرے لیے اچنبھے کی بات تھی اور کیا فوزیہ نے اسی خبیث شاہ میر کو ہی "انکل" تھا اور کون تھا بھلا اس کے علاوہ کمرے میں؟ تب ہی میری دھندلاتی نظروں نے جواب دھیرے دھیرے

صاف ہونے لگی تھیں، نے شاہ میر کو ٹھہرتے اور یک دم اپنا سرنج والا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالتے دیکھا۔ وہ پلٹا۔ میں نے بھی گردن ذرا گھما کر دیکھا۔

فوزیہ وہیل چیئر سمیت دروازے پر موجود تھی۔ میں نے چلا کر کچھ بولنے کی کوشش چاہی تھی مگر اتنی سکت ہی نہ تھی، میں نے اپنے جسم کو ہلانے کی بھی سعی چاہی مگر ایک ذرا جنبش کے وہ ہل کے نہ دیا تھا۔ میں چیخ کر فوزیہ سے کہنا چاہتا تھا۔ "مجھے اس درندے سے بچاؤ فوزیہ! ورنہ یہ سفاک شخص ہمارے بیچ دائمی جدائیاں ڈال دے گا۔"

"آں، ہاں، بیٹا! میں ابھی آتا ہوں، تم چلو۔" شاہ میر کی آواز ابھری اس نے فوزیہ کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی چالاکی سے کہا تھا۔

"نہیں..... نہیں فوزیہ! مت جانا، اس کی باتوں میں مت آنا۔" میں اندر سے چیخا، مارے بے بسی کے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"او کے انکل!" فوزیہ کی آواز ابھری۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اس مکار کے جھانسے میں آ گئی تھی۔

"لیکن انکل! آ..... آپ وہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ کیا کوئی پرابلم ہوئی ہے؟" یکلخت مجھے فوزیہ کی قدرے چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میری ٹوٹتی امید کی شاخ دوبارہ تن گئی۔

"کچھ نہیں بیٹا! بس میں وہ ذرا ڈرپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ کیا بھروسا یہاں کے ہاسپٹلز کا ایکسپائرڈ ادویات بھی استعمال کر ڈالتے ہیں۔" وہ چالاکی سے بولا۔

"ہاں انکل! یہ بات تو آپ نے صحیح کہی۔" فوزیہ بولی، میرا دل ایک بار پھر ڈوبنے لگا۔ امید حیات کا دیا ایک بار پھر بجھنے کے لیے ٹمٹمانے لگا۔ کیا فوزیہ ایک بار پھر مجھے اس رزیل کے رحم وکرم پر چھوڑ جائے گی؟ لیکن یہ سب آخر کیا تھا؟ فوزیہ اس شخص کو "انکل" کہہ رہی تھی۔ کیوں؟

"اچھا انکل!" فوزیہ یہ کہہ کر پلٹنے لگی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے عطا محمد کی آواز سنائی دی۔

"چلو اچھا ہوا میر صاحب! آپ ادھر ہی مل گئے لیکن آپ یہاں کیسے؟" اس کے لہجے میں اچنبھا آمیز حیرت تھی۔

"جی..... یہ مجھے زہریلا ٹیکا لگا کے ہلاک کرنا چاہتا ہے، خدا کے لیے اس وقت کوئی اس کمرے سے نہ جائے۔" میں چیخ کر یہ کہنا چاہتا تھا مگر عبث۔ ہاں! اب اتنا ضرور ہوا تھا کہ میری آنکھوں میں ڈالے گئے ڈراپس کی تاثیر ختم ہونے لگی تھی۔ میں اب دیکھنے کے لائق ہو گیا تھا۔ تب ہی میں نے سب سے پہلے اپنے ازلی دشمن پر نظر ڈالی تھی۔

اس کا چہرہ گورا اور چربیلا سا تھا، چوڑا اور بھاری بھی۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں، ناک آگے کو مڑی ہوئی تھی۔ میں نے عطا محمد کی آواز سن کر سکون و اطمینان کی سانس لی اور تب ہی میں نے شاہ میر کا چہرہ سیاہ پڑتے دیکھا۔

وہ فوزیہ کی آمد پر سرنج والا ہاتھ نیچے کر چکا تھا اور اب عطا محمد کی آمد پر وہ ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال چکا تھا۔

"ہاں عطا! آؤ مجھے فوزیہ بیٹی نے بتایا تھا کہ تم مجھے باہر ڈھونڈ رہے تھے۔ میں ابھی تمہاری طرف آنے ہی والا تھا۔" کہتے ہوئے شاہ میر اس کی جانب پلٹا۔

لگتا تھا قسمت میری یاوری کر رہی تھی کیونکہ اسی وقت

شناہ خان ماڈلنگ کے ذریعے ٹی وی ڈراموں تک پہنچی اور ڈراموں نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اسی دوران اس کی ملاقات بابر خان نامی اداکار سے ہوئی۔ بابر خان نے شادی کی پیشکش کی تو وہ فوراً راضی ہو گئی۔ ابھی ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ حادثہ رونما ہو گیا۔ وہ بابر خان کے ساتھ ایک اسٹیج پروگرام کرنے حیدرآباد جا رہی تھی کہ اس کی کار کو حادثہ پیش آ گیا۔ بابر خان کمبیر روپ سے زخمی ہوا مگر شناہ موت کی بانہوں میں جا سوئی۔

☆☆

شمیم ایمن پشتو زبان کی مشہور گلوکارہ تھی۔ 26 اپریل 2009ء کو اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے شوہر نے قتل کا الزام اس کے بھائی پر لگایا تھا لیکن قتل کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔

☆☆

شہناز بیگم 1950ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ وہ معروف گلوکارہ بن بیگم کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے گلوکاری میں 13 نگار ایوارڈ حاصل کیے تھے۔ 2011ء میں لکس اسٹائل ایوارڈ کا لائف ٹائم ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔ وہ غیر شادی شدہ زندگی گزار رہی تھیں۔ 19 جنوری 2013ء کو وہ علاج کی غرض سے کراچی سے میامی فلوریڈا جاتے ہوئے بحرین کے ہوائی مستقر پر ٹرانزٹ کے دوران انتقال کر گئیں۔

سفید کوٹ پہنے اور شفاف عدسوں کی نفیس عینک لگائے ڈاکٹر بھی اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک وارڈ بوائے ٹائپ لڑکا اور یونیفارم میں ملفوف خاصی فربہ اندام مگر خوب صورت سی نرس بھی تھی، جس نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔

"تم اب ٹھیک ہو! گھبرانے کی بات نہیں۔" ڈاکٹر خوش خلقی سے کہتے ہوئے مجھ پر ذرا جھکا تھا۔ اس نے شاید میرے نہ بول سکنے کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ لہٰذا ایک لمحاتی توقف کے بعد آگے بولا۔

"ایسا کمزوری کی وجہ سے ہے۔ شکر کرو کہ گولی نے اندرونی اعضا کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔" تھوڑے توقف کے بعد وہ دوبارہ سنجیدگی سے بولا۔

"تمہاری طبیعت ذرا سنبھل جائے تو پولیس کو بیان بھی دے دینا۔ پولیس کا ایک اے ایس آئی اسی انتظار میں ہے وہ بار بار مجھے فون کر کے تمہارا پوچھ رہا ہے، تھانہ قریب ہی ہے۔ ضابطے کی کارروائی نمٹانا ہوگی اس نے۔"

مجھ میں سروست کمزوری اور نقاہت کے باعث بولنے کی سکت نہیں تھی، ورنہ میں کالیا کے بارے میں ضرور پوچھتا لیکن اچانک مجھے خیال آیا۔ کیا پولیس کو بیان دیتے وقت مجھے کالیا کا ذکر کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔ لیکن ابھی تو میرے نزدیک یہ پریشان کن سوال تھا کہ کالیا کہاں تھا؟

اس کے بعد وہ نرس اور وارڈ بوائے کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ عطا محمد نے بھی ڈاکٹر سے میری طبیعت کے بارے میں پوچھا اس کے بعد وہ شاہ میر کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر بھی اپنے مختصر اسٹاف کے ساتھ چلا گیا۔ میں ڈاکٹر سے کالیا کے بارے میں بھی دریافت کرنا چاہتا تھا۔

فوزیہ وہیں موجود رہی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں شاہ میر موقع پاتے ہی دوبارہ نہ اندر داخل ہو جائے۔ فوزیہ اپنی وہیل چیئر میرے بیڈ کے قریب لا چکی تھی اور اب ایک چھوٹے سے رائٹنگ پیڈ پر میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہوئے کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے وہ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ دیکھو میں نے آزاد نظم لکھی ہے۔"

مجھے اس کی نظم سے زیادہ اس وقت اپنی فکر ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ دیکھ کر میں نے اپنے ایک ہاتھ کو جنبش دی۔ میں اس کے ہاتھ سے قلم اور پیڈ لینا چاہتا تھا تاکہ اسے لکھ کر اس خطرے سے آگاہ کر سکوں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی موت کے فرشتے کی طرح میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔

فوزیہ نے پیڈ کھول کر میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ میں اسے پکڑنے کی سعی کرنے لگا۔ اس ہاتھ کی نس میں ڈرپ کی سوئی لگی ہوئی تھی۔

"آں ہاں! نہیں..... نہیں، اپنا ہاتھ مت ہلاؤ، دیکھتے نہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"فف..... فف..... فوزی..... یہ....." جسم کی پوری طاقت مجتمع کرتے ہوئے میں نے اسے پکارا۔

"پلیز! نومی! مت زور لگاؤ بس! آرام سے لیٹے رہو اور میری نظم پڑھو..... اچھا ٹھہرو..... میں تمہیں سناتی ہوں پڑھ کر۔"

وہ میرا مطلب نہیں سمجھ سکی اور اپنی نظم گنگنانے لگی۔ میں نے اپنے چہرے پر فکر و پریشانی اور تکلیف کے آثار طاری کر لیے۔ تب ہی فوزیہ چونکی اور اسے احساس ہو گیا کہ میں کسی مشکل یا تکلیف میں ہوں۔

"کک..... کیا ہوا نومی؟ شش..... شاید تم کسی تکلیف میں ہو۔ ٹھہرو میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ مڑی جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ اس کی وہیل چیئر خودکار تھی۔ یعنی اس میں موٹر فٹ تھی جس کی ہتھی میں ایک لیور لگا ہوا تھا اسی کے ذریعے وہ اسے چلاتی اور موڑتی تھی۔ وہ پلٹ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ مجھے سخت پچھتاوا ہوا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ ادھر ہی موجود رہتی اور میں اس کی شاعری میں مگن رہتا۔ اسی بہانے وہ ادھر ہی رہتی۔

کیونکہ خطرہ ابھی میرے سر سے ٹلا نہیں تھا، جب تک کہ میری جسمانی طاقت بحال نہیں ہو جاتی، یوں بھی وہ کب تک رہ سکتی تھی۔ مجھے خود ہی کچھ کرنا تھا، شاہ میر ابھی یہیں تھا۔ وہ اب مجھے ہر ممکن کوشش کے تحت ختم کرنے کی تگ و دو میں ہوگا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ عطا محمد کو "فارغ" کر کے دوبارہ یہاں کا رخ کرتا۔ میں اب ایک بار پھر کمرے میں اکیلا تھا۔ غنودگی میرے ذہن پر طاری تھی اور آنکھیں مسکن آور دوا کے زیرِ اثر بوجھل سی ہو رہی تھیں، میں ایک ذرا جھپکی لینے کی کوشش کرتا تو نیند کی وادیوں میں اتر جاتا۔ جو میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی آنکھیں "کھلی" رکھی ہوئی تھیں۔

میری تھرکتی نظریں کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں اور دل تیزی سے دھڑکے جا رہا تھا کہ نجانے کب، کس وقت وہ شیطان دوبارہ اندر داخل ہو جاتا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جو ڈاکٹر مجھے دیکھ کر گیا تھا اس نے مجھے کچھ انجکشن لگوائے تھے اور ساتھ ہی تسلی دی تھی کہ میں جلد

ہی اپنی اتنی جسمانی توانائی تو حاصل کر ہی لوں گا کہ ہلنے جلنے کے علاوہ بات تو کر سکوں۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی، کسی اندیشناک وسوسہ تلے میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور پھر جیسے دل ہی میرا اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

وہ موت کے فرشتے کی صورت ایک بار پھر میرے سامنے کھڑا تھا مگر اس بار اس کے ہاتھ خالی تھے۔ پتا نہیں اب وہ میرے ساتھ کیا کون سا حربہ استعمال کرنے والا تھا۔ اب میں اس کی منحوس و مکروہ صورت دیکھ سکتا تھا اور ہاسپٹل بیڈ پر لیٹے ہوئے میری نظریں اسی کے چہرے پر یک ٹک سی جمی ہوئی تھیں۔

"اچھی طرح سے پہچان لو میری صورت کو۔" وہ پھر سنسناتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں بولا۔ "مجھے اس وقت تمہاری قابلِ رحم حالت پر ترس آ رہا ہے۔ چلو، تمہیں تو میرا ممنون ہونا چاہیے کہ میں تمہیں اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا دلانے والا ہوں۔ ویسے تمہاری لک (قسمت) کی داد دینی چاہیے۔ زہریلے انجکشن سے تو تم بچ گئے، جو مجھے کسی مجبوری کی بنا پر پھینکنا پڑا مگر خیر..... ان ہاتھوں نے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے تک اٹھا کے دیکھا۔

"بغیر ہتھیاروں کے بھی نجانے کتنے ہی دشمنوں کو چپ چپاتے ہی موت کی نیند سلایا ہے۔ اب دیکھنا کیا کرتا ہوں میں۔" وہ دہشت زدہ کرنے والے لہجے میں ایک قدم اور آگے بڑھا، میری گردشی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ دل بے تحاشا دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اپنے جسم کو جنبش دینے کی میری کوشش جاری تھی۔

وہ خبیث ڈرپ کی ٹیوب کو چھوتے ہوئے ایک بار پھر حظ اٹھاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں کرنا میں نے بس! ذرا ڈرپ کی اس ٹیوب کو اپنی انگلیوں سے دو تین بار پنچ کروں گا۔ تمہارے جسم میں جاتے ہوئے محلول کے اندر ایک ایئر ببل (بلبلہ) بنے گا، جو تمہارے خون میں شامل ہو کر سیدھا دل کی شریانوں تک پہنچے گا تو تمہارے ترتیب وار دھڑکتے دل کی دھڑکنوں کو یکلخت بے ترتیب کر دے گا اور تمہارا دل بند (ہارٹ بلاک) کر دے گا۔ لو دیکھ لو تم بھی میرا یہ کمال۔" کہتے ہوئے اس نے اپنے ایک ہاتھ سے ڈرپ کی ٹیوب کو انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دو تین بار پنچ کیا۔ میں نے پھٹی پھٹی وحشت زدہ نظروں سے دیکھا۔

ڈرپ کی ٹرانسپرنٹ ٹیوب میں ایک دو بلبلے بنے۔ ایک دو سیکنڈ میں وہ محلول کے اندر تھرکے پھر انہوں نے جیسے "موت کا سفر" شروع کر دیا۔ صرف چند سیکنڈوں کی بات تھی اور وہ میری نس کے ذریعے خون میں شامل ہونے والے تھے۔

میں تب تک اپنی جان توڑ کوشش کے ساتھ دوسرے ہاتھ کو اتنا متحرک تو کر ہی چکا تھا کہ اس کا بھیانک مقصد بھانپتے ہی میں اسے سینے تک اور اوڑھی ہوئی چادر کے اندر ہی اندر سے دوسرے بازو تک لانے میں کامیاب ہو رہا تھا، یہی نہیں مجھے اب اپنے جسم کی طاقت بھی بحال ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ شاید ڈاکٹر کے تازہ وزٹ اور اس کے لگائے ہوئے انجکشن کا ہی کمال ہو سکتا تھا، یوں بھی میں اب اپنی طبیعت کو کچھ سنبھلتے ہوئے بھی محسوس کر رہا تھا۔

میری آنکھوں کے ڈیلے اس "بلبلہ اجل" کو نیچے اترتا دیکھ رہے تھے اور اسی کے ساتھ ہی حرکت کر رہے تھے۔ شاہ میر کی خبیثانہ سفاک ہنسی جاری تھی۔ بلبلہ جیسے ہی سفر کرتا ہوا نس میں کھبی ہوئی سوئی کے قریب آیا میں نے ایک جھٹکے سے دوسرے ہاتھ سے نلکی پکڑ کر سوئی نکال دی مگر اب میں ایک نئی مصیبت کا شکار ہو گیا۔ سوئی چونکہ کینولا کے ساتھ نتھی تھی تاکہ بار بار کی "پرکنگ" کی اذیت سے بچا جا سکے اور کینولا کے ساتھ اسٹکنگ پلاسٹر چپکا ہوا تھا۔ اسی لیے وہ بھی ادھڑ کر نکلا تو خون کا فوارہ سا چھوٹا ایک موت سے بچا تھا کہ دوسری نے آن لیا۔

شاہ میر کو میں نے ایک لمحے کے لیے پریشان ہوتے دیکھا، اس لیے نہیں کہ میری نس سے خون چھوٹا تھا، اس لیے کہ اس کا منصوبہ ایک بار پھر میں نے ناکام کر ڈالا تھا۔ وہ جلدی سے گھوم کر بیڈ کی دوسری جانب آیا اور دوسری لگی ہوئی ڈرپ کے ساتھ یہی کچھ کرنے لگا تھا کہ میں نے لیٹے لیٹے اچھل کر خود کو بیڈ سے نیچے گرا لیا۔ نتیجے میں دوسری لگی ہوئی ڈرپ کی سوئی بھی اسی طرح نکل گئی۔ وہاں سے بھی گاڑھا گاڑھا سرخ خون چھوٹ پڑا۔

میں نے فوراً اپنے دونوں بازوؤں کو بینڈ کر لیا۔ خون بہنا بند ہوا تو میں نے حلق کے بل دھاڑ ماری۔ آواز پھٹی پھٹی سی برآمد ہوئی تھی یہ بھی میرے لیے بہت تھا جبکہ گر پڑنے والے ڈرپ اسٹینڈ بھی دونوں اس طرح گرے تھے کہ ایک تو دروازے کے شیشے پر پڑا تھا، جس سے وہ ٹوٹ گیا جبکہ دوسرا اسٹیل کی ٹیبل سے ٹکرایا تھا جس پر دوائیاں رکھی ہوئی

تھیں۔ کچھ شور اور چیخنا کوں کی آوازیں تو ابھری تھیں۔ میں نے بھی حلق کے بل پاگلوں کی طرح بغیر کسی وقفے کے چلانا شروع کر دیا تھا۔

اس صورتِ حال نے شاہ میر کو پریشانی کے ساتھ بوکھلا بھی دیا تھا۔ اس نے فوراً کوٹ کی اندرونی جیب سے پستول نکال لیا۔ ادھر میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ کمزوری کا اثر غالب آنے لگا تو میں نے لڑکھڑاتے ہی خود کو اس کے ساتھ ٹکرا دیا۔ وہ ابھی مجھ پر گولی چلانے کے سلسلے میں تردد کا شکار تھا اور میں اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ میرے ٹکراتے ہی ہم دونوں گرے تھے، میں تو فرش پر ہی ڈھے گیا تھا مگر شاہ میر کچھ سنبھل گیا تھا۔

پستول ہنوز اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا کہ اسی وقت عملہ اندر گھس آیا اور شاہ میر نے ان کے دوڑتے قدموں کی آواز سنتے ہی اپنا پستول جیب میں ڈال لیا تھا۔

"او مائی گاڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟" ایک موٹی سی نرس چلائی اور مجھے سنبھالنے کو لپکی۔ ایک سفید وردی پوش وارڈ بوائے ساتھ تھا۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر بھی دوڑتا ہوا اندر آ گیا اور اس کے پیچھے فوزیہ اپنی وہیل چیئر میں بیٹھی نمودار ہوئی۔

"پتا نہیں کیا ہوا تھا اسے؟ اچانک ہی پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اس پر۔" شاہ میر جیسے ایک دم انجان بن گیا کیونکہ اس سے ہی میری اس حالتِ زار کا پوچھا گیا تھا۔ بروقت میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا..... کچھ باتوں کو مصلحتاً دبا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ یوں بھی کیا فائدہ اس بات کا کہ اگر میں انہیں یہ حقیقت بتانے کی کوشش کرتا کہ شاہ میر نے مجھے ہلاک کرنے کی دو بار ناکام کوشش چاہی تھی۔

سردست مجھے اپنی حالتِ زار کی فکر ہو رہی تھی۔ بہرطور مجھے سنبھالا گیا اور بیڈ پر دوبارہ لٹا دیا۔ نرس اور وارڈ بوائے میرے ہاتھوں سے بہنے والے خون کی ڈریسنگ وغیرہ کرنے لگے۔ شاہ میر تھوڑی دیر کھڑا پریشانی کا اظہار کرتا رہا پھر خاموشی سے کھسک گیا۔ وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حالات معمول پر آ گئے۔ مجھے کینولا لگا کر دوبارہ ڈرپس لگا دی گئی تھیں۔ فوزیہ کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ صورتِ حال سنبھلنے کے بعد جب ماسوائے فوزیہ کے سب کمرے سے چلے گئے تو فوزیہ نے تفکر بھرے لہجے اور اپنائیت سے پوچھا۔

"کیا ہو گیا تھا تمہیں نومی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟"

"ہاں..... مم..... میں ٹھیک ہوں۔" میں نے بہ مشکل جواب دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اب کچھ بولنے کے قابل ہوا تھا۔ فوزیہ کو بھی کچھ تسلی ہوئی۔

"فوزیہ! یہ شاہ میر کا تم لوگوں سے کیا تعلق ہے؟"

"انکل شاہ میر میری پھپھو کے شوہر ہیں۔" اس نے جیسے چونکا دینے والا انکشاف کیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے بھی قدرے بھرے بھرے انداز میں مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"کیا آپ انکل شاہ میر کو جانتے ہیں؟"

"ہاں!" میں نے کہا۔ اتنا کہہ کر میں ہانپ سا گیا تھا اور ذرا دیر کی خاموشی اختیار کیے ہوئے میں نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو بحال کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے تم آرام کر لو۔" وہ میری ہیئت کذائی دیکھتے ہوئے بولی۔

"فوزیہ! اس وقت جو میں کہوں وہ غور سے سنتی رہو۔ خدا کے لیے میری باتوں پر بھروسا کرنا اور اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ اب جو میں پوچھوں اسی کا جواب دیتی رہنا۔" میں نے کچھ سنبھل کے کہا۔ وہ اس طرح کی بات اور میرے لہجے کی سنسنی کو محسوس کر کے ایک متوحش سی نظر آنے لگی۔

"کک..... کیا ہوا ہے نومی؟ خ..... خیریت تو ہے ناں؟" وہ بے چاری تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

"فوزیہ! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اس وقت۔"

"مدد؟ میری تو جان بھی حاضر ہے تمہارے لیے نومی!"

"فوزیہ! مجھے مختصر الفظوں میں شاہ میر کے بارے میں بتاتی چلو۔ پھر میں تمہیں اصل بات بتاؤں گا تاکہ تم بھی سمجھ سکو اور مجھے بھی موجودہ حالات کا ادراک ہو سکے۔"

فوزیہ نے شاہ میر کے بارے میں یہی بتایا کہ آج سے پچیس برس پہلے اس کی پھوپی جمیلہ نے شاہ میر سے گھر والوں کی مرضی کے خلاف پسند کی شادی کر لی تھی۔ اس وقت جمیلہ کے ماں باپ یعنی فوزیہ کے دادا دادی حیات تھے۔ جمیلہ کا باپ سخت آدمی تھا۔ اس نے جمیلہ سے ہر طرح کا تعلق توڑ دیا مگر عطا محمد کو اپنی بہن سے پیار تھا۔ دونوں بہن بھائی چوری چھپے مل لیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ عطا محمد اور شاہ میر آپس میں گہرے دوست تھے۔ شاہ میر اکثر ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا۔

یہ شادی پانچ چھ سال چلی تھی۔ شاہ میر اور جمیلہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک دن جمیلہ کا کسی جانکاہ حادثے میں انتقال ہو گیا۔ اس حادثے میں حالانکہ شاہ میر بھی زخمی ہوا تھا مگر وہ

معمولی زخمی ہوا تھا۔ عطا محمد اور جمیلہ کے باپ نے اپنے داماد شاہ میر پر الزام عائد کر دیا کہ اس کی بیٹی کو شاہ میر نے ہی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہلاک کروایا ہے۔ ان دنوں شاہ میر اتنا زیادہ دولت مند نہ تھا اور موٹر بائیک چلایا کرتا تھا۔ معمولی سی نوکری کرتا تھا۔ بائیک کا ٹائر پھسلنے سے ہی یہ حادثہ ہوا تھا۔

انہی دنوں ان کا باپ بھی چل بسا۔ شاہ میر سے ان کا بھی تعلق منقطع ہو گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ شاہ میر کو قطر میں ایک اچھی جاب مل گئی ہے اور وہ وہاں جا چکا تھا۔ کئی سال بعد وہ ہم سے بھی ملا تھا۔ بس ایک سرسری سی ملاقات اس کی عطا محمد سے ہوئی تھی کیونکہ دونوں سالے بہنوئی میں اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی، پھر دونوں پرانے اور اچھے دوست بھی تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عطا محمد کی شاہ میر نے مالی مدد کی تھی۔

شاہ میر تب تک کسی عربی خاتون (لیلیٰ صماد) سے شادی کر چکا تھا اور اس سے اس کے دو بچے ہوئے تھے۔ ثمیر اور کاشفہ۔ لیکن اب کچھ دنوں سے شاہ میر اکثر عطا محمد سے میل جول بڑھانے لگا تھا۔ شاید یہ ان کی پرانی دوستی کے ناطے ایسا تھا۔ وہ ان کے لیے بڑے قیمتی تحائف بھی لایا تھا۔ شاہ میر کہتا تھا کہ وہ سالا بہنوئی تو بعد میں بنے تھے، دوستی تو ان کی پرانی تھی۔

"مجھے اب یہ بتاؤ فوزیہ کہ مجھے یہاں اسپتال تک کون لایا تھا اور تمہیں اور عطا صاحب کو کیسے میرا پتا چلا؟"

یہ باتیں سننے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ وہ جواب میں بولی۔

"یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس رات پاپا کے ساتھ کار میں کہیں جا رہی تھی۔ پولیس کی موبائل کھڑی تھیں اور راستہ بلاک اور ٹریفک بھی جام تھا۔ بابا کی عادت ہے کہ وہ کار سے اتر کر صورتِ حال کا جائزہ ضرور لینے کی کوشش کرتے ہیں، پولیس گاڑیوں کے ساتھ ایمبولینس بھی کھڑی تھی۔ اسٹریچر پر آپ کو خون میں لت پت دیکھا تو بابا آپ کو پہچان کر فوراً حرکت میں آ گئے۔ آپ کی حالتِ زار کا سن کر میری اپنی حالت تو غیر ہی ہونے لگی تھی۔ بہرحال آپ کو جلدی سے قریبی اسپتال لے جایا گیا اور اللہ کا شکر ہے کہ آپ کا کامیاب آپریشن کر کے گولیاں نکال لی گئیں۔ تب سے میں اور بابا ادھر ہی ہیں، بابا البتہ ایک بار گھر کا چکر لگا آئے تھے۔"

"یہ بتاؤ زخمیوں میں اکیلا میں ہی تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "کیا اور کوئی بھی تھا تمہارے ساتھ؟ ویسے کن لوگوں نے تمہاری یہ حالت بنائی تھی؟"

اس کے جواب نے کالیا سے متعلق میری تشویش کو فزوں تر کر کے رکھ دیا اور میں نے ان کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"شاہ میر کو کیسے خبر ہوئی کہ میں یہاں ہوں۔ یہ یہاں کس حیثیت سے پہنچا تھا؟ میرا مطلب ہے، کیا تمہیں یا عطا صاحب کو محسوس نہیں ہوا کہ بھلا شاہ میر کا مجھ سے کیا تعلق تھا؟"

"حیرت تو ہوئی تھی ہمیں جب ہمارے پہنچنے اور تمہارا آپریشن ہونے کے بعد ہماری ان انکل شاہ میر پر نظر پڑی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے کسی دوست کی مزاج پرسی کے لیے آئے تھے مگر اب اسے آج دن کے وقت یہاں سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔"

"میرے بارے میں شاہ میر کی دلچسپی کو تم نے یا تمہارے بابا نے محسوس نہیں کیا تھا؟"

"شاہ میر کو جب بابا نے تمہارے متعلق یہ بتایا کہ تم ان کی ٹرانسپورٹ کمپنی کے مینیجر ہو تو انکل انسانی ہمدردی کے طور پر آپ کی مزاج پرسی کے لیے رک گئے تھے۔"

"ہمم..... میری مزاج پرسی!" میں تلخی سے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا تو فوزیہ نے قدرے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

"آخر کیا بات ہے نومی! تم کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے؟"

"تم سے ہی تو میں کچھ بھی نہیں چھپانا چاہتا فوزیہ!" میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔ اس کے بعد میں نے اسے دھیمے دھیمے لہجے اور مناسب الفاظ میں شاہ میر کی اصلیت اور دشمنی سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ یہاں کون سا گل کھلانے کے لیے رکا ہوا تھا اور میری اس نے جان لینے کی یہاں دو بار ناکام کوشش بھی کی تھی۔"

"ہائے میرے اللہ!"

یہ سن کر فوزیہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے حسین چہرے پر خوف اور تشویش کے گہرے سائے امڈ آئے تھے۔ اس کے نرم و گداز ہونٹ متوحش سے انداز میں دائرے کی صورت اختیار کر گئے تھے۔

''کک..... کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''اتنی بڑی بات میں بھلا غلط کہہ سکتا ہوں؟'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھپھو..... پھر تو تمہاری جان کو یہاں خطرہ ہے۔ میں ابھی.....''

''ٹھہر جاؤ۔'' میں نے فوراً سرگوشیانہ آواز میں کہا۔ ''ابھی فی الحال مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن خبردار! ابھی یہ حقیقت کسی پر ظاہر مت کرنا، اپنے بابا پر بھی نہیں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم نومی؟'' فوزیہ چونک کر بولی۔ ''تمہاری جان خطرے میں ہے، تمہیں فوراً پولیس کو مطلع.....''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کمرے میں ڈاکٹر اور دو پولیس وردی میں ملفوف افراد داخل ہوئے۔ ایک ایس آئی نظر آتا تھا اور دوسرا کانسٹیبل تھا۔

پولیس نے ضابطے کی کارروائی نمٹائی، مجھ سے بیان لیا، میں نے نامعلوم دشمنوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان سے جان چھڑائی اس کے بعد وہ چلے گئے۔

''یہ کیا کیا تم نے نومی؟ تم نے انہیں بتایا کیوں نہیں یہ سب، جو تم مجھے بتا چکے ہو؟''

ان کے جانے کے بعد فوزیہ نے حیرت آمیز تفکر سے میری طرف تکتے ہوئے کہا۔

''فوزیہ! یہ معاملات میرے لیے نئے نہیں ہیں، تم تو جانتی ہوں ناں سب۔''

''ہاں ٹھیک ہے مگر یہ دانش مندی تو نہیں کہ تم پولیس سے کچھ چھپاؤ۔ اس طرح تمہارے دشمن اور دلیر ہو جائیں گے، وہ یہی سمجھیں گے تم ان سے ڈر گئے ہو اور یہ تمہارے اپنے تحفظ کے لیے بھی اچھا ہوتا۔''

''کیا صحیح ہے کیا بہتر ہے، یہ تم میرے سوچنے کے لیے چھوڑ دو۔ بس! اتنا دھیان رکھو کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے اس ''انکل'' پر نگاہ رکھو۔ ہو سکتا ہے یہ ابھی میری وجہ سے تم لوگوں کے ساتھ نتھی ہو کر رہے کیونکہ میں اس کا شکار ہوں۔''

''نومی! مجھے تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔'' وہ الجھن آمیز پریشانی سے بولی۔

''اسی لیے تو تمہیں کوئی ایسی بات نہیں بتاتا، تم تعاون کرنے کی بجائے الٹا مجھے پریشان کرنے لگتی ہو۔'' میں نے قدرے چڑ کر کہا تو وہ بے اختیار ایک گہری سی ہنکاری خارج کر کے بڑے رسان سے بولی۔

''نومی! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی، میں نے تم سے محبت کی ہے، اب تم ہی میری دنیا ہو، تم ہی میری سوچوں اور آرزوؤں کا محور بھی۔ تم مجھ سے تعاون کی کیا بات کرتے ہو میری زندگی ہی تم ہو۔''

وہ کچھ مغموم سی ہونے لگی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے شاید برا مان کر اس کا دل دکھا دیا تھا جس کا مجھے فوراً قلق ہوا تو میں نے اپنا دایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھایا (اس میں ڈرپ کی سوئی لگی ہوئی تھی اسی لیے اتنا ہی اٹھا سکا تھا) اور بڑی محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر اسے ہولے سے پکارا ابھی وہ میرا اشارہ بھانپ گئی اور اس نے بھی اپنی دھیل چیئر تھوڑی آگے سرکا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ آہ..... کس قدر لطافت اور سرور تھا اس کے نرم و نازک ہاتھ کے لمس میں محبت کی آنچ تھی جو اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے گداز کو محسوس کر کے میں جیسے سرتاپا سرشار سا ہو گیا، تب ہی میرے منہ سے دل کی عمیق گہرائیاں لیے ہوئے الفاظ امڈے۔

''فوزیہ! میں بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں، بہت شدید اور بہت زیادہ جس کی کوئی حد و انتہا ہی نہیں۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ ہرگز نہیں، بس میں اس وقت حد سے زیادہ پریشان اور فکرمند ہوں۔ یہ وہ نازک وقت ہے جس میں مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہے، مجھے اپنے دوست شیراز عرف کالیا کی بھی فکر کھائے جا رہی ہے کیونکہ دشمنوں کے ساتھ اس جنگ میں اس یار بے بدل کے بغیر میں خود کو بالکل تنہا سمجھتا ہوں۔ اسی نے ہی تو مجھے منافقوں کے اس سماج میں جینے کا اور معاشرتی ناسوروں سے ٹکر لینے کا ڈھنگ سکھایا ہے مگر اس سے بڑھ کر وہ میرا محسن بھی ہے اور یارِ غم خوار بھی۔ پتا نہیں وہ بے چارہ کس حال میں اور کہاں ہوگا؟ زندہ بھی ہے کہ نہیں لیکن خدا کرے وہ زندہ ہی ہو۔''

''فوزیہ! میں اس وقت ایک چومکھی جنگ لڑ رہا ہوں لیکن میرا اصل دشمن تو اب میرے سامنے آیا ہے۔ میرے دوسرے سارے دشمن ایک طرف اور ان سب کے مقابلے میں شاہ میر ایک اکیلا ہی بھاری پڑ سکتا ہے مجھ پر۔ تم نے دیکھا کس طرح یہ غیر متوقع طور پر موت کا فرشتہ بننے لگا تھا میرے لیے۔ اسی سفاک اور رذیل آدمی نے میرے چھوٹے بھائی نعیم کی دشمنی میں دونوں ٹانگیں اس بیدردی سے کاٹ ڈالیں کہ انسانیت بھی لرز اٹھے۔ یہ سات پردوں میں چھپا میرے خلاف جانے کیا کیا گل کھلا رہا تھا، یہ میں اور کالیا ہی تھے جس کی کوششوں کے باعث یہ سات پردوں سے باہر آنے پر مجبور

ہوا ہے۔ تمہارے کہنے پر اگر میں پولیس کو وہ سب بتا بھی دوں تو اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے میرے پاس۔ بالفرض اگر پولیس اسے گرفتار بھی کر لے تو بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گی۔ وہ اپنی ضمانت نہیں کروائے گا بلکہ کیس لڑے گا اور جب رہا ہوگا تو پہلے سے زیادہ اس کی قانونی پوزیشن مضبوط اور میری کمزور پڑ جائے گی۔ مجھے اس سے اور طریقے سے نمٹنا ہے صرف اپنے لیے نہیں بلکہ میرے اپنے باپ سے کیے ہوئے اس وعدے کے لیے جو اس نے تختہ دار پر بے گناہ چڑھنے سے پہلے مجھ سے لیا تھا کہ رفعت خانم مرڈر کیس کے اصل مجرم کو میں نے ایک دن کٹہرے میں لانا ہوگا تاکہ ہمارے خاندان کی پیشانی سے قاتل اور پھانسی کے سزا یافتہ مجرم کا دھبا ہمیشہ کے لیے دھل سکے۔ اسی سبب میرے لیے شاہ میر ایک مشکل مجرم بھی ہے اور دشمن بھی۔ وہ مجھ پر براہِ راست حملہ کرنے کے ہر حربے استعمال کر سکتا ہے لیکن مجھے اس پر ایک ذرا انگلی اٹھانے کے لیے بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ آج یوں اچانک شاہ میر کا یہاں اسپتال میں موجود ہونا اور مجھے ہلاک کرنے کی دوبارہ کوشش کرنا ثابت کرتا ہے کہ اسی نے ہی کالیا اور مجھ پر اپنے گرگے بھیج کر ہم پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔

میں نے اتنی صراحت کے بعد خاموشی اختیار کی تو فوزیہ کے چہرے پر اثر پذیری کے ساتھ کچھ خفت کے تاثرات بھی ابھرے تھے یوں کہ جیسے وہ اب میری پورے طور پر اصل بات سمجھی ہو۔ اسی لہجے میں بولی۔

''نومی! تمہاری بات سن کر مجھے احساس ہوا ہے کہ میں ہی اپنی کوتاہ بینی کے سبب تمہیں جلد بازی کا غلط مشورہ دے کر اس حساس اور نازک معاملے کو خراب کرنے کے درپے ہو رہی تھی۔''

''نہیں تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے فوزیہ!'' میں نے پیار بھری مسکراہٹ سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم نے جو کہا وہ نیک نیتی اور میری محبت میں ایسا سوچا تھا کیونکہ تمہیں پس منظر کا صحیح علم نہ تھا اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو لامحالہ میں بھی یہی سوچتا۔''

''میں اس وقت تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' فوزیہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرا سیل فون اور وہ سب جو نامعلوم دشمنوں کے حملے کے وقت میرے پاس جو کچھ موجود تھا وہ کسی طرح مجھے لا دو، ممکن ہے وہ اسپتال کی انتظامیہ نے میرا آپریشن کرتے وقت سنبھال لیا ہو۔''

''میں ابھی جا کر پتا کرواتی ہوں۔'' فوزیہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک عطا محمد کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے پوری طرح ہوش میں اور اپنی بیٹی سے باتیں کرتے پا کر ایک دم خوش ہو کے بولے۔ ''ارے واہ برخوردار! بڑی کمال کی قوتِ ارادی ہے تمہاری۔ اتنی جلدی باتیں بھی شروع کر دیں۔'' ان کی آمد پر میں اور فوزیہ تھوڑا چونکے تھے۔ پھر فوزیہ کے گداز ہونٹوں پر ہلکی مسکان ابھری اور میں بھی انہیں دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے دیکھا ان کے ہاتھ میں سفید رومال نما کپڑا تھما ہوا تھا۔ وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''یہ مجھے اسپتال کی انتظامیہ نے دیا ہے، اس میں تمہارا سیل فون اور پاکٹ پرس ہے۔''

''شکریہ جناب!'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''ساتھ ہی میں آپ دونوں باپ بیٹی کا تہہ دل سے مشکور بھی ہوں کہ اس نازک موقع پر آپ دونوں نے میری دل داری کی اور مجھے یہاں اسپتال تک پہنچایا۔''

''ارے بھئی، شکریے کی کیا بات ہے نعمان میاں!'' وہ بولے۔ ''ہم نے تو بس! خانہ پوری کی ہے اصل کام تو پولیس نے کیا ہے۔''

''بابا! کیا انکل شاہ میر چلے گئے؟'' فوزیہ نے اچانک باپ سے پوچھ لیا۔ میں جانتا تھا اس کی وجہ کیا تھی۔

''ہاں بیٹی! وہ جا چکے ہیں۔'' عطا محمد نے جواب دیا۔ تو بے اختیار فوزیہ اور میں نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ مجھے شاہ میر کی طرف کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ اب کھل کر میرے سامنے آ چکا تھا اور پھر کسی موقعے کی تاک میں ہو سکتا تھا۔ عارضی طور پر اگرچہ اس کا خطرہ ٹل چکا تھا۔

''بیٹی! میں ذرا دیر کے لیے کہیں جا رہا ہوں۔ انور شاہ یہاں پہنچ رہا ہے۔ اسے میں نے ابھی اطلاع دی ہے۔ تم کہو تو تمہیں میں گھر چھوڑتا چلوں؟''

فوزیہ نے باپ کو جواب دینے میں تھوڑا سا تامل کیا تو وہ خود ہی بول پڑا۔

''اچھا ٹھیک ہے، تم ادھر ہی رہو، میں بھی تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا، پھر ساتھ ہی گھر چلیں گے۔'' فوزیہ نے فوراً مسکرا کر سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

''اور نومی بیٹا! تم کسی بات کی فکر نہ کرنا، ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے، میں نے پولیس سے کہہ دیا ہے کہ جلد از جلد ان نامعلوم حملہ آوروں کی تلاش اور گرفتاری کو یقینی بنائیں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔''

وہ یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں اور فوزیہ ایک بار پھر اکیلے رہ گئے۔ میں نے نرم سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں رک گئیں؟ اب کوئی پریشانی نہیں مجھے۔ گھر جا کر ذرا تم بھی فریش ہو جاتیں، جانے کب سے یہاں ہو؟"

"میں سب سے زیادہ یہاں فریش ہوں اگر تمہیں یہاں بیٹھی اچھی نہیں لگ رہی ہوں تو چلی جاؤں؟" وہ شرارت بھرے انداز میں مسکرائی تو میں نے کہا۔

"میں تو چاہتا ہوں تم ساری زندگی اسی طرح میرے نزدیک، میری آنکھوں کے سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں۔"

"او..... تو جناب کو بستر علالت پر بھی عشق سوجھ رہا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی، مجھے اس کا یوں مسکرانا اچھا لگا۔ جواب میں، میں بھی مسکرا دیا۔

اس کے بعد میں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مقصد فوراً بھانپ گئی اور اپنی وہیل چیئر ذرا آگے کھسکا کر میرا موبائل فون اٹھا لیا۔ اس نے بتایا کہ وہ آف تھا۔ وہ اس نے آن کر لیا۔ اس میں کچھ مسڈ کالز تھیں، اس میں روزی کی بھی مس کالز تھیں۔ فوزیہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو میرے سیل فون پر کسی لڑکی کی مس کال دیکھ کر کسی غلط فہمی میں پڑتی۔ تاہم شرارتی لہجے میں اس نے روزی کے بارے میں پوچھا ضرور تھا اور میں نے مسکراتے ہوئے اسے مختصراً روزی کے متعلق بتا دیا۔ بہرکیف میں نے اس سے کہا۔

"میں تمہیں ایک نمبر بتا رہا ہوں، اس پر کال ملا دو۔" کہتے ہوئے میں نے اسے سدو بھائی کا نمبر بتایا۔ پھر میرے کہنے پر اس نے اس کا وائیڈ اسپیکر آن کر دیا اور میرے چہرے کے بھی قریب کر دیا۔

میں نے سدو بھائی سے بات کر کے اسے ساری حقیقت حال مختصر الفاظ میں بتا دی اور وہ علاقہ بتایا جہاں یہ واقعہ ہوا تھا۔ اسے ہدایت کی کہ ابھی اسی وقت وہاں جا کر کسی طرح کالیا کا پتا کرے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اسے فون کرنے کے بعد میں نے استاد بھابھا سے بھی رابطہ کیا اور اسے بھی یہی کچھ بتا دیا، وہ کالیا کی طرف سے خاصا پریشان ہو گیا تھا تاہم اس نے مجھے تسلی بھی دی کہ وہ خود اپنے ساتھ لڑکوں کی ٹولی لے کر جائے گا اور کوئی بات ہوئی تو مجھ سے رابطہ کر کے مطلع کرے گا۔

فہیم سے بھی میں نے بات کی تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو اگرچہ وہ میری حالت پر تشویش زدہ تو ہو ہی گیا تھا اور اسپتال آنا چاہتا تھا مگر میں نے منع کر دیا اور تسلی دی کہ میں جلد اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جاؤں گا میرے پاس یہاں عطا محمد اور ان کی "فیملی" موجود ہے، نیز چاچا انور شاہ بھی پہنچنے والا تھا وغیرہ۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ زنیرہ کی بھی کال آئی ہوئی تھی، میں نے اسے بھی فون پر مختصراً بتا دیا۔ اس نے اسپتال کا پتا پوچھا میری طبیعت جانی اور فون رکھ دیا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی تھی۔ عاصمہ بہن کو البتہ اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے پہلے ہی اشاروں میں بتا دی تھی۔ پہلے وہ مجھ سے خود ملنے آ رہی تھی۔

"فوزیہ! انور شاہ پہنچنے والے ہیں۔ وہ آ جائیں تو تم بھی بابا کے ساتھ گھر چلی جانا۔"

تھوڑی دیر بعد چاچا انور شاہ پہنچ گئے۔ وہ بہت پریشان اور فکرمند نظر آ رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے مجھ سے حال و احوال شروع کر دیا، میں نے انہیں دھیرے دھیرے سب بتا دیا۔

تھوڑی دیر بعد عطا محمد جس ضروری کام سے ذرا دیر کے لیے گئے تھے واپس لوٹ آئے اور پھر فوزیہ کو لے کر چلے گئے۔ انہوں نے اگلے دن پھر آنے کا کہا تھا۔ انور چاچا میرے پاس بیٹھے رہے، ان سے میں زیادہ تر اڈے کے معاملات سے متعلق ہی گفتگو کرتا رہا۔ مزید ڈرا دیر گزری تو ایڈووکیٹ زنیرہ آ گئی۔ مجھے باتیں کرتا دیکھ کر اس نے قدرے سکون کا سانس لیا۔ ہم کچھ آپس میں ایسی گفتگو کرنا چاہتے تھے جو چاچا انور شاہ کے سامنے نہیں کر سکتے تھے۔

زنیرہ نے البتہ آتے ہی سب سے پہلے میری یہاں سیکیورٹی کو جانچا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ پولیس نے "ایم ایل سی" (میڈیکو لیگل کیس) کے اس کیس کو اس قدر ورخور اعتنا جانا تھا کہ میری سیکیورٹی کا کوئی بندوبست ہی نہیں کیا گیا تھا۔

بہرطور ہم دونوں اس سلسلے میں اور بہت سی باتوں میں تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔

میں نے چاچا انور شاہ کو کسی طرح وہاں سے رخصت کر دیا۔ اگرچہ وہ بہت کچھ جانتے تھے، ان سے بھلا کیا پوشیدہ تھا؟ مگر کچھ باتیں ایسی ضرور تھیں جس سے معلناً میں نے انہیں بھی بے خبر رکھا ہوا تھا، بلاشبہ یہ میرا ایک عارضی عمل کہلاتا تھا کیونکہ بعد میں مناسب موقع پر میں وہ حقائق بھی ان کے گوش

گزار کر دیا کرتا تھا اور وہ بھی یہ بات سمجھتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد ہی میں نے زنیرہ کو تفصیل سے سب باتیں بتا ڈالیں۔

شاہ میر کے بارے میں بھی بتا دیا کہ وہ کس طرح اپنے گرگوں کے ناکام حملے کے بعد خود ہی مجھے ٹھکانے لگانے کسی چھلاوے کی طرح آن پہنچا تھا۔

"شاہ میر پردے کے پیچھے سے نکل آیا ہے اور تمہارے لیے اب پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" سب کچھ بالصراحت سننے کے بعد زنیرہ نے گمبھیرانہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے تشویش تلے اس کا چہرہ سوجھا سوجھا نظر آنے لگا تھا۔

"مشکل تو یہ ہے کہ ابھی تک اس کی معاملہ واری رانا بشیر کے ساتھ جاری ہے جو کسی بھی وقت خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے۔ شاہ میر کا اپنا نمائندہ بن رائد کا اس کی طرف ہوٹل ڈی اسٹار بھیجنا خالی از علت نہیں۔"

وہ پُرسوچ انداز میں آگے بولتی رہی۔ "یہی نہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ رانا بشیر کی طارق روڈ والی رہائش میں آتشزدگی کا بھی واقعہ اسی کا شاخسانہ ہے۔ اس پر مستزاد شاہ میر نے صاف لفظوں میں اس بات کا اقرار بھی کر لیا ہے کہ رانا بشیر کی بیوی رفعت خانم کو ہلاک کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے جبکہ ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ رفعت خانم کے قتل میں کسی نہ کسی حوالے سے رانا بشیر خود بھی شریک ہے۔"

"سدو بھائی نے رانا بشیر اور بن رائد کی ہوٹل ڈی اسٹار میں ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ کر لی ہے۔ وہ میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے زنیرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ان دونوں کے بیچ اب خوب ٹھن چکی ہے، میں بھی شاہ میر پر آخری وار کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا کہ مجھ پر شاہ میر نے قاتلانہ حملہ کروا دیا۔ کیونکہ مجھے اب پورا یقین ہے کہ شاہ میر کے نمائندے بن رائد سے رانا بشیر کے مذاکرات ناکام ہونے کے بعد رانا بشیر اور شاہ میر کے درمیان خوب اچھی طرح سے ٹھن چکی ہے۔ وہ مجھ سے پورا تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب اسے یہ پتا چلے گا کہ میں بھی اصل حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہوں اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ بھی میرے پاس محفوظ ہے، یہی نہیں ایک ترپ کا اور پتا شاہ میر کے بیٹے ثمیر کی صورت بھی میرے پاس ہے، جو سدو بھائی کی معلومات کے مطابق رانا بشیر کی حسین اور اسمارٹ بیٹی فرحانہ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔"

فرح جہانزیب بہت پیاری شکل کی تھی۔ اس کی معصوم صورت نے ہی اسے شوبز کی دنیا میں متعارف کرایا لیکن 21 جولائی 2014ء کو اس کی موت ہو گئی۔ پولیس، میڈیا اور عوام ہنوز اس کی موت کی وجہ جان نہ سکی۔

☆☆

تمنا بیگم 1948ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے میڈیا کے سفر کا آغاز 1960ء میں ریڈیو پاکستان سے کیا۔ وہ 1970ء میں فلمی دنیا میں آ گئیں۔ ان کی مشہور فلموں میں افشاں، الزام، نادان، مہندی، بہن بھائی اور بھروسا شامل ہے۔ انہیں 1977ء میں نگار ایوارڈ بھی دیا گیا۔ 1980ء تک انہوں نے 300 فلموں میں اداکاری کی پھر وہ ٹی وی ڈراموں کی جانب آ گئیں اور تقریباً ایک سو ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ 20 فروری 2012ء کو وہ کراچی میں انتقال کر گئیں۔ وہ گردے کے عارضے میں مبتلا تھیں اور ہفتے میں دو بار ڈائیلیسس کراتی تھیں۔

☆☆

"یہ سب ٹھیک ہے۔" زنیرہ نے کہا۔ "مگر ثمیر اور فرحانہ کے بیچ دوستی کے اس تعلق کو ابھی کوئی نام نہیں دیا جا سکتا کہ آیا ثمیر اور فرحانہ واقعی اصل حقائق سے نابلد ہیں یا پھر ثمیر ہی اپنے باپ کے کہنے پر رانا بشیر کی بیٹی سے محبت کی محض پینگیں بڑھا رہا ہو جبکہ اصل مقصد اس کا کچھ اور ہو۔"

مجھے زنیرہ کی اس زیرک دماغی کا قائل ہونا پڑا، لہٰذا میں نے فوراً کہا۔

"میرا آئندہ کا لائحہ عمل یہی تھا کہ میں رانا بشیر اور بالخصوص اس کی بیٹی فرحانہ سے مل کر اس سے بات کروں مگر اس بدبخت شاہ میر نے مجھے یہاں بستر پر پہنچا دیا۔"

"تم یہ باتیں چھوڑو۔" زنیرہ ایک دم قدرے پُرجوش سی ہو کر بولی۔

"رانا بشیر اور بن رائد کی ہونے والی آپس کی گفتگو کی ریکارڈنگ مجھے سناؤ بلکہ وہ سارا اسٹف (مواد) میرے حوالے کرو۔ میں اسے سننے کے بعد ہی اپنا کوئی قانونی لائحہ عمل تیار کرتی ہوں مگر اس کے لیے سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ تم بھلے چنگے ہو جاؤ۔"

"میں ٹھیک ہی ہوں اور تم ایک کام کرو۔ کسی طرح سے

ڈاکٹر کو رضامند کردو کہ وہ مجھے آج اور ابھی اسی وقت یہاں سے ڈسچارج کردے۔ باقی بیڈ ریسٹ اور ٹریٹمنٹ میں گھر پر ہی ہائر کرلوں گا۔"

"میرا خیال ہے ڈاکٹر نہیں مانے گا۔" وہ بولی۔ "کیونکہ یہ ایم ایل سی (میڈیکولیگل کیس) ہے لیکن بہرحال میں کوئی جواز بنا کے اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کوشش کرکے دیکھتی ہوں۔"

تھوڑی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد زنیرہ نے ڈاکٹر سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ میں یہاں بغیر کسی پولیس انتظامیہ کی سیکیورٹی کے کتنا غیر محفوظ ہوں۔ دشمن ناکام قاتلانہ حملے کے بعد یہاں بھی شب خون مار سکتے تھے۔

مذکورہ ڈاکٹر جس کا نام ڈاکٹر افتخار حسین تھا۔ وہ یہاں کا ایڈمن جنرل بھی تھا۔ زنیرہ نے اپنے تعارف کے ساتھ اسے کچھ باریکیاں بھی سمجھائی تھیں۔ ڈاکٹر اس سلسلے میں شش و پنج کا شکار رہا۔ وہ ابھی کم سے ایک دن مجھے اپنی "انڈر میڈیکل آبزرویشن" میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس میں "پیشنٹ" (میرا) کا ہی فائدہ ہے۔ پوسٹ اپ کمپلی کیشنز کا خطرہ ہوتا ہے۔ کوئی اسٹچ آؤٹ ہونے کے باعث بلیڈنگ خطرناک حد تک ہوسکتی ہے اور ایسی ایمرجنسی کو گھر میں ہرگز ڈیل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بات پر زنیرہ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ بالآخر اس نے پھر میری سیکیورٹی کی درخواست متعلقہ تھانے کو دے ڈالی اور چار پولیس اہلکار وہاں تعینات کردیئے گئے۔

وہ دن خیریت سے گزرا اور پھر اگلا دن بھی۔ میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی تھی۔ آفرین تھا میرے ان بہی خواہوں پر جنہوں نے اس نازک اور مشکل وقت میں مجھے بالکل بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ زنیرہ چلی جاتی تو عطا محمد اور فوزیہ اس کی جگہ سنبھال لیتے یا پھر چاچا انور شاہ آجاتے۔ ابتدا میں مجھے ڈرپس کے ذریعے خوراک کی کمی پوری کی جاتی رہی، پھر میں رقیق غذا پر آگیا۔

ایک دن مزید اسپتال میں گزارنے کے بعد مجھے ڈسچارج کردیا گیا۔ مجھے کالیا کی طرف سے سخت فکر و تشویش لاحق تھی۔ نجانے وہ بے چارہ کہاں اور کس حال میں تھا؟ "تھا" بھی کہ نہیں؟ اس ہولناک خیال سے ہی میرا دل بار بار ڈوبنے لگتا تھا۔ زنیرہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر میں نے انکار کردیا۔

وجہ یہی تھی کہ اس کے پاس پہلے عاصمہ تھی۔ اب میں بھی اس پر بوجھ بن جاؤں۔ عاصمہ تو چلو لڑکی تھی۔ میں تو مرد تھا۔ ہمارے سماج میں ایک غیر مرد اور غیر عورت کا ساتھ رہنا یوں بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

بھابھا کے اڈے میں فہیم تھا جہاں میں بھی رہتا تھا۔ کالیا تو تھا ہی وہاں لیکن اب وہ جانے کہاں تھا۔ بھابھا کے اڈے میں مجھے کالیا کے ساتھ ہی مزہ آتا تھا۔ سچی بات تو یہی تھی کہ اپنے گھر میں رہنے کے سوا بھلا اور کہاں رہنے کا مزہ آتا ہے۔ چاہے محل ہی کیوں نہ ہو۔ حالات ہی ایسے تھے کہ ہم تینوں بھائی بہن الگ الگ رہنے پر مجبور تھے۔

میں سمجھتا تھا کہ کالیا بہت غلط وقت پر مجھ سے جدا ہوگیا تھا۔ اس کے بغیر بہت سے اہم ترین کام یا تو ادھورے رہ جاتے یا پھر طوالت کا شکار ہوسکتے تھے اور طوالت کا مطلب ناکامی تھا۔

ناچار میں نے استاد بھابھا کے اڈے کا ہی رخ کیا۔ اس کے دو آدمی جمی اور ارشد مجھے لینے آگئے تھے۔ یہ دونوں کالیا کے قریبی ساتھی تھے۔ فہیم کی دیکھ بھال یہی کرتے تھے۔

شانو کھوجا سے رابطہ کیا تو وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"اڑے بابا! تم کدھر رہ گیا ہے؟ میرے کام کا کیا بنا؟ دیری ہوگئی تو معاہدہ ختم سمجھو۔"

"ارے شانو بھائی! چھری کے نیچے دم تو لینے دو۔" میں نے کہا۔

"اڑے؟ یہ تیری آواز کو کیا ہوگیا ہے؟ تو نعمان ہی بول رہا ہے یا کوئی اور....." وہ میری آواز میں لرزتی نقاہت کو محسوس کرتے ہوئے چونک کر بولا تو میں نے اس سے آدھا سچ بول دیا۔

"بس یار، شانو بھائی! کیا بتاؤں میرا اور کالیا کا بائیک سے ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ تین دن اسپتال میں پڑے رہنے کے بعد آج چھٹی دی ہے۔ پر کالیا کی حالت زیادہ نازک ہے وہ ابھی تک اسپتال میں ہی داخل ہے۔"

"او..... سمجھا خدا خیر کرے گا۔ پر تم تو اب ٹھیک ہو ناں؟" شانو نے پوچھا۔

"ہاں! بس، ٹھیک ہی ہوں مگر ڈاکٹروں نے کچھ روز آرام کرنے کو کہا ہے۔" میں نے کہا۔ جسے سن کر دوسری جانب شانو چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی میں مستغرق رہا اس کے بعد اس کی گہری ہمکاری خارج کرنے کے ساتھ ہی آواز ابھری۔

"دیکھ لو نومی بھائی! معاملے میں دیری، نتیجے سے دوری پیدا کردے گی۔"

"دیکھو شانو بھائی!" میں نے اسے سمجھانے اور تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"میں نے اپنے کام کے بدلے میں اگر تمہارے کام آنے کا وعدہ کیا ہے تو وہ میں ضرور کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ میں کر بھی لوں گا لیکن اگر چند دنوں کی تاخیر سے تمہارا کوئی حرج ہو رہا ہے تو تم کسی اور سے کروالو۔ ہم اپنے معاملے کو کسی اور ذریعے سے کرلیں گے۔ ویسے بھی سچی بات یہی ہے کہ ہمیں تم نے ابھی تک ہمارے کام کے بارے میں مطمئن نہیں کیا ہے۔"

میں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس سے یہ بات کہہ تو دی تھی مگر اندر سے ڈرا ہوا بھی تھا کہ کہیں یہ واقعی انکار ہی نہ کردے اور نہ کرتا تو میرا کام پکا تھا۔

"نہیں..... نہیں، ایسی بات تو نہیں۔" اچانک اس کی آواز ابھری اور میں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آگے بولا۔

"جہاں اتنے دن لگ گئے وہاں چند دن اور سہی، میں انتظار کرلوں گا اور اس بات کا مجھے بھی یقین ہے کہ تم ہی یہ کام کرسکتے ہو مگر یار! یہ مطمئن کرنے والی بات اگر تم کرتے ہو تو اپنی تسلی کے لیے میرے ساتھ ایک بیٹھک اور کرلو۔ تم اچھے خاصے سمجھدار آدمی ہو۔ اڑے بابا! یہ لالچ اور اس کے اندر کا مال میرداد کے لیے گلے کا پھندا ہی نہیں چھچھوندر بھی بنا ہوا ہے۔ یہ پکڑا گیا تو میرداد سب سے پہلے اندر ہوگا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، مجھے بس دو دن اور دے دو۔" بالآخر میں نے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔" وہ خوش ہوکر بولا۔ "سمجھو تو جتنی جلدی یہ کام کرلو اور میرداد تمہارے احسان تلے دب جائے گا۔ بلکہ تمہارا دوست بھی بن جائے گا۔ تم اور تمہارا خاندان سکون کی نیند سوئے گا۔"

مجھے اس کم بخت کی آخری بات بری لگی تاہم میں نے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کردیا۔

استاد بھابھا سے میری ایک نشست لگی تو اس نے کالیا کی تلاش سے متعلق پہلے یہی بتایا کہ وہ ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ تاہم اس کے آدمی کالیا کی تلاش پر اس نے معمور کردیے ہیں۔ حیرت اس بات پر تھی کہ کالیا اس قدر زخمی حالت میں کہاں اور کیسے غائب ہوگیا تھا؟ اسے تو ہاسپٹلائز کی سخت ضرورت تھی۔

میرے اس سوال پر کہ شہر بھر کے ہاسپٹلز میں بھی اسے تلاش کرنا چاہیے، کیا خبر وہاں ہو۔ استاد بھابھا کے کہنے کے مطابق کالیا پولیس سائرن کی آواز سنتے ہی کسی نہ کسی منظر نامے سے دور کھسک گیا ہوگا تاکہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ سکے، میری بات اور تھی مگر کالیا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو خود اس کے لیے کافی مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ میں نے بھی اسی لیے اپنے بیان میں کالیا کا کہیں بھی ذکر تک نہیں کیا تھا۔

دو دن مزید استاد بھابھا کے اڈے میں گزر گئے۔ معاملات بہت سے تھے جو مجھے سلجھانے تھے لیکن سب سے پہلے والا معاملہ میرداد کا تھا اسی لیے میں نے اسی کام کو اوّلیت دینے اور اس پر عمل کرنے کا سوچا۔ کالیا اب میرے ساتھ نہیں تھا۔ ٹھٹھہ میں بھی نہیں گیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ملیر گوٹھ کے رہائشی اور اپنے بچپن کے دوست سائیں داد کا خیال آیا۔ میں نے فوراً اسے فون کھڑکھڑا دیا۔

"ارے نومی یار! بڑے دن ہوگئے، کدھر ہے تو؟ خیریت سے تو ہے ناں؟" وہ بولا۔

"خیریت کہاں ہے یار! وہی بھاگا دوڑی لگی ہوئی ہے مگر اتنے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تجھ سے بات کیے ہوئے کہ تو پریشان ہوجائے؟ ابھی چند دن پہلے ہی تو تجھے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ حاجی مہران خان کو میں نے کیسی شکست سے دوچار کیا تھا۔"

"ہاں! یار مگر شاید تجھے اس کے بعد کی حقیقت کا علم نہیں ہوا۔ میں ابھی تجھے اسی سلسلے میں فون کرنے والا تھا کہ تیرا فون آگیا۔" وہ بولا۔ اس کا لہجہ مرجھایا ہوا سا ہوگیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ پھر بھی میں نے پوچھ لیا تو اس نے وہی بات بتائی جس کی مجھے توقع تھی۔ بولا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے خورشید خان سے اس سنگین معاملے سے متعلق ملنے کی کوشش کی تو پتا چلا وہ محلہ ہی نہیں شہر ہی چھوڑ کر جاچکا ہے۔ کہاں گیا ہے، کچھ بھی اور کسی کو بھی نہیں بتا کر گیا۔"

"مجھے پہلے سے اس کا اندازہ تھا۔" سائیں داد نے ایک گہری سانس خارج کرکے کہا۔ "یہ سرمایہ دار و ڈیرے لوگ پیسے اثر و رسوخ، طاقت اور کمزور لوگوں کو دھونس و دھمکی کے بل بوتے پر سب کچھ کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔ میری شہزادی کو بھی تو حاجی مہران خان نے اسی طرح زبردستی حاصل کیا تھا۔ دیکھ لو میں کیسا عاشقِ نامراد ہوں کہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں۔" پھر ایک لمحہ کے توقف کے بعد مجھے بھی میرا وعدہ یاد دلاتے ہوئے بولا۔

"او ..... معاف کرنا دوست! تم نے بھی تو میری شہزادی کے حصول کے سلسلے میں مجھ سے وعدہ کیا تھا، کیا بگاڑ پائے تم ابھی تک مہران خان کا لیکن مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ برا مت منانا یار!" اس کا لہجہ آج خاصا تلخ ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ شرمندگی کا بھی احساس ہوا، تاہم بولا۔

"میں بھلا کیوں برا مناؤں گا دوست؟ تم جو کچھ کہہ رہے وہ کوئی غلط تھوڑی ہے۔ سچ ہی تو کہہ رہے ہو تم۔ میں واقعی اب تک شہزادی بہن کو مہران خان کے چنگل سے چھڑانے کے سلسلے میں کیا کر سکا ہوں۔ میں تم سے واقعی شرمندہ ہوں سائیں داد!

"ارے..... نہیں..... نہیں یار نومی تُو تو سنجیدہ ہی ہو گیا، میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔" وہ جلدی سے خفت زدہ ہو کر بولا۔ بے چارہ وہ بھی شرمندہ سا ہو رہا تھا۔

"تم نے تو اپنی سی ساری کوششیں کر ڈالی تھیں۔ حاجی مہران خان جیسے آدمی کو اتنا تو پریشان کر ہی دیا تھا کہ اس کے بیٹے کو جیل ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ وہ سزائے موت اور بعد میں عمر قید کی سزا بھی بھگتنے لگا تھا۔ یہ کیا کوئی کم کارنامہ تھا تمہارا۔"

"سائیں داد! تقدیر نے ایک اور موقع دیا ہے مجھے کہ اس بار ایسی قبر کھودوں کہ مہران خان ساری زندگی اس میں سے نہ نکل پائے۔" میں نے کہا۔

"اچھا.....! وہ کیسے؟" وہ پہلی بار دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

"یہ میں تمہیں مل کر ہی بتا سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو چلے آؤ میرے پاس دیر کس بات کی ہے اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

"تمہاری ہی تو مدد کی ضرورت ہے یار!" میں نے کہا۔

"تم میرے ساتھ ذرا وقت نکال کر ٹھٹھہ چل سکتے ہو؟"

"بالکل چل سکتا ہوں جب بولو۔" اس نے فوراً کہا۔

"میں کبھی گیا نہیں ہوں آج تک کبھی گزرا ہوں تو الگ بات ہے مگر اس بار مجھے وہاں کچھ دن قیام بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔"

"ٹھٹھہ کے کون سے علاقے میں جانے کا ارادہ ہے؟"

"یار ایک مہم ہی سمجھو گھوڑا باڑی کا کوئی ساحلی علاقہ ہے جہاں تیمر کے جنگلات ہیں۔"

"وہ تو ایک خطرناک دلدلی علاقہ ہے۔ وہاں تم نے ایسی کون سی مہم میں ہاتھ ڈالنا ہے؟"

"یار! اب ساری تفصیل تو میں فون پر نہیں بتا سکتا۔"

"ٹھیک ہے، کب چلنا ہے؟"

"کل صبح سویرے۔"

"بس وغیرہ میں یا اپنی گاڑی میں؟"

"اپنی گاڑی کو وہاں کہاں سنبھالتے پھریں گے۔ اپنی ہی بس جاتی ہے صبح سات بجے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں پہنچا دے گی۔"

"بسم اللہ..... دوست! میں تیار ہوں۔"

"بس پھر تم کل صبح ہمارے قائد آباد والے لاری اڈے پر آ جاؤ۔ پہلی بس پر روانہ ہو جائیں گے۔"

"ہاں..... ہاں! تمہیں بسوں کی کیا کمی ہے، کراچی کے ایک بڑے لاری اڈے کے مالک ہو۔" وہ شوخ ہنسی کے ساتھ بولا تو میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

"یار! میں کہاں مالک ہوں۔ میں تو وہاں کا ایک نوکر ہوں۔"

"مگر سارا انتظام تو تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے ناں۔ تمہارے اشارے کے بغیر مجال ہے جو کوئی لاری ادھر سے ادھر ہو۔" اس نے قہقہہ مارا تو میں بھی دوستانہ انداز میں ہنس پڑا۔

"ارے..... میں تو بھول ہی گیا۔" وہ ایک دم بولا۔

"کیا تمہارا وہ لنگوٹیا یار..... کیا نام تھا اس کا..... شش..... شیراز عرف کالیا وہ بھی چلے گا ساتھ؟"

کالیا کے ذکر پر میں کچھ مغموم سا ہو گیا۔ حقیقت یہی تھی کہ اگر کالیا ہوتا تو میں اسی کے ساتھ ہی ٹھٹھہ جانے کا پروگرام بناتا۔

"تم کل آ جاؤ..... باقی تفصیل بعد میں۔"

"چلو ٹھیک ہے، کل میں ناشتا تمہارے ساتھ لاری اڈے پر ہی کروں گا۔ تمہاری طرف حلوا پوری اور چنوں کا سالن بڑا اچھا بنتا ہے۔" سائیں داد بولا۔

"ہاں..... ہاں ضرور..... کیوں نہیں یار! نوش جان کرنا۔ دونوں دوست مل کر گرما گرم حلوا پوری کا ناشتا کریں گے۔ ہم بھی تو تمہارے گوٹھ کا خالص کھویا نہیں بھولے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ اس کے بعد کل پہنچنے کا وعدہ کر کے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

جب میں سائیں داد سے فون پر باتیں کر رہا تھا تو مجھے کسی اور کال کی بھی بپ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کال دیکھی تو چونک پڑا۔ وہ روزی کی کال تھی۔ میں نے فوراً اس

سے رابطہ کیا۔

"میں کافی دیر سے کوشش کر رہی تھی مگر تمہارا فون انگیج جا رہا تھا۔" وہ بولی۔

"ہاں! میں کسی سے ضروری بات کر رہا تھا، بولو کیا بات ہے؟"

"تم خیریت سے تو ہو ناں کہاں ہو اس وقت؟"

مجھے اس کا سوال کچھ عجیب سا لگا۔ بولا۔ "ہاں! میں ٹھیک ہوں۔ استاد بھابھا کے اڈے پر کیوں خیریت تو ہے۔"

"شکر ہے خدا کا۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ یوں لگا جیسے وہ چند دن پہلے حادثے سے متعلق سب جانتی ہو۔ میں ابھی اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"جلدی سے ایک جگہ کا پتا نوٹ کرو وہاں آسانی سے آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔ تمہارے دوست کالیا کی حالت بہت نازک ہے۔" اس نے جیسے میری ساعتوں پر دھماکا کیا۔

"کک..... کیا؟ کالیا کدھر ہے؟"

"ساری باتیں چھوڑ دو اور فوراً اس پتے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔" کہتے ہوئے اس نے مجھے موسمیات کے کسی رہائشی پروجیکٹ شیراٹن اسکوائر کے ایک فلیٹ کا پتا سمجھا دیا۔

میرے سینے میں شدید قسم کی کپکپاہٹ ہونے لگی۔ دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ روزی کے فون نے مجھے جیسے پل کے پل دہشت زدہ سا کر کے رکھ دیا تھا۔ روزی مجھے کیوں بلا رہی تھی؟ اسے گزشتہ روز والے حادثے کا کیسے علم ہوا؟ اسے کالیا کہاں مل گیا اور کیسے؟ بقول روزی کے اس کی حالت نازک تھی، وہ روزی کے پاس کیسے پہنچ گیا یا پھر روزی نے اسے کہیں ایسی حالت میں دیکھ کر مجھے کال کر دی ہے؟

اب ان لائحل سوالات کے جواب مجھے روزی کے بتائے ہوئے پتے پر ہی پہنچ کر مل سکتے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے کالیا کے لیے خیر کی دعا مانگی اور تیزی سے سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اکیلے ہی اس پتے پر نکل جاؤں؟ یا پھر استاد بھابھا کو مطلع کروں اور اس کے ساتھ ہی وہاں پہنچوں۔ اپنا آخری الذکر خیال مجھے زیادہ مناسب لگا، کیونکہ ایک تو میری اپنی حالت بھی پوری طرح نہیں سنبھلی تھی اور اگر کالیا کسی خطرے میں تھا تو مجھ سے زیادہ استاد بھابھا ہی اس کی مدد کر سکتا تھا۔

لہٰذا میں نے اسی وقت استاد بھابھا سے بات کی اور وہ خود میرے ساتھ چلنے پر فوراً تیار ہو گیا۔ جمشید اور ارشد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم ایک سوزوکی جیپ میں موسمیات روانہ ہو گئے۔ موسمیات کا علاقہ یونیورسٹی روڈ پر واقع تھا۔

جیپ استاد بھابھا خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا وہ اتنی ٹریفک ہونے کے باوجود جیپ کو دوڑا رہا تھا اور شارٹ کٹ راستے اختیار کرتا ہوا بالآخر یونیورسٹی روڈ پہنچا۔ موسمیات کے قریب واقع شیراٹن اسکوائر کے اس پروجیکٹ میں ہم نصف پون گھنٹے کے اندر اندر ہی پہنچ گئے۔

جیپ ایک جگہ روک کر ہم گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ مطلوبہ فلیٹ سیکنڈ فلور پر واقع تھا۔ وہاں ہم پہنچتے ہی فلیٹ پر دستک دینے لگے۔ دروازہ روزی نے ہی کھولا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ میں نے اسے دیکھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ قریب کے ایک کمرے کی طرف دوڑی۔ ہم بھی اس کے پیچھے چل دیے۔ سامنے کا منظر دیکھ کر ہی میرے ہوش خطا ہونے لگے۔

"کالیا! میرے یار!" کالیا کی موجودہ ہیئت کذائی دیکھ کر سب سے پہلے میرے منہ سے یہ کپکپاتے ہوئے الفاظ برآمد ہوئے تھے۔

سامنے بیڈ پر کالیا بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے قریب کوئی نرس ٹائپ عورت پریشان سی کھڑی تھی۔ کالیا کے جسم پر کہیں کہیں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور بیڈ کے ساتھ ہی ایک ڈرپ اسٹینڈ بھی رکھا نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کالیا کا یہاں خفیہ طور علاج ہوتا رہا تھا۔

میں کالیا کی طرف لپکا۔ قریب کھڑی عورت میرے لیے اجنبی تھی مگر شاید روزی کے لیے نہیں۔ وہ وہاں سے کھسک کر روزی کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔

استاد بھابھا بھی اپنے گردہ کے سب سے ولیر اور جی دار ساتھی کو اس قابلِ رحم حالت میں دیکھ کر بری طرح تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔ میں کالیا کے بالکل قریب آ کر اس پر جھک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ کمزوری اور شدید نقاہت کے سبب پیلا زرد پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت ناگفتہ سی ہو رہی تھی۔ مجھے ہی نہیں بلکہ استاد بھابھا کو بھی یقیناً اسی بات پر حیرت ہوئی ہو گی کہ کالیا اس کے اڈے کی بجائے یہاں کیوں تھا؟ اگر کالیا نے کسی طرح روزی کی کوئی مدد لی تھی تو وہ ہمیں کیوں فراموش کر گیا تھا؟ خیر! یہ بعد کی باتیں تھیں۔ روزی ایک طرف خود بدحواس اور متوحش سی کھڑی تھی۔ وہ کالیا کے لیے بے حد فکرمند نظر آ رہی تھی۔ اسی وقت نرس نما عورت نے بیڈ پر پڑے کالیا

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے فوراً ہاسپٹلائز کرنے کی ضرورت ہے۔ میں جہاں تک اسے سنبھال سکتی تھی، سنبھال لیا مگر اس کی روز بروز گرتی حالت قابو میں نہیں آرہی ہے۔ اسے آئی سی یو کی ضرورت ہے۔"

اس کی بات پر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اس خاتون سے اسی لہجے میں کہا۔ "تو پھر اسے ابھی تک کسی اسپتال کیوں نہیں لے جایا گیا اور....." یہ کہتے ہوئے میں روزی کی طرف مڑا۔ "کیا تمہیں بھی یہ عقل نہیں آئی تھی؟" میں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"مم.....میں تو.....میں تو....." وہ بوکھلا گئی۔ استاد بھابھا نے مجھے ٹوک دیا۔

"نومی! یہ وقت ان باتوں میں الجھنے کا نہیں ہے۔ اسے فوراً اٹھاؤ اور کسی اسپتال لے چلو۔"

"کک.....کالیا نے کسی اسپتال لے جانے سے منع کیا تھا۔" بالآخر روزی نے اپنے مخل پڑتے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے بتایا۔

"شٹ اپ!" میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ جمی اور ارشد نے کالیا کے بے سدھ جسم کو اٹھایا اور فوراً فلیٹ کی سیڑھیاں اترنے لگے، میں ان کی مدد میں شامل تھا۔ آتے جاتے لوگ باگ ہمیں حیرت بھری نظروں سے تکے جارہے تھے۔ میں نے دیکھا روزی اور وہ نرس خاتون آپس میں تیزی کے ساتھ کچھ کھسر پسر کررہی تھیں۔ روزی وہیں فلیٹ میں رہ گئی تھی البتہ وہ نرس ہمارے ساتھ ہی نیچے اتر آئی تھی۔

ہم نیچے پہنچے اور کالیا کے بے سدھ وجود کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈالا تو نرس ہم سے بولی۔

"اسے کون سے اسپتال لے جانا اس وقت زیادہ مناسب ہوگا یہ میں جانتی ہوں۔ وقت ضائع مت کریں۔ میری بات سمجھیں۔ روزی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ کالیا نے صحیح کہا تھا کہ اسے کسی اسپتال لے جانے کی بجائے گھر میں ہی اس کا علاج کیا جائے۔ وہ پولیس کی بیان بازی سے بچنا چاہ رہا تھا۔"

اس کی بات میں تو اب سمجھا تھا مگر شاید گھاگ استاد بھابھا بہت پہلے یہ بات سمجھ چکا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

"تم جو کہو گی وہی ہم کرنے کو تیار ہیں، تم نے ہم پر پہلے ہی بڑا احسان کیا ہے۔"

جیپ میں اب اتنے لوگوں کے سوار ہونے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ استاد بھابھا نے جمی اور ارشد کو رکشا کروانے کا کہا اور پھر ذرا ہی دیر بعد جیپ آندھی طوفان کی طرح خاتون نرس کے بتائی ہوئی منزل کے پتے پر دوڑی چلی جارہی تھی۔

☆.....☆

یہ سفر بہ مشکل نصف گھنٹے میں طے ہوگیا تھا۔ ہم لانڈھی کے ایک نچلی آبادی ٹائپ کے علاقے میں پہنچے تھے۔ یہاں ایک پرانی سی عمارت کے سامنے نرس کے اشارے پر جیپ روک دی گئی۔ عمارت مستطیل تھی اور رنگ مٹیالا تھا۔ رقبہ بہ مشکل دو سو گز پر محیط تھا۔ گیٹ کی پیشانی پر ایک الخورد سا بورڈ لٹک رہا تھا جو بادی النظر میں گرنے کے قریب ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر مٹے مٹے الفاظ میں دارالاشفاء درج تھا۔ لوگوں کی آوک جاوک نظر آرہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی کمپلیکس یعنی کمپوڈر ڈاکٹر ٹائپ کا اسپتال تھا، جہاں علاج معالجے کے علاوہ چھوٹی موٹی جراحی (سرجری) کا بھی کام "نسلی بخش" کیا جاتا ہوگا۔

ہم کالیا کو اٹھائے اندر بھاگے۔ نرس نے ہمارے پوچھنے پر راستے ہی میں ہمیں جو کچھ جلدی جلدی بتایا تھا اس کا لب لباب یہی تھا کہ پولیس سائرن کی آواز سن کر شدید زخمی ہونے کے باوجود کالیا وہاں سے کسی طرح خود کو گھسیٹتا ہوا تاریک کونے میں لے گیا جہاں اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

نامعلوم حملہ آور تو پولیس سائرن سنتے ہی اپنی کار میں گلی کے دوسرے سرے سے رفو چکر ہوگئے تھے۔ مجھے زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں اپنی موبائل میں ڈال کے پولیس لے گئی۔ کالیا وہیں سسکتا ہوا پڑا رہ گیا۔ اس نے محض اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو شدید زخمی حالت کے باوجود سنبھالنے کی کوشش جاتے ہوئے، جب اپنا سیل فون نکالنا چاہا تو وہ بے کار ہو چکا تھا۔ وہ وہیں نڈھال ہو کے پڑا رہا۔ سوئے اتفاق اس وقت بشریٰ جو ایک نرس تھی۔ (یہ وہی نرس خاتون تھی) وہ اس وقت اپنی ایوننگ ڈیوٹی کر کے واپس گھر آرہی تھی۔ کالیا کو اسی نے سنبھالا تو کالیا نے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسے اپنی "مجبوری" بتا دی۔ بشریٰ ایک مہربان خاتون نرس تھی، گھر بھی اس کا اسی گلی میں صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ وہ اسے کسی طرح سنبھال کر اپنے گھر لے آئی۔ یہاں اس کا کچھ نہ کچھ فرسٹ ایڈ کا سامان رکھا تھا۔

ایک گھنٹے تک اس نے کالیا کی حالت کچھ سدھاری مگر کالیا پر اب مکمل بے ہوشی طاری تھی۔ بشریٰ اکیلی گھر میں تھی۔ اس نے کالیا کی جیب سے سیل نکالا۔ جو پہلے ہی ناکارہ

ہو چکا تھا۔ تاہم بشریٰ نے ایک عقل مندی یہ کی کہ اس کے موبائل فون کی سم نکال کر اپنے سیل میں ڈال لی۔ یہ سیٹ ڈوئل سم تھا، اس میں اس نے سب سے پہلے وہ نمبر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی جس میں کسی خاتون کا نام ہو، وہ کسی مرد کے نمبر پر کال نہیں کرنا چاہ رہی تھی، یوں اسے "روزی" کا نام لکھا ہوا نمبر ملا، اس نے اسے ہی فون کر ڈالا۔

روزی کے لیے کالیا بھی میرے حوالے سے ایک دوست اور محسن کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ آن پہنچی اور بشریٰ نے اس سے یہی کہا، کالیا کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے میں اس کا علاج کرنے کی کوشش کروں گی کیونکہ گولیاں اس کا گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھیں۔ دو ہی گولیاں لگی تھیں، اس نے زخم صاف کر کے پٹی تو کر دی تھی۔ تاہم اس نے روزی سے کہا کہ وہ کالیا کا خفیہ طور علاج تو کر دے گی مگر اپنے گھر میں نہیں کر سکتی، کیونکہ اسے باہر جانا ہوتا ہے، لک آفٹر کون کرتا اس کی، تب روزی نے کہا وہ اسے اپنے فلیٹ پر لے جائے گی جو روزی نے حال ہی میں کرائے پر لیا تھا۔

روزی نے مجھے بھی کال کرنے کی کوشش کی تھی مگر ظاہر ہے رابطہ نہ ہو سکا تھا، کیونکہ ایک تو اپنی میری حالت اسپتال میں ناگفتہ بہ تھی، دوسرے یہ کہ میرا سیل آف تھا اور اسپتال انتظامیہ کے حوالے تھا۔

بہر طور نرس بشریٰ نے اپنے اسپتال کی ہائی روف ایمبولینس منگوا کر راتوں رات کالیا کو روزی کے فلیٹ میں منتقل کر دیا۔ وہاں علاج تو کالیا کا خفیہ طور پر ہوتا رہا مگر زخم کاری ہونے کے سبب کالیا کی حالت بگڑنے لگی۔

نرس بشریٰ درحقیقت ایک ایسے کلینک میں کام کرتی تھی جو کسی "کمپلیکس" کی سرپرستی میں چل رہا تھا۔ وہ کمپلیکس ڈاکٹر اکرم تھا۔ تھا تو تجربہ کار مگر ڈگری ہولڈر نہ تھا۔ بالآخر روزی نے دوبارہ مجھے کال کی اور یوں مجھے اس کا علم ہوا۔

ڈاکٹر اکرم خود کو "ڈاکٹر" ہی کہلوانا پسند کرتا تھا۔ لانڈھی کے ایک دور افتادہ علاقے میں اس کی پریکٹس اچھی چل رہی تھی۔ بہر حال ہمارا مقصد یہ تھا کہ پولیس کیس اور بیان سے بچ کر کالیا کا خفیہ طور علاج ہوتا رہے۔ وہ ہمیں "ڈاکٹر" اکرم کی صورت میں میسر آگیا تھا۔

اکرم نے کالیا کو سنبھال لیا تھا اور وہیں ایک کمرے میں اسے شفٹ کر دیا تھا۔

اس طرف سے تسلی ہونے کے بعد میں کل والی اپنی مہم کے لیے تیار تھا۔ مجھے اب کالیا کی طرف سے کوئی فکر نہ تھی۔ اس کی حالت سنبھلنے لگی تھی۔ استاد بھابھا کے علاوہ اب روزی بھی اس کے ساتھ تھی۔ نرس بشریٰ تو پہلے ہی رحمت کا فرشتہ بنی ہوئی تھی۔ تاہم اب روزی کو سیٹھ ستار سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ جیل میں اور اپنے مقدمے بھگتنے میں مصروف تھا۔

اگلے دن علی الصبح سائیں داد آگیا۔ ہم نے لاری اڈے میں اکٹھے ناشتا کیا اور ٹھٹھے والی بس میں سوار ہو کر روانہ ہوگئے۔

ٹھٹھہ کراچی سے 228 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اپنی کار میں یہ فاصلہ دو ڈھائی گھنٹوں پر محیط تھا، تیز رفتار لگژری کوچ تین گھنٹے کے اندر اندر پہنچا دیتی تھی۔ ہماری مسافر لاریاں چونکہ غریب عوام کو سستی سواری دینے کی دعویٰ دار تھی، وہ لوکل چلتی تھی اور تقریباً چار ساڑھے چار گھنٹوں میں پہنچاتی تھی۔

لہٰذا ہم سات بجے صبح والی لاری میں سوار ہوئے تھے اور گیارہ بج کر پچاس منٹ پر ٹھٹھہ پہنچے۔ اپنی بس تھی، اس لیے کرایہ ہم سے نہیں لیا گیا تھا۔ اڈے پر اتر کر ہم نے ایک تانگہ لیا اور سیدھا گھوڑا ہائی کار خ کیا۔

وہاں پہنچ کر ہم نے ایک سستا سا ہوٹل کرائے پر لیا۔ یہ ٹھٹھہ کا ایک ساحلی علاقہ تھا اور یہاں بڑے چھوٹے ہر طرح کے ہوٹلز تھے، ہم نے ایک سستے سے ہوٹل میں کمرا لیا اور نہا دھو کر فریش ہو گئے۔ تھوڑا آرام کر کے تکان اتاری پھر آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ سائیں داد پوری طرح میرا ساتھ دینے پر آمادہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ مہم ایک بڑے مگرمچھ حاجی مہران خان کے گلے کا پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔ مہران خان اپنے بیٹے کو تو عمر قید سے صاف بچا گیا تھا مگر اس بار میں نے اس کے گرد جو جال بچھایا تھا وہ اس کے نرغے میں آنے کے بعد خود کو ایک بڑی سزا سے نہیں بچا سکتا تھا اس کے ساتھ ساتھ میں میر داد سے بھی جان چھڑا سکتا تھا کیونکہ قانون کی زد میں وہ بھی آنے والا تھا۔ منشیات فروشوں کے خلاف آج کل قوانین بہت سخت کر دیے گئے تھے اور ایسے مجرموں کے خلاف کیس انسدادِ منشیات کی خصوصی عدالتوں میں چلتے تھے۔

"ہمیں سب سے پہلے انسپکٹر وجاہت سیال سے رابطہ کرنا چاہیے۔" سائیں داد نے مشورہ دیا۔

"میرے اگلے پلان میں یہی ہے کہ وجاہت سیال جیسے فرض شناس اور ایمان دار پولیس افسر کی مدد کے بغیر ہم یہ پالا نہیں مار سکتے۔" میں نے اس کے مشورے پر صاد کرتے

ہوئے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور آگے بولا۔

"لیکن سب سے پہلے اس اہم مہم کا ایک ابتدائی حصہ ہمیں ازخود انجام دینا ہوگا۔" میری بات پر سائیں داد مستفسرانہ نظروں سے میرا چہرہ تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ "شانو کھوجا کے بتائے ہوئے علاقے میں پہلے خود جا کر اس بات کا کھوج لگانا ہوگا کہ آیا میر کے ان ساحلی اور دلدلی جنگلات میں پھنسی ہوئی اس متروکہ لانچ میں واقعی منشیات موجود ہے یا نکال لی گئی ہے۔"

"کیا یہ ضروری ہے؟" سائیں داد نے کہا۔

"اس تسلی کے بغیر تو ہمارا اگلا قدم اٹھانا ایسا ہی ہوگا دوست! جیسے خود ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھود رہے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا مگر سائیں داد کچھ نہیں سمجھ پایا اور بولا۔

"لیکن ہم خود کو کیوں خطرے میں ڈالیں؟ ہم انسپکٹر وجاہت سیال سے رابطہ کریں گے اور اسے بتا دیں گے کہ لانچ میں اجناس کی بوریوں کی خفیہ تہہ میں منشیات کی بھاری کھیپ موجود ہے۔ پولیس بھاری نفری کے ساتھ خود ہی یہ کارروائی کر گزرے گی اور ہم ہاتھ جھاڑ کر واپس کراچی لوٹ جائیں گے۔" مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ بولا۔ "اور اگر لانچ کے اندر سے منشیات نہ ملی تو پتا ہے کیا ہوگا؟ پولیس سب سے پہلے ہمیں دھرے گی۔ اس کے بعد ہم جن لوگوں کے خلاف یہ جال ڈال رہے ہیں وہ ہم پر الٹ دیں گے یوں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا کیا خیال ہے کہ شانو کھوجا نے تمہیں یہ سب باتیں غلط بتائیں ہوں گی؟"

"غلط بیانی میں اسی کا نقصان ہے اور پھر وہ ایسا کرے گا ہی کیوں؟" میں نے کہا۔ "اسے پکی خبر ہوگی کیونکہ اس کالے دھندے میں وہ خود بھی شریک ہے۔ بس! بلا شرکتِ غیرے اس قیمتی مال پر خود قبضہ کر کے ساری دولت اکیلے ہی ہڑپ کرنا چاہتا ہے لیکن میں اپنے نقطہ نظر پر عمل کرنے کا عادی ہوں۔ اسی لیے پہلے اپنی تسلی کروں گا، ہوسکتا ہے وقت کے ساتھ کوئی اور چال میرے ذہن میں آ جائے جو زیادہ موثر ثابت ہو۔"

"ہمم..... اس کا مطلب ہے تمہارے ذہن میں صرف ایک نہیں کئی لائحہ عمل، خام مال کی صورت، پہلے سے ہی موجود ہوتے ہیں۔" سائیں داد معنیٰ خیز انداز میں مسکرایا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں، دوست! تم نہیں جانتے کہ اس لانچ میں کتنے بڑے بڑے مگرمچھوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔"

"ہمم..... چلو پھر جو کرنا ہے کر ڈالو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ہمیں میر کے ان جنگلات کا رخ کرنا ہوگا۔ لانچ کے اندر گھس کر اجناس کی خفیہ تہوں میں منشیات کی موجودگی کا آنکھوں دیکھا یقین کرنا ہوگا اور اس کے بعد ان سب کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں گے۔"

"فرض کرو حاجی مہران خان کو بڑی سزا ہو جاتی ہے، تو کیا میری شہزادی اس کے چنگل سے آزادی حاصل کر لے گی؟" سائیں داد نے دبے دبے جوش تلے پوچھا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"حاجی مہران خان کے طویل عرصہ جیل چلے جانے اور اسے بڑی سزا ملنے کے بعد اس کی طاقت اور اثر و رسوخ گھٹ جائے گا۔ ایسے میں پھر تمہیں اور شہزادی کو تھوڑی ہمت دکھانے کی ضرورت ہوگی۔ شہزادی کو تم اس کی حویلی سے بھگا کر لے جانا۔ میں تم دونوں کو کراچی میں ہی ایک جگہ رکھوں گا۔ حاجی مہران خان سے معاملہ طے کریں گے۔ اگر وہ خاموشی سے شہزادی کو طلاق دے دیتا ہے تو ٹھیک ہے، بہ صورتِ دیگر شہزادی عدالت میں خلع کی درخواست دائر کر دے گی۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو گے کہ ان جیسوں کے لیے یہ کیسی ذلت کی بات ہوگی، اسی لیے مجھے یقین ہے کہ مہران خان اپنی جگ ہنسائی کسی صورت بھی نہیں چاہے گا اور خاموشی سے شہزادی کو طلاق دے دے گا اور کورٹ کچہری کی نوبت ہی نہیں آنے دے گا۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا دوست!" سائیں داد بہ یک ترنت بولا۔ "لیکن..... تم شاید ان کی کینہ پرور فطرت سے واقف نہیں ہو، وہ یہ سب کر بھی دے گا لیکن اپنی اس سبکی کو غیرت کا معاملہ بنا کر مجھے اور شہزادی کو ختم کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا لیکن مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہے۔" وہ ایک لمحہ توقف کے بعد آخر میں بولا۔

"میں اپنی شہزادی کو لے کر کسی اور شہر یا ملک نکل جاؤں گا۔"

"میرے ذہن میں بھی یہ سب کچھ ہے۔" میں نے کہا۔ "اس لیے میں بھی تمہیں یہی مشورہ دینے والا تھا کہ ایک بار شہزادی اس جاگیردار کے چنگل سے نکل جائے تو تم ملک سے باہر نکل جانے کی کوشش کرنا۔"

"میرے چاچے کا لڑکا دریل خان دبئی میں کام کرتا ہے۔ میں اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے مجھے سب سے پہلے اس وقت یہ مشورہ دیا تھا کہ شہزادی کی شادی اس بڈھے گدھ سے ہونے والی تھی مگر اس وقت میری جوان بہن اور میرا بوڑھا باپ میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے لیکن اب بابا کو اللہ سائیں جنت نصیب کرے وہ تو دنیا میں نہیں رہے، بہن کی شادی ہوگئی۔ وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اندرون سندھ کے کسی شہر جا بسی ہے۔ اب میں اکیلا ہوں۔ اب تو میں یہ قدم ضرور اٹھاؤں گا۔"

"تو بس، پھر ملاؤ ہاتھ۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا۔ "میں گھوڑا باڑی اور میر کے ان ساحلی جنگلات سے واقف نہیں ہوں۔ تم وہاں تک صرف میری رہنمائی کر دو۔ بعد کا کام میں سنبھال لوں گا۔" اس پر وہ بولا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو دوست! اس مہم میں، میں تمہارا آخری وقت تک ساتھ دوں گا۔ میں تو اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوں بس! یہ بتاؤ کہ کب نکلنا ہے۔"

"ذرا شام کا اندھیرا پھیل جائے یا پھر تم بتاؤ کہ ہمارا کب نکلنا مناسب ہوگا؟" میں نے اس کا مشورہ لینا ضروری سمجھا تو وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے، ذرا شام اترنے دو پھر نکلتے ہیں لیکن وہاں بقول تمہارے پولیس کا بھی تو پہرا ہوگا؟ ان سے بچنا بھی ہمارا ضروری ہوگا۔"

"شانو کھوجا نے ہمیں آخر میں یہ بھی بتایا تھا کہ یہ معاملہ پرانا ہو گیا ہے اور وہ خود بھی یعنی مہران خان اور میر داد وغیرہ یہی چاہتے تھے کہ پولیس تنگ آ جائے، کیونکہ انہیں ابھی کچھ نہیں حاصل ہو سکا ہے، پولیس نے اس معاملے کو ایک عام حادثہ قرار دے دیا ہے۔ میرا تئیں خیال کہ وہاں اتنا سخت پہرہ ہوگا۔"

اسی طرح گفتگو میں کافی وقت کٹ گیا۔ عمل کا وقت قریب آیا تو ہم دونوں ہوٹل سے روانہ ہو گئے۔ ایک تانگہ کروایا اور گھوڑا باڑی کی طرف نکل گئے۔ تانگے والے کو جب سائیں داد نے سندھی میں یہ نیو بندر کی طرف چلنے کا کہا تو وہ پہلے حیرت زدہ ہوا تھا، کیونکہ مذکورہ علاقے میں سوائے ویرانی کے کچھ نہ تھا یعنی وہاں کوئی تفریح مقام تھانہ ہی دکانیں وغیرہ، جہاں کی سیر کرنے میں لطف آتا۔

"اڑے چاچا! یہ سب انجینئر ہیں اور میں سرویئر

سمیتا پاٹل

سمیتا پاٹل ایک فطری اداکارہ تھی۔ اس کو صحیح معنوں میں پرفارمر کہا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر آرٹ فلموں میں اس کی اداکاری اتنی جاندار ہوتی کہ حقیقت کا گمان ہوتا۔ اس نے ایک درسگاہ کی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اس کی پیدائش 17 اکتوبر 1955ء کو پونا میں ہوئی۔ اس نے پونا ہی کے اسکول میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے کیمرے کا سامنا 1970ء میں کر لیا تھا۔ اس وقت وہ دوردرشن ٹی وی سے خبریں پڑھا کرتی تھی۔ سمیتا نے متوازی سنیما (آرٹ فلم) میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ اس نے جس دور میں فلموں میں کام شروع کیا اس دور میں متوازی فلمیں بہت دیکھی جاتی تھیں۔ خاص طور پر دانش ور طبقہ ان فلموں کو بہت پسند کرتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ شروع ہی میں اسے شیام بینگل، گووند نہالانی اور ستیہ جیت رے جیسے ڈائریکٹرز مل گئے جنہوں نے اس کی صلاحیتوں کو پہچان کر اس کے مزاج اور موڈ کے مطابق کام دیا اور سمیتا نے ان فلموں میں اپنا کردار ادا کر کے حق ادا کر دیا۔ سمیتا نے فلم "بھومیکا" میں بہترین اداکارہ کا نیشنل ایوارڈ بھی حاصل کر لیا تھا (اس کے علاوہ بھی بے شمار اعزازات اس کے نام پر ہیں) وہ ایک سرگرم سماجی کارکن بھی رہی ہے۔ اس نے عورتوں کے حقوق کے لیے بہت کام کیا۔ مغربی فلمی دنیا بھی اس سے متاثر تھی۔ اسی لیے اسے موتیریال فلم فیسٹیول میں جیوری کا رکن بھی بنا دیا گیا تھا۔ مشہور میگزین "فارلس" کے ایک جائزے کے مطابق ہندوستانی فلموں کی تاریخ کی پچیس انتہائی بے مثال اداکاری کی تاریخ میں سمیتا کا نام کئی بار شامل ہو چکا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی کچھ یوں رہی کہ ایک بار اس کی ملاقات مشہور اداکار راج ببر سے ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ بالآخر دونوں کی شادی ہوگئی۔ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اسی بیٹے کی پیدائش پر سمیتا کا انتقال ہو گیا تھا لیکن اخبارات نے الزام لگایا کہ راج ببر نے پہلی بیوی نادرہ کے دباؤ میں آ کر سمیتا سے منہ موڑ لیا تھا۔ اسی ڈپریشن کی وجہ سے سمیتا کا کیس بگڑ گیا اور وہ بھری جوانی میں مر گئی۔

☆☆

ہوں۔ ہم میٹھے پانی کے لیے وہاں زمین کا معائنا کرنے کی غرض سے جارہے ہیں۔" سائیں داد نے بڑی چالاکی سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بوڑھے تانگہ بان کی بات بنائی۔ وہ مطمئن ہوگیا۔

تانگے والے نے ہمیں "دوآبہ" نامی ویران ساحل کے قریب اتار دیا۔ ہمیں اتارنے اور اپنا کرایہ وصولنے کے بعد وہ اپنے گھوڑے کو مخصوص آواز میں ٹشکارتا ہوا چلتا بنا۔

سائیں داد نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ویران جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

میں نے سامنے سمندر اور ساحل پر اترتی شام کی لالی تلے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ ماسوائے لہروں کے شور کے۔ خنک ہوا کے ہلکے جھونکے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں دور ملگجے سے جھٹپٹے میں افق پر تارے ٹمٹمانے لگے تھے۔ آسمان روشن تھا اور کوئی دم کو چاند اپنا رخِ روشن دکھانے والا تھا۔

"وہ سامنے دیکھو اس طرف۔" سائیں داد نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا تو میں پورا اسی جانب کو گھوم گیا مگر وہاں مجھے ملگجی سی تاریکی کے سوائے کچھ نظر نہ آیا۔

"وہاں تو اندھیرا سا چھایا ہوا ہے۔" میرے منہ سے برآمد ہوا۔

"یہی وہ جگہ ہے جہاں سے تیمر کے ولدلی جنگلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔" سائیں داد بولا۔ "تم نے جو اس لانچ "المیر" کے پھنسی ہوئی جگہ کی جو لوکیشن بتائی ہے اس کی سمت یہی ہے۔"

"اندازاً کتنا کلومیٹر چلنا پڑے گا ہمیں؟" میں نے وبے وبے جوش سے کہا۔

"فاصلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے جواب دیتے ہوئے کہا اور آگے بولا۔ "مسئلہ وہاں تک بہ خیریت پہنچنے کا ہے۔ اگرچہ یہ علاقہ جاتی اور کیماڑی تک وسیع ہے مگر جہاں میں تمہیں لے کر آیا ہوں، یہاں سے بے حد قریب ہے تاکہ ہم بھٹک نہ سکیں۔ اصل مسئلہ زمین کا ہے۔ اندھی ولدلیں ہیں ان گنت زہریلے آبی حشرات الارض ہیں، سانپ، مچھر، بچھو، جونکیں اور بچھوؤں کی بہتات ہے اور....." وہ شاید مزید کوئی خطرناک انکشاف کرتے کرتے اچانک چپ ہوگیا مگر میں اس کی بات سن کر میرے امید بھرے چہرے پر مایوسی کی شام اترنے لگی۔ میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"یار! یہ تو واقعی خطرناک کام ہے۔ میں تو سمجھا تھا محض ولدلوں کا مسئلہ ہوگا تو وہ کسی نہ کسی طرح حل کرلیں گے مگر....." میری بات پر وہ مسکرایا اور ازرائے تشفی بولا۔

"ناامید کیوں ہوتے ہو میرے یار! میں ہوں نا تمہارے ساتھ آؤ، لیکن خیال رہے، میری مرضی کے بغیر آگے ایک قدم بھی خود سے مت بڑھانا۔" میں نے اس کی بات سن کر پھیکی پھیکی سی مسکراہٹ سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ تاہم اسے یاد دلایا۔ "تم کچھ اور بھی کہنے والے تھے؟"

"ہاں!" اس نے کہا۔ "لیکن چھوڑو، بلاوجہ تم پھر پریشان ہوجاؤ گے، بات تو بس یونہی سنی سنائی ہے۔"

"نہیں، اب پریشان نہیں ہوں گا میں تم جو میرے ساتھ ہو اور پھر اللہ کی مدد تو ہے ہی شامل حال ہمارے۔"

وہ ایک گہری اور متانت زدہ سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں یہ جھوٹ ہے یا سچ ہے۔ مفروضہ البتہ اس بات سے ملتا جلتا ہی ہے کہ جس طرح کوہ کھل کی سنگلاخ پہاڑیوں کے دامن میں "مم" دیکھے جانے کا مفروضہ عام ہے اسی طرح یہاں ٹھٹھہ کے تیمری جنگلات میں "سبز آدمی" دیکھے جاتے رہے ہیں۔ یہ آدمی بظاہر چھریرے جسم اور لمبے قد کے ہوتے ہیں اور بے حد طاقت ور ہوتے ہیں۔ بالکل برہنہ ہوتے ہیں مگر ان کی برہنگی ان کے گہرے سبز رنگ سے اس طرح ڈھکی ہوتی ہے کہ جیسے وہ ہرے رنگ کا لباس پہنے ہوئے ہوں۔

مم کی طرح یہ خود سے کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے مگر اپنی عمل داری اور راجدھانی میں کسی غیر کو دیکھ لیں تو غضب ناک ہوجاتے ہیں۔ مم کی طرح یہ سامنے سے حملہ نہیں کرتے بلکہ چھپ کے کرتے ہیں۔ انہیں لڑائی بھڑائی کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا لیکن ہاتھ پاؤں مار کے یہ کسی بھی انسان کو جان سے مار ڈالنے کی قوت رکھتے ہیں۔"

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ وہ بھی ہنس دیا تھا۔ مم کے بارے میں تو میں نے بھی سن رکھا تھا جو نہ صرف وادو اور سیہون شریف کے گنجان پہاڑی علاقوں بلکہ بلوچستان کے بے آب و گیا اور بنجر پہاڑی علاقوں میں بھی دیکھی جاتی رہی ہے مگر تیمر کے جنگلات میں سبز انسانوں کے بارے میں، میں آج پہلی ہی بار سن رہا تھا۔

بہرطور ہم اللہ کا نام لے کر آگے بڑھ گئے۔ میرے ذہن میں آرہا تھا کہ اگر ہمیں اسی ویران راستے سے جانا تھا تو کیوں نہ دن کے وقت نکلا جاتا۔ چلتے چلتے جب میں نے

اس کا موہوم سا اظہار سائیں داد سے کیا تو وہ بولا۔

"ون میں دیکھ لیے جانے اور پولیس کے کسی اہلکار سے مڈبھیڑ ہوجانے کا خطرہ درپیش رہتا۔ شام اور رات پڑتے ہی مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس خطرناک علاقے سے پناہ مانگتے ہوئے دور ہوجاتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ ہمارے پاس ٹارچیں تھیں، دو عدد چاقو تھے، رسی تھی اور ادویہ کا ایک بکس۔ سائیں داد نے ایک پستول بھی ساتھ رکھ لیا تھا جس کے چیمبر میں چھ گولیاں تھیں۔ فالتو راؤنڈ ہمارے پاس نہیں تھے۔ تاہم میں نے اسے کسی بھی حالت میں گولی چلانے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا جبکہ ٹارچیں بھی ہم نے کسی احتیاط کے پیش نظر ابھی نہیں جلائی تھیں، سائیں داد نے کہا تھا کہ ہم ابھی محض اندازے سے جہاں تک جاسکتے ہیں اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بڑھتے رہیں مگر ٹارچ اشد اور بوقتِ ضرورت ہی استعمال کی جائیں گی۔

جلد ہی مجھے لگا جیسے ہم دونوں اندھیرے کا حصہ بن کر رہ گئے ہوں۔ ہاتھ کو ہاتھ تو کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب قریب اور ساتھ چل رہے تھے، وہ تک سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے تو گھبرا کے سائیں داد کو ہولے سے پکارا بھی۔

"میں ساتھ ہی ہوں دوست! ابھی ہم خطرے سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہیں۔" اس کی سرگوشی ابھری۔ "میں تمہیں خبردار کردوں گا بلکہ تھوڑی دیر کے لیے ہم رکیں گے بھی، ابھی بس چلتے رہو۔" کہتے ہوئے سائیں داد نے میرا ہاتھ بھی تھام لیا۔ مجھے کچھ تسلی ہوگئی۔ اب مجھے اپنی عقل مندی یا پھر تقدیر کے اس اتفاق پر حیرت آمیز مسرت بھی ہونے لگی تھی کہ میں نے اپنی اس پُرخطر مہم کے لیے سائیں داد جیسے آدمی کا بالکل ٹھیک انتخاب کیا تھا۔

کیونکہ میرے نزدیک یہ مہم بالکل ہی مختلف اور انوکھی طرز کی تھی۔ گھوڑا باڑی کا طویل اور ویران ساحلی علاقہ جو جاتی، کیٹی بندر اور کیماڑی تک محیط تھا اور پھر ان سے ذرا ہٹ کر میمر کے پُرخطر اور سیلے سیلے دلدلی جنگلات، جہاں انواع واقسام کے زہریلے کیڑے مکوڑے اور سانپ وغیرہ پائے جاتے تھے۔

قدرت میری مدد کررہی تھی۔ مہران خان کے گلے سے ایک پھندا ڈھیلا ہوتا تو دوسرا تیار ہوتا اور مجھے یقین تھا کہ اس بار بذاتِ خود مہران خان قانون کے نرغے میں آنے والا تھا اور اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

ذرا دیر بعد روشنی سی ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار اپنا سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند اپنی آب وتاب کے ساتھ نکلنے لگا تھا۔ کچھ بادلوں کی آوارہ ٹولیاں اس کے رخِ روشن پر آجاتی تھیں تو ذرا دیر کے لیے تاریکی چھا جاتی تھی۔ مجھے اب اپنے ساتھ چلتا ہوا سائیں داد کا ہیولا بھی نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بھی سر گھما کر میری طرف دیکھا تھا۔ ہم خاموشی سے اور بہت احتیاط کے ساتھ قدم آگے بڑھا رہے تھے۔

"شش..... رک جاؤ....." معاً تاریکی میں مجھے سائیں داد کی جھنجھلی ہوئی سرگوشی سنائی دی اور میں فوراً ٹھہر گیا۔

میرے نتھنوں سے اب کائی زدہ سی سیلی سیلی بو ٹکرانے لگی تھی۔ ہوا میں نمی کا تناسب بھی زیادہ محسوس ہورہا تھا۔

"ہوشیار! ہم خطرے کی حدود میں داخل ہوچکے ہیں۔" سائیں داد نے دوبارہ سرگوشی میں کہا۔

"ہوں! میں محتاط ہوں، کیا ادھر ہی رکنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تھوڑا جائزہ لینے دو اور تم بھی اپنے گردوپیش پر نگاہ رکھو ذرا۔" اس نے کہا۔

مجھے اطراف میں کوئی غیر معمولی شے دکھائی نہیں دی۔ تاہم پیروں کے نیچے کی زمین تھوڑی نرم اور کیچڑ زدہ سی محسوس ہوئی۔

"آگے بڑھو۔" کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور ہم قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگے۔ اب جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے، ہمارے اطراف میں گھنا جنگل بنتا جارہا تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ ہم منزلِ مقصود اور خطرات کے قریب پہنچ چکے تھے۔

اچانک ایک مقام پر میرا پاؤں پھسلا۔ غیر ارادی طور پر میں نے سائیں داد کا کاندھا تھامنے کی کوشش چاہی تھی کہ میرا ہاتھ ہوا ہوگیا اور میں گر پڑا۔ میرا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ میرے ہاتھ اور پیر کیچڑ میں لتھڑ گئے، میں نے سائیں داد کو دیکھنے کی کوشش چاہی تھی کہ دو ہاتھوں نے مجھے کندھوں سے تھام لیا۔

"اٹھو دوست! احتیاط سے۔" یہ سائیں داد تھا۔

"تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

اس کی آواز سن کر میں نے سکون کی سانس لی۔

"نہیں، ٹھیک ہوں میں تم کہاں سرک گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں چند پل کے لیے تمہارے پیچھے رک گیا تھا۔"

"کیوں؟"

"مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی ہمارے پیچھے دبے پاؤں چلا آرہا ہو۔" سائیں داد نے بتایا اور یکلخت مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی اُترتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"اسی لیے میں تھوڑی دیر کے لیے رک گیا تھا۔"

"کیا محسوس ہوا تھا تمہیں؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، شاید میرا وہم تھا، آگے بڑھتے رہو مگر ذرا سنبھل کر۔" وہ بولا۔

ہم گاڑھے اور موٹے پتوں والے جنگل میں داخل ہوچکے تھے اور ہمارے پیروں تلے کیچڑ کے علاوہ کہیں کہیں جمع شدہ پانی بھی آجاتا تھا۔ جنگل چھدرا سا ہی تھا۔ ہم شاید ساحل سے قریب اور متوازی چل رہے تھے۔ کیونکہ ہماری سماعتوں سے لہروں کا شور ٹکرا رہا تھا۔ اطراف میں گہری خاموشی تھی ماسوائے جھینگروں کی سائیں سائیں کے۔

سائیں داد میرے دائیں بازو پر چل رہا تھا۔ اچانک میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی سیلن زدہ جھاڑیوں میں کسی کی آہٹ سنی اور میں ٹھٹک کر رک گیا۔

"کیا ہوا؟" سائیں داد نے بھی رکتے ہوئے پوچھا۔

"اس طرف کوئی ہے۔" ابھی میں نے اسی طرف نظریں گاڑے رکھتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا کہ اچانک مذکورہ سمت سے دو انسانی ہیولے نمودار ہوئے اور ہم پر پل پڑے۔ ایک نے مجھ پر جست لگائی تھی۔ میں نے اس کے ایک ہاتھ میں کوئی چمکتی ہوئی شے دیکھی تھی۔

"چاقو۔" میرے ذہن میں ابھرا تھا مگر جب تک میں سنبھلتا وہ مجھ پر پل پڑا، تاہم میں نے اس کے چمکتے ہتھیار کے وار سے بھی بچنے کی کوشش چاہی تھی اور کرتے ہی اس نامعلوم حملہ آور نے مجھ سے فیصلہ کن وار کرنے کی غرض سے اپنا چاقو والا ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ میں اس کے نیچے سے ماہی بے آب کی طرح تڑپا، اس کا توازن بگڑا، چاقو والا ہاتھ بھی اس کا بہکا تو وہ میری گردن سے صرف ایک دو انچ کے فاصلے سے کیچڑ زدہ زمین میں گڑھ گیا۔ یوں حملہ آور کا سر ذرا جھک کر میرے قریب ہوا تو میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی زوردار ضرب سے اس کی ناک کی تو اضع کر ڈالی، وہ حلق کے بل چیخا، بلبلا کر وہ چاقو کا مجھ پر دوسرا وار کرسکتا تھا اسی لیے میں نے جھٹکے سے اسے خود سے دور پھینکا، میرے چہرے پر خون کے گرم چھینٹے محسوس ہوئے تھے، جو اس کی پھوٹی ہوئی ناک سے ہی نکلے ہوں گے۔

میں نے اس کے چاقو والے ہاتھ کو دبوچ لیا جو کیچڑ سے نکل کر فضا میں بلند ہونے لگا تھا۔ یہیں مجھے اس کے پیٹ پر ایک زوردار لات لگانے کا بھی موقع مل گیا۔ وہ دور جا پڑا مگر اس کا چاقو اندھیرے میں گر چکا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے سائیں داد کی گھٹی گھٹی چیخ کی آواز سنی۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ وہ دوسرے حملہ آور کی زد میں تھا اور میں اس کی مدد کو لپکنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں میں فولادی چال کی مخصوص "کلک" سنائی دی۔

میرے حملہ آور نے شاید کوئی آتشی ہتھیار نکال لیا تھا۔ میں بے بس سا ہوگیا۔ اندھیرا ابھی تھا چند انچ کے فاصلے سے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ کس طرف سے مجھے اپنے پستول کا نشانہ بنانے والا تھا، مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں نے اچھل کر دوسرے حملہ آور پر جست لگادی، یوں گویا میں نے ایک پنتھ دو کاج سے کام لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرا والا حملہ آور بوکھلا کر فائر کرنے سے باز رہے گا مگر اس نے پھر بھی شاید اندازے سے فائر کر ہی ڈالا تھا، گولی چلنے کی دھماکے دار آواز ابھری اور ساتھ ہی ایک انسانی کرب ناک چیخ بھی ابھری۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میرا خدشہ سائیں داد کی طرف چلا گیا۔ کہیں پہلے والے حملہ آور کی چلائی ہوئی گولی سائیں داد کو تو نہیں چاٹ گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے مجھے پتا چلا کہ وہ چیخ دوسرے حملہ آور کی تھی جو اپنے ہی ساتھی کی چلائی ہوئی اندھی گولی کا شکار ہوکر ایک طرف ڈھیر ہوگیا تھا۔ میری سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں اور سینے میں دل جیسے پنجرہ توڑ کر باہر آنے کے لیے زور زور سے دھڑکے جارہا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر پہلا والا حملہ آور سوزِ جنون میں آکر ہم پر تابڑ توڑ گولیاں برسانا شروع کردیتا اور شاید ایسا ہی ہوا بھی کیونکہ اسی لمحے میں نے آخر الذکر حملہ آور کے حلق سے وحشیانہ غراہٹیں اُبلتی سنیں اور ساتھ ہی اس کا پستول والا ہاتھ اٹھا، میں ابھی اس کی ہولناک فائرنگ سے بچنے کی تدبیر ہی کررہا تھا کہ تلے اوپر دو فائر ہوئے۔

"ٹھائیں..... ٹھائیں....." ساتھ ہی پہلا والا حملہ آور کریہہ ناک چیخ خارج کرکے دھپ سے کیچڑ زدہ زمین پر گرا اور ختم ہوگیا۔

"بہت برا ہوگیا یہ سب۔" سائیں داد نے ہانپتی ہوئی

سی آواز میں کہا۔ اس کے ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا۔ دو گولیاں اسی کے پستول نے اگلی تھیں۔

"جانے کون تھے یہ لوگ؟ اور اس طرح ہم پر پل پڑے تھے جیسے ہمیں دشمن کی حیثیت سے پہچان گئے ہوں۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں خود کلامیہ انداز میں بڑبڑا کر کہا۔

"یہاں موجود لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہی ہوتے ہیں، چلو آگے بڑھو، جلدی۔" سائیں داد بولا۔

"ٹھہرو! ان کی جیبوں کی تلاشی لو۔" میں نے کہا اور اپنے والے حملہ آور کی لاش کی طرف بڑھا جبکہ سائیں اپنے مردہ شکار کی طرف چلا گیا۔

دونوں کی جیبوں کی تلاشی لی گئی تو ایک کے پاس سے موبائل، پرس، رومال اور کوئی کارڈ ٹائپ سخت اور کڑک شے برآمد ہوئی۔ دو چھوٹی ٹارچیں بھی ملیں۔ یہ پینسل ٹارچیں تھیں۔ میں نے پینسل ٹارچ سے کارڈ پڑھنے کی کوشش چاہی اور چونک پڑا۔ یہ بندرگاہ پر کام کرنے والے ایمپلائی کا سروس کارڈ تھا اور جب میں نے نام پڑھا تو بری طرح چونک پڑا۔

"جہانگیر"۔

یہ نام اور یہ آدمی میرواد کا ہی تھا جو بن رائد کی لانچ "سی گوڈیز (سمندری دیوی) پر کام کرتا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میرواد کا ایک اور آدمی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی، سوچنے کی بات میرے نزدیک یہ تھی کہ میرواد کے آدمی یہاں چھپے ہوئے کیا کر رہے تھے؟ ان کے اچانک حملہ کرنے کا انداز یہی بتاتا تھا کہ یہ لوگ یہاں کسی کو بھی برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور مار کے ان کی لاشوں کو اسی دلدلی ویرانوں میں گاڑھ دیا کرتے تھے۔ میں نے سائیں داد کو جب یہ حقیقت بتائی تو وہ بولا۔

"ہمیں ان کی لاشیں گاڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیڑے مکوڑے خود ہی ان کی لاشیں چٹ کر جائیں گے لیکن ہمیں اب یہاں سے آگے نکل جانا چاہیے۔"

ہم آگے بڑھ گئے۔ مچھروں کی بہتات نے ہمیں ستانا شروع کر دیا تھا۔ کئی جگہوں پر تو سانپوں کی پھنکاریں بھی سنائی دی تھیں۔ سائیں داد اور میں ان سے بچتے بچاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، ایک جگہ پر تاریکی زیادہ تھی۔ سائیں داد اور میں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"منزل اب زیادہ دور نہیں رہی دوست! محتاط رہنا۔" سائیں داد نے سرگوشی کی اور میرے اندر کا جوش سوا ہونے لگا۔

ہم محتاط روی سے چلتے رہے، دفعتاً ہی سائیں داد نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں پہلے یہی سمجھا کہ ایسا اس نے خود ہی کیا ہوگا، اگرچہ مجھے اس کی اس حرکت پر حیرت ہوئی تھی کہ ابھی تو تاریکی چھٹی بھی نہیں تھی۔ تاہم میں رکا نہیں اور یہی سمجھتا رہا کہ سائیں داد بھی میرے ساتھ چل رہا ہے، جلد ہی تاریکی ذرا چھٹی، شاید چاند کے آگے سے کوئی آوارہ بدلی ہٹ گئی تھی، میں بری طرح چونک پڑا۔ سائیں داد غائب تھا۔

اس پُرہول اور خطرناک دلدلی جنگل میں، سائیں داد کے بغیر تو میں ایک قدم بھی چلنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ اب تک وہی تھا جو مجھے نسبتاً محفوظ راستوں سے منزل کی طرف لیے جا رہا تھا جبکہ میں ان پُرخطر راستوں سے نابلد تھا۔ بقول سائیں داد کے ہی اگر کوئی یہاں ایک بار بھٹک جاتا تو کوئی نہ کوئی اندھی دلدل اس کا مقدر ہی ہوتی۔ میں اب خود کو سائیں داد کے بغیر بالکل ہی اکیلا سمجھنے لگا جیسے کسی اندھے کو جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہو۔

"سائیں داو..... سائیں داو!"

میں نے رک کر پہلے ہولے ہولے اسے آوازیں دیں پھر تھوڑا تیز آواز میں پکارا۔ "سائیں داو!"

دفعتاً پاس کی سیاہ زدہ جھاڑیوں میں سے کسی ہیولے کو حرکت کرتے دیکھا، چھٹکی ہوئی مدھم مدھم سی چاندنی میں وہ کوئی سبزی مائل رنگت کا ہیولا تھا جو ایک ذرا سی جھلک دکھا کر نہ جانے کس طرف کی جھاڑیوں کے پیچھے جا دبکا تھا۔

"سبز آدمی!"

اس پُراسرار ہیولے کی سبز رنگ والی جھلک دیکھ کر یکلخت میرے ذہن میں یہ ابھرا تھا اور پھر تو جیسے میں سرتاپا لرز گیا۔ مجھے خود پر دلیری یا بہادری کا کوئی دعویٰ نہ تھا مگر یہاں اس وقت جس ہیبت ناک ماحول میں، میں شکار تھا ایسے حالات میں تو اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو کر رہ جائے۔ میرا جی چاہا کہ میں دیوانہ وار دوڑتا ہوا اس منحوس دلدلی ویرانے سے نکل جاؤں مگر اب تو یہ بھی کرنا میرے لیے شاید ممکن نہ رہا تھا۔ سائیں داد کے بغیر آگے بڑھنا یا پیچھے پلٹنا بھی میرے لیے ممکن نہ رہا تھا۔

دفعتاً مجھے عقب سے ایک زبردست ٹھوکر لگی۔ دہشت انگیزی کے باعث میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ ٹھوکر زبردست تھی، جس نے مجھے زمین سے تقریباً ایک ڈیڑھ فٹ اچھال کر پرے پھینکا۔ میں جھپاک سے ایک کیچڑ زدہ دلدل میں جا گرا، شکر رہا کہ دلدل زیادہ گہری نہیں تھی۔ میں گھٹنوں

تک اس میں کھڑا ہو گیا تھا۔ میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔

بڑی خطرناک اور پراسرار صورتِ حال تھی میرے ساتھ۔ سبز آدمی جو محض ایک مفروضے کے سوا کچھ نہ تھا، میں آج اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا بلکہ میری مڈبھیڑ بھی ہو گئی تھی اس کے ساتھ۔ میں نے دلدلی کیچڑ کی چیخوں سے اپنی آنکھیں بچانے کی کوشش چاہتے ہوئے مدھم چاندنی میں اس طرف دیکھا تو اس خبیث کو ایک بار پھر حملے کے لیے پر تولتے پایا۔ وہ بھی مجھے بچھاڑنے کے لیے گھٹنوں تک دلدل میں اتر آیا تھا۔

مجھے ایک بات پر ضرور اچنبھا ہوا تھا کہ بقول سائیں داد کے "سبز آدمی" بلاوجہ حملہ نہیں کرتے ہیں، البتہ ان کی عمل داری میں کسی کو برداشت نہیں کرتے۔ سائیں داو نجانے کہاں یک دم غائب ہو گیا تھا، جبکہ میرا اغلب خیال یہی تھا کہ اسے بھی کسی سبز انسان نے ہی بچھاڑ ڈالا تھا، اس وقت مجھے اپنی فکر لاحق تھی کیونکہ وہ سبز آدمی اپنے حلق سے غراہٹ سے مشابہ آوازیں خارج کرتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا مجھے اور اک ہو گیا کہ ڈرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا، زیادہ بہتر تھا کہ اس موذی کا مقابلہ کیا جاتا۔

جب وہ میرے قدرے قریب آیا تو میں نے آنکھیں سکیڑ کر بغور اس کی "ہیبت" کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی تو باوی النظر میں مجھے وہ عام سا ہی آدمی دکھائی دیا۔ پھر مجھے زیادہ غور کرنے کا موقع نہ ملا۔

اس نے بڑی بلاخیز پھرتی کے ساتھ مجھ پر جمپ لگا دی۔ وہ ان کم گہری دلدلوں میں اچھل کود کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سے تو کھڑا ہونا بھی دوبھر ہو رہا تھا، نتیجتاً اس نے جیسے ہی مجھ پر حملہ کیا، میں اپنے دفاع میں جھکائی دے کر نکلا تو پھر گر پڑا، میں کیچڑ میں اب سرتاپا آلودہ ہو چکا تھا۔

اس کم بخت نے میری گردن دبوچ لی، اس کی گرفت سے مجھے لگا جیسے میری گردن کسی آہنی شکنجے میں آ گئی ہو، میں نے ایک لمحہ کے لیے خود کو بے بس پایا مگر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اگر مرنا ہی تھا تو مقابلہ کیوں نہ کیا جائے۔ ایک موقع تاک کر میں نے اس کے پیٹ میں گھونسا رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے ابھرتی چیخ نے مجھے کم از کم اتنا تو ضرور باور کرا دیا تھا کہ وہ کوئی مافوق الفطرت شے نہیں تھا، اس نے میری ہمت کو سوا کر ڈالا مگر اس نے میری گردن نہ چھوڑی۔ تاہم سنبھلتے ہی میں نے دوسرا گھونسا اس کے چہرے پر رسید کرنا چاہا تھا کہ اس نے مجھے دھکا دے دیا۔ میں کیچڑ میں گرا، وہ میرے اوپر آ رہا۔ میں صرف ہاتھوں سے ہی بیک وقت اپنا دفاع اور حملہ ہی کرنے کی سکت رکھے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے گرایا اور میرے سینے پر سوار ہونے کی کوشش چاہی۔

ایک ہولناک خیال سے میں لرز اٹھا۔ یہ بدبخت مجھے کیچڑ میں حبسِ دم کر کے مار ڈالنا چاہتا تھا کیونکہ سینے پر سوار ہوتے ہی میں دلدل کی کیچڑ میں ڈوب گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اذیت ناک موت کے تصور سے ہی میں لرز اٹھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میری رگ و پے میں جان بچانے کا جذبہ فزوں تر ہو کے جنون خیزی میں بدلا اور میں نے اپنے دونوں گھٹنے کہنیاں اور اس کے سینے پر پیر جما کر اسے اپنے اوپر سے دور اچھال دیا۔

اتنی کامیابی حاصل کرتے ہوئے میں نے سب سے پہلے اس منحوس دلدل سے نکلنے پر توجہ دی مگر میرا چہرہ اور کیچڑ آلودہ ہو گیا تھا، ہاتھ تو پہلے ہی لتھڑے ہوئے تھے، چہرہ اور آنکھیں پونچھتا تو اور زیادہ لتھڑنے لگتا اب تو آنکھوں میں بھی شدید جلن ہونے لگی تھی۔ میں اسی طرح ہی آنکھیں پٹپٹا کر دیکھنے کی سعی کرتا ہوا بمشکل کنارے کی طرف جانے لگا۔ بڑی ہی ناگفتہ بہ اور سنگین صورتِ حال تھی۔ بس ایک کوشش تھی جو اللہ کی مدد کے آسرے پر میں کیے جا رہا تھا۔

میں چند منٹوں میں دو ایک قدم ہی اٹھا پایا تھا کہ میں نے اسی سبز انسان کو کیچڑ سے کسی "سوائپ تھنگ" کی طرح دوبارہ ابھرتے دیکھا۔ اس بار میں نے دیکھا اس کے ایک ہاتھ میں کوئی تیز اور تیکھا سا سرکنڈے کا ٹکڑا تھا ہوا تھا۔ جانے اس نے کہاں سے یہ حاصل کیا تھا، وہ خاصا غضب ناک دکھائی دے رہا تھا ابھی یہ سب میں دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک اور منظر میں نے دیکھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ دائیں کنارے سے میں نے اسی جیسے دو اور سبز انسانوں کو دلدل کی کیچڑ میں اترتے دیکھا، ان کے ہاتھوں میں بھی اسی طرح کے تیکھے اور نوکیلے سرکنڈوں کے ٹکڑے تھمے ہوئے تھے۔

چھٹکی ہوئی چاندنی میں ان تینوں کو موت کی صورت اپنی طرف بڑھتا پا کر میری رہی سہی ہمت بھی اب جیسے جواب دینے لگی اور مجھے اپنی یقینی اور اذیت ناک موت محض چند ہی فاصلے سے اپنی جانب سرکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

(جاری ہے)

مرگ برگ

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم
ہم حسد، بدگمانیاں پالتے ہیں۔ دوسروں کے حقوق غضب کرتے ہیں، ہر وہ کام کرتے ہیں جن کا انجام جہنم ہے اور پھر روتے بھی ہیں بلکتے بھی کہ ہم پر یہ افتاد کیوں ٹوٹی۔ بے بسی کی دہائیاں دیتے نہیں تھکتے۔ گویا اپنی مرگ برگ کے ذمے دار ہم خود ہیں اسی نکتے نے اس سچ بیانی کو جنم دیا ہے۔

بشریٰ شوکت
(لاہور)

لبیک اللھم لبیک
لبیک لا شریک لک لبیک
ان الحمد والنعمت
لک والملک

لاشریک لک

ان روح پرور کلمات کا ورد جوں جوں بلند ہو رہا تھا روح پر جمی کثافت یکا یک اکھڑنے لگی دل پر لگے قفل زوردار آواز سے ٹوٹنے لگے اور ذہن پر طاری دنیاوی دھندوں کی فکریں اپنے وجود پر شرمسار ہونے لگیں۔

میرا سراپا اس وقت زبان تھا اور اس کے روئیں روئیں سے ایک ہی صدا بلند ہو رہی تھی

''حاضر ہوں، اے اللہ!! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔''

میرا وجود موم کی طرح پگھل رہا تھا۔ آنکھوں میں چناب، راوی اور بیاس کا پانی یک مشت امڈ آیا۔ آنسوؤں کی چادر بار بار اردگرد کے منظر دھندلا دیتی۔ آس پاس موجود لوگوں کا کوئی ہوش تھا نہ ہی پروا۔ دل و دماغ پر تو اس عظیم الشان 'منظر' نے محبت نما ہیبت طاری کر رکھی تھی۔

کہتے ہیں ہیبت نفرت کا دوسرا عکس ہوتی ہے لیکن یہ اپنے طرز کی انوکھی ہی ہیبت تھی جو پور پور میں محبت کے سوتے جاری کر دیتی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی پیشانی ٹیک دی۔

''تُو سب کچھ جانتا ہے میرے مولا! تجھ سے میری تڑپ پوشیدہ ہے نہ ہی حالِ دل، تُو البصیر ہے، میری دعائیں بھی تُو ہی سنے گا، تُو السمیع ہے۔ میری ہر مشکل تیرے سامنے ہے، تو سب کچھ جانتا ہے، تُو ہی العلیم ہے۔ میری مشکل کشائی کر دے۔ میری دعاؤں کو قبولیت بخش دے، میرا ادھورا وجود کامل کر دے، آج تک تُو نے جو عطا کیا میں نے شکر ادا کیا۔ تیری ہر نعمت کی بساط بھر قدر کی۔ اب یہ آزمائش بھی ختم کر دے۔ میں ایک کمزور بندی ہوں۔ یہ دکھ سہار نہیں سکتی۔ تُو نے ہمیشہ میری سنی۔ آج بھی سن لے۔''

میرا رواں رواں فریاد کر رہا تھا۔ جانے کتنی ہی دیر ٹھنڈے فرش پر پیشانی ٹکائے انہی مناجات میں گڑگڑاتی رہی۔ زمان و مکان کی حدود سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ فرش کی ٹھنڈک اب پورے وجود میں سرایت ہوتی جا رہی تھی۔ مسلسل گریہ زاری نے پپوٹوں پر بھاری پن پیدا کر دیا اور اعصاب پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

میں نے ایک ستون سے کمر ٹکائی اور آنکھیں ایک بار 'خانہ خدا' پر جما دیں۔ یہ انوکھا اور حسین منظر میں اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے ہی نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسی پل کسی نے میرے کندھے پر نرمی سے ہاتھ دھرا۔

''چلیں!'' ایک مانوس آواز سماعت میں پڑی۔

''ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ میں کچھ دیر مزید رکنا چاہتی ہوں۔''

''فلائٹ کا وقت نہ نکل جائے۔'' انہوں نے اصرار کیا۔

"یہاں میری جان ہی نہ نکل جائے۔"

"مایوس کیوں ہوتی ہو؟"

"آج ہی تو مایوسی کے آسیب نے میرے وجود کو رہائی دی ہے۔" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تو پھر چلنے سے انکار کیوں؟ اللہ نے چاہا تو اگلے سال بھی یہاں حاضری دیں گے۔"

"کل کس نے دیکھا ہے؟"

"ضد چھوڑ دو۔" انہوں نے ذرا سختی سے کہا۔

"ضد نہیں مان بھری آس ہے۔ صدیوں پہلے یہاں اسی سرزمین پر ایک ماں نے تڑپ کر اپنی اولاد کے لیے بہتری مانگی تھی۔ ایک شیر خوار نے ایڑیاں رگڑیں تو اس کے لیے رہتی دنیا تک پانی کا چشمہ جاری ہوگیا۔"

"ہم تو ان کے قدموں کی دھول بھی نہیں۔"

"ہاں! بالکل بھی نہیں وہ عرش ہم فرش، وہ پاک ہم خاک۔" میں نے جذب کے عالم میں کہا۔

"تو پھر یہ ضد کیسی؟" وہ مصر ہوئے۔

"یہ ضد نہیں ہے شوکت! مان ہے۔ آس ہے، جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ آج کچھ انہونی ہوگی۔ اس مقدس سرزمین پر آج ہمارا آخری دن ہے اور میرا دل بچوں کی طرح مچل مچل کر کہہ رہا ہے کہ میری آرزو پوری ہونے کا کوئی عندیہ مل جائے۔ امید کا کوئی جگنو مل جائے تو واپسی کا سفر آسان ہوجائے گا۔"

"اچھی بات ہے، تمہاری یہ اُمید اب مجھے بھی حوصلہ دینے لگی ہے۔ میں چند ضروری کام نمٹا آؤں پھر چلتے ہیں۔" وہ دھیرے سے کہہ کر ایک جانب بڑھ گئے۔

میری نظریں اب بھی اسی سمت اٹھی تھیں اور ہونٹوں پر ایک ہی کلمہ جاری تھا:

"بے شک تُو ہی تعریف کے قابل ہے۔ سب نعمتیں تیری ہی ہیں، بادشاہت بھی بس تیری ہے، تیرا کوئی ہمسر نہیں۔"

کتنے ہی لمحے بیت گئے۔ مجھے اپنی دائیں جانب ایک بھینی بھینی سی مہک کا احساس ہوا۔ بے ساختہ نظر گھمائی تو حیران رہ گئی۔ وہاں اونچا، لمبے وجود کا مالک ایک شخص بیٹھا تھا۔ رنگت میں ایسی سرخی تھی جو میں نے پہلے کبھی کہیں دیکھی ہی نہ تھی۔ داڑھی بے ترتیب اور بالوں میں دھول جمی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں سرخی جھلکتی تھی لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ اس سرخی سے دل موم ہونے لگتا۔ کمزور سے چہرے پر وقار اور دبدبہ ایسا تھا کہ مقابل کے لیے نظر جمائے رکھنا مشکل ہونے لگتا۔ میرا دل بے اختیار زور سے دھڑک اٹھا۔

"جب انسان تخلیق نہیں ہوا تھا تو فرشتے آسمانوں پر رب کی حمد و ثناء کرتے تھے۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ پھر ایک روز رب نے حکم دیا کہ کھڑکھڑاتی مٹی سے ایک پتلا تخلیق کرنا ہے اور اسے زندگی بخشنی ہے۔ پھر جانتی ہے کیا ہوا تھا؟" انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

بشرے کے برعکس ان کی آواز میں بے پناہ گھن گرج تھی بلکہ آواز اور شخصیت تو کوئی لگا کھاتی ہی نہ تھیں۔

"ظاہر پہ مت جانا دان لڑکی!! یہ پل بہت قیمتی ہیں۔ میرے سوال کا جواب دے۔"

"جی ہاں! میں جانتی ہوں۔ فرشتے بہت حیران ہوئے تھے۔" میری آواز پھنسی پھنسی تھی۔

"وہ کیوں حیران ہوئے تھے؟" ایک اور سوال آیا۔

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کمرۂ امتحان میں بیٹھی ہوں اور کسی سخت گیر استاد کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"انہوں نے کہا تھا کہ کیا تو ایسی مخلوق بنانا چاہتا ہے جو زمین پہ فساد برپا کرے گی اور خون بہائے گی جبکہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری ہی تعریف کرتے ہیں۔"

"ہاں! جانتی ہے۔ تو کافی جانتی ہے۔" انہوں نے اپنا سر دائیں بائیں ایک خاص انداز میں ہلایا۔ "آدمؑ کو سجدہ سے انکار کرنے والے نے کیا دعویٰ کیا تھا بھلا؟" ایک اور سوال آیا۔

"وہ کہتا تھا میں قیامت تک تیرے بندوں کو بھٹکاتا رہوں گا۔"

"بھٹکانے کا مطلب سمجھتی ہے تُو؟"

"جی! اپنے علم کے مطابق بساط بھر۔"

"بتاتی جا!"

"ابلیس نے انسان کو ہدایت کے رستے سے دور کرنے کا عہد کیا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ انسان نافرمانی کی روش اختیار کرتا رہے۔" میں نے محتاط الفاظ میں جواب دیا۔

"جب انسان کی تخلیق کے لیے اللہ کے حکم سے مٹی گوندھی گئی تھی تو اس پر چالیس روز پانی برسایا گیا تھا۔ کیا تجھے علم ہے؟" ان کے استفسار پر میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ ایک برسات تھی۔ انتالیس دن آزمائشوں اور دکھوں کی بارش ہوئی اور ایک روز خوشیوں نے اس کی مٹی کو

بھگویا۔ جانتی ہے کیوں؟"

میرا جواب ایک بار پھر نفی میں تھا۔

"انسان فطری طور پر بڑا بے صبرا اور سرکش ہے۔ اس کی طنابیں ہمیشہ کھینچ کر رکھنی پڑتی ہیں ورنہ کسی اڑیل گھوڑے کی طرح سرپٹ اپنے نفس کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا ہے۔ دکھ آتا ہے تو رب کے سامنے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، تڑپتا ہے، مچلتا ہے۔ بلک بلک کر اس کی ربوبیت کو اپنی بے بسی کے ٹکڑے سنا کر رحم اور بھیک طلب کرتا ہے لیکن جب اپنا مطلوبہ گوہر مل جائے تو سب بھول جاتا ہے۔ مستی اور کیف میں مبتلا ہوجاتا ہے۔" ان کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ میرا دل جھنجوڑ رہا تھا۔

"آپ نے درست فرمایا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"خاموش رہ نادان! میں درست فرمانے والا کون ہوتا ہوں؟ یہ سب تو چودہ صدیاں پہلے ہی فرما دیا گیا تھا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واضح رستہ بتا دیا تھا۔"

"بے شک، بے شک۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ہر نعمت کی ایک آزمائش ہوتی ہے۔ مال بھی فتنہ ہے، اولاد بھی فتنہ ہے۔ انسان ہر طرح آزمایا جاتا ہے۔ مال، بھوک، افلاس، اولاد سب آزمائشیں لاتے ہیں۔ ہر نعمت کے ساتھ ابلیس اپنا وعدہ نبھانے کے لیے ساتھ چلا آتا ہے۔ کیا تیری ذات اس آزمائش کی اہل ہوگی؟"

"میرا وجود ایک بے ثمر درخت ہے۔ میں سایہ دار بننا چاہتی ہوں۔ اولاد کی طلبگار ہوں۔ اب تھک چکی ہوں۔"

"اس کے ہاں دیر ہوتی ہے مگر اندھیر نہیں۔ تیری مراد بھی ضرور پوری ہوگی لیکن ہر نعمت کی آزمائش بھی ہوا کرتی ہے۔"

"میں پروردگار کے دیئے گئے حوصلہ اور ہمت سے اس آزمائش میں پوری اترنے کی کوشش کروں گی۔" میرا لہجہ کانپا۔

"تیرے نصیب میں اولاد کی خوشی موجود ہے۔ اللہ پاک تجھے گوہر سے نوازے گا لیکن حالات بڑے کٹھن ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ تیرے ساتھ رہنے سے انکار کردے گا۔" ان کے الفاظ میں بیک وقت زندگی کی نوید اور موت کی سفاکی نے مجھے ساکت کردیا۔

"وہ میرے ساتھ رہنے سے انکار کیوں کردے گا؟" میں نے گڑگڑا کر پوچھا۔

"گوہر کی حفاظت کرنا ورنہ وہ تیرے ساتھ نہیں رہ

اردو کے وہ چند ادیب جنہوں نے خودکشی کی

شمس آغا (1922-1945)
شکیب جلالی (1933-1966)
شبیر شاہد (1949-1974)
سارا شگفتہ (1954-1984)
انس معین (1959-1986)
ثروت حسین (1949-1996)

اردو کے وہ ادیب جن پر اقدام (الزام) خودکشی ہے

میراجی (1912-1949)
سعادت حسن منٹو (1912-1949)
علاؤالدین کلیم (1922-1965)
مصطفیٰ زیدی (1930-1970)
صغیر ملال (1950-1992)
جمیلہ شاہین (1930-1997)
جون ایلیا (1935-2002)

☆☆

سلک اسمتھ: وجے لکشمی ویدلاپتی جو سلک اسمتھ کے نام سے مشہور ہوئی اسے ساؤتھ انڈیا کی فلم انڈسٹری میں کامیابی کی ضمانت کہا جاتا ہے۔ وہ 2 دسمبر 1960ء میں پیدا ہوئی۔ اس نے فلمی سفر کا آغاز سائیڈ رول سے کیا۔ 1979ء میں ٹمل قائم ویدی چکرم میں وہ سلک کے نام سے آئی جسے فلم بینوں نے بہت پسند کیا۔

☆☆

نفیسہ جوزف 28 مارچ 1978ء کو بنگلور، کرناٹک انڈیا میں پیدا ہوئی۔ والد نرمل جوزف کرناٹکی سیرن کرسچن تھے اور ماں اوشا جوزف بنگالی ہندو تھی۔ خاندانی تعلق رابندر ناتھ ٹیگور سے تھا۔ شرمیلا ٹیگور ان کی چچا زاد تھیں جنہوں نے بھوپال کے نواب پٹودی سے شادی کی تھی۔ نفیسہ بشپ کاٹن گرلز اسکول اور سینٹ جوزف کالج بنگلور سے تعلیم حاصل کی۔ وہ کیتھولک کرسچن تھی لیکن ایک ددھیالی رشتے دار جو مسلمان تھیں ان کے رکھے ہوئے نام نفیسہ کو اپنے نام کا حصہ بنالیا۔

☆☆

پائے گا۔" انہوں نے میری بات ان سنی کردی۔

"میں اسے بہت محبت دوں گی۔ وہ اس مقدس سرزمین کا تحفہ ہوگا۔ میں تو ہمیشہ اس نعمت کا حق ادا کروں گی۔" میں ٹرانس کے عالم میں کہتی چلی گئی۔

"وقت سب بتا دے گا۔ ابلیس اپنا عہد پورا کرنا نہیں بھولتا لیکن یہ کم بخت انسان اپنے سبھی عہد بھول جاتا ہے۔ اس کی ترجیحات کچھ اور بن جاتی ہیں۔ انسان کی اوقات ہی کیا ہے؟ بدبودار پانی اور گارا ملی مٹی سے بنا ہے اور کائنات کو اپنی مٹھی میں کرنے کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ بے شک انسان خسارہ میں ہے۔ تُو گوہر کی حفاظت کرنا۔" وہ اپنی ہی دھن میں کہتے چلے گئے۔

میری بصارت اور سماعت میں کوئی ربط باقی نہ رہا۔ ان کے کہے الفاظ سنائی تو دے رہے تھے لیکن ذہن بس ایک ہی نقطہ پر منجمد ہوگیا تھا "گوہر" مجھے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا یقین ہوگیا۔ ساعتوں کو اب کسی اور صدا کی آرزو نہ رہی۔ میری آنکھیں سرود کے عالم میں بند ہورہی تھیں۔ اعصاب ہلکے پھلکے ہوئے تو غنودگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں وہیں ستون سے ٹیک لگائے ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔

☆.....☆

میں اس وقت کسی صحرا میں موجود تھی۔ سر پر سورج کی تپش دماغ میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح سرایت کررہی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ قدم وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہورہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بے دم ہوکر یہیں گر جاؤں گی لیکن پھر مجھے اپنی انگلی پر کسی لمس کا احساس ہوا۔ میرا دایاں ہاتھ کسی کی گرفت میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی منظر بالکل تبدیل ہوگیا اور نخلستان کی ٹھنڈک تن بدن میں محسوس ہونے لگی۔

میں اس بھرپور منظر کی معنویت سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی کہ ایک صدا نے دھیان کی کڑیاں توڑ دیں؛

"بشریٰ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" شوکت کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

میری آنکھ کھل گئی۔ منظر وہی تھا لیکن اب کچھ دیر پہلے کی یاسیت اور افسردگی ختم ہوچکی تھی۔ ہر چیز بہت نکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"بتایا تو تھا تمہیں کہ چند ضروری کام نمٹانے ہیں۔ یہاں میرے کئی واقف کار رہتے ہیں جو اپنی فیملی کو تحائف وغیرہ بھیجنے کے لیے بااعتماد افراد کا کوچ یا عمرے پر آمد کا انتظار کرتے ہیں۔ میں توفیق صاحب کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے بیٹی کی شادی کے لیے کچھ زیورات بنوا کر اہلیہ کو بھیجنے تھے۔" وہ خلاف توقع تفصیل بتانے لگے۔ غالباً میرا دھیان ہٹا کر معمولات زندگی کی طرف لانا چاہتے تھے۔

"اللہ پاک اسے پہننا نصیب کرے اور اس کی قسمت نیک کرے۔" میں نے صدق دل سے دعا کی۔

"آمین..... لیکن تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

"جی ہاں! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم اس قدر گہری نیند میں تھیں اور جانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھیں کہ مجھے واقعی فکر ہونے لگی۔" ان کی محبت اور توجہ پر مجھے ہمیشہ ہی سے بہت مان تھا۔ میرے تسلی دینے پر وہ کچھ مطمئن ہوگئے۔

میں انہیں اپنے ساتھ ہونے والے اس عجیب وغریب سانحہ سے باخبر کرنا چاہتی تھی لیکن ابھی وقت موزوں نہیں تھا۔ میں نے الوداعی نگاہ ان روح پرور مناظر پر ڈالی اور آنکھیں بند کرکے ایک جذب کے عالم میں زیرلب کہا؛

"سب بادشاہت تیری ہے اور سب تعریفیں بھی تیری ہیں۔"

☆.....☆

واپسی کا سفر اب مشکل نہیں تھا۔ آس کا ایک غیر یقینی جگنو میری تاریک راہیں روشن کرنے کے لیے مٹھی میں بند تھا۔ جہاز میں وہی معمول کے مناظر تھے۔ حجاز کی سرزمین سے جدا ہونے اور ایک بار پھر دنیاوی دھندوں میں کوچ کرنے کے لیے بہت حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے اردگرد اپنی نشستوں پر براجمان مرد وزن بھی انہی کیفیات میں مبتلا تھے۔ شوکت جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی نیند کی وادی میں کھوگئے۔ وہ سفر کے عادی تھے اور ہر قدم کے ماحول میں نیند پوری کرلیا کرتے تھے۔ میں نے ایک پیار بھری نظر ان کے خوابیدہ چہرے پر ڈالی۔ وہ آج بھی ہشاش بشاش اور اپنی عمر سے کہیں چھوٹے دکھائی دیتے تھے۔

ہماری شادی کو پانچ سال ہوچکے تھے۔ شادی کے وقت شوکت پچیس سال کے تھے۔ وہ مجھ سے چار سال بڑے تھے۔ وہ صرف دو ہی بھائی تھے۔ ان کی والدہ کسی وچولن کے توسط ہمارے گھر آئی تھیں۔ وہ پرانے وقتوں کی سیدھی سادی سی خاتون تھیں۔ سر پر کروشیہ کی جھالر والا دوپٹا لیے ان کا جھریوں بھرا چہرہ ممتا اور شفقت کا بھرپور آئینہ تھا۔ سیاہ فریم کی

مستطیل سی عینک کے عقب سے جھانکتی آنکھوں میں ہر وقت ایک نمی کی کیفیت رہتی تھی۔

"میرا بیٹا دس جماعتیں پاس ہے۔ ادھر بازار میں ہی ہماری کپڑے کی دکان ہے۔ بڑی اچھی گزر رہی ہے۔" انہوں نے سادگی سے بتایا۔

"پیسا تھوڑا ہو یا بہت، حلال رزق کا ہونا چاہیے بس۔ ہماری تو یہی آرزو ہے۔" میری والدہ نے جواب دیا۔

"میں نے شوکے کو بھی یہی چیز سمجھائی تھی کہ نصیب اور کوشش سے زیادہ کبھی کچھ نہیں مل سکتا۔ بڑا ہی بیبا اور سمجھدار بچہ ہے۔ ہیرا پتر ہے میرا۔ میں نے وچولن کو ایک ہی شرط رکھی تھی کہ لڑکی پڑھی لکھی ہونی چاہیے۔ شوکا کہتا ہے کہ ماں ہی بچے کا پہلا اسکول ہوتی ہے۔ اب ہمارا وقت تو اور تھا۔ ماں باپ نے کبھی اسکول کا منہ دیکھنے ہی نہ دیا لیکن اب تعلیم بہت ضروری ہے۔"

"میں آپ کی بات سے بالکل متفق ہوں بہن سرداراں!" امی کا انداز بتاتا تھا کہ وہ انہیں پسندیدگی کا درجہ دے چکی ہیں۔

حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو مجھے بھی ان میں کوئی برائی نظر نہیں آئی تھی اور ایماندارانہ تجزیہ کروں تو میرے پاس انتخاب کی کوئی آپشن ہی نہیں تھی۔ ہم سفید پوش لوگ تھے جن کی ساری زندگی چادر اور پاؤں کی کشمکش میں گزر جاتی ہے۔ غربت کے علاوہ ہمارے یہاں بیٹیاں بھی وافر مقدار میں تھیں۔ ہم سات بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی باجی اور میری عمر میں سولہ سال کا فرق تھا۔ میں سب سے چھوٹی تھی۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی۔ پڑھائی میں کافی ہوشیار تھی اس لیے سرکاری اسکول اور کالج میں پڑھائی کرکے گریجویٹ ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

مجھے کتابوں کا بھی بہت شغف تھا۔ کالج کی لائبریری سے ادھار لیے گئے ناولز اور شاعری کی کتابوں نے جہاں تخیل بہت زرخیز کردیا تھا وہیں دوسری جانب خوابوں میں رہنے کی بجائے عملی زندگی گذارنے کے طور طریقے بھی سکھا دیئے۔ میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح کسی شہزادہ گلفام یا اپنی خوبصورتی کی بناء پر کسی امیر کبیر انسان کو دام الفت میں پھنسانے کی کوشش میں ہلکان ہوکر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے پڑھائی مکمل ہونے کے بعد پہلے تو گھر میں چھوٹی موٹی ٹیوشنز پڑھانا شروع کردیں۔ پھر اپنے وسیع مطالعہ کو استعمال میں لاتے ہوئے لکھنے لکھانے کا مشغلہ جاری کردیا۔ ٹیوشن میں پڑھنے والے کسی بھی بچے کے توسط تازہ غزل یا چھوٹی موٹی کہانی بذریعہ ڈاک ارسال کرنا مشکل نہ تھا۔ اس سلسلہ میں جوابی خط وکتابت کے لیے کالج ہی کی ایک سہیلی کا پتا کام آرہا تھا۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش تھی۔ قدرت نے مجھے ہر چیز سے نوازا تھا۔ محبت کرنے والے والدین، تعلیم، شعور، لکھنے کی صلاحیت اور اب گھر بیٹھے شوکت حسین جیسے مالی آسودہ شخص کا رشتہ مل جانا خوش نصیبی کی انتہا نہیں تو اور کیا تھا؟

ان کی والدہ کے مان بھرے اصرار پر امی نے رسمی طور پر کچھ دن سوچنے کی مہلت لی اور پھر چھ ماہ بعد ہی ہماری شادی ہوگئی۔

☆.....☆

شوکت کی والدہ نے شادی پر سبھی ارمان پورے کیے۔ وہ روایتی عورتوں کے برعکس تھیں۔ بہو کی آمد اور متوقع دخل اندازی کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا تاہم ایک بات میرے لیے خاصی حیران کن تھی کہ ان کے چھوٹے بھائی سے عمر کا فرق بہت زیادہ تھا۔ احمد ان سے اٹھارہ سال چھوٹا تھا۔ میری یہ الجھن بھی ساس نے ایک روز خود ہی ختم کردی۔

"شوکت کے ابا ہم لوگوں سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ دوسری عورتوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی تھے۔"

"ماں جی! آپ نے انہیں کبھی منع نہیں کیا۔"

"نہ پتر! مرد سے مقابلہ کرنے والی عورت بڑی نادان ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس سے جیت نہیں سکتی اور دوسری صورت میں اپنی عزت ہمیشہ کے لیے اس کے سامنے ہار دیتی ہے۔ تو مجھ ان پڑھ سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ تو جانتی ہے کہ دولت کے بغیر تو رہا جاسکتا ہے لیکن عزت کے بغیر عورت ایک لمحہ نہیں رہ سکتی۔"

"تو پھر آپ نے کیا کیا ماں جی؟"

"میں نے صبر کیا، شکر کیا اور اپنے لیے حوصلہ کی دعائیں مانگیں۔ ہم ماں پتر نے بڑا کڑا وقت دیکھا اور پھر وہ ہمارے پاس لوٹ آیا۔ میرے صبر کا سوہنے رب نے بڑا اچھا صلہ دیا۔" وہ ہر معاملہ میں انکساری سے کام لیتی تھیں۔

شوکت مزاجاً برعکس تھے۔ زندگی میں باپ کے حیات ہونے کے باوجود برداشت کرنے والی تنگی ترشی نے انہیں کافی حد تک مادہ پرست بنا دیا تھا۔ اپنی والدہ کی طرح مذہب کی طرف رجحان بھی تھا لیکن دنیاوی مال ومتاع کی طلب بھی موجود تھی۔ وہ نمود ونمائش کے قائل تھے۔ ان کا نظریہ یہی تھا

کہ انکساری کو فی الوقت انسانی کردار کی کمزوری تصور کیا جاتا ہے۔ اگر وسائل موجود ہیں تو ان کا بھرپور اظہار اور نمائش بھی ضروری ہوتی ہے۔

"یہ وہ لوگ ہیں جو غربت میں ہمارے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ اب حالات بدلے ہیں تو ان کی آنکھوں میں حسد دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔" وہ صاف گوئی سے کہتے۔

میں ان کے خیالات سے مکمل متفق تھی۔ شوکت کے رشتہ دار جب دبے لفظوں میں مجھ سے حسد کا اظہار کرتے تو بہت خوشی ہوتی تھی۔ میں نے بھی زندگی میں بہت تنگی اور غربت دیکھی تھی اور اب ان آسائشوں کو اپنا مقدر اور حق سمجھ کے 'فار گرانٹڈ' لیتی تھی۔ سسرال کے علاوہ میکے میں بھی رشتہ داروں کی حسد بھری نظریں مجھے عجیب سی خوشی دیتیں۔ شوکت اور میری ذہنی ہم آہنگی بھی کمال تھی۔

شادی کو چھ ماہ گذر چکے تھے جب مجھے اپنے وجود میں ایک نئی زندگی کے سانس لینے کی خبر ملی۔ شوکت کی والدہ بہت خوش تھیں۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب وہ صدقہ، خیرات اور شکرانے کے نوافل ادا نہ کرتیں۔ مجھے اکثر ایک ہی بات کہا کرتی تھیں۔

"تم اس کائنات کے سب سے بڑے رتبے تک پہنچنے والی ہو۔ دل میں کبھی غرور کو جگہ نہ دینا۔ یہ صفت تو میرے سوہنے رب کو سجتی ہے۔"

شوکت کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ہمیں ولادت کا شدید انتظار تھا لیکن پانچویں ماہ ایک قیامت کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

☆.....☆

وہ جنوری کی یخ بستہ ہواؤں میں گودا جما دینے والی ایک شام تھی۔ مغرب ہو چکی تھی۔ اماں جی اپنے معمول کے وظائف میں مصروف تھیں کہ دروازے پر اطلاعی گھنٹی بجی۔ احمد اپنے قاری صاحب سے سیپارہ پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی دروازہ کھول دیا۔ وہاں ایک برقع پوش عورت کے ساتھ چوبیس، پچیس سالہ لڑکی تھی۔

"جی فرمائیے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"سرداراں بہن سے ملاقات کرنی ہے۔" برقع پوش نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی کے ڈیرے تھے۔

"آپ اپنا تعارف تو کروائیے۔ میں یونہی تو کسی کو اندر نہیں لے جا سکتی ناں۔" میں نے شائستگی سے کہا۔

"ان سے کہیے رضیہ اور اس کی بیٹی آئی ہیں۔" یہ نام میرے لیے کچھ مانوس تھا۔ پھر یکدم ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ شوکت کی ایک خالہ کا ذکر اماں جی سے سنتی آئی تھی جو ان سے میل جول ختم کر چکی تھیں۔

میں انہیں لیے اماں جی کے کمرے میں ہی چلی آئی۔ ان کے ملاپ کا منظر دیدنی تھا۔ میں نے چائے اور خشک میوہ جات انہیں پیش کیے تو خاتون نے پہلی بار میرا بغور جائزہ لیا۔

"شوکت کی بیوی ہے کیا؟"

"ہاں! بہت نیک اور سعادت مند بچی ہے۔ پورا گھر سنبھال لیا ہے۔ اللہ پاک اسے سدا سہاگن رکھے۔"

"دوسرے جی سے معلوم ہوتی ہے۔" لڑکی نے میرا جائزہ لے کر پہلی بار زبان کھولی۔ اس نے ہلکے رنگوں کا گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرہ اور نقوش جاذب نظر تھے لیکن آنکھوں میں چھپے بیزاری اور نفرت کے رنگ اس کی خوبصورتی گہنا دیتے تھے۔ وہ ساری دنیا سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی خفا معلوم ہوتی تھی۔

"ہاں! اللہ نے اپنا بڑا کرم کیا ہے۔" اماں جی نے حسب عادت انکساری سے کہا۔

لڑکی نے تیز نگاہ سے مجھے گھورتے ہوئے یکدم منہ پھیر لیا۔ اس کے بعد اس نے مزید کوئی بات نہ کی اور تھوڑی ہی دیر میں واپس بھی چلی گئیں۔ ان کی آمد اور اچانک روانگی نے میرے ذہن میں بہت سے سوال پیدا کر دیے لیکن اماں جی عشاء کی نماز اور وظائف میں مشغول ہو گئیں اس لیے خاموشی کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

شوکت اس رات نو بجے گھر آئے۔ کھانے اور چائے سے فرصت ملتے ہی وہ دکان پر ہونے والی سیل کے حساب کتاب میں مگن ہو گئے۔ میں خاموشی سے اپنی رضائی میں لیٹ گئی۔

"کیا ہوا؟ لگتا ہے کسی گہری سوچ میں ہو؟"

"جی! بس یونہی ذہن میں کچھ سوال آ رہے تھے۔"

"ذہن پر زیادہ زور نہ دیا کرو۔ تمہیں پریشانی اور فکروں سے گریز کرنا چاہیے۔"

"آج رضیہ خالہ اور ان کی بیٹی آئی تھیں۔"

"اوہ!! خیر سے آئی تھیں۔" وہ یکدم سنبھلے۔

"اماں جی سے ہی باتیں کر رہی تھیں۔"

"تمہیں کچھ نہیں کہا؟ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ تمہیں ہی ملنے آئی ہوں گی۔" ان کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"کہا تو کچھ نہیں..... لیکن اس کی نظریں بن کہے بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔" میں نے اپنا تجزیہ بتایا۔

"اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" ان کا رویہ اور انداز بالکل ناقابل فہم تھا۔

"کیا مطلب؟ کھل کر بتائیے مجھے۔"

"جب انسان پر برا وقت ہو تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور جب اچھا وقت آئے تو سبھی پروانوں کی طرح اس کے گرد اکٹھے ہونے لگتے ہیں۔ یہی وہ رشتہ دار ہیں جو ابا جی کی دوسری شادی کے بعد ہمیں حقیر کیچوے سمجھنے لگے تھے اور آج دوبارہ میل ملاپ کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔"

"یہ تو قانون قدرت ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں! لیکن شاید تمہیں علم نہیں کہ کرن سے میری بچپن سے بات طے تھی۔ جب ہمارے حالات گردش میں آئے تو اس کی وفاداری بھی بدل گئی۔ ان دنوں میں اپنے تعلیمی خرچے پورے کرنے کے لیے گھروں میں اخبار دیتا تھا اور اسے یہ محنت مزدوری قبول نہیں تھی۔ خالہ نے منگنی توڑ دی اور جواز یہ دیا کہ اگر باپ بدکردار ہے تو بیٹا بھی اس جیسا ہی نکلے گا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میری زندگی میں تم آ گئی اور اللہ کا کرم ہے کہ ماضی کے کسی لمحہ کا مجھے ملال ہے نہ پچھتاوا۔"

"کرن کی شادی نہیں ہوئی کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہوئی تھی۔ شوہر نے بانجھ ہونے کے باعث طلاق دے دی۔"

"بہت افسوس ہوا۔"

"تم ان باتوں کو زیادہ ذہن پر سوار نہ کرنا۔ تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی تیسرے فرد کی زبانی حقائق جاننا اچھا نہ لگتا۔"

"آپ نہ بھی بتاتے تو میں کوئی گلہ نہ کرتی۔"

"ہمم..... آج اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دولت، گھر، سکون اور سب سے بڑھ کر اولاد کی خوشی بھی ملنے والی ہے۔ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔" انہوں نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر بات کا اختتام کیا۔

شوکت کی سادگی اور بے نیازی کے پیچھے بھی ایک تپش اور اضطراب محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بظاہر بے پروائی جتا رہے تھے لیکن میں جانتی تھی کہ جب کوئی عورت کسی مرد کو چھوڑ دیتی ہے تو وہ لاشعوری طور پر اس سے ساری زندگی کا بیر باندھ لیتا ہے۔ اس کی زندگی میں آنے والے دکھ اور پریشانیاں اسے بہت خوشی اور سکون دیتے ہیں۔ کرن کی اس حالت پر بھی وہ بہت خوشی محسوس کر رہے تھے۔

میرے ذہن میں کچھ دیر پہلے کے لمحات تازہ ہو گئے۔ کرن کی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا؟ حسد، محرومی، غصہ، کرب اور تڑپ۔ میں بے اختیار جھرجھرا کر رہ گئی۔ شوکت آنکھوں پر بازو رکھے لیٹ چکے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ واضح محسوس ہو رہی تھی۔

☆.....☆

اگلی صبح کا آغاز قیامت خیز تھا۔ میں اپنے معمول کے مطابق فجر کی نماز کے لیے اٹھی تھی۔ غسل خانہ میں پاؤں پھسل جانے کے بعد میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ سہارے کے لیے دروازہ تھامنا چاہا لیکن بے سود۔ ٹھنڈے فرش پر گرنے سے پہلے میسر اسٹرونٹی کے ساتھ جا لگا اور اس کے بعد ہوش آیا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میں اسپتال کے مخصوص بستر پر موجود تھی۔ اماں جی اور شوکت کا ستا ہوا چہرہ اور سب سے بڑھ کر اپنے وجود میں خلا کا احساس بہت بھیانک تھا۔

"نہ میری وحی! رونا نہیں۔ اس کا مال تھا۔ اسی نے لے لیا۔ وہ سوہنا رب جس حال میں بھی رکھے۔" اماں جی کے تسلی بھرے الفاظ سن کر میرے آنسو مزید تیز ہو گئے۔

دو دن اسپتال میں گذارنے کے بعد میں سونی گود اور خالی وجود لیے گھر چلی آئی۔ میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ شوکت اور اماں جی نے ہر ممکن میرا خیال رکھا۔ احمد بھی اپنی بساط کے مطابق میری دلجوئی کیا کرتا۔ سب کچھ میسر تھا لیکن جو چلا گیا اس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔

اگلے دو سال میں اماں جی کا سایہ بھی ہمارے سر سے اٹھ گیا۔ وہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کی وفات کے بعد مجھے تنہائی مزید ڈسنے لگی۔ شوکت اپنے کاروبار میں مگن تھے۔ احمد پڑھائی میں مصروف رہتا اور میں سارا دن خالی دیواروں کو تکتی اپنی سوچوں سے الجھتی رہتی۔ یہ سلسلہ شاید یونہی چلتا رہتا مگر شادی کے پانچویں سال اللہ نے حج کی توفیق عطا کر دی۔ احمد کو تایا کے گھر چھوڑ دیا گیا اور ہم دونوں زیارت کعبہ کے لیے چلے آئے۔ اور پھر برسوں بعد مجھے میری محرومی کا جواب مل گیا۔ اس انوکھے شخص سے ملاقات نے آنکھوں پر موجود پردے ہٹا دیے۔

"پروردگار! تکبر صرف تیری ہی ذات کے لیے ہے۔ اب میں کبھی اس غرور کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دوں گی۔" میں نے بہتے آنسوؤں سے ایک بار پھر عزم کیا۔ مجھے یقین تھا کہ قبولیت کا وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔

☆.....☆

ائیرپورٹ لاؤنج میں بہت رش تھا۔ یہ حاجیوں کی پہلی فلائٹ تھی۔ استقبال کرنے کے لیے سبھی کے عزیز و اقارب موجود تھے۔ ہم نے اپنی آمد کی اطلاع کسی کو بھی نہ دی تھی۔ کچھ دن بعد خاندان میں دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ انہی دنوں میری طبیعت گری گری رہنے لگی۔ ابتدا میں تو ہم اسے سفری تھکاوٹ اور دعوتوں کی گرانی سمجھتے رہے لیکن جب یہ سلسلہ دراز ہوا تو چیک اپ کے بعد علم ہوا کہ پروردگار نے ہماری دعائیں قبول کرلی ہیں۔

شوکت بہت خوش تھے۔ انہوں نے صدقہ و خیرات کا منہ کھول دیا۔ مجھے بھی خصوصی آرام کی تلقین کرتے رہتے۔

"یہ میرے رب کا خصوصی تحفہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی حفاظت بھی وہی فرمائے گا۔" میں نے کہا۔

"کوئی نام سوچا ہے کیا؟" وہ مسکرائے۔

"بیٹا ہو یا بیٹی میں اس کا نام گوہر رکھوں گی۔"

"کافی اولڈ فیشن نام ہے یہ۔ منفرد نام ہونا چاہیے۔"

"نہیں شوکت، اب کوئی بڑا بول نہیں بولیں گے ہم۔" میں تڑپ اٹھی۔

"ارے! ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟" وہ حیران ہوئے۔

"آپ جانتے ہیں آخری روز جب آپ اپنے دوست سے ملنے کے لیے گئے تھے اور میں وہیں اکیلی بیٹھی تھی۔"

"ہاں! اس کے بعد تمہارا رویہ بھی کچھ تبدیل سا ہوگیا تھا۔"

"اس روز مجھے ایک حقیقت کا احساس ہوا تھا کہ ہم نے نادانستگی میں کتنی بڑی کوتاہی کردی تھی۔"

"پہیلیوں میں بات نہ کرو بشریٰ! کھل کر بتاؤ مجھے۔"

میں نے جواب میں انہیں اس عجیب و غریب ملاقات کا سارا ماجرا سنا دیا۔

"حیرت انگیز! تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔" وہ بے یقین تھے۔

"نہیں۔ وہ ایک حقیقت تھی۔ جاگتی آنکھوں کی حقیقت۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ ہم نے لمحاتی غرور کا کتنا بڑا تاوان ادا کیا ہے۔ اب مجھ میں مزید کسی ادائیگی کی سکت نہیں ہے۔ یہ خوشی مجھے بہت ترس کر ملی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بات تو درست اور منطقی ہے۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔" وہ سنجیدہ ہوگئے۔

"میں نہیں شوکت! ہم ..... ہم دونوں ہی کو خیال رکھنا ہوگا۔"

"بے فکر ہوجاؤ۔" انہوں نے میرا ہاتھ نرمی سے تھپتھپایا۔

☆.....☆

پھر بالآخر وہ مشکل ترین لمحہ بھی آگیا جو کسی بھی عورت کی زندگی کی معراج ہوتا ہے۔

"مبارک ہو بی بی! اللہ پاک نے بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔" میرے ہوش میں آتے ہی سکینہ لپک کر میرے پاس آئی۔

سکینہ کو کچھ عرصہ قبل ہی شوکت نے کُل وقتی ملازمہ کی حیثیت سے رکھا تھا۔ وہ بیوہ اور بے سہارا ادھیڑ عمر عورت تھی جس نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا اور اسپتال میں بھی میرے ساتھ ہی موجود رہی۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوش قسمت ہو بی بی آپ۔" وہ کافی پُرجوش لگ رہی تھی۔

"اللہ ہی کا کرم ہے سکینہ۔"

"آپ میری بات نہیں سمجھ رہیں۔ میں ابھی ابھی چھوٹے صاحب کو دیکھ کر آئی ہوں۔ اس کے ختنے پیدائشی ہیں۔ ایسے بچے تو بہت نایاب ہوتے ہیں۔ اس کی بہت حفاظت کرنا بی بی! اللہ پاک نے بڑی رحمت کی ہے۔"

"اس نعمت کی بہت قدر کروں گی میں۔"

تھوڑی دیر بعد نرس نے میری گود میں تھمایا تو میری خوشی ناقابل بیان تھی۔ کائنات کی ہر خوشی اور خزانہ مجھے اپنی دسترس میں محسوس ہو رہا تھا۔ میری ریاضتوں اور دعاؤں کا ثمر مل گیا۔ خزاں رسیدہ اور اداس زندگی پر بہار کا موسم ٹھہر گیا۔ گوہر کی پیدائش نے مجھے ایک نئی توانائی دے دی تھی۔ میرا دھیان اسی میں لگا رہتا۔ سکینہ کی موجودگی کے باوجود میں اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی۔

گوہر کی آمد نے گھر کے سب افراد کی زندگی بدل دی تھی۔ احمد کے ہاتھ جیسے کوئی کھلونا لگ گیا تھا۔ اس کے ذرا ہوش سنبھالتے ہی وہ باہر لیے پھرتا۔ شوکت نے ان دنوں تاخیر سے گھر آنا شروع کردیا۔

"اتنی دیر کیوں کردیتے ہیں آپ؟ کھانے پینے کا بھی خیال نہیں کرتے۔" میں نے شکوہ کیا۔

"یہ سب بہت ضروری ہے بشریٰ!"

"آپ کی صحت سے زیادہ ضروری تو نہیں۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب گوہر کی بھی ذمہ داری ہے۔ کل کو اس کی تعلیم کے اخراجات بھی آئیں گے۔ میں اپنے بیٹے کو کسی بھی قسم کی کمی نہیں رہنے دینا چاہتا۔ اسے ہر چیز بہترین فراہم کرنی ہے۔"

"کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"مارکیٹ میں زمین کا ریٹ تیزی سے بڑھتا ہے۔ میں اپنی دکان کے علاوہ بھی دو دکانیں خرید کر کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔"

"کرائے کا کیا کریں گے؟"

"فی الحال تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلوا دوں گا۔ کرائے کی ساری رقم بینک میں جمع ہوتی رہے گی۔ بعد میں یہی پیسے بچوں کے کام آئیں گے۔" ان کے پلان سے میں مطمئن ہوگئی۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ گوہر کی پرورش میں مجھے دن رات کا ہوش بھول چکا تھا۔ سکینہ بھی حتی الامکان مدد کروایا کرتی۔ اسے ہم نے رہائشی کوارٹر الاٹ کردیا تھا۔ کھانا پینا بھی ہماری طرف ہی سے ہوتا۔ موسم کی تبدیلی کے علاوہ تہواروں پر بھی میں اسے نئے کپڑے بنوا دیا کرتی۔ وہ بھی بہت خوش اور مطمئن رہتی۔ اس کی وفاداری اور خلوص میں پہلے سے اضافہ ہی ہوا تھا۔ زندگی میں بہت ٹھہراؤ اور سکون تھا۔

☆.....☆

گوہر چار سال کا ہو چکا تھا۔ بے حد خواہش کے باوجود اس کے بعد مزید اولاد نہ ہو پائی۔ ہماری امیدوں اور خواہشوں کا محور اب صرف وہی تھا۔ وہ بہت صابر اور منفرد بچہ تھا۔ عام بچوں کی طرح بے جا ضد بالکل بھی نہ کرتا۔ اس روز سکینہ اور میں نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ میں کپڑے ہفتہ وار ہی دھوتی تھی لیکن پردوں اور بیڈ شیٹس تبدیل کرنے سے وقت بہت زیادہ ہوگیا۔

"سکینہ! گوہر کو چاول کھلا دو۔ اس نے صبح ناشتے کے بعد کچھ نہیں کھایا۔" مجھے تشویش ہو رہی تھی۔

"میں ابھی چھوٹے صاحب سے پوچھ کر آئی ہوں بی بی! وہ نہیں کھائیں گے۔" سکینہ نے کپڑے تار پر پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

"حیرت ہے۔"

"حیرت کیسی بی بی؟ میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہا تھا۔ گوہر پر اللہ پاک کا خاص کرم ہے۔" اس نے محبت سے کہا۔

"اللہ سوہنا میرے بچے کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" میں نے اپنی خوشی اور فخر پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

کپڑے اب دھل چکے تھے۔ صرف تار پر پھیلانے کا کام باقی رہ گیا تھا۔ میں سکینہ کو ہدایات دے کر نیچے آئی تو برآمدے سے آتی کچھ آوازوں نے قدم ساکت کردیئے۔

مجھے در پہ پھر بلانا مدنی مدینے والے
مہ عشق بھی پلانا مدنی مدینے والے

دھیمے سروں میں آتی گوہر کی باریک سی آواز نے مجھے کافی حیران کردیا۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہو میرے چاند؟"

"میں اکیلا اندر تھک گیا تھا۔ اس لیے باہر آگیا۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ کم عمری کے باوجود اس کی زبان دانی بہت صاف تھی۔

"یہ ابھی آپ کیا پڑھ رہے تھے؟"

"نعت پڑھ رہا تھا ماما!"

"یہ آپ کو کس نے سکھائی؟" میں الجھی۔ اسے سپارہ پڑھانے کے لیے ایک مولانا صاحب گھر آتے تھے اور وہ بھی اس کے پڑھنے کی رفتار اور لگن سے بہت متاثر تھے۔

"میں نے خود ہی سیکھ لی۔"

"بری بات گوہر! اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے۔ قاری صاحب نے سکھائی ہے کیا؟" مجھے خوشی کے ساتھ تجسس بھی تھا اس لیے سوالات کرتی چلی گئی۔

"گوہر جھوٹ نہیں بولتا ماما!" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ وہ اکثر اپنا نام لے کر ہی بات کرتا تھا۔

"تو پھر بتاؤ؟ خود کیسے سیکھ لی؟"

"مسجد میں جب قاری صاحب پڑھتے ہیں تو میں نے بھی یاد کرلی۔" اس کی بات پر یکدم میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ جمعہ کی نماز سے قبل خطبہ کے بعد اکثر مولانا صاحب نعتیہ کلام پڑھا کرتے تھے۔ وہ یقیناً انہی کی بات کر رہا تھا۔ مجھے بے ساختہ اس پر پیار آگیا اور دل سے شکرانے کے کئی کلمات برآمد ہوئے۔

اس شام میں بے تابی سے شوکت کا انتظار کرتی رہی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنی اس خوشی میں سب سے پہلے انہیں شریک کروں لیکن انہیں معمول سے زیادہ دیر ہوگئی۔ نہ

جاتے ہوئے بھی میرا مزاج بہت خراب ہو گیا۔ گذشتہ سال انہوں نے پرانے بازار میں اپنی دکان کرائے پر دے کر پوش علاقے کی ایک مارکیٹ میں جگہ خرید لی تھی۔ یہاں منافع کا مارجن زیادہ تھا اور سیل بھی دوگنا زیادہ ہوا کرتی۔ قباحت صرف یہ تھی کہ وہاں لوگوں کا معیارِ زندگی ہم سے میل نہیں کھاتا تھا۔ مارکیٹ میں رش شام کے بعد ہی زیادہ ہوتا اور رات گئے تک جاری رہتا۔ اس جگہ کاروبار سے مالی طور پر تو بہت فائدہ ہوا تھا لیکن ذاتی زندگی بہت متاثر ہو رہی تھی۔ اس روز شوکت ایک بجے گھر آئے تھے۔

"اتنی دیر کیوں لگا دیتے ہیں آپ؟ کبھی تو جلدی آجایا کریں۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ یہ وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔"

"کاروبار اور رزق کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ذاتی زندگی نظر انداز کر دینا بھی کہاں کی عقلمندی ہے؟"

"ذاتی زندگی کی خوشیاں اور سکون اسی کے طفیل ہیں۔ یہ مت بھولو۔" وہ بہت تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

"میں کب انکار کر رہی ہوں۔ جانتی ہوں کہ یہ سب آپ اولاد ہی کے لیے کر رہے ہیں لیکن اگر اولاد کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بس کر دیں گے تو زندگی بوجھل بنتی جائے گی۔" میں نے گوہر کے متعلق تازہ ترین سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم ہی کوئی حل بتاؤ کہ کیا کروں میں؟ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ وقت گذارا کروں لیکن دکان کو ملازموں کے سہارے بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"ایک حل تو ہے میرے پاس لیکن کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔" میں ہچکچائی۔

"اچھا وہ کیا ہے بھلا؟"

"احمد پر بھی تھوڑی ذمہ داریاں ڈالیں شوکت۔"

"وہ ابھی بچہ ہے بشریٰ!"

"بچہ تو نہیں ہے وہ میٹرک پاس کر چکا ہے۔" میں نے جتایا۔ "کالج جا کر دو چار سال اور پڑھ لے گا۔ اس کے بعد کیا کرے گا؟"

"میں نے اس بارے سوچا نہیں۔"

"تو کب سوچیں گے؟" مجھے غصہ آیا لیکن پھر اپنا لہجہ متوازن کر لیا۔ "میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ اسی کے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ کوئی ڈگری یا ڈپلوما لے کر چند ہزار کی نوکری پر غیروں کی محتاجی اور غلامی رہے گی۔"

"ہرگز نہیں! میں تو ویسے بھی نوکری کے حق میں نہیں ہوں۔" وہ ناگواری سے بولے۔

"میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں۔ اپنا کاروبار ہوتے ہوئے وہ غیروں کی ملازمت کیوں کرے۔ آپ نے بھی تو میٹرک ہی پاس کیا ہے اور اپنی سمجھ بوجھ سے بڑے بڑے ڈگری ہولڈرز کو مات دیتے ہیں۔ یہی مناسب وقت ہے۔ وہ آپ کے ساتھ اس کام کی باریکیاں سیکھ لے گا تو کل کو ہم اسے الگ کاروبار بھی شروع کروا دیں گے۔"

"بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" وہ نیم رضامند ہوئے۔ "میں کل ہی اس سے بات کر لوں گا۔ چار چھ مہینے میرے ساتھ گذارے۔ پھر ہم ڈپوٹی بانٹ لیں گے۔"

میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ شوہر اور بچے کے ساتھ کچھ وقت گذارنے کی خواہش تو بہت عرصہ سے دل میں بے چینی پیدا کرتی تھی تاہم کوئی رستہ تل کے ہی نہ دیتا۔ شوکت کی اس تجویز سے مجھے امید کی ایک کرن نظر آنے لگی۔ اب مستقبل کا فیصلہ احمد کے ہاتھ میں تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گا۔

☆.....☆

احمد عام نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا۔ والدین کے بڑھاپے کی اولاد ہونے کی بدولت گھریلو حالات نے اسے وقت سے پہلے ہی سمجھدار بنا دیا۔ بڑے بھائی کی محنت اور معاشی استحکام کے لیے کی گئی دن رات محنت بھی اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ وہ شوکت کا دل و جان سے احترام کرتا تھا۔ اماں جی کی بیماری کے دوران میں نے ان کی بہت خدمت کی تھی اور وہ اس پہلو کا بھی بہت احترام کرتا۔

اماں جی کی وفات کے وقت بھی بہت کم عمر تھا۔ اس کی سبھی ذمہ داریاں میں نے ماں کی طرح نہیں تو اس سے کم بھی نہیں پوری کی تھیں۔ اسے وقت پر کھانا' دھلے ہوئے کپڑے اور ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ ہمارے مابین بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ کبھی میری کوئی بات رد نہیں کرتا تھا۔ پڑھائی میں وہ ایک ایوریج اسٹوڈنٹ تھا۔ رزلٹ بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں آتا تھا۔ شوکت نے اگلے ہی روز اس سے بات کر لی۔

"مستقبل کے بارے میں کیا ارادے ہیں احمد؟"

"میں انجینئرنگ ڈپلوما لینا چاہتا ہوں بھائی!"

"اس کے بعد کیا کرو گے؟"

"ظاہر ہے کوئی نوکری ہی کروں گا۔" وہ حیران ہوا۔

"دیکھو احمد! میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ باپ کی طرح ہر ذمہ داری پوری کی ہے میں نے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔"

"میں نے اس بات سے کب انکار کیا ہے بھائی؟ آپ اور بھابی ہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ آپ دونوں کی میرے لیے محبت بے لوث ہے۔" اس نے خلوص سے کہا۔

"اسی لیے میں تم سے آج کچھ مانگنے آیا ہوں۔"

"مانگنا کیسا بھائی؟ آپ حکم بھی کر سکتے ہیں۔ میں انکار تو کبھی بھی نہیں کروں گا۔"

"ملکی حالات تمہارے سامنے ہیں احمد! مہنگائی اور مسائل کا انبار رہتا ہے۔ اگر تم نوکری کرتے ہو چند ہزار میں تو اگلے تمہیں اپنا غلام سمجھ کر برتاؤ کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ دکان پر آجایا کرو۔ ابھی سے کسٹمرز کو ڈیل کرنا سیکھو گے تو مستقبل میں کامیابی ملے گی۔"

"ٹھیک ہے بھائی! جیسے آپ کی خوشی۔" اس کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔

"میں تمہارا بھلا ہی چاہتا ہوں احمد! اس کام کے داؤ پیچ سیکھ لو پھر تمہیں الگ دکان خرید دوں گا۔"

"میرے لیے آپ کی ہر خواہش سر آنکھوں پر ہے۔ الگ دکان کا خیال آپ ذہن سے نکال دیں۔ ہم ایک ساتھ ہی رہیں گے۔" اس نے دوٹوک کہا۔

"وقت آنے پر وہ بھی دیکھ لیں گے۔" شوکت نے ٹالا۔

بات بن گئی۔ احمد ان کے ساتھ دکان پر جانے لگا۔ اگلے چھ مہینوں میں اس نے انتظامی معاملات کافی حد تک سنبھال لیے۔ کاروبار تھوڑا وسیع ہوا تو دو ملازمین مزید رکھ لیے گئے۔ اب صورتِ حال یوں ہوتی کہ شوکت شام کو گھر لوٹ آتے اور احمد دکان پر ملازمین کے ساتھ سب انتظامات دیکھتا۔ سب کچھ بہت اچھا چل رہا تھا۔ میری بروقت تجویز اور شوکت کی رضامندی نے بہت سی خوشیاں ہمارے دامن میں بھر دیں۔ ہم اکثر کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے بھی چلے جاتے۔ خاندان میں ہونے والی تقریبات میں شرکت یقینی ہونے لگی۔ شوکت جب گوہر کی ذہانت اور معصومانہ اداؤں کا ملاپ دیکھتے تو بے اختیار جھوم جاتے۔

"اب افسوس ہوتا ہے کہ میں نے زندگی کے کتنے بہترین لمحات ضائع کر دیئے۔" ایک روز انہوں نے کہا۔

"خیر! ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ اب بھی بہت کچھ انجوائے کر سکتے ہیں۔" میں نے ایک ادا سے کہا۔

"احمد کے ساتھ ہونے سے بہت آسرا ہو گیا ہے لیکن ایک مسئلہ اب بھی برقرار ہے۔"

"وہ کیا بھلا؟" میں پریشان ہوئی۔

"دکان پر ملازمین زیادہ عرصہ کے لیے ٹکتے ہی نہیں۔ انہیں رات گئے ڈیوٹی سے اعتراضات ہوتے ہیں۔ جو ٹک جائیں پھر کچھ عرصہ بعد تنخواہ اور دیگر سہولتوں میں اضافہ کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔" انہوں نے منہ بنایا۔ ملازمین کے حوالے سے ان کا رویہ خاصا سخت ہوتا تھا۔

"آپ نچلے طبقے کے لوگ ملازم رکھ لیں۔ اسٹوڈنٹس کو پارٹ ٹائم جاب دیں گے تو یہی کچھ ہو گا۔"

"میں تو ان کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ترس کھا کر جاب دے دیتا ہوں لیکن بعد میں یہ لوگ منہ کو آنے لگتے ہیں۔" پھر وہ سانس لے کر بولے۔ "ارے! ہم نے ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ناں ترس کھانے کا۔ ملازم اپنی مدد اور سہولت کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ کیا فائدہ جب الٹا ہمیں ہی ذہنی سکون نہ رہے۔"

"میں نے کہا ناں، نچلے طبقے کے لوگ ملازم رکھ لیں۔"

"نچلے طبقے کے لوگ لباس وغیرہ کے معاملہ میں ٹٹ پونجیے ہوتے ہیں۔ میری دکان کا امیج خراب ہو گا۔"

"اس کا بھی حل ہے۔ آپ انہیں مخصوص انداز کی پینٹ شرٹس سلوا دیں۔ وہ یہی یونیفارم پہنیں گے تو دکان کا امیج مزید بہتر ہو گا۔" میں مسکرائی۔

شوکت یہ آئیڈیا سن کر خوش ہو گئے اور میری ذہانت کے مزید قائل ہو گئے۔ میرے لیے تو صرف شوہر اور بیٹے کے ساتھ وقت گذارنا ہی سب سے اہم تھا۔ اس مقصد کے لیے ایسے آئیڈیاز ایجاد کرنا میری مجبوری تھی۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر میرے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

☆.....☆

"آپ کا بیٹا ایک جینئس ہے مسز شوکت!" ٹیچر کے الفاظ نے مجھے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔

"اللہ کا کرم ہے جی۔ سب اسی کی دین ہے۔" میں نے فوری طور پر اپنے جذبات کو ضبط کیا۔ فخر اور مسرت کا اگلا زینہ غرور ہی ہوتا ہے اور میں اس سے حتی الامکان گریز کرتی

تھی۔

گوہر کو شہر کے سب سے مہنگے اسکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی ذہین بچہ تھا اور سبھی اساتذہ اکثر پیرنٹس ٹیچر میٹنگ میں برملا اس کی تعریفیں کیا کرتے۔ وہ دس سال کا ہو چکا تھا اور اس کا فقط گریڈ کا رزلٹ لینے ہی ہم اسکول میں موجود تھے۔

''یقیناً آپ کی محنت اور کوشش کا بھی عمل دخل ہوگا ورنہ اس عمر میں ایسی ذہانت اور سنجیدگی بہت کم دیکھنے میں ملتی ہے۔'' میں جواب میں محض مسکرا کر خاموش ہوگئی۔

اس روز گھر میں بھی خوشی اور جشن کا سا سماں تھا۔ گوہر نے اسکول کی تاریخ میں سب سے زیادہ نمبر لینے کا ریکارڈ توڑا تھا۔ شوکت نے اسی کے اعزاز میں چھوٹی سی تقریب رکھ لی۔ رشتہ داروں کے تاثرات قابل دید تھے۔ ہمارے حالات جس طرح بلندی پر پہنچے تھے اس سے بہت سے لوگوں میں حسد پیدا ہو اتھا۔ ایسی اطلاعات وقتاً فوقتاً دوسرے رشتہ داروں سے ملتی رہتی تھیں۔ شوکت اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہوتے اور رہی میں تو میں بھی انہیں مختلف تجاویز دے کر مزہ دوبالا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔

تقریب بخیر و عافیت ختم ہوگئی۔ گوہر سب کا مرکز نگاہ تھا۔ اس رات اچانک احمد ہمارے کمرے میں دستک دے کر آ گیا۔

''کہو احمد! سب خیریت تو ہے؟'' میں حیران تھی۔

''جی بھابی! گوہر کے متعلق کچھ بات کرنی تھی۔ مجھے علم ہوا تھا کہ آپ اسے ادیبوں کروانا چاہتے ہیں۔''

''ہاں! ارادہ تو یہی ہے۔'' شوکت نے جواب دیا۔ میرے دل میں وسوسوں نے سر اٹھالیا۔ احمد شاید اپنی نامکمل پڑھائی کا انتقام گوہر کے رستے کھوٹے کر کے لینا چاہتا تھا۔

''آپ اس کے والدین ہیں۔ یقیناً اس کے لیے بہتر ہی فیصلہ کریں گے لیکن کبھی اسے کلام پاک حفظ کروانے کے متعلق کیوں نہیں سوچا؟'' اس کی بات پر میں چونک گئی۔ یہ خیال مجھے واقعی پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

''اماں جی کی خواہش تو تھی کہ ان کی نسل میں کوئی حافظ قرآن پیدا ہو لیکن یہ راہ بہت مشکل ہے۔ گوہر ابھی بچہ ہے۔'' شوکت متامل تھے۔

''اللہ پاک اپنی راہ کے مسافروں کے لیے منزل خود بخود آسان کر دیتا ہے بھائی! باقی جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔'' وہ نرمی سے بولا۔

ہم دونوں ہی ایک نئی سوچ میں پڑ گئے۔ گوہر کی ذہانت اس سعادت کی اہل تھی لیکن میں نے سن رکھا تھا کہ بچوں کے ساتھ مار پیٹ کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنا ایماندارانہ تجزیہ کروں تو علی الصباح اٹھنے کا خیال ہی میرے دل میں تساہل پسندی پیدا کر رہا تھا۔ خیر! ایک بہترین مقامی مدرسہ میں گوہر کو داخل کروا دیا گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ اپنے اسکول کی رنگ برنگی دنیا سے دوری پر احتجاج کرے گا افسردگی محسوس کرے گا لیکن وہ اس نئے معمول سے بہت خوش اور پرسکون تھا۔

گوہر نے بہت جلد ناظرہ اور حفظ کی منازل طے کرنی شروع کر دیں۔ وہ میرے لیے بالکل بھی پریشانی کا باعث نہیں بنتا تھا۔ کئی بار تو یوں بھی ہوتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی اٹھ جایا کرتا۔ اسے مدرسے لے جانے کی ذمہ داری احمد نے اپنے سر لے رکھی تھی۔

وقت تھوڑا اور آگے سرکا تو گوہر کے جوہر مزید کھل کر سامنے آنے لگے۔ مدرسے کے منتظمین بھی اس کی ذہانت اور اہلیت سے بہت متاثر تھے۔ عام طور پر کوئی بھی بچہ کلام پاک حفظ کرنے میں تین سے پانچ سال کا عرصہ لیتا ہے لیکن میرے بیٹے نے یہ سعادت ڈیڑھ سال میں ہی حاصل کر لی۔ ہم سب اس روز بہت خوش تھے۔ گوہر کی رسم آمین بڑے وسیع پیمانے پر کی گئی۔ اس کی تلاوت اور خوش الحانی دلوں پر رقت طاری کر دیتی تھی۔

''بڑے خوش قسمت ہو بھئی تم لوگ۔ ہیرا صفت اولاد دی ہے اللہ نے تمہیں۔'' رشتہ داروں کا ردِعمل دیدنی تھا۔

''ہاں بھئی! اللہ نے واقعی ان کی بہت نزدیک سے سنی ہے۔ پیسا اور سکون تو ہن کی طرح برس رہا ہے ان پہ۔'' ایک اور خاتون نے دل جلا تبصرہ کیا۔

''میرے مالک کا کرم ہے سب۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''ویسے احمد کے بارے میں بھی کچھ سوچو۔ اسے کیا یونہی ساری زندگی ملازم بنا کر رکھنا ہے۔'' شوکت کی ایک تائی نے چٹکی لی۔

''اس کے بارے میں بھی سوچ لیں گے تائی جی! آپ کیوں فکر مند ہو رہی ہیں۔'' مجھے غصہ آنے لگا۔

''تو کیا بوڑھا کر کے شادی کرو گی اس کی؟ خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔''

''اس بارے میں شوکت ہی فیصلہ کریں گے۔'' میں نے جان چھڑائی۔

اس رات ہم دونوں کے مابین یہی موضوع زیر گفتگو رہا۔ شوکت کو بھی خاندان کے بزرگوں نے انہی سوالات سے زچ کر رکھا تھا۔

''جاہل لوگ ہیں سب کے سب۔ خود تو ترقی کی نہیں ہماری خوشحالی سے بھی حسد کرتے رہتے ہیں۔'' وہ بہت غصہ میں تھے۔

''خاندان میں شادی کرنے کی تجویز دی ہے سب نے۔ کیا سوچا ہے آپ نے اس بارے میں؟'' میں نے انہیں ٹٹولا۔

''ارے یہ اس قابل کہاں۔ محنت ہم نے کی ہے اور پکا پکایا پھل کھانے کے لیے یہ لوگ چلے آئیں۔ مجھے تو آج بھی وہ وقت نہیں بھولا جب ہماری مشکل گھڑی میں یہ سب ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف کھڑے ہماری بے بسی کا تماشا دیکھتے تھے۔''

''میں تو خود بھی خاندان میں شادی کے حق میں نہیں ہوں۔ ہمارا حلقہ احباب مختلف کلاس سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسے میں انہیں متعارف کروانا باعث شرمندگی ہی ہو گا۔''

''ہم۔ صحیح کہہ رہی ہو۔ کہیں باہر ہی ڈھونڈتے ہیں رشتہ۔'' شوکت نے کہا۔

احمد نے ان کے سبھی ارادوں پر پانی پھیر دیا ''میں مہرین سے شادی کرنا چاہتا ہوں بھائی۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر جھکا کر کہا۔

''کون مہرین؟ وہ خالہ رضیہ کی چھوٹی بیٹی تو نہیں؟'' شوکت چونکے۔

''جی ہاں وہی۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میرا اس سے کوئی افیئر ہے۔ بس مجھے وہ اپنی کچھ خوبیوں کی وجہ سے اچھی لگتی ہے۔ میں اپنی شریک حیات میں ایسی ہی خوبیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اس بارے میں پلیز ایک بار سوچیے گا۔'' وہ سر جھکائے کمرے سے چلا گیا۔

شوکت کا مزاج بہت برہم تھا۔ وہ اسے بے نقط سنانا چاہتے تھے لیکن میں نے ہاتھ دبا کر انہیں سنبھلنے کا اشارہ کیا۔

''اس موقع پر اپنے جذبات کو ذرا قابو میں رکھیے۔''

''تم نے سنا تمہیں کس کا نام لے کر گیا ہے وہ؟'' وہ طیش میں تھے۔

''بالکل سنا ہے۔ آپ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھیے۔ ہم اس موقع سے بہترین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' میں نے انہیں اپنا منصوبہ بتایا۔ شوکت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

☆.....☆

احمد کی شادی کے دن مقرر کر دیے گئے۔ گوہر بھی اس موقع پر بہت خوش تھا۔ احمد سے اس کی بچپن ہی سے بہت دوستی تھی۔ شادی کی رسومات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت طے کی گئی تھیں۔ نکاح، رسم مایوں اور برات میں ایک ایک ہفتہ کا فرق تھا۔ نکاح کے بعد شوکت نے مہرین کے بھائی اور چند بزرگوں کو ایک کمرے میں بلا لیا۔

''کیا بات ہے بھائی؟ سب خیریت تو ہے ناں؟'' نصیر پریشان سا ہوا۔

''اگر تم لوگوں کو اس شادی کے اخراجات میں کوئی مسئلہ تھا تو ہمیں بتا دیتے لیکن اس طرح کے تھرڈ کلاس انتظامات کر کے ہماری ناک تو نہ کٹواتے۔''

''کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے کیا؟'' وہ بوکھلایا۔

''اس طرح کے ٹینٹس اور ڈیکوریشن تو اب کوئی فقیر بھی نہیں کرواتا۔ کوئی کلر اسکیم نہیں تھی۔ کھانا بھی بہت بے کار تھا۔''

''میں برأت میں خیال رکھوں گا۔''

''برأت..... ارے تو کیا مایوں کا فنکشن بھول گئے تم؟'' شوکت نے دانستہ حیرانی دکھائی۔

''لیکن ہمارے درمیان پہلے تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' نصیر نے کہا۔

''ہر بات کیا کہنی یا جتانی ضروری ہوتی ہے؟ کیا تمہیں علم نہیں کہ بہن بیٹی کی شادی کے کیا لوازمات ہوتے ہیں۔ ہمارا ایک وسیع حلقہ احباب ہے۔ سب ہی احمد کو اور مجھے جانتے ہیں۔ ہمارا سوسائٹی میں ایک مقام ہے۔ میں نے سب کی بیگمات اور فیملی ممبرز کو مایوں کا دعوت نامہ دے رکھا ہے۔ اب کیا انہیں سوکھے منہ یہاں سے واپس بھیجو گے؟''

''کتنے افراد ہو جائیں گے؟'' نصیر مزید پریشان ہوا۔

''پچاس تو ہوں گے کم از کم۔''

''شوکت یہ تم زیادتی کر رہے ہو۔ نصیر کے حالات کا خیال رکھو۔ وہ کیسے اتنے اخراجات پورے کرے گا؟'' تایا جی نے ٹوکا۔

''خیال ہی رکھ رہا ہوں تایا جی! ورنہ ہمارے سرکل میں سو ڈیڑھ سو سے زائد افراد اس رسم کے لیے جاتے ہیں۔''

''میں اتنے افراد کا کھانا ارینج نہیں کرسکوں گا۔ تھوڑی بہت ریفریشمنٹ سے کام چلاسکتا ہوں۔''

''تو کیا تم ہماری ناک کٹوانا چاہتے ہو؟'' میں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''نہیں بھابی! ایسا مت سوچیے۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں۔ اتنے اخراجات کیسے پورے کروں؟''

''ہمیں احمد کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ مل رہا تھا لیکن خاندان ہی کا مشورہ تھا کہ گھر کی بچی لائی جائے۔ اب دیکھ لیجیے آپ سب لوگ! یہ صلہ مل رہا ہے ہمیں۔'' شوکت نے باقی سب کو مخاطب ہوکر کہا۔

''تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے لیکن کوئی درمیانی راہ نکال لو۔'' نصیر کے ایک ماموں نے التجا کی۔

''ایک ہی حل ہے پھر میرے پاس تو! میں یہ شادی مؤخر کردیتا ہوں۔ جب ان کے پاس یہ بنیادی اخراجات پورے کرنے کے وسائل ہوجائیں گے ہم برأت لے آئیں گے۔'' شوکت اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے بھی چلنے کا اشارہ کیا۔

نصیر اور اس کے خاندان کی حالت دیدنی تھی۔ ہم لوگ خاموشی سے واپس چلے آئے۔ نتیجہ حسب توقع برآمد ہوا۔ اگلے روز ہی وہ لوگ ہمارے گھر چلے آئے اور انتہائی معافی تلافی کے بعد سب مطالبات تسلیم کرلیے۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ نصیر نے شادی کے شایان شان اخراجات کے لیے بیوی کے سب زیورات فروخت کردیئے تھے۔

اس طرح تو ہوتا ہے پھر اس طرح کے کاموں میں۔

☆.....☆

ہماری قسمت ان دنوں عروج پر تھی۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے تو سونا بن جاتی۔ مہرین کو میں نے دانستہ طور پر بہت دباؤ میں رکھا تھا۔ وہ کرن کی طلاق کے باعث بھی ذہنی تناؤ میں رہتی تھی۔ اس کی دوبارہ شادی نہیں ہوسکی تھی۔ اس کے ذہن میں پہلے ہی سے ایک بات نقش تھی کہ اسے حتی الامکان اپنا گھر خراب کرنے کے حالات سے گریز کرنا ہے۔ بہ صورتِ حال میرے لیے بہت سازگار تھی۔ میں نے سکینہ کی ذمہ داریوں میں کمی کردی۔

دکان کے معاملات بھی بہت اچھے چل رہے تھے۔ ملازمین کے معاملہ میں شوکت کی اب بھی وہی سوچ تھی۔ انہیں زیادہ سر پر چڑھایا ہی نہ جاتا۔ منافع کی شرح احمد اور گوہر میں یکساں تقسیم ہوتی۔ گوہر کے نام پر ایک دکان مزید خرید کر کرائے پر چڑھا دی گئی۔ حفظ کرنے کے بعد اس نے پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا۔ اپنے نئے اسکول میں بھی اس نے ذہانت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ چھ ماہ بعد ہی اسکول کے پرنسپل نے ہمیں ایک خصوصی میٹنگ میں بلا بھیجا اور رسمی حال احوال کے بعد اصل مدعا پر آگئے۔

''آپ کا بیٹا ایک انمول ہیرا ہے مسٹر شوکت! ایسی ذہانت ہمارے اسکول کی تاریخ میں کبھی ریکارڈ نہیں ہوئی۔''

''اللہ کا کرم ہے جی!'' شوکت نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ہم نے اس کے مختلف آئی کیو ٹیسٹ کروائے ہیں۔ اس کا آئی کیو لیول 160 پلس ہے۔ ہی از اے سپر جینئس۔''

''ہمیں تو بہت امید ہے کہ وہ بورڈ لیول پر کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور لے گا۔'' میں نے اپنی ایک خواہش بیان کی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایسا نہ ہوسکے۔ وہ ٹاپ تھری میں ضرور آئے گا لیکن ابھی یہ قبل از وقت ہے۔ ابھی ہم نے اس کے لیے کچھ اور سوچا ہے۔''

''یقیناً آپ نے کچھ بہتر ہی سوچا ہوگا۔'' شوکت نے اعتماد سے کہا۔

''ہم انٹرنیشنل لیول کے ایک کانیسٹ میں پاکستان کی نمائندگی کے لیے گوہر کو بھیجنا چاہتے ہیں۔ یہ ملٹی پرپز کانیسٹ ہوگا۔ کری ایٹو رائٹنگ' اسپیچ' کوئز اور سوئمنگ کے علاوہ بھی مختلف گیمز میں حصہ لینا ہوگا۔''

''کب ہوگا یہ کانیسٹ اور کہاں؟'' میں نے پوچھا۔ گوہر کے انٹرنیشنل اسٹار بننے کا تصور ہی بہت خوش کن تھا۔

''آسٹریلیا میں۔ آپ کی منظوری ملتے ہی ہم فارم بھیج دیں گے۔ کانیسٹ اگلے سال ہے۔ اس دوران سلیکٹڈ اسٹوڈنٹس کو جم کے تیاری بھی کروائی جائے گی۔''

''گوہر کے علاوہ اور کون سے اسٹوڈنٹس ہیں؟'' شوکت نے برسبیل تذکرہ پوچھا۔

''ایک لڑکی کا تعلق پشاور سے ہے جبکہ تیسرا اسٹوڈنٹ کراچی کا رہائشی ہے۔''

''آل رائٹ! ہمیں کوئی ایشو نہیں۔'' میں نے پرنسپل

کے فراہم کردہ ایک فارم پر دستخط کردیئے۔

گوہر سب کی امیدوں پر پورا اترا۔ اس کانیسٹ میں اس کی کارکردگی لاجواب تھی۔ قومی ٹیم یہ مقابلہ جیت تو نہیں سکی تھی لیکن اس کی انفرادی پوزیشن نے آرگنائزرز کو بہت متاثر کیا۔ انہوں نے گوہر کو اپنے خصوصی ادارے میں داخلہ کی آفر کردی۔ شوکت یہ پیشکش کرنے میں کافی متامل تھے۔ بیٹے سے دوری کا احساس تو میرے لیے بھی ناقابل برداشت تھا لیکن اس کے بہتر مستقبل کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا بھی ضروری تھا۔ احمد بھی میرے اس فیصلہ سے کافی افسردہ تھا۔ ''بھابی! یہاں بھی تو ہر سہولت میسر ہے۔ انٹرنیشنل لیول کے ادارے ہیں۔ کیا گوہر کو بھیجنا ضروری ہے؟''

''جی بھابی! گھر بالکل سونا ہوجائے گا۔'' مہرین کی بات سن کر مجھے غصہ آگیا۔ وہ یقیناً میرے بیٹے کی ترقی اور میری خوش قسمتی سے حسد محسوس کررہی تھی۔

''وہ میرا بیٹا ہے۔ اس کے اچھے برے کا فیصلہ میں بہتر طور پر کرسکتی ہوں۔ اگر گھر کی ویرانی کی اتنی ہی فکر ہے تو اپنی اولاد کا رستہ کیوں روکے بیٹھی ہو؟ تم لوگوں کا ہنی مون پیریڈ ہی ختم نہیں ہورہا۔ اب اولاد کا بھی کچھ سوچ لو۔'' میں نے سختی سے کہا۔ احمد اور مہرین کے چہرے تاریک ہوگئے۔

''ماما! دس از ناٹ فیئر!'' گوہر نے احتجاج کیا۔ ''میں خود بھی آسٹریلیا نہیں جانا چاہتا۔''

''تو پھر کہاں جانا ہے تمہیں؟'' میں نے اسے بھی لتاڑ دیا۔ ''اور آخر برائی ہی کیا ہے وہاں؟''

''مجھے وہاں کا ماحول پسند نہیں آیا۔ ایشیئنز کو بہت ڈی گریڈ کرتے ہیں وہ۔ میں علوم شرعیہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ میری بچپن ہی سے خواہش ہے کہ 'جامعۃ الازہر' جیسی کسی قدیم یونیورسٹی کا حصہ بنوں۔''

''ہیو یو گون میڈ؟'' میں چلائی۔ ''ایک برائٹ فیوچر چھوڑ کر کیا الم غلم پلان کرکے بیٹھے ہو؟ ایسے کسی بھی ادارے میں داخلہ تمہاری پرسنالیٹی پر کٹر ہونے کی چھاپ لگا دے گا۔ تمہیں ہر حال میں آسٹریلیا ہی پڑھنا ہے۔'' میں نے حتمی بات کی۔

اس کی افسردگی اور وقتاً فوقتاً احتجاجی مظاہروں کے باوجود شوکت اور میں نے اپنی بات منوالی۔ اسے سڈنی بھیج دیا گیا۔ اس کی کارکردگی وہاں بھی بے مثال تھی۔ اگلے پانچ سال میں وہ صرف سمسٹر بریک کے دوران گھر آتا۔ اس کی شیلڈز' اعترافی سرٹیفکیٹس اور ٹرافیز کا ایک انبار جمع ہوچکا تھا۔ خاندان اور احباب میں گوہر کی مثالیں دی جاتیں۔ احمد ابھی تک بے اولاد تھا۔ مجھے اس کی ذات سے کوئی بیر نہیں تھا بلکہ ہم دونوں میں ہی انسیت کا رشتہ استوار تھا۔

''بھابی! آپ دعا کیا کریں کہ اللہ ہمیں بھی صاحب اولاد کردے۔ یہ کمی اب برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ رودیا۔

''یہ کمی تو اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ گوہر کی پیدائش سے پہلے میں نے اس محرومی کی اذیت جھیلی تھی۔ وہ وقت میں آج تک نہیں بھول سکی۔'' میں نے خلوص سے اسے تسلی دی۔

''اللہ پاک ہماری بھی سنے گا ناں؟''

''بالکل سنے گا۔ ایسا کرتے ہیں گوہر اس بار سمسٹر بریک میں گھر آئے گا تو عمرہ کے لیے جائیں گے۔'' میں نے تجویز دی۔

''میری بھی بہت خواہش ہے۔ اس سال یہ حاضری ضرور دوں گا۔'' اس نے عزم سے کہا۔ اس متوقع سفر کی پلاننگ کرتے ہم میں سے کسی کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا کہ تقدیر نے اپنی آستین میں بہت کاری خنجر چھپا رکھے ہیں۔

☆.....☆

گوہر نے پری میڈیکل کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ اپنے کالج کی اس فیکلٹی میں اس نے ٹاپ کیا۔ کالج کی تاریخ میں اس پرسنیج کا حصول تاریخی تھا۔ اسے یورپ کی کئی میڈیکل میں یونیورسٹیز نے اسکالرشپ ایڈمیشن کی پیش کش کی لیکن اس کا رجحان خلائی سائنس میں تھا۔ وہ خلاء میں چھپے بہت سے جہان تسخیر کرنا چاہتا تھا۔ اسپیس سائنسز پر اس کے کئی مقالے بین الاقوامی جرائد کا حصہ بنے۔ ادب اور لکھنے لکھانے کی صلاحیت دیکھ کر مجھے اپنا ماضی بہت یاد آتا۔ زندگی کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر میرا قلم سے ناتا دوبارہ جڑ ہی نہ پایا تھا۔ اب میرے سبھی خواب گوہر سے وابستہ تھے۔ وہ ایک انٹرنیشنل اسٹار بن چکا تھا۔ وہ اس بار کافی طویل عرصہ بعد پاکستان آرہا تھا۔ آمد سے ایک رات قبل وہ فون پر بہت پُرجوش تھا۔ شوکت اپنی دکان کے لیے مال خریدنے کے لیے شہر سے باہر تھے۔ احمد اور مہر نے ایئرپورٹ اسے ریسیو کرنے کے لیے جانا تھا۔ میں گھر ہی میں اس کی آمد کے لیے تیاریاں کررہی تھی۔

فلائٹ کا وقت چھ بجے تھا۔ میں ایک ایک پل بہت دقت سے گزار رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں نے نوکا ہندسہ

عبور کیا تو برداشت کا مزید یارانہ رہا۔ احمد کا نمبر کئی بار ملایا لیکن موبائل بند ہونے کی ریکارڈنگ سن کر جھنجلاہٹ طاری ہوجاتی۔ مہرین اپنا موبائل گھر ہی بھول گئی تھی۔ شوکت بھی کئی بار فون کرکے گوہر کے متعلق پوچھ چکے تھے۔ دس بجنے کے بعد میرے صبر کا پیمانہ بالکل ختم ہوگیا۔ اسی لمحہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب میری بڑی باجی تھیں۔

"بشریٰ! گوہر خیریت سے تو ہے ناں؟"

"میں اسی کا انتظار کررہی ہوں باجی! احمد اور مہرین لینے گئے ہیں اسے لیکن ابھی تک نہیں لوٹے۔"

"تم نے ٹی وی نہیں دیکھا کیا؟"

"نہیں! پریشانی میں خیال ہی نہ رہا۔"

"ٹی وی لگاؤ جلدی۔ میں بعد میں فون کرتی ہوں۔" ان کے لہجہ میں بہت سے اندیشے تھے۔

میں نے لپک کر ٹی وی آن کیا۔ ہر نیوز چینل پر ایک ہاہا کار مچی تھی۔ ائیر پورٹ سے کچھ فاصلہ پر ایک پولیس ٹریننگ سینٹر پر خودکش حملہ آور نے دھماکے سے خود کو اڑا لیا تھا۔ اس دھماکے کی زد میں قریبی گاڑیاں اور مقامی افراد بھی آئے تھے۔ میں بے تابی سے چینل بدلنے لگی۔ ایک جگہ شوکت کی کلٹس کھڑی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ گاڑی کی ڈکی کے اوپر انہوں نے اپنی فیملی سے اظہار محبت کے لیے ایک بہت بڑا اسٹیکر لگوا رکھا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر نظر آتا وہ اسٹیکر میرے دل و دماغ میں ایک قیامت برپا کرگیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

☆.....☆

منظر ایک بار پھر وہی تھا۔

بارگاہ الٰہی میں حاضری دینے والے اپنی بندگی کے اظہار کے لیے روح پرور کلمات کی ادائیگی کررہے تھے۔ میں آج بھی ایک ستون سے ٹیک لگائے بے بسی سے اشک بہا رہی تھی۔ نظریں بے تابی سے ادھر اُدھر گردش کرتی تھیں لیکن ناکامی ہی ہر بار مقدر ٹھہرتی۔ گوہر، احمد اور مہرین کو ہم سے جُدا ہوئے جانے کتنی صدیاں بیت چکی تھیں۔ میرا بیٹا، ذہانت و قابلیت کا ایک انمول خزانہ منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ فرنگیوں کے دیس میں اس کا دل نہیں لگتا۔ وہ کسی مسلم یونیورسٹی سے پڑھنا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں نے ایک نہ سنی۔ ماں کی بات مانتے ہوئے اس نے وہی رستہ اپنا لیا لیکن پھر واپس ہی نہ آیا۔ لوگ کہتے ہیں وہ اتنی ہی زندگی لکھوا کر لایا تھا۔ ان کی یہ باتیں میری روح مزید گھائل کرتیں۔ شوکت کی حالت بھی ابتر تھی۔ انہوں نے بیٹے کے ساتھ ماں جایا بھی کھو دیا تھا۔ میری ذہنی حالت دیکھتے ہوئے وہ مجھے ایک بار پھر حجاز مقدس لے آئے۔

یہاں آکر مجھے ایک بار پھر وہ مرد قلندر یاد آگیا۔ میں دیوانوں کی طرح اسے تلاشتی لیکن وہ بھی مل کے ہی نہ دیا۔ اس کی ایک بات دل و دماغ کو بری طرح جھنجوڑتی تھی۔

"تیرا بیٹا تیرے ساتھ رہنے سے انکار کردے گا؟"

روانگی کے دن ایک بار پھر قریب آنے لگے لیکن میری تلاش اب بھی ادھوری تھی۔ ایک روز میں پیشانی زمین پر ٹیکے اپنے بگڑے نصیب کی مرگ پر ماتم کناں تھی کہ کسی نے میری سماعت میں سرگوشی کی۔ "تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں؟"

میں ہڑبڑا کر سیدھی ہوگئی۔ وہ آگہی کا لمحہ تھا۔ میرے ذہن میں اس مرد قلندر کی باتیں اور گوہر کی پیدائش کے بعد کچھ لمحات پوری قوت سے اجاگر ہوئے۔

"ابلیس ہر نعمت کے بعد اپنا وعدہ پورا کرنے چلا آتا ہے لیکن انسان اپنا ہر وعدہ بھول جاتا ہے۔"

گوہر کی پیدائش اور اس کی صلاحیتیں عطیہ خداوندی تھیں۔ ہم دونوں نے شعوری طور پر غرور اور تکبر سے تو اجتناب کیا لیکن اپنی بشری کمزوریوں میں ایک سے بڑھ کر ایک گناہ کرتے گئے۔ اولاد کے لیے ہی میں نے احمد کے خواب چھینے تو شوکت نے اپنے ماتحت افراد سے ناروا سلوک کیا۔ ہم نے حسد کیا، بدگمانیاں پالیں، رشتہ داروں کے حقوق پامال کیے، کمزور کا استحصال کیا اور نہ جانے کتنے انسانی دل دکھاتے رہے۔ خالق نے تو ہمیں نواز دیا لیکن ہم اس نعمت کی قدر نہ کرپائے اور ایک بار پھر روتے بلکتے، اپنی بے بسی کی دہائیاں دیتے اس کے در پر چلے آئے۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ میں کس حق سے اپنی اولاد کے بچھڑ جانے پر پروردگار سے محرومی کا گلہ کررہی تھی؟ اس نے تو ہمیشہ مجھے عطا کیا لیکن میں نے دانستہ نادانستہ نافرمانی کی روش جاری رکھی۔ گوہر کی اس مرگ ناگہاں کی ذمہ دار تو میں خود ہی تھی۔

اور ایک مجھ پہ ہی کیا موقوف، ہر انسان اپنی مرگ برگ کا کہیں نہ کہیں ذمہ دار خود ہے کیونکہ بے شک انسان خسارے میں ہے۔

میں اس کو نہیں جانتا تھا لیکن شاید میں اس خود غرض دنیا میں صرف اسی کو جانتا ہوں۔

میرے ایک دوست کا انتقال ہوگیا تھا۔ مجھے اس کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے جانا پڑا تھا۔ پاپوش نگر کے قبرستان میں جگہ ملی تھی۔ عام طور پر اب شہر کے قبرستانوں میں جگہ نہیں ملتی ہے لیکن میرے دوست کو اس لیے مل گئی تھی کہ اس کے دادا نے ایک بڑا سا پلاٹ خرید کر اپنے گھر اور خاندان والوں کے لیے مخصوص کروا دیا تھا۔ اس چہار دیواری کے اندر اس کے گھر اور خاندان کے لوگ دفن ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے میرے دوست کے لیے جگہ کے حصول میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

لوگ تدفین کے انتظامات میں تھے اور میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ اسی دوران ایک نوجوان میرے پاس آگیا۔ سولہ سترہ برس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اس نے بڑے مہذب انداز میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ "جناب! آپ کیا اپنے کسی عزیز کے لیے آئے ہیں؟"

"ہاں بھائی میں ایک دوست کی تدفین کے لیے آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اوہ۔" وہ کچھ مایوس سا نظر آنے لگا تھا۔ "خیر۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے جانے لگا تھا کہ مجھے اس سے دلچسپی سی محسوس ہوئی۔ کوئی خاص بات ضرور تھی ورنہ کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے کہ وہ کس لیے قبرستان آیا ہے۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ "میاں ذرا بات سنو۔"

بنجارا

محترم مدیر
السلام علیکم
ایک چھوٹی سی سرگزشت مرگِ ناگہاں نمبر کے لیے ارسال کررہا ہوں اگر پسند آجائے تو شائع کردیں۔

نعیم الحسن
(کراچی)

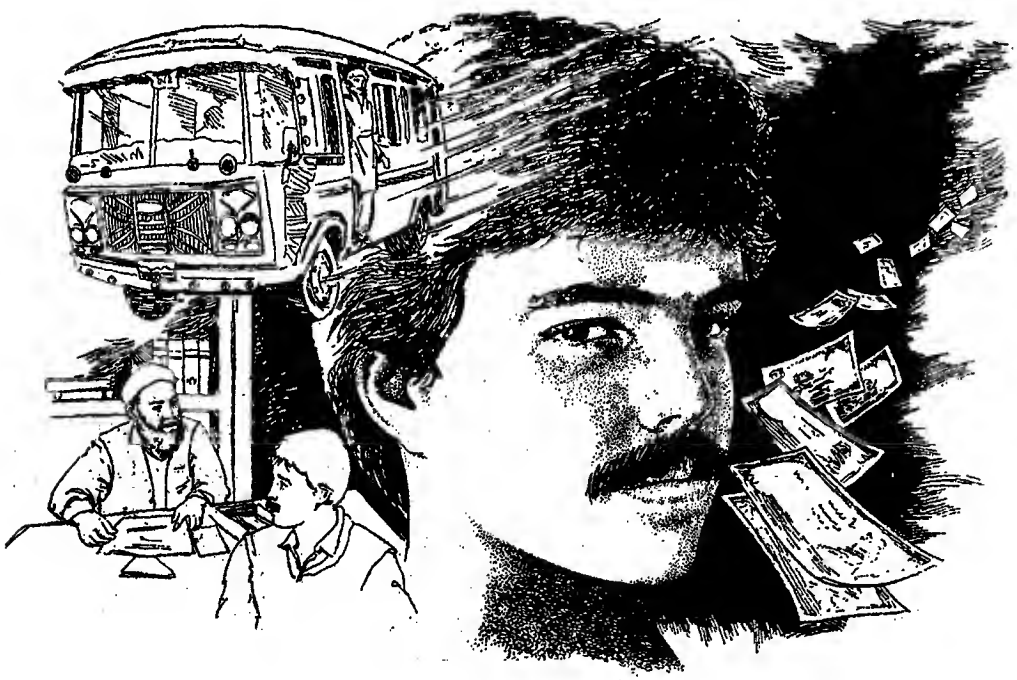

"جی جناب۔" وہ میرے پاس آگیا۔
"بتاؤ کیا بات ہے تم کون ہو؟ مرنے والوں سے کیا دلچسپی ہے تمہیں؟"
"جناب میں تو یہاں اپنے روزگار کے لیے آتا ہوں۔" اس نے بتایا۔
"روزگار کے لیے؟" میں اور حیران ہو گیا تھا۔ "کیسا روزگار؟"
"صاحب میرے ابو مر چکے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اسی قبرستان میں ان کی قبر ہے۔ میں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتا ہوں اور نظیر صاحب کی نظم سناتا ہوں۔"
مجھے اس میں اور دلچسپی پیدا ہو گئی۔ نظیر صاحب کی نظم سناتا ہوں کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔
"آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں بتاتا ہوں۔" اس نے کہا۔
اس وقت میں اس لڑکے کے بارے میں جاننے کا اتنا مشتاق ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اسی قبرستان میں بہت سی قبروں کے درمیان ہوتا ہوا ایک قبر پر آ کر رک گیا۔ وہ ایک کچی قبر تھی اس پر کوئی کتبہ بھی نہیں تھا۔
"یہ میرے ابو کی قبر ہے۔" اس نے اشارہ کیا۔
"تم جو نظیر صاحب کی نظم کی بات کر رہے تھے وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"وہ میں سناتا ہوں۔"
اس نے اس کے بعد نظم شروع کر دی۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم
"ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلاسر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"
خدا کی پناہ کیا آواز تھی اس لڑکے کی۔ میں رو رہا تھا۔ دل کی کیا کیفیت تھی اس کو بیان کرنا محال ہے۔ کیا سماں بندھ گیا تھا۔ قبرستان کی خاموشی۔ ہر طرف قبریں اور اس لڑکے کی دلکش ہوئی آواز۔ نہ جانے کتنا سوز تھا اس کی آواز میں۔
بہت دیر تک یہی کیفیت رہی تھی۔
اس نے نظم کے دو بند سنائے اور میں تڑپ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "بس بیٹا! اب نہیں اب برداشت نہیں ہوگا، تم یہ بتاؤ یہ نظم کس نے سکھائی ہے؟"
"میرے ابو نے۔" اس نے بتایا۔ "وہ بھی شاعر تھے۔"
"کیا نام تھا تمہارے ابو کا؟" میں نے پوچھا۔
"ان کا نام مظہر نسیم تھا۔" اس نے بتایا۔
"اوہ خدا کیا تم انہی مظہر نسیم کے بیٹے ہو جن کی نظمیں بہت مشہور ہیں۔"
"جی ہاں اور ان کی نظموں کا ایک مجموعہ بھی ہے، صدائے صحرا۔"
"ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔ وہ کتاب میرے پاس بھی ہے۔ تمہارے ابو ایک بہت اچھے شاعر تھے۔"
"انکل، ابو کے پاس بہت سی کتابیں تھیں۔ اب وہ سب میرے پاس ہیں۔ میں وہ سب پڑھتا رہتا ہوں۔ یہ نظم بھی میں نے پڑھی تو مجھے بہت اچھی لگی۔ ایک بار میں نے ابو کو گا کر سنائی تھی تو بہت خوش ہوئے تھے، کہہ رہے تھے، خدا نے تمہیں بہت اچھی آواز دی ہے۔ یہ بھی خدا کی نعمت ہے۔ جس طرح شاعری کا فن ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسی طرح آواز کی موسیقی بھی سب کے بس میں نہیں ہے۔ پھر یہ ہوا کہ ابو کا انتقال ہو گیا۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے ابو کی قبر پر یہ نظم سنانی شروع کر دی۔ ایک دو نے اعتراض بھی کیا کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ اس بچے کو سنانے دیں۔ اس کے بعد سے میرا یہ وتیرہ ہو گیا ہے کہ جب فاتحہ کے لیے آتا ہوں تو فاتحہ پڑھ کر یہ نظم سناتا ہوں۔ آج آپ کو بھی سنا دی ہے۔"
میں اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد میں نے پوچھا۔ "بیٹے تم جو روزگار کی باتیں کر رہے تھے وہ کیا تھا۔"
"ارے انکل! ہوا یہ کہ میں نے جب ابو کی قبر پر یہ نظم سنانی شروع کر دی تو کچھ لوگ میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں دوبارہ سناؤں۔ میں نے دوبارہ سنائی۔ انہوں نے پیسے دیئے۔ میں تو نہیں لے رہا تھا لیکن کہنے لگے کہ خوش ہو کر دے رہے ہیں۔ بس اس کے بعد سے میرا یہی کام ہو گیا۔"
بہت عجیب کہانی تھی اس کی خدا نے اس کے لیے کیا ذریعہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کی دلنشیں آواز کیا کام آ رہی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کا انتخاب۔ اس نے جو نظم منتخب کی تھی وہ احساس دلاتی ہوئی تھی کہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس کے بعد ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا۔ جب لاد چلے گا بنجارہ۔
میں نے بھی اپنی جیب سے کچھ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ رکھ لو بیٹا۔ لیکن میری ایک بات سن لو۔"
پہلے تو اس نے لینے سے انکار کیا۔ اس کے بعد پوچھا۔

"جی انکل آپ کیا کہہ رہے تھے؟"
"بیٹا! میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ تم نے جو لفظ روزگار استعمال کیا ہے تو یہ تمہارا روزگار نہیں ہو سکتا۔ تم پہلے اپنی تعلیم پر دھیان دو۔ اس کے بعد جو دل میں آئے کرو۔ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ تمہارا مستقبل نہیں بنا سکتا۔ فرض کرو۔ تمہیں اپنے گھر کی کفالت کرنی پڑے تو کیسے کرو گے۔ نظیر کی نظم کتوں کو سناؤ گے؟"
"جی انکل! میں تو فرسٹ ایئر کا طالب علم بھی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "یہ تو میں یوں ہی چلا آتا ہوں تو لوگ مجھ سے نظم کی فرمائش کرتے ہیں۔"
"نہیں بیٹا۔ میری نصیحت اگر مانو تو میں یہ کہوں گا کہ یہ مت کرو۔ پہلے پڑھ لو۔ اس کے بعد اپنا مستقبل بناؤ اور جہاں تک تمہارے تعلیمی اخراجات کا تعلق ہے تو تم مجھے انکل کہہ رہے ہو تو یہ انکل تم سے کہتا ہے کہ میں تمہارے تعلیمی اخراجات پورے کروں گا۔ چاہے جتنے ہوں۔ یہ تم پر کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ یہ تمہارے ابو کو خراج تحسین ہوگا۔ کیونکہ میں ان کی شاعرانہ عظمت کا مداح ہوں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔"
"جی انکل!" اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔
"سمجھ گیا ہوں۔"
"اب تم بتاؤ تم کہاں رہتے ہو؟"
اس نے بتایا کہ قبرستان سے کچھ فاصلے پر اس کی رہائش ہے۔ اس کے گھر میں صرف اس کی ماں تھی۔ ایک بڑی بہن ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کو صرف ماں کی فکر تھی۔
میں نے اس سے کہا کہ میں ایک دو دنوں کے بعد اس کے گھر کی طرف چکر لگاؤں گا۔
وہ مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں اپنے دوست کی قبر کی طرف آ گیا۔ وہاں سب کچھ ہو چکا تھا۔ اس کی تدفین ہو گئی۔ سب مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں کہاں رہ گیا تھا۔ اب میں کسی کو کیا بتاتا کہ میں کتنے بڑے تجربے سے گزرا ہوں۔
اس وقت میرے کانوں میں اسی کی آواز گونج رہی تھی۔
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلاسر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ
دو چار دنوں کے بعد میں اس کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس کا باپ ایک مشہور آدمی تھا۔ لوگ اس کے گھر سے واقف تھے۔ اسی لیے اس کا پتا بہت آسانی سے مل گیا تھا۔ میں نے اس گھر کے بوسیدہ دروازے پر دستک دی تو دستک کے جواب میں اسی نے دروازہ کھولا تھا۔
مجھے دیکھ کر وہ خوش اور حیران ہو گیا تھا۔ "انکل آپ؟"
"ہاں بیٹے! میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری طرف آؤں گا تو آج آ ہی گیا۔"
"ایک منٹ انکل!" وہ اندر چلا گیا۔ شاید وہ میرے بیٹھنے کا انتظام کرنے گیا ہوگا۔ اس کی واپسی جلد ہی ہوئی تھی۔
"چلیں انکل، اندر چلیں۔" اس نے کہا۔ "میں نے امی کو آپ کے بارے میں بتایا تھا وہ بھی آپ سے ملنا چاہ رہی تھیں۔"
اس نے مجھے ایک چھوٹی سی بیٹھک میں بٹھا دیا۔ (میں اسے بیٹھک ہی کہوں گا) اس میں فرنیچر تو بہت کم تھا لیکن الماریوں میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے یہ کتابیں اس کے مرحوم باپ ہی کی ہو سکتی تھیں۔
"انکل!" اس نے کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ "میں کورس کی کتابوں کے علاوہ یہ سب بھی پڑھتا رہتا ہوں۔"
"چلو یہ تو اچھی بات ہے لیکن تم اپنی اصل پڑھائی سے غافل نہیں ہو جانا۔"
"نہیں انکل، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس دن جو سمجھایا تھا وہ اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہے۔"
میں ابھی اس سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ اس کی ماں کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھنے والی عورت ہے۔
میرے بیٹھ جانے کے بعد وہ بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ خود اسی نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ "ندیم آپ کی بہت تعریف کر رہا تھا کہ قبرستان میں ایک بہت اچھے آدمی سے ملاقات ہو گئی ہے۔"
"جی ہاں! آپ کا بیٹا بہت سمجھدار ہے۔ اس نے نسیم صاحب کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس کی آواز نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔"
"مرحوم بھی اس کی آواز کو بہت پسند کرتے تھے۔" اس نے کہا اس کا ارادہ اپنے مرحوم شوہر کی طرف تھا۔
"میں نے اسے سمجھایا ہے کہ اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو۔ اس کے بعد زندگی کے راستے تمہارے لیے اور وسیع ہو جائیں گے۔ اس سے ہمدردی اور دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کے شوہر بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کا دیوان میرے پاس ہے۔"
"ندیم یہ بھی بتا رہا تھا۔"

"میں نے اس سے ایک بات کی ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو اس کے اخراجات میں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔"

"میری غیرت گوارا تو نہیں کرتی لیکن ہماری مجبوری ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میں نے اتنی تعلیم حاصل نہیں کی ہے کہ کہیں نوکری کر سکوں۔ کپڑے سی کر گزارا کرتی ہوں۔ جاننے والے میرے اس ہنر کو دیکھ کر اپنے جوڑے سلوانے میرے پاس آجاتے ہیں۔ بس اسی سے گزارا ہو جاتا ہے۔ اب تو یہی دعا ہے کہ ندیم اس قابل ہو جائے کہ گھر کو چلا سکے۔"

"خدا نے چاہا تو ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "آپ مجھے اپنا بھائی سمجھیں۔ میں جس کام بھی آسکتا ہوں دریغ نہیں کروں گا۔"

اس شریف عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ چلتے ہوئے میں نے اصرار کر کے دو ہزار میز پر رکھ دیئے تھے۔ "بہن جی میں ہر مہینے پانچ ہزار دیا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ میری طرف سے ایک اچھے شاعر کو خراج تحسین ہوگا۔" اس نے کچھ نہیں کہا۔

مجھے ایک گونہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید میں کسی طرح ان کے کام آسکوں۔ میرے ایک دوست کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ اس میں مردوں کی بنیان بنا کرتے تھے۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ "یار! تمہیں ایک کام کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں یہ نہیں سنوں کہ تمہارے یہاں کام ہے یا نہیں، بس تمہیں یہ کام کرنا ہے۔"

"بھائی بتاؤ تو سہی کیا کام ہے؟"

"ایک خاتون کو ملازم رکھنا ہے۔" میں نے پوری کہانی سنا دی۔

اس نے سب کچھ جان لینے کے بعد کہا۔ "یار یہ درست ہے کہ ہمارے یہاں فی الحال کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن تم نے کہا ہے اسی لیے کرنا تو ہوگا۔ تم یہ بتاؤ وہ خاتون تھوڑا بہت حساب کتاب تو کر ہی لیں گی؟"

"ہاں یہ تو ہو جائے گا۔"

"بس تم ان کو کل ہی بھیج دینا۔ ہمارا چھوٹا سا اکاؤنٹ ہوتا ہے، وہ دیکھ لیا کریں۔"

یہ بہت بڑا چانس تھا۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے کئی دنوں تک اس طرف جانے کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ پھر جب اس طرف گیا تو اس مکان میں تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ایک پڑوسی سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ "جناب یہ لوگ تو یہاں سے چلے گئے۔"

"چلے گئے؟ مگر کہاں؟"

"اوہو کیا آپ کو نہیں معلوم ہو سکا کہ ان لوگوں کے ساتھ کیسی قیامت گزری ہے؟"

"نہیں تو۔" میں دھک سا ہو گیا تھا۔ "کیا ہوا تھا؟"

"وہ لڑکا تھا نا ندیم، ایک ہی تو بیٹا تھا وہ روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی؟"

"ہاں صاحب! ایسا ہی ہوا ہے۔ بے چاری کے ساتھ بہت برا ہوا۔ ایک تو شوہر کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ پھر بیٹا بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

یہ سن کر میری کیفیت ہی عجیب ہو گئی تھی۔ اس لڑکے کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ ممکن ہے اس کی خبر میں نے کہیں پڑھی یا دیکھی ہو لیکن دھیان نہیں دیا ہوگا۔

"اور وہ خود کہاں ہیں؟"

"وہ بے چاری چونکہ خود اکیلی رہ گئی تھی اسی لیے ان کی بہن اور بہنوئی انہیں ساتھ لے گئے کہ باقی کے دن وہیں گزارنا۔ یہاں ان کے ساتھ کون رہتا؟"

میں گم ہو کر یہ سب سنتا رہا تھا۔ اس لڑکے کی کہانی کتنی جلدی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ اس کی خوب صورت آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کا بھولا سا چہرہ مجھے یاد آرہا تھا۔

"کیا آپ لوگ بتا سکتے ہیں کہ اس کی قبر کہاں بنائی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی جناب کیوں کہ ہم خود اس کے جنازے میں شریک تھے۔ پتا نہیں آپ جانتے ہوں یا نہ ہوں اس کے والد کی قبر کے بالکل پہلو میں اسے جگہ ملی ہے۔ شاید آپ نے وہ قبر دیکھی ہو؟"

"ہاں دیکھی ہے میں نے۔"

میں وہاں سے بہت بوجھل سا ہو کر واپس آگیا۔

اسی شام میں پھول لے کر لڑکے کی قبر پر پہنچ گیا۔ اس کے والد کی قبر یاد تھی۔ اس کی قبر بالکل پہلو میں تھی۔ وہ نظیر کو گانے والا اپنے ابو کے ساتھ جا کر سو گیا تھا۔

میں فاتحہ پڑھ رہا تھا اور قبرستان کی اس ازلی خاموشی میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

تک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بہ دیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

چھوٹی سی جان

عذرا رسول صاحبہ
آداب عرض
ایک سچی روداد ارسال کر رہی ہوں جو میری اپنی ہے۔ اسے خاص نمبر میں ضرور لگائیں نوازش ہوگی۔
عالیہ
(فیصل آباد)

وہ ایک بہت خوبصورت بچہ تھا۔

گول مٹول، بڑی بڑی روشن آنکھیں، دونوں گالوں پر پڑے ہوئے گڑھے، سنہری بال، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ باتیں بھی کرتا تھا۔ اس کی باتیں بہت دلکش ہوا کرتیں۔ ان باتوں میں معصومیت بھی ہوتی تھی اور دل موہ لینے والی شوخی بھی۔ گرچہ اس کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ ناراض ہو کر منہ پھلا لیتا تھا۔ اس کی یہ ادا بھی بہت زبردست ہوا کرتی۔ اس پر اتنا پیار آتا کہ کیا بتاؤں۔

میری امی مجھے سمجھایا کرتی تھیں۔ "عالیہ بیٹا۔ اتنا پاگل پن

بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھو ورنہ پاگل ہی ہو جاؤ گی۔"

"امی میں کیا کروں۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو میں بے قرار ہو جاتی ہوں۔ اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔"

امی میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھ کر رہ جاتیں۔

اس کی کہانی میرے اور عاطف کے پیار سے شروع ہوتی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو اسی وقت اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا جب ہم کالج میں تھے۔ پورے کالج میں ہم ہیر رانجھا یا لیلیٰ مجنوں کے طور پر جانے جاتے تھے۔

عاطف ایک ذہین طالب علم تھا۔ اس نے کئی پیپرز کی تیاری میں میری مدد کی تھی۔ بلکہ امی اور ابو کی اجازت سے میرے گھر آ کر مجھے کوچ بھی کر دیا کرتا تھا۔ ابو پہلے تو اس بات پر راضی نہیں تھے لیکن جب انہوں نے عاطف سے ملاقات کی تو اس کی شرافت اور تہذیب دیکھ کر راضی ہو گئے۔

انہوں نے کہا۔ "لڑکا کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھنے سے پتا چل جاتا ہے۔"

اس طرح عاطف نے میرے گھر میں آنا جانا شروع کر دیا۔ ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ ایک دن ابو نے عاطف سے دریافت کیا۔ "بیٹے، تمہارے ابو کا کیا نام ہے؟"

"جی انکل ان کا نام خورشید شیرازی ہے۔" عاطف نے بتایا۔ "وہ کسٹم سے ریٹائر ہوئے ہیں۔"

"اوہ خدا، تم شیرازی صاحب کے بیٹے ہو؟" ابو نے حیرت سے پوچھا۔

"جی انکل..... کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟"

"بیٹے تمہارے ابو میرے باس تھے۔" ابو نے بتایا۔ "میرا خیال ہے کہ پورے کسٹم کی تاریخ میں تمہارے ابو جیسا فرض شناس اور ایماندار آفیسر نہیں آیا ہوگا۔"

بہر حال تو اس طرح عاطف کی ہمارے یہاں آمد ہوئی اور ہماری شادی ہو گئی۔

ہم میں محبت اور انڈر اسٹینڈنگ تو پہلے سے موجود تھی، اس رشتے نے اور بھی تقویت دے دی۔

ہم نے شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں پلاننگ کر لی تھی کہ ہم زیادہ سے زیادہ تین بچوں کے والدین بنیں گے تاکہ ان کو پوری توجہ دے سکیں۔ ان کی بہتر تربیت کر سکیں، ان کی تعلیم بہتر ہو۔ اور یہ مرحلے بھی ابتدائی پانچ چھ برسوں میں کر لیں گے۔ اس کے بعد پھر سارا دھیان بچوں پر ہوگا۔

میں تو اپنے بارے میں کہہ سکتی ہوں کہ میرا سارا دھیان ہی اب آنے والوں کی طرف تھا۔

ہم ایک خوبصورت زندگی گزارنے لگے تھے۔ عاطف کے پاس اپنا اپارٹمنٹ تھا جس کو ہم دونوں نے اپنی مرضی اور شوق سے ترتیب دیا تھا۔ ہم نے فرنیچر زیادہ نہیں رکھا تھا۔ لیکن جو بھی تھا وہ بہت سلیقے کا اور آرٹسٹک تھا۔ اس معاملے میں بھی ہماری پسند ایک تھی۔

میں نے ایک بات محسوس کر لی تھی کہ اگر ہم سفر مزاج کے مطابق مل جائے تو زندگی کا سفر بہت خوبصورت ہو جاتا ہے۔ ہر لحظہ ایک نئی خوشی کا سامنا ہوتا ہے۔

ان ہی دن راتوں کے درمیان وہ بچہ کہیں سے آ گیا۔

ویسے وہ بچہ کہیں سے آیا نہیں تھا۔ وہ تو میرے تصور میں موجود تھا اور ایک رات وہ خواب میں بھی آ گیا۔ بہت خوبصورت تھا۔ بڑی بڑی سحر انگیز آنکھیں، ریشمی سنہرے بال، دمکتا ہوا رنگ، گول مٹول سا۔ ایسا خوبصورت بچہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا (خواب کی حالت میں) "بیٹا کون ہو تم؟"

"امی، آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں آپ ہی کا بیٹا ہوں۔" اس نے کہا۔

یہ سن کر میں نہال ہو گئی تھی۔ اتنا پیار آیا کہ میں نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ اس کے معصوم بدن کی گرمی میرے وجود میں شامل ہونے لگی تھی کہ اسی وقت کسی آواز نے چونکا دیا۔ میری آنکھ کھل گئی تھی۔

یہ ایک خواب تھا۔ انتہائی خوبصورت خواب۔ میں نے اس خواب کے بارے میں جب امی کو بتایا تو انہوں نے ڈھیر سی دعائیں دے دیں۔ "ہاں بیٹا۔ خدا نے چاہا تو ایک چاند تیری گود میں اترنے والا ہے۔ یہ بہت اچھا خواب ہے۔ بہت پیارا سا بیٹا ہونے والا ہے۔"

میں نے جب عاطف کو بتایا تو وہ بھی بہت خوش تھا۔ اسی دوران میرے ماں بننے کی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ ایک اچھے اسپتال میں میری رجسٹریشن ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے پھر اسی بچے کو خواب میں دیکھا۔ اس بار وہ کچھ ناراض سا تھا۔

"کیا ہوا میری جان۔ کیوں ناراض ہو؟" میں نے پوچھا۔

"امی آپ مجھے بلاتی ہی نہیں ہیں۔" اس نے روٹھے انداز میں کہا۔

"بس تم کو بلانے والی ہوں بیٹا۔" میں نے کہا۔ "تم

1987ء سے خدمت میں مصروف
LEUCODERMA-VITILIGO-
پھلبہری
تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج
قابلِ علاج مرض ہے
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT
ملٹی ایوارڈ ہولڈر
اجمل زیدی
ماہر برص
کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام
ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD
AWARD OF BEST ACHIEVEMENT
AWARD PILLAR OF LEUCODERMA
اسلام آباد
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مستقل پتہ
مکان نمبر 62، اسٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
سریا چوک (تعلیمی چوک)، اسلام آباد
فون: 2854595 - 2255880 (051)
موبائل: 0300-8566188
فیکس: 2261636
پشاور
یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر
قیام
ہوٹل امین
جی ٹی روڈ نزد ہشتنگری چوک پشاور شہر
فون: 2218215-9 (0521)
موبائل: 0300-8566188
لاہور
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر
قیام
گلف سینٹر
آفس: نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد صنم مارکیٹ (آرکیڈ) لاہور
موبائل: 0300-8566188
کراچی
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
قیام
فورچون سینٹر
آفس 706، 7 فلور، شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بلمقابل K.F.C کراچی
فون: 021-7012068-9
موبائل: 0300-8566188
ملتان
28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
قیام
ہوٹل سلور سینڈ
ریلوے روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون: 4518061-62 (061)
4582803 (0300-8566188)
E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

میرے پاس آنے والے ہو۔"

"سچ امی؟" وہ خوش ہو کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

مجھے کامل یقین تھا کہ جو بھی آنے والا ہے وہ بیٹا ہی ہے کیونکہ میں بیٹے کا خواب دیکھتی رہی تھی۔ عاطف کے کہنے پر الٹرا ساؤنڈ بھی کروالیا اور وہی ہوا۔ جو میرے خواب میں تھا۔ یعنی میں ایک بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔

میری اور عاطف کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ شادی کے بعد منزل تو ایک ہی ہوتی ہے کہ کسی خوبصورت سے بچے کے ماں باپ بنا جائے۔ قدرت ہمیں یہ موقع فراہم کر رہی تھی۔ ہمارے پاس وہ آنے والا تھا جو میرے خوابوں میں آیا کرتا تھا۔

ایک تجربہ یہ بھی ہوا کہ ان دنوں میں شوہر کی توجہ اور محبت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ بہت خیال رکھنے لگتا ہے۔ ہم نے امی کو اپنے پاس ہی بلا لیا تھا۔ بدقسمتی سے میری ساس نہیں تھیں۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ میرے ابو اور امی دونوں کا سایہ ہمارے سروں پر تھا۔

امی مجھے لیکچر دیا کرتی تھیں۔ یہ احتیاط کرو۔ وہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ ہی گیا جب مجھے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ عاطف بوکھلائے بوکھلائے گھوم رہے تھے۔ اس دن سے ایک رات پہلے وہ بچہ پھر میرے خواب میں آیا تھا۔ وہ پھر ناراض سا تھا۔ "کیا ہوا میری جان۔ اب کیوں ناراض ہو؟" میں نے خواب ہی میں پوچھا۔

"آپ مجھے نہیں بلا رہی نا، اسی لیے۔" اس نے کہا۔

"نہیں بیٹا۔ اب تو تم میرے پاس آنے ہی والے ہو۔" میں نے کہا۔

وہ خوش ہو کر مجھ سے چمٹ گیا۔ میں بھی بہت خوش تھی۔ بس ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ کیا اس قسم کے خواب صرف میں ہی دیکھ رہی ہوں یا ہر وہ عورت دیکھتی ہے جو ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی ہو۔

میں نے امی سے پوچھا تو وہ مسکرا دیں۔ "بیٹے بات یہ ہے کہ تم اس کے بارے میں زیادہ سوچتی ہو۔ اسی لیے وہ شریر تمہیں خوابوں میں آ کر تنگ کر رہا ہے۔"

"لیکن امی اس کی یہ شرارت تو مجھے اچھی لگ رہی ہے۔"

"ماں بننے والی ہونا اسی لیے۔" امی ہنس دیں۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب مجھے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ لیکن کچھ اور ہو گیا۔

شاید خدا کی یہ مصلحت تھی۔ کون جانے کہ انسان کی زندگی کا اگلا مرحلہ کیا ہوتا ہے۔ گاڑی عاطف ہی چلا رہے تھے۔ جب اچانک ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ حادثے اچانک ہی ہوتے ہیں۔ جب گمان بھی نہیں ہوتا۔ جب سب کچھ ٹھیک معلوم ہونے لگتا ہے تو اسی وقت گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ سب ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایکسیڈنٹ ہوا۔ گاڑی ایک تیز رفتار بس سے ٹکرا گئی۔ اس وقت گاڑی میں عاطف تھے، امی تھیں اور میں تھی۔

ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔

مجھے تو ہوش نہیں تھا صرف اتنا یاد ہے کہ میں بہت زور سے چیخی تھی۔ جبکہ امی اور عاطف بھی چیخ اٹھے تھے۔

ہوش آیا تو ہم سب اسپتال میں تھے۔ ہم میں سے کسی کو بھی اتنی سیریس چوٹ نہیں آئی تھی لیکن میں برباد ہو گئی تھی۔ میرا آنے والا شہزادہ روٹھ گیا تھا۔ پیٹ پر لگنے والی چوٹ نے میرا حمل ضائع کر دیا تھا۔

مجھے جب ہوش آیا تو میں اسپتال ہی میں تھی۔ خدا کے فضل سے عاطف اور امی کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ ویسے بظاہر مجھے بھی کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی لیکن کسی کو کیا بتاتی کہ میرا کتنا بڑا نقصان ہو چکا تھا۔ میرا شہزادہ مجھ سے روٹھ گیا تھا۔

یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹرز نے بتا دیا تھا کہ میں ماں بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی ایسی اندرونی چوٹ ہوتی جو مجھے بے ثمر کر دیتی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا لیکن میں تو کہیں کی نہیں رہی تھی۔

بہت دنوں کے بعد میرا شہزادہ پھر میرے خواب میں آیا۔ وہ مجھ سے ناراض تھا، کہہ رہا تھا۔ "امی میں آپ سے نہیں بولتا۔ آپ نے مجھے بلایا کیوں نہیں۔ میں تو کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ جائیں میں آپ سے کٹی ہو گیا ہوں۔"

میری آنکھ کھلی تو میں اس رات فجر تک روتی رہی۔ اب میں اسے کیسے بتاتی کہ بیٹے میں تمہیں کیسے بلاتی۔ میرے ساتھ تو حادثہ ہو گیا تھا۔ وہ معصوم کیا سمجھتا کہ حادثہ کیا چیز ہے۔

اس سانحے کے بعد ہمارے یہاں تین اور بچے بھی ہوئے۔ ماشاءاللہ تینوں صحت مند ہیں لیکن میں اس شہزادے کو کہاں سے لاؤں؟ وہ کیوں میرے خوابوں میں آتا ہے؟ کیا اس معصوم کی روح ابھی تک بھٹک رہی ہے؟

میرا بہت روحانی علاج ہو چکا ہے لیکن چین ہی نہیں آتا۔

میں اپنی کیفیت اس لیے لکھ رہی ہوں کہ شاید کوئی بتا سکے کہ میں کیا کروں۔ اور میری یہ عام سی کہانی سرگزشت کے جواں مرگ میں جگہ بنا سکے۔

ذمے دار

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
ایک روداد ارسال کر رہا ہوں۔ یہ ان والدین کے لیے ہے جو اپنے بچوں پر نظر نہیں رکھتے۔ یہ جو ون وہیلنگ کا کھیل شروع ہوا ہے یہ کتنا خطرناک ہے اس کا اندازہ سب کو ہے۔ پھر بھی لوگ بچوں پر نظر نہیں رکھتے۔

عاطر شاہین
(لاہور)

سہ پہر کا وقت تھا۔ اٹھارہ سالہ نبیل اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر جیسے ہی اس کی سماعت سے موٹر بائیک کے ہارن کی آواز ٹکرائی تو اس نے آنکھیں کھول دیں پھر پلنگ سے اتر کر اس نے سینڈل پہنا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کی امی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"امی! آپ رکیں میں دروازہ کھولتا ہوں۔" نبیل نے امی سے کہا تو وہ مڑ کر کچن میں چلی گئیں اور نبیل دروازے کی

طرف بڑھ گیا۔اس نے دروازہ کھولا تو باہر اس کے ابو موٹر بائیک سمیت موجود تھے۔موٹر بائیک اسٹارٹ تھی اور وہ اسے اندر لے آنا چاہتے تھے کہ نبیل نے کہا۔

''ابو۔مجھے موٹر بائیک چاہئے۔''

''تم نے کہاں جانا ہے؟''انہوں نے پوچھا۔

''ایک دوست سے نوٹس لینے ہیں۔''نبیل بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔جلدی آنا اور موٹر بائیک دھیان سے چلانا۔''اس کے ابو سموٹر بائیک سے اترتے ہوئے بولے۔

''جی بہتر۔''نبیل نے کہا اور پھر وہ موٹر بائیک پر سوار ہو کر اپنے دوست ساجد کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔نبیل کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔اس سے بڑا ایک بھائی تھا اور ایک بہن تھی۔بڑے بھائی ریحان کی اپنی گارمنٹس کی شاپ تھی جبکہ چھوٹی بہن رمشا میٹرک کی طالبہ تھی۔اس کے والد کی کریانے کی دکان تھی جس کی وجہ سے ان کا گزر بسر بہت اچھا ہو رہا تھا۔

نبیل کے دوست ساجد کا تعلق متمول گھرانے سے تھا۔اس کے والد امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے اور ان کا شمار شہر کے مشہور بزنس مینوں میں ہوتا تھا۔ان کی امارت کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھر میں کئی نوکر چاکر تھے۔کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی۔اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔نبیل اور ساجد گہرے دوست تھے۔ہم عمر ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف تھے۔دونوں ایف اے کے اسٹوڈنٹ تھے اور ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔

ساجد ایک بے پروا اور والدین کا کہنا نہ ماننے والا لڑکا تھا۔اس کے والد نے اسے موٹر بائیک لے کر دی ہوئی تھی جس پر وہ اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر ون ویلنگ کرتا تھا۔وہ اتنی تیز موٹر بائیک چلاتا تھا گویا وہ ہوا سے باتیں کر رہا ہوتا تھا۔اس نے نبیل سے بھی کئی بار کہا تھا کہ وہ بھی موٹر بائیک پر ون ویلنگ کیا کرے لیکن نبیل ون ویلنگ کرنے سے ڈرتا تھا بلکہ اس نے ساجد کو بھی کئی بار منع کیا تھا کہ وہ ایسا خطرناک کھیل نہ کھیلا کرے لیکن مجال ہے جو ساجد کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔وہ نبیل کا مذاق اڑاتا، اسے بزدل کہتا تھا۔ساجد کو اس نے کئی بار ون ویلنگ کرتے دیکھا تھا۔وہ انتہائی خطرناک اور بہادری سے ون ویلنگ کرتا تھا۔جب وہ سامنے کا پہیا اوپر اٹھا کر اسپیڈ مزید تیز کرتا تو نبیل کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔اس دن اس نے ساجد سے کہا کہ وہ اپنی ابو کی موٹر بائیک لے کر اس کے گھر آئے گا پھر وہ اسے ون ویلنگ کرنا سکھائے گا چنانچہ اب سہ پہر ہو رہی تھی اس لیے نبیل ون ویلنگ سیکھنے ساجد کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔تھوڑی دیر کے بعد وہ ساجد کے گھر پہنچ گیا اور ساجد اسے ون ویلنگ کرنے کا طریقہ اور گُر سکھانے لگا۔چند دن کے اندر اندر ہی نبیل نہ صرف ون ویلنگ کرنے کا طریقہ سیکھ گیا بلکہ اس نے ماہرانہ انداز میں سڑکوں پر ون ویلنگ بھی شروع کر دی۔

☆.....☆

سعدیہ بس اسٹاپ پر ایک بینچ پر بیٹھی بس کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔اسے وہاں بیٹھے بیس منٹ ہو گئے تھے لیکن بس نہیں آئی تھی۔گرمیوں کا موسم تھا اور سورج بھی سوا نیزے پر تھا اس لیے وہ پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔اس کے ہاتھ میں ایک ٹشو پیپر تھا جس سے وہ اپنے چہرے پر آنے والا پسینا بار بار پونچھ رہی تھی۔بس اسٹاپ پر اور بھی مسافر موجود تھے جن میں دو ادھیڑ عمر عورتیں، تین لڑکیاں اور چار مرد تھے۔ادھیڑ عمر عورتیں اور لڑکیاں بینچوں پر بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ مرد حضرات ایک سائیڈ پر کھڑے تھے۔

سعدیہ کی عمر چوبیس، پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔وہ زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن جاذب نظر اور قبول صورت ضرور تھی۔اس کی رنگت سانولی تھی مگر اس میں بے پناہ کشش تھی۔سعدیہ کی منگنی اپنے ماموں زاد ریحان سے ہو چکی تھی اور ان کی شادی چار ماہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔

سعدیہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔اسے ٹیچنگ کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔اس کا شمار اسکول کی بہترین ٹیچروں میں ہوتا تھا۔وہ دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔سب سے بڑا بھائی تھا، اس کے بعد سعدیہ تھی۔بڑا بھائی شادی شدہ اور ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتا تھا جبکہ سعدیہ سے چھوٹی بہن رابعہ نویں جماعت اور بھائی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔اس کے والد محکمہ انہار سے ریٹائرڈ تھے اور ان کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔

بیس منٹ مزید گزر جانے کے باوجود جب بس نہ آئی تو سعدیہ کی الجھن بڑھ گئی اور چہرے پر بے زاری کے تاثرات ابھر آئے۔اس نے سوچا کہ اسے پیدل ہی گھر جانا چاہیے نہ جانے بس کب آئے۔حالانکہ بس روزانہ اپنے مقررہ وقت پر ہی اسٹاپ پر آ جاتی تھی لیکن آج نجانے کیوں لیٹ ہو گئی تھی۔یہی کچھ سوچ کر سعدیہ اٹھی اور اسٹاپ سے نکل کر پیدل ہی اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ابھی وہ بس اسٹاپ سے تھوڑی ہی دور پہنچی تھی کہ اچانک ایک کار اس کے قریب آ کر

رکی تو سعدیہ نے بے اختیار چونک کر کار کی طرف دیکھا۔کار میں اس کی اسکول کی میڈم رضیہ سوار تھیں اور انہوں نے کار کی سائیڈ سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

''آجاؤ سعدیہ۔''

سعدیہ جھجکتے ہوئے کار میں بیٹھ گئی تو میڈم رضیہ نے اسے مسکرا کر دیکھا اور کار آگے بڑھا دی۔میڈم رضیہ پینتالیس سالہ پکی عمر کی خاتون تھیں۔ان کی رنگت سفید تھی اور وہ بے حد اچھی خاتون تھیں۔

''سعدیہ۔تم ابھی تک گھر نہیں گئی۔''انہوں نے پوچھا۔

''میڈم، بس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔آدھا گھنٹا ہو گیا ہے لیکن بس نہیں آئی اس لیے پھر میں نے پیدل ہی جانا مناسب سمجھا۔''

ابھی انہوں نے تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک سعدیہ کی نظر ایک موٹر بائیک پر سوار لڑکے پر پڑی تو وہ بے اختیار چونک پڑی۔وہ اس کا ماموں زاد نبیل تھا ریحان کا بھائی اور اس کا ہونے والا دیور۔سعدیہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے نبیل کو ون ویلنگ کرتے دیکھا۔نبیل کے آگے ایک اور لڑکا بھی موٹر بائیک پر ون ویلنگ کر رہا تھا۔وہاں سے گزرنے والے لوگ حیرت بھری نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''ان لڑکوں کو دیکھو، ان کو اپنی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔کتنے خطرناک طریقے سے ون ویلنگ کر رہے ہیں۔''میڈم رضیہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''ان میں ایک میرا کزن ہے۔پیچھے موٹر بائیک والا۔''سعدیہ نے کہا تو میڈم رضیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔پھر وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولیں۔

''تم اس کے والد سے اس کی شکایت کرو۔''

''جی کروں گی۔''

تھوڑی دیر کے بعد میڈم رضیہ نے سعدیہ کو اس کے گھر کی قریبی گلی کے پاس ڈراپ کر دیا تو سعدیہ نے گھر پہنچتے ہی اپنے پرس سے سیل فون نکالا اور ممانی کو کال کرنے لگی۔

''السلام علیکم ممانی جان۔کیسی ہیں آپ؟''رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے ممانی کی آواز سنائی دی تو سعدیہ نے نہایت ادب سے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹی۔تم کیسی ہو۔گھر والے کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں ممانی جان۔وہ.....وہ میں نے ایک بات کرنی تھی۔''سعدیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔

''ہاں، ہاں بولو بیٹی۔کیا کہنا چاہتی ہو۔''ممانی نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

''ممانی۔میں نے نبیل کے بارے میں بات کرنی تھی۔''

''ہاں بولو، کیا بات کرنی ہے، کیا اس نے تم سے کوئی بات کی ہے؟''

''نہیں ممانی جان۔نبیل نے تو مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ.....کیا آپ کو خبر ہے کہ نبیل سڑکوں پر ون ویلنگ کرتا ہے۔''

''کیا۔کیا کہہ رہی ہو۔''

''آج میں نے خود نبیل کو سڑک پر ون ویلنگ کرتے دیکھا ہے۔''سعدیہ نے کہا۔''اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی تھا وہ بھی ون ویلنگ کر رہا تھا۔میں آپ سے نبیل کی شکایت نہیں کر رہی بلکہ یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ اسے سمجھائیں کہ ون ویلنگ کرنا بہت برا عمل ہے۔کئی لڑکے ون ویلنگ کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔''

''بیٹی، یہ شکایت نہیں ہے۔اچھا کیا تم نے مجھے بتا دیا ورنہ ہم تو لاعلم تھے۔''ممانی جان نے کہا تو سعدیہ نے ایک طویل سانس لیا۔ممانی مزید بولیں۔''نبیل گھر تو آئے میں اس کی خبر لیتی ہوں۔''

''آپ اسے ڈانٹیے گا نہیں بلکہ پیار سے سمجھائیے گا۔''

''تم بے فکر رہو۔''ممانی نے کہا اور پھر مزید چند باتیں کرنے کے بعد سعدیہ نے اللہ حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

☆.....☆

نبیل موٹر بائیک صحن میں کھڑی کر کے جانے لگا تو اس کی امی کمرے سے باہر نکل کر اسے آواز دینے لگیں۔''نبیل۔میری بات سنو۔''

''جی امی۔''نبیل نے قریب آ کر مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔اچانک امی کی نظر نبیل کے کپڑوں پر پڑی تو وہ چونک پڑیں۔اس کے کپڑے گرد آلود ہو رہے تھے ایسے لگتا تھا جیسے وہ کہیں گرا ہو۔

''یہ تمہارے کپڑے گرد آلود کیوں ہیں؟''

نبیل گڑبڑا گیا اور پریشانی اس کے چہرے سے مترشح ہو گئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں کو کیا جواب دے۔کیونکہ وہ ون ویلنگ کرتے ہوئے گر گیا تھا۔

"دہ.....وہ۔"

"دن ویلنگ کرتے ہوئے گرے ہو؟"

امی کی بات سن کر نبیل ایسے اچھل پڑا جیسے کسی نے اس کے پیروں میں پٹاخہ پھاڑ دیا ہو۔ وہ متوحش نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"نن۔نن۔نہیں تو۔"

"جھوٹ مت بولو۔ مجھے سب پتا ہے کہ تم ون ویلنگ کرتے ہو۔" امی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ڈانٹا تو نبیل کا چہرہ مزید متغیر ہو گیا۔ امی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری خاموشی سے پتا چلتا ہے کہ تم ون ویلنگ کرتے ہو۔ دیکھو نبیل۔ ون ویلنگ بے حد خطرناک کھیل ہے۔ تم اخبارات میں پڑھتے ہو، ٹی وی پر دیکھتے ہو۔ کئی لڑکے ون ویلنگ کرتے ہوئے اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو....."

ریحان پھر بھی خاموش رہا۔ اسی لمحے بیرونی دروازہ کھلا اور ریحان کے ابو داخل ہوئے۔ اپنے والد کو دیکھ کر نبیل کے چہرے پر اب خوف کے تاثرات ابھر آئے اور وہ سوچنے لگا کہ اگر امی نے ابو کو بتا دیا کہ وہ ون ویلنگ کرتا ہے تو پھر اس کی خیر نہیں۔ اس کے ابو سخت مزاج تھے۔ وہ تو چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں ماں بیٹے میں؟" نبیل کے ابو نے ہاتھ منہ دھونے کے بعد صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے آئے تھے۔ نبیل کی امی نے پہلے ریحان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ چٹانوں کی طرح سخت ہوا پڑا تھا۔ پھر وہ اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کچھ خاص بات نہیں ہے۔ کیا آپ کے لیے کھانا لگا دوں؟"

"ہاں لگا دو۔ آج تو بے حد بھوک لگی ہے۔"

نبیل کی امی نے نظروں ہی نظروں میں ریحان کو تنبیہہ کی کہ وہ آئندہ ون ویلنگ نہ کرے۔ آج تو وہ اس کے ابو کو شکایت نہیں کر رہیں اگر آئندہ انہیں معلوم ہوا کہ وہ ون ویلنگ کرتا ہوا پایا گیا ہے تو وہ اس کی شکایت اس کے ابو سے کر دیں گی۔ وہ نہ صرف اسے موٹر بائیک لے جانے سے منع کر دیں گے بلکہ اس کی اچھی خاصی دھنائی بھی کریں گے۔

"تم بھی ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو۔"

"جی امی۔" نبیل واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو وہ بال بال بچ گیا ہے۔

"رمشا کہاں ہے؟"

"وہ سو رہی ہے۔ اس کے سر میں درد ہے۔"

"ہونہہ۔" نبیل کے ابو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو ان کی بیگم کچن میں چلی گئیں۔

☆.....☆

نبیل کی امی نے اپنے بڑے بیٹے ریحان کو بتا دیا کہ نبیل اپنے دوست کے ساتھ مل کر ون ویلنگ کرتا ہے۔ انہوں نے اسے بھی سختی سے منع کیا تھا کہ اپنے ابو کو کچھ نہ بتائے البتہ وہ نبیل پر نظر رکھے اور اگر وہ دوبارہ ون ویلنگ کرنے کی کوشش کرے تو وہ اسے بتائے تاکہ وہ اس کے ابو سے بات کر سکیں۔

ریحان کو نبیل پر بے حد غصہ آیا تھا مگر وہ ضبط کر گیا تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ ون ویلنگ ایک خطرناک کھیل ہے اور اس سے کئی جانیں جا چکی ہیں۔ ریحان نے سعدیہ کو فون کر کے اس کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے نبیل کو ون ویلنگ کرتے دیکھ کر اس کی امی کو آگاہ کر دیا تھا۔ ریحان نے نبیل کو یہ نہیں بتایا کہ اسے ون ویلنگ کرتے اس کی ہونے والی بھابی نے دیکھا تھا ورنہ اس کے دل میں سعدیہ کے لیے بدگمانی پیدا ہو سکتی تھی۔

نبیل نے بھی کافی سوچ بچار کی تھی کہ آخر اسے کس نے ون ویلنگ کرتے دیکھا تھا، کس نے اس کی شکایت اس کی امی سے کی تھی۔ اس نے ریحان سے بھی معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے ذہن اس خیال نے بھی سر ابھارا تھا کہ شاید ریحان بھائی نے اسے ون ویلنگ کرتے دیکھا تھا۔ نبیل نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ ون ویلنگ نہیں کرے گا۔ بزرگوں نے صحیح کہا ہے کہ اچھے دوست کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے اور برے دوست ہمیشہ بری لت ہی لگاتے ہیں۔

کچھ دن تو نبیل، ساجد سے نہ ملا اور نہ ہی اس نے ون ویلنگ کی لیکن پانچویں روز ساجد کی نبیل سے ملاقات ہوئی تو نبیل نے ساجد کو بتایا کہ اسے اس کے گھر والوں نے ون ویلنگ کرتے دیکھ لیا ہے اس لیے وہ آئندہ ون ویلنگ نہیں کرے گا۔

"نبیل۔ میرے گھر والوں کو بھی پتا ہے کہ میں ون ویلنگ کرتا ہوں لیکن انہوں نے تو آج تک مجھے نہیں روکا۔"

"تمہاری بات اور ہے۔ میرے والدین ڈرتے ہیں کہ مجھے کچھ ہو نہ جائے۔" نبیل نے جواباً کہا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میرے گھر والوں کو میری فکر نہیں ہے۔"

اس کی بات پر نبیل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"بہر حال میں آئندہ ون ویلنگ نہیں کروں گا۔ زاہد بھائی نے کہا ہے کہ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے ون ویلنگ کی ہے تو وہ نہ صرف ابو کو بتا دیں گے بلکہ مجھے آئندہ کبھی موٹر بائیک کو ہاتھ لگانے بھی نہیں دیں گے۔" نبیل نے ایک بار پھر اپنا فیصلہ دہراتے ہوئے کہا۔

"میری موٹر بائیک حاضر ہے۔"

"نہیں یار۔ سمجھا کرو۔"

"ارے یار۔ تم بھی ڈرپوک انسان ہو۔ کچھ نہیں ہوتا۔ آؤ چلیں۔" ساجد نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلیں؟"

"ون ویلنگ کرنے۔"

"لیکن....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم چلو۔" ساجد نے اس کی بات کاٹی۔

نبیل کے بار بار انکار کرنے کے باوجود ساجد اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ پولیس کو بھی ایسے لڑکوں کو گرفتار کرنے کا آرڈر تھا اس لیے وہ بھی ون ویلنگ کرنے والوں کی تلاش میں رہتی تھی۔ پھر جب پولیس کو اطلاع ملی کہ شہر کی معروف ترین سڑک پر کچھ لڑکے ون ویلنگ کر رہے ہیں تو پولیس کی بھاری نفری موقع پر پہنچ گئی اور انہوں نے تین لڑکوں کو ون ویلنگ کرتے ہوئے پکڑنے کی کوشش کی۔ اسی دوران ایک لڑکا فرار ہونے کی کوشش میں اپنی موٹر بائیک پر قابو نہ رکھ سکا اور ایک کار سے ٹکرا گیا جس کی وجہ سے وہ شدید زخمی ہوا اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ موقع پر موجود لوگوں نے اسے فوری طور پر اسپتال پہنچایا جبکہ تین لڑکے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے جن میں نبیل بھی شامل تھا۔ پولیس نے گرفتار لڑکوں کو نہ صرف تھانے میں بند کر دیا تھا بلکہ ان کی موٹر سائیکلیں بھی جمع کر لی تھیں۔ نبیل بے حد پریشان تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا کہ جیسے ہی اس کے گھر والوں کو اطلاع ملے گی کہ وہ ون ویلنگ کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے تو اس کے ابو بے حد غصہ ہوں گے اور اس کی امی بھی اسے ڈانٹیں گی۔ اب وہ بے حد پچھتا رہا تھا کہ کاش وہ ساجد کی باتوں میں نہ آتا مگر اب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ سوائے پچھتاوے کے کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا۔

☆.....☆

حمید صاحب اپنی کریانے کی دکان میں بیٹھے تھے کہ ان کے سیل فون پر ایک کال آئی۔ کال کرنے والے نے ارتھی اگروال نے صرف سولہ سال کی عمر میں پہلی فلم "پاگل پن" کی تھی۔ اس کا مستقبل بہت شاندار دکھائی دے رہا تھا لیکن اس نے اپنی صحت کا خیال نہیں کیا اور وزن بڑھتا چلا گیا جس کی وجہ سے اس پر بمبئی کے فلمی دروازے بند ہو گئے۔ (ہو سکتا ہے کہ یہی دل برداشتگی ہو کہ وہ ڈپریشن کا شکار ہو گئی۔) وہ ایک خوب صورت اور ذہین اداکارہ تھی۔ اس کی پیدائش 1984ء نیو جرسی امریکا کی تھی جہاں اس نے تعلیم حاصل کی۔ وہ عرف عام میں پٹاخا قسم کی تھی۔ اداکار سنیل سیٹھی امریکا ایک شو کے سلسلے میں گیا وہاں اس نے ارتھی اگروال کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس لڑکی کو اگر چانس مل گیا تو یہ بہت اچھا اضافہ ثابت ہو گی۔ ارتھی خود بھی اسی قسم کے کسی چانس کے انتظار میں تھی۔ اس میں ڈانس کی صلاحیت بچپن ہی سے تھی۔ سنیل نے اسی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اسے آفر کی تھی۔ شو کے منتظمین کو اس بات پر شک تھا کہ اتنی سی لڑکی اتنے بڑے شو میں کوئی پرفارم کر پائے گی لیکن سنیل نے انہیں یقین دلا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ارتھی کو ایک چانس ضرور دیں گے۔ شو شروع ہوا۔ ارتھی اسٹیج پر آئی اور اس نے پورے ہال پر اپنی مہارت ثابت کر دی۔ اس کا ڈانس ختم ہوا تو لوگ بے ساختہ تالیاں بجانے لگے۔ سنیل نے ارتھی کے باپ شاشانک کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ارتھی کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دے۔ شاشانک ایک بزنس مین تھا۔ امریکا میں اس کا ہوٹل کا کاروبار تھا۔ ارتھی کو اجازت مل گئی اور وہ ہندوستان آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے سولہ سال کی عمر میں اپنی پہلی فلم "پاگل پن" کی، یہ اس کی واحد ہندی فلم تھی۔ اس کے بعد وہ تیلگو فلموں کی طرف چلی گئی۔ وہ واحد ہندی بولنے والی اداکارہ تھی جس نے تیلگو فلم میں چرن جیت کے ساتھ کام کیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ زندگی سے مایوس ہو گئی۔ اخبارات کی رپورٹ کے مطابق اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی اور حیدرآباد کے ایک اسپتال میں اسے وینٹی لیٹر میں رکھا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ قدم محبت میں ناکامی پر اٹھایا تھا۔ اس نے ایک سوفٹ ویئر انجینئر سے شادی کی تھی لیکن یہ شادی چل نہ سکی۔ 2009ء میں طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد وہ بیمار پڑ گئی۔ اسے امریکا لے جایا گیا۔ نیو جرسی کے ایک اسپتال میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر 31 برس تھی۔

پوچھا۔ ”کیا آپ حمید علی بات کررہے ہیں؟“

”جی۔ میں حمید علی بات کررہا ہوں مگر آپ کون ہیں؟“

”میرا نام انسپکٹر اصغر ہے اور میں تھانے سے بات کررہا ہوں۔“

”جی کہیے۔ کس سلسلے میں آپ نے فون کیا ہے؟“ حمید صاحب نے چونکتے ہوئے کہا۔

”آپ کا بیٹا نبیل اس وقت ہماری تحویل میں ہے۔ آپ فوراً تھانے پہنچ جائیں۔“ انسپکٹر اصغر نے کہا تو حمید صاحب کے چہرے پر حیرت و پریشانی کے ملے جلے تاثرات پھیلتے چلے گئے۔

حمید صاحب بولے۔ ”میرا بیٹا نبیل آپ کی تحویل میں ہے۔ کیوں۔ اس نے کیا جرم کیا ہے؟“

انسپکٹر حمید نے جواباً کہا۔ ”آپ تھانے آجائیں، آپ کو آپ کے بیٹے کا جرم بھی بتادیا جائے گا۔“

”جی میں تھوڑی دیر تک پہنچ رہا ہوں۔“ حمید صاحب نے کہا اور پھر انہوں نے سیل فون آف کرکے اسے جیب میں رکھا اور دکان بند کرکے گھر آگئے۔ جب ان کی بیگم نے انہیں پریشان دیکھا تو ان سے وجہ دریافت کی۔ حمید صاحب نے جب بیگم کو بتایا کہ نبیل کو پولیس نے پکڑ لیا ہے تو ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ ان کا ذہن بے اختیار ون ویلنگ کی طرف چلا گیا۔ یقیناً وہ ون ویلنگ کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوگا۔ حمید صاحب نے بڑے بیٹے زاہد کو بھی فون کرکے بلالیا۔ زاہد بھی اپنی دکان بند کرکے گھر آگیا اور پھر دونوں باپ بیٹا تھانے پہنچے۔

”کس جرم میں آپ نے میرے بیٹے کو گرفتار کیا ہے؟“ حمید صاحب نے پوچھا۔

”آپ کا بیٹا ون ویلنگ کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔“

”ون ویلنگ۔“ حمید صاحب کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔ زاہد بھی چونک اٹھا تھا۔

”جی ہاں۔“ انسپکٹر اصغر نے اثبات میں سر ہلایا۔

حمید صاحب کشمکش میں پڑتے ہوئے بولے۔ ”انسپکٹر صاحب، آپ کو غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ میرا بیٹا ون ویلنگ نہیں کرتا۔“

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔“ انسپکٹر اصغر نے کہا۔ ”مجھے تو آپ پر حیرانی ہورہی ہے کہ آپ اس کے والد ہوتے ہوئے بے خبر ہیں کہ آپ کا بیٹا سڑکوں پر اپنے دوستوں کے ساتھ ون ویلنگ کرتا ہے۔“

حمید صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ بولے۔ ”انسپکٹر صاحب۔ میں واقعی اس بات سے بے خبر ہوں۔“ پھر انہوں نے زاہد کی طرف دیکھا۔ ”زاہد، کیا تمہیں معلوم ہے؟“

زاہد نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ابو۔ میں جانتا ہوں لیکن.....“

حمید صاحب کو غصہ آگیا اور وہ درشتگی سے بولے۔ ”اگر تمہیں معلوم تھا تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں نے نبیل کو سمجھایا تھا اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی بھی سڑکوں پر ون ویلنگ نہیں کرے گا اس لیے میں نے اعتبار کرلیا اور آپ کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔“ زاہد نے توجیہہ پیش کی تو حمید صاحب غصے کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ساجد کے ابو اور ایک اور لڑکے کے والدین بھی تھانے پہنچ گئے۔ وہ سب بھی اپنے بچوں کی حرکتوں سے لاعلم تھے۔ انسپکٹر اصغر نے تینوں لڑکوں کو اپنے کمرے میں بلایا تو ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور وہ شرمندہ شرمندہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ تینوں لڑکوں کے والدین اپنے اپنے بچوں کو غصیلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”دیکھو لڑکو! آج تو میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن آئندہ ون ویلنگ کرتے ہوئے پکڑے گئے تو پھر میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔“ انسپکٹر اصغر نے کہا۔ ”کیا تم جانتے نہیں ہو کہ ون ویلنگ کرنا ایک خطرناک عمل ہے۔ کئی لڑکے اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور آج بھی ایک لڑکے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے وہ اسپتال داخل ہے۔“ پھر وہ تینوں لڑکوں کے والدین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ بھی اپنے بچوں کے اس فعل کے ذمہ دار ہیں۔“

”ہم کیسے ذمہ دار ہیں انسپکٹر صاحب؟“ ساجد کے ابو نے کہا۔

انسپکٹر اصغر، ساجد کے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ آپ اپنے بچوں کو موٹر بائیک نہ دیں اور اگر دے دی ہے تو ان پر نظر رکھیں۔ ان کی دوستی کس قماش کے لڑکوں سے ہے، وہ کیا کرتے ہیں، کہاں جاتے ہیں۔ اگر آپ لوگ اپنے بچوں پر نظر رکھیں تو میرا خیال ہے کہ بچے معاشرتی برائیوں میں ہی نہ پڑیں گے۔“

انسپکٹر اصغر کی بات معقول تھی اس لیے وہ جواب نہ دے سکے۔ تینوں لڑکوں نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ون ویلنگ نہیں کریں گے اس لیے انسپکٹر اصغر نے انہیں چھوڑ دیا اور ان کے

والدین اپنے بچوں اور موٹر بائیکس لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ گھر پہنچتے ہی حمید صاحب نے نبیل کی اچھی خاصی کلاس لی اور آئندہ موٹر بائیک لے جانے پر پابندی لگادی۔

☆.....☆

چھ ماہ گزر گئے تھے۔ زاہد اور سعدیہ کی شادی ہوگئی تھی اور وہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ اس کی ممانی بے حد شفیق اور ملنسار خاتون تھیں۔ انہوں نے سعدیہ سے بہو کی بجائے بیٹی والا رویہ رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سعدیہ بھی اپنی ممانی اور ماموں کی بے حد خدمت کررہی تھی۔ اس کی ممانی نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے اپنی ساس نہیں بلکہ ماں سمجھے اور انہیں ممانی ہی کہا کرے۔ سعدیہ انہیں ممانی ہی کہہ کر بات کرتی تھی۔

جس دن سے نبیل تھانے ہو کر آیا تھا اسی دن سے اسے اس کے ابو نے موٹر بائیک لے جانے پر پابندی لگادی تھی۔ اس نے ساجد سے بھی ملنا جلنا کم کردیا تھا۔ اسے ایک اور دوست کی زبانی پتا چلا تھا کہ ساجد اب بھی ون ویلنگ کرتا ہے۔

ایک روز سعدیہ کو اطلاع ملی کہ اس کی امی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے تو سعدیہ بے چین ہوگئی۔ اس کا شوہر زاہد چونکہ شاپ پر گیا ہوا تھا اور گھر میں اس کی ممانی اور نبیل موجود تھے۔ اس نے زاہد کو فون کیا۔ ”زاہد، امی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ میں امی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“

زاہد نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”اوہ، کیا ہوگیا ہے انہیں؟“

”ابو نے بتایا ہے کہ اچانک انہیں چکر آیا ہے اور وہ گر گئی تھیں۔“ سعدیہ نے بتایا۔ ”انہیں بخار بھی ہوگیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم ابو سے کہو کہ وہ تمہیں چھوڑ آئیں۔“ زاہد نے کہا۔ ”شام کو میں وہیں آجاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابو سے بات کرتی ہوں۔“ سعدیہ نے کہا اور پھر وہ فون بند کرکے ممانی کے کمرے میں آگئی اور انہیں اپنی ماں کی طبیعت کا بتایا تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔ انہوں نے حمید صاحب کو فون کیا تو ان کا فون بند تھا۔ پھر انہوں نے نبیل کو بھیجا تو اس نے واپس آکر بتایا کہ اس کے ابو کی شاپ بند ہے اور وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔

”نبیل! تم اپنی بھابی کو موٹر بائیک پر بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آؤ۔“

”موٹر بائیک پر۔“ نبیل چونکا۔

”ہاں۔ میں تمہیں چابی دیتی ہوں۔“

”اگر ابو کو پتا چل گیا تو وہ میری کھال ادھیڑ دیں گے۔“

”میں انہیں سمجھا لوں گی۔“ اس کی امی نے کہا اور پھر انہوں نے دیوار میں ایک کیل پر لٹکی موٹر بائیک کی چابی اتار کر اسے دے دی۔ اس طرح وہ سعدیہ کو موٹر بائیک پر بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آیا۔ جب وہ واپس آرہا تھا تو راستے میں اسے کچھ لڑکے دکھائی دیئے جو ون ویلنگ کررہے تھے۔ ان لڑکوں کو ون ویلنگ کرتے دیکھ کر نبیل کا دل چاہا کہ وہ بھی ون ویلنگ کرے۔ کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ کچھ اسی طرح نبیل کے ساتھ بھی تھا۔ گو اس نے چھ ماہ پہلے انسپکٹر اصغر اور اپنے ابو کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ وہ ون ویلنگ نہیں کرے گا لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے بھی ون ویلنگ کرنی چاہئے۔ ویسے بھی اسے اب موٹر بائیک نہیں ملتی تھی اگر آج مل ہی گئی تھی تو اسے موقع کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے بھی موٹر بائیک کی رفتار تیز کرتے ہوئے ون ویلنگ شروع کردی۔ جب موت کا وقت آجائے تو اسے کوئی بھی نہیں ٹال سکتا خاص کر بے وقت موت، جس کا دوسرے انسان کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ ہوا یوں تھا کہ ون ویلنگ کرتے اچانک ایک گلی سے ایک اور موٹر بائیک آگئی تھی جس سے نبیل نے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ موٹر بائیک سنبھال نہ سکا اور دوسرے موٹر بائیک سے ٹکراتا ہوا اچھل کر سر کے بل سڑک پر گرا اور اسی لمحے ایک ٹرک اسے کچلتا ہوا گزر گیا۔ یوں نبیل بے وقت موت کے منہ میں چلا گیا۔ یہ خبر گھر آئی تو کہرام برپا ہو گیا۔ جوان بیٹے کی بے وقت موت پر والدین پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ نبیل کی ماں خود کو ہی اس کا ذمہ دار قرار دے رہی تھیں کہ انہوں نے ہی نبیل کو موٹر بائیک دی تھی۔ کاش اگر وہ نبیل کو موٹر بائیک نہ دیتیں تو وہ بے وقت موت کا شکار نہ ہوتا لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

آج نبیل زندہ نہیں ہے لیکن وہ نوجوان لڑکوں اور ان کے والدین کے لیے ایک مثال چھوڑ گیا ہے کہ خدارا، اپنے بچوں کو ون ویلنگ سے روکیں، ان پر نظر رکھیں اور انہیں بے وقت موت کا شکار نہ ہونے دیں۔ دیکھا جائے تو اس خطرناک کھیل میں نوجوانوں کے ساتھ ساتھ والدین بھی ذمہ دار ہیں۔ اگر والدین اپنے بچوں کو موٹر بائیک دیتے وقت ان پر نظر رکھیں اور ون ویلنگ کرنے سے روکیں تو کوئی بھی ایسے ہولناک سانحے کا شکار نہ ہو۔

میری گڑیا

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم
ایک دلچسپ سچ بیانی بھیج رہا ہوں جو میری اپنی ہے۔ میری بیٹی علیزہ کی ہے۔ میری بیوی عالیہ کی ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔
احمد توقیر
(کراچی)

روحیل نام تھا اس کا۔

وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ ہنڈسم۔ وہ عالیہ کا خالہ زاد بھائی تھا۔ اس نے زندگی امریکا میں گزاری تھی۔ ان دنوں اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں شرکت کرنے پاکستان آیا ہوا تھا۔

میں نے عالیہ کو اسی کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ شادی کی تقریب تھی۔ میں عالیہ کا شوہر تھا اسی لیے میں بھی اس شادی میں موجود تھا۔

میں ایک بزنس مین ہوں۔ اچھا خاصا کاروبار ہے میرا۔ معاشرے میں ایک حیثیت بھی ہے لیکن بس ایک کمی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں عالیہ کی طرح جوان اور خوبصورت نہیں ہوں۔

میری عمر چالیس کے لگ بھگ ہو چکی ہے۔ ہوتا بھی یہی ہے کہ جب انسان کامیابیاں حاصل کر لیتا ہے تو زندگی سے لطف اٹھانے کا ٹائم کم رہ جاتا ہے۔ وہ بہت تیزی سے اپنے انجام کی طرف سفر کر رہا ہوتا ہے۔

مجھ میں چاہے اور پچاس خوبیاں ہوں لیکن یہ کمی کیسے پوری ہو سکتی تھی؟

جبکہ میرے مقابلے میں عالیہ ایک جوان اور خوبصورت عورت تھی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک بچی کی ماں ہے۔ علیزا، ہماری بیٹی، ایک پیاری بیٹی۔ وہ ہماری جان تھی۔ ہم اس کو دیکھ کر جیتے تھے۔ عالیہ تو خیر اس کی ماں تھی لیکن خود میرا یہ حال تھا کہ اگر اسے ذرا بھی تکلیف ہوتی تو میں تڑپ کر رہ جاتا تھا۔

خاندان والے کہا کرتے تھے کہ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے عاشق ہیں۔ علیزا کا بھی یہی حال تھا۔ اگر کبھی میرے سر میں درد بھی ہوتا تو وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے میرا سر دبانے لگتی تھی۔ بابا جانی، بابا جانی کہہ کر مجھے پیار کرتی رہتی۔ میں اس کے لیے دن بھر بے چین رہتا۔ دفتر سے کم از کم دو بار عالیہ کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ کیسی ہے وہ؟ کیا کر رہی ہے۔ اس نے کچھ کھایا یا نہیں۔ اس کو پی نٹ بٹر بہت پسند ہے۔ وہ اس کے لیے رحمت سے منگوا لو وغیرہ وغیرہ۔ عالیہ کبھی کبھی تنگ بھی آجاتی تھی۔

''ارے بابا۔ ایسا کریں۔ آپ اسے اپنے ساتھ ہی آفس لے جایا کریں۔ خوامخواہ اتنی زحمت کرتے ہیں۔''

شام کے وقت ہم عام طور پر علیزا کو لے کر کہیں چلے جایا کرتے یا باہر کھانا کھا لیتے۔ زندگی بہت ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔

میں کبھی کبھی عالیہ کے ساتھ اس کے خاندان والوں میں بھی چلا جاتا۔ عالیہ مجھ سے روحیل کا ذکر کیا کرتی تھی۔ روحیل بہت اچھا ہے۔ بہت ذہین۔ بہت سمجھدار اور بہت ہینڈسم۔

میں چڑ جاتا۔ ''تو پھر تم نے اسی سے شادی کیوں نہیں کر لی؟''

''اس لیے کہ میری قسمت تو تمہارے ساتھ لکھی گئی تھی۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتا۔

اور یہ سب مذاق میں ہوا کرتا۔ ہم ایک دوسرے کو چھیڑا کرتے تھے۔ ویسے میں عالیہ پر بے انتہا بھروسا کرتا تھا۔ اور وہ بھی ایک شوہر پرست عورت تھی۔ جس طرح ہمارے یہاں کی عورتیں ہوتی ہیں۔ ماں باپ نے جس کے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ زندگی گزار دی۔

کبھی کبھی مجھے اس وقت ہلکا سا غصہ ضرور آتا جب راستہ چلتے ہوئے کوئی کمینہ صفت نوجوان ہم دونوں کو دیکھ کر آواز لگایا کرتا۔ ''لنگور کے پہلو میں حور'' یا اس قسم کی کوئی گھٹیا بات۔ اس وقت مجھے احساس ہوتا کہ میں شاید کبھی اس خلا کو پُر نہیں کر سکتا۔

بہرحال اس کے باوجود ہم خوش تھے۔

پھر یہ ہوا کہ ہماری اس زندگی کو نظر لگنی شروع ہو گئی۔

ایک بار ہم ساحل پر گھوم رہے تھے۔ علیزا ایک طرف ریت سے گھروندے بنانے میں لگی ہوئی تھی کہ ایک آدمی ہمارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک سادھو قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔

ہمارے یہاں عام طور پر ایسے لوگ دکھائی نہیں دیتے لیکن وہ ہمارے سامنے آگیا تھا۔

اس نے ہندوانہ دھوتی باندھ رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک لگی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے علیزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بچی تمہاری ہے نا؟''

''ہاں۔ ہماری ہے۔'' عالیہ نے تڑخ کر جواب دیا ''تم کو اس سے کیا؟''

''ناراض نہ ہو۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''اس کی حفاظت کرنا۔ حفاظت کرنا اس کی۔''

اس سے پہلے کہ خود میں بھی اسے غصے میں کچھ کہتا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ ویسے بھی اس نے ناراض کرنے والی کوئی بات نہیں کی تھی۔ ایک عام سی بات تھی۔ ہماری بیٹی پیاری ہی اتنی تھی کہ ہر کوئی یہی کہا کرتا۔ ''بھائی اپنی بیٹی کی نظر اتارتے رہنا۔ ماشاءاللہ۔ بہت پیاری ہے۔ خیال رکھنا اس کا۔''

اسی لیے اس سادھو نے بھی جو کہا تھا وہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔

ہم واپس آگئے۔ اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم پہلے بھی علیزا کا خیال رکھتے تھے۔ اب اور بھی رکھنے لگے۔

پھر یہ ہوا کہ عالیہ کے خالہ زاد بھائی کی شادی کا دن

آ گیا۔ عالیہ اس میں بہت مصروف ہوگئی۔ اس کی خالہ اسے ساتھ شاپنگ کے لیے لے جانے لگیں۔ اس گھر میں دو ہی بیٹے تھے۔ ایک شرجیل جس کی شادی ہو رہی تھی۔ دوسرا روحیل جو امریکا میں تھا۔ ان کے یہاں لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اسی لیے سارا کام عالیہ ہی کو کرنا تھا۔ یہ اس کی ذمے داری تھی۔

میں نے بھی اس لیے اجازت دے دی کہ عالیہ کی خالہ ایک بہت اچھی خاتون تھیں۔ بہت سمجھدار۔ کسی زمانے میں ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی تھیں۔ اسی لیے ان کے خیالات خاندان والوں سے مختلف تھے۔ میں بھی ان کا احترام کیا کرتا تھا۔

ہماری بیٹی علیزا ابھی ان سے بہت مانوس تھی۔

روحیل شادی سے ایک دن پہلے ہی امریکا سے پہنچا تھا۔ اسی لیے میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اس کو میں شادی کی تقریب ہی میں دیکھ سکا تھا۔ وہ واقعی ایک ہینڈسم شخص تھا۔ خوبصورت اور خوش مزاج۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ جن میں سینس آف ہیومر بہت زیادہ ہو۔ روحیل میں یہ خوبی تھی۔ اگرچہ وہ مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملا تھا لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔

میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ عالیہ اس کے آس پاس ہی تھی۔ حالانکہ اس تقریب میں اس کے اور بھی رشتے دار تھے لیکن عالیہ کی توجہ روحیل ہی کی طرف تھی۔ روحیل بھی آتے جاتے اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔

میرا موڈ خراب ہو گیا۔ میں نے عالیہ سے کہا۔ ”سنو۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم کسی کے ساتھ آ جانا۔“

”ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ عالیہ جلدی سے بولی۔ ”جب آپ جا رہے ہیں تو میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔“

”نہیں تم رک جاؤ۔“ میں نے کہا۔

لیکن وہ میرے ساتھ ہو لی۔ میں نے اسے محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ میری طبیعت کی خرابی کیا تھی یا میرا موڈ اچانک خراب کیوں ہو گیا تھا۔ میں کیا کہتا۔ ایسی کوئی بات ہی نہ تھی۔ علیزا بہت ڈس ہارٹ ہوئی تھی۔ ”بابا، اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں۔ ابھی تو میں سب کے ساتھ کھیل رہی تھی۔“

”بیٹے تمہارے بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا۔ اسی لیے جلدی جا رہے ہیں۔“ عالیہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بابا۔ سر میں درد ہو رہا ہے؟ میں دبا دوں؟“

اس وقت بہت پیار آیا تھا اس پر۔ کتنی پیار کرنے والی بچی تھی۔ گھر واپس آ کر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

دو چار دنوں کے بعد زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ میں نے بھی اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ اس کا کزن اتنے دنوں کے بعد ملک واپس آیا تھا تو اگر عالیہ نے اس سے ہنس بول کر بات کر لی تھی تو کیا ہو گیا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے اتفاقاً ان دونوں کو ایک مال سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ میں اس طرف سے گزر رہا تھا کہ ان پر نظر پڑ گئی تھی۔ علیزا کو ہم دو چار دنوں کے لیے اس کے چاچو کے گھر چھوڑ آئے تھے۔ اس نے وہاں جانے کی ضد کی تھی۔ وہاں اس کی عمر کے دو بچے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھیل کر بہت خوش رہا کرتی تھی۔

عالیہ اور روحیل ہنستے بولتے ایک دوسرے کے ساتھ میری گاڑی کے برابر سے گزر گئے۔ انہوں نے میری گاڑی پر دھیان نہیں دیا تھا۔

وہ دونوں آگے نکل گئے جب کہ میں بہت دیر تک اسٹیرنگ تھامے بیٹھا رہا تھا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی اٹھ رہی تھیں۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ۔ میں جیسا بھی سہی عالیہ کا شوہر تھا۔ ہر طرح اس کا خیال رکھتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں روحیل کی طرح خوش شکل نہیں تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں عالیہ کے کسی کام کا نہیں تھا۔ کیا نہیں تھا میرے پاس اپنا گھر، گاڑی، بینک بیلنس، اپنا بزنس، اور کیا چاہیے؟ یہ سوچ میرے ذہن کو برما رہی تھی پھر یہ عالیہ کن راستوں کی مسافر ہو گئی ہے؟

گھر واپس آیا تو خالی گھر کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ علیزا ابھی خالہ کے ہاں رکی ہوئی تھی اور عالیہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً روحیل ہی کے ساتھ ہو گی۔ کسی ہوٹل میں یا ساحل پر۔ دونوں دنیا بھر کی باتیں کر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ عالیہ اس بات کا رونا رو رہی ہو کہ اسے مجھ جیسا شوہر مل گیا تھا۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔

عالیہ کی واپسی نو بجے رات کو ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں تھا۔ وہ میرے سامنے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ خود ہی بتانے لگی تھی۔ ”توبہ ہے اس کو تو بچوں کی طرح چلانا پڑ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”کس کی بات کر رہی ہو؟“ میرا لہجہ خشک تھا۔

”ارے وہی روحیل، سارا دن اسی کے ساتھ نکل گیا۔ موصوف واپس جا رہے ہیں، امریکا کے دوستوں کے لیے شاپنگ کرتے پھر رہے ہیں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئی ہوں۔“

”پھر تو کھانا بھی کھا لیا ہوگا؟“ میرا لہجہ خشک ہی تھا۔

”ہاں اس نے زبردستی کھلا دیا تھا۔ میں آپ کے لیے کھانا لگا دیتی ہوں۔“ پھر اس نے ملازمہ کو آواز دینی چاہی تھی کہ میں نے منع کر دیا۔ ”رہنے دو۔ میں بھی کھا کر آیا ہوں۔“

اس نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک خلیج سی آتی چلی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی خلیج تھی جس کے بارے میں کسی سے ڈسکس بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

ہماری جان علیزا دو دنوں کے بعد واپس آ گئی تھی۔ میں اس کو سینے سے لگا کر بہت دیر تک کھڑا رہا تھا۔ وہ میرے گالوں پر بوسے دیتی رہی تھی۔

ایک دن عالیہ نے مجھ سے کہا۔ ”کیا بات ہے میں کچھ دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کچھ کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ آپ میں جو کھل مل جانے والی بات تھی وہ اب نہیں رہی۔“

”نہیں بھئی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ذرا اپنے معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔“

”کیسے معاملات؟“ اس نے پوچھا۔ ”آپ تو مجھ سے ہر معاملہ ڈسکس کرتے ہیں۔ اب کیا ہوا۔ ہاں ایک بات اور سن لیں۔ آپ کے موڈ کی اس تبدیلی کو علیزا نے بھی محسوس کر لیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ کتنی حساس اور ذہین بچی ہے۔“

عالیہ نے علیزا کے حوالے سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی کہ مجھے خود پر کنٹرول رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں عالیہ کو احساس دلا دوں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

عالیہ کے ساتھ میرا وہی رویہ رہا۔ میں واقعی اس سے کھنچ گیا تھا۔ عالیہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ علیزا ایک حساس لڑکی ہے۔ اس نے عالیہ سے میری کشیدگی محسوس کر لی تھی۔ اتنی کم عمر کسی لڑکی کا یہ احساس بھی کمال کا تھا۔

ایک دن وہ میرے پاس آ کر لیٹ گئی۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے میری جان۔ کیا سوچ رہی ہو؟“

”بابا جانی ایک بات تو بتائیں۔“ اس نے کہا۔ ”کیا آپ ماما سے ناراض ہیں؟“

”نہیں تو کس نے کہہ دیا؟“

”کسی نے نہیں کہا۔ مجھے ایسا لگا کہ آپ ماما سے ناراض ہیں۔“

”نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں۔“

”پھر آپ آفس سے آ کر ماما کے پاس کیوں نہیں بیٹھتے؟“ اس نے پوچھا۔

میں حیران ہو گیا۔ اس بچی نے کتنی چھوٹی سی بات نوٹ کر لی تھی۔ کیسا گہرا مشاہدہ تھا اس کا۔ اس نے دوبارہ وہی سوال کیا تو میں نے کہا۔ ”نہیں میری جان۔ میں کوئی ناراض نہیں ہوں۔ آج کل آفس میں کام بہت ہے۔ اسی لیے تھک جاتا ہوں۔ ماما کے پاس بیٹھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔“

پتا نہیں میں اسے مطمئن کر سکا تھا یا نہیں۔ لیکن اس کے بعد اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

زندگی کچھ دنوں تک اسی طرح چلتی رہی۔ روحیل ابھی واپس نہیں گیا تھا۔ عالیہ بھی اس کے ساتھ کئی بار باہر جا چکی تھی۔ ایک دن میں آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ علیزا سو رہی تھی۔

عالیہ نے مجھے بتایا۔ ”معلوم ہے آپ کو۔ ہم نے روحیل کے لیے لڑکی تلاش کر لی ہے۔“

”روحیل کے لیے لڑکی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا اسے شادی نہیں کرنی؟ وہ اتنی دور سے یہاں کس لیے آیا ہے؟ شادی ہی کرنے آیا ہے۔ بیوی کو لے کر واپس چلا جائے گا۔

اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے سے اندھیرے اچانک چھٹ گئے ہیں۔ میں نہ جانے کیا

سوچتا رہا تھا۔ کیسے کیسے خیالات ذہن میں آنے لگے تھے۔ اب سب کچھ صاف ہوگیا تھا۔ بہت نیچرل سی بات تھی۔ عام سی۔ روحیل عالیہ کا خالہ زاد تھا۔ ان دونوں نے بچپن ایک ساتھ گزارا تھا۔ دونوں کے درمیان دوستی یا انڈراسٹینڈنگ ایک عام سی بات تھی۔

کیا فرق پڑتا تھا۔ اگر عالیہ اس کے ساتھ گھومتی تھی۔ اس کو وقت دیتی تھی۔ میرا دماغ ہی خراب ہوگیا تھا کہ میں اس پر شک کرنے لگا تھا۔

لیکن میں نے عالیہ کو کچھ نہیں بتایا کہ میں کیا کیا سوچتا رہا ہوں؟

اصل کہانی دوسرے دن سے شروع ہوتی ہے۔ جب میں آفس میں تھا کہ علیزا کے اسکول سے میرے لیے فون آگیا۔ ''ہیلو۔ آپ علیزا کے فادر بول رہے ہیں؟'' کسی نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ میں علیزا کا فادر بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ علیزا کے اسکول آجائیں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''ایمرجنسی ہے۔''

گرچہ فون کرنے والے نے اور کچھ نہیں کہا تھا لیکن نہ جانے کیوں ریسیور رکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔ کسی انجانے اندیشے نے گھیر لیا تھا۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح گاڑی چلاتا ہوا علیزا کے اسکول تک پہنچا تھا۔

میں نے جب اپنا تعارف کرایا تو مجھے فوراً پرنسپل کے کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں پتا چلا کہ علیزا کو فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ کھیلتے کھیلتے جھولے سے گر پڑی تھی اور نہ جانے کہاں چوٹ آئی تھی کہ بے ہوش ہوگئی۔

اس خبر کو سنتے ہی میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ علیزا تو میری جان تھی، زندگی تھی میری۔ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔ رونے لگا تھا۔ پرنسپل نے کہا۔ ''دیکھیں آپ مرد ہو کر اس طرح رو رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ آپ خود اپنی مسز کو بلا لیں۔ ہم نے اسی لیے ڈائریکٹ آپ ہی کو فون کیا ہے۔''

پرنسپل نے بتایا کہ علیزا کس اسپتال میں ہے۔ میں نے عالیہ کو تفصیل تو نہیں بتائی۔ صرف یہ کہا کہ وہ اسپتال پہنچ جائے۔

اس نے علیزا کا نام سنتے ہی رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔

بہرحال میں پرنسپل کو لے کر اسپتال پہنچ گیا۔

مجھے فوری طور پر اس روم میں لے جایا گیا۔ جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کو خون دیا جا رہا تھا اور آکسیجن ماسک لگی ہوئی تھی۔ خود اندازہ کر لیں کہ اپنی جان کو اس حال میں دیکھ کر میرے دل پر کیا گزری ہوگی۔

اسی دوران عالیہ بھی پہنچ گئی تھی۔ اس نے علیزا کو دیکھتے ہی بلبلا کر رونا شروع کر دیا۔ خود میں بھی رو رہا تھا۔ علیزا کی ایکسرے رپورٹ یہ بتا رہی تھی کہ اس کے دماغ میں چوٹ لگی ہے اور ایک مشہور نیورو سرجن کو بلایا گیا ہے۔

میرے اور عالیہ کے کچھ رشتے دار بھی اس خبر کو سن کر اسپتال پہنچ گئے تھے۔ خبر ہی ایسی تھی جس نے سب کے ہوش اڑا دیے تھے۔ ہم اس کے بغیر کیسے زندہ رہتے؟ وہی تو ہماری زندگی میں اُمید کا سورج تھی۔

علیزا کو دوسرے دن ہوش آیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اپنی کمزور آواز میں پکارا۔ ''بابا جانی۔''

''ہاں میری جان۔'' میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''بابا جانی۔ آپ ماما کا ہاتھ تھام لیں۔'' اس نے کہا۔

میں اس کی فرمائش پر بلبلا کر رو دیا۔ اس کو اس وقت بھی اسی بات کا احساس تھا کہ میں شاید اس کی امی سے خفا ہوں۔ اسی لیے اس نے یہ فرمائش کی تھی۔

میں نے عالیہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ہماری گڑیا نے جب یہ دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اسی وقت اس کے سینے سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں۔ عالیہ روتی بلبلاتی ہوئی اس سے چمٹ گئی۔

میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے چیختا چلاتا ہوا ایک طرف بھاگا۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔

ہماری گڑیا شاید اسی لیے اب تک زندہ تھی کہ وہ ہمیں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے دیکھ لے۔ میں روتا رہا۔ بڑبڑاتا رہا۔ ''میری جان۔ میری جان۔ چلو میرے ساتھ۔ آنکھیں کھولو بیٹا۔ میں تمہیں سندباد لے چلوں گا۔''

لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ اس دیس میں جا چکی تھی جہاں پریاں رہتی ہیں اور جہاں پریوں کے خوبصورت بچے ہوتے ہیں۔ جہاں وہ پھول ہوتے ہیں جو ہماری گڑیا کو بہت پسند تھے۔

اسی لیے ہم اس کی ننھی سی قبر کو ان ہی پھولوں سے ڈھانپ کر رکھتے ہیں۔ آپ سب ہمیں دلاسا دیں اور یہ دعا کریں کہ خدا ہمیں قرار دے دے۔ سکون دے دے۔

خونِ ناحق

جناب معراج رسول
تسلیم
میں پیشے سے وکیل ہوں۔ دن بھر میرے پاس بھانت بھانت کے لوگ آتے رہتے ہیں ان سب کی دلچسپ کہانیاں ہوتی ہیں لیکن جس نوجوان کی کہانی میں سنانے جا رہا ہوں۔ یہ انوکھی ہے اسی لیے قلمبند کر کے بھیج رہا ہوں۔
مختار حسین ایڈووکیٹ
(سیالکوٹ)

اس نے راستے میں مجھے گھیر لیا۔

وہ ایک جنونی سا نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ گریبان پھٹا ہوا۔ بال الجھے ہوئے۔ آنکھوں سے وحشت ناچتی ہوئی۔

میں اس وقت عدالت جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ایک اہم مقدمے کی پیروی کرنی تھی۔ میں ایک جانا پہچانا وکیل ہوں۔ لیکن میری وکالت کی شہرت بہت مختلف ہے۔ میں ایسا کوئی کیس ہاتھ میں لیتا ہی نہیں ہوں جس میں

جھوٹ اور غلط بیانی کا شائبہ ہو۔

یہ میں اپنی تعریف نہیں کر رہا لیکن یہ سب میرے مزاج ہی میں نہیں ہے۔ بہرحال میں اس صبح گھر سے باہر آیا تو وہ نوجوان میرے رستے میں آ گیا۔

اس کی عمر زیادہ نہیں ہوگی۔ بیس بائیس کے درمیان ہوگی لیکن اس نے اپنا حلیہ عجیب بنا رکھا تھا۔

''تم وکیل ہو نا۔'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کچھ خوفزدہ ہو کر اپنی گردن ہلا دی۔ اس قسم کے لوگوں سے مجھے ہمیشہ وحشت سی ہوتی ہے۔ نہ جانے کس وقت کیا کر جائے۔

''وکیل صاحب میرا ایک کام کر دو گے۔'' اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔

''ہاں جلدی بتاؤ کیا کام ہے۔'' میں اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔

''خدا کے لیے مجھے پھانسی دلوا دو۔'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔ پھانسی دلوا دو مجھے۔''

اس کی اس انوکھی فرمائش نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ کون ایسا کہہ سکتا ہے کہ اسے پھانسی دلوا دی جائے۔

''بتاؤ مجھے پھانسی دلوا دو گے نا؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''نعیم کیا کر رہے ہو۔'' کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا۔ ایک آدمی بہت تیزی سے ہماری طرف آ رہا تھا۔ ''جاؤ۔'' اس نے قریب آ کر اس وحشت زدہ نوجوان سے کہا۔ ''جاؤ کیوں وکیل صاحب کو تنگ کر رہے ہو۔''

وہ وحشی نوجوان میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''وکیل صاحب اس وقت جا رہا ہوں لیکن آپ کو میرا یہ کام کرنا ہو گا، پلیز۔''

وہ چلا گیا اس کے جانے کے بعد وہ دوسرا آدمی مجھ سے معذرت کرنے لگا۔ ''معاف کیجیے گا وکیل صاحب، یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ہم سب اس کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ اچھا خاصا لکھنے پڑھنے والا نوجوان تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا ایک دم ہی بدل گیا۔ آپ اس کی کیفیت دیکھ رہے ہیں نا؟''

''میرا خیال ہے کہ کوئی ذہنی مرض لاحق ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پتا نہیں۔'' اس کے لہجے میں بے زاری تھی۔ ''ہم تنگ آ چکے ہیں۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے کبھی رونے لگتا ہے۔ کبھی خاموش ہو جاتا ہے۔ کئی کئی گھنٹوں تک چھت پر ٹہلتا رہتا ہے اور ہر ایک سے ایک ہی بات کہتا ہے کہ اسے پھانسی دلوا دیں۔''

مجھے اگرچہ دیر ہو رہی تھی۔ پھر بھی یہ معاملہ کچھ اتنا دلچسپ معلوم ہو رہا تھا کہ میں اس شخص سے باتیں کرتا رہا۔

''کیا آپ لوگوں نے کبھی اس سے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' میں نے پوچھا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔''

''بہت کوشش کی، پیار سے، نرمی سے۔ بچوں کی طرح پوچھتے رہے کہ خدا کے لیے بتاؤ کیا معاملہ ہے۔ لیکن وہ ہمیں کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب میں آپ کو ایک مشورہ دیتا ہوں۔ دیکھیں اس قسم کے معاملات کا علاج اسی طرح ہوتا ہے۔''

''جی فرمائیں۔''

''آپ اس سے کہیں کہ وکیل صاحب تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ یعنی وہ تمہیں پھانسی دلوا سکتے ہیں۔ تم ان سے جا کر مل لو۔ پھر جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اسے کریدکر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔'' اس نے پُرخیال انداز میں اپنی گردن ہلا دی۔ ''میں اسے آپ کے پاس بھیجنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اس گفتگو کے بعد میں اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دن بھر عدالت میں مصروف رہا۔ اس کے باوجود اس نوجوان کا خیال آتا رہا تھا۔ جس کی یہ خواہش تھی کہ اسے پھانسی دلوا دی جائے۔ اب اس کے اندر تو کوئی ماہرِ نفسیات ہی جھانک سکتا تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ شاید اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی جس کی تلافی وہ اس انداز سے چاہتا تھا۔

دو دنوں کے بعد نعیم میرے پاس آ گیا۔ میں اس وقت شام کی چائے پینے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو وہی کھڑا تھا۔

''السلام علیکم وکیل صاحب۔'' اس نے بڑے سلیقے سے سلام کیا۔

''اوہ تم۔'' میں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ ''آؤ

اندر آ جاؤ۔''

''وہ جھجکتا ہوا اندر آ گیا۔ میں نے اسے اپنی چھوٹی سی بیٹھک میں بٹھایا تھا جہاں ہر طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بہت دلچسپی سے ان کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں تمہارے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔''

''نہیں وکیل صاحب۔ کوئی تکلف نہ کریں۔''

''کوئی تکلف نہیں۔ یہ تو چائے کا وقت ہے اور ویسے بھی میں اکیلا چائے پیتا ہوا اچھا نہیں لگوں گا۔''

''چلیں جیسی آپ کی مرضی۔''

میں اس کے لیے چائے بنانے چلا گیا۔ چائے پلانے سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ کسی حد تک مجھ سے بے تکلف ہو جائے اور اپنی بات کہہ سکے۔ میں نے عام طور پر دیکھا ہے کہ چائے ایسا مشروب ہے جو برف کی چٹانوں کو بھی پگھلا دیتا ہے۔

چائے کے دوران میں اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کی سانسیں معمول سے تیز چل رہی تھیں۔ جیسے اس کے اندر کوئی طوفان برپا ہو۔ کوئی کشمکش ہو رہی ہو۔

چائے ختم ہونے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں تو نعیم میاں! تم نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے۔''

''وکیل صاحب آپ میری تعلیم کا ذکر رہنے دیں۔ بس میرا ایک کام کر دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔ مجھے کسی طرح پھانسی دلوا دیں۔''

''دیکھو اگر تم موت کے اتنے ہی خواہش مند ہو تو پھر خودکشی بھی زندگی سے نجات کا ایک طریقہ ہوتی ہے۔''

''نہیں میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں انصاف پا کر پھانسی پانا چاہتا ہوں۔''

''آخر کیوں۔ پھانسی تو اس کو ملتی ہے جس نے کسی کا خون کیا ہو۔''

''وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ میں نے بھی خون کیا ہے وکیل صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن کوئی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہے اور میں نے جس کا خون کیا ہے اس نے میرا جینا عذاب کر دیا ہے۔ اس کی روح ہر وقت میرے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔ مجھ سے پوچھتی ہے کہ اس نے ایسا کیا قصور کیا تھا جس کی اتنی بڑی سزا دی گئی؟''

میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا یعنی اس کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ تھا۔ اس کا ضمیر کسی جرم پر اسے ملامت کر رہا تھا لیکن کس جرم پر! یہ معلوم ہونا بہت ضروری تھا۔ اس کے بعد ہی اسے سمجھایا جا سکتا تھا۔

''اچھا چلو بتاؤ تم نے کس کا خون کر دیا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''شاہدہ نام تھا اس لڑکی کا۔'' اس نے بتایا۔ ''چھری کے وار کر کے اس کو مار دیا اور اس کے تڑپنے کی حالت میں اس کی وڈیو بناتا رہا موبائل کے ذریعے۔''

''میرے خدا! تم اس لڑکی کی بات تو نہیں کر رہے جس کی خبریں تمام اخباروں میں آئی ہیں اور ہر چینل پر دکھایا گیا ہے۔''

''جی ہاں میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔''

''لیکن اس بے چاری کو تو اس کے بھائی نے قتل کیا تھا۔ اور وہ نہ صرف گرفتار ہو چکا ہے بلکہ جرم کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔ (یہ خبر پچھلے دنوں ملک کے ہر اخبار میں شائع ہوئی اور ہر چینل پر دکھائی جاتی رہی ہیں)۔''

''ہاں بظاہر تو یہ قتل اس کے بھائی نے کیا ہے لیکن اصل مجرم میں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''چلو تم مجھے بتاؤ۔ یہ سب کیا ہوا۔'' میں نے پوچھا۔

پھر اس لڑکے نے جو کہانی سنائی وہ میں اس کے حوالے سے تحریر کر رہا ہوں۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن میں سوچ کے کئی دریچے کھل جائیں گے۔

☆.....☆

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہوگی۔

حالانکہ اس کا گھر ہمارے ہی محلے میں تھا۔ ہم برسوں سے ایک ساتھ رہتے تھے۔ اس کا بھائی منصور (فرضی نام) میرا دوست تھا لیکن میں نے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

منصور نے بتایا تھا کہ جب اس کی بہن تین سال کی تھی تو خالہ نے اسے گود لے لیا تھا۔ وہ لوگ لاہور میں رہتے تھے۔ خالہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے بہن کی بیٹی کو اپنے سینے سے لگایا اور اسے اپنی اولاد بنا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔

شاہدہ نے لاہور ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اس خاندان کی معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ خوب صورت، اسمارٹ، پڑھی لکھی، وہ کبھی کبھی کراچی اپنے والدین کے پاس بھی آتی لیکن یہ اتفاق ہے کہ وہ جب بھی آئی میں اسے دیکھ نہیں سکا۔

میرے دوست منصور کا خاندان بہت مختصر سا تھا۔

صرف دو بہن بھائی۔ یعنی منصور اور شاہدہ۔ ماں اور باپ۔ باپ ایک غریب آدمی تھا۔ وہ کسی فیکٹری میں کام کیا کرتا جب کہ منصور صرف آوارہ گردی کیا کرتا۔

دوستوں کا ایک حلقہ تھا۔ جس کا کام دن بھر اِدھر اُدھر گھومتے رہنا اور شام کے وقت کسی ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتا۔

منصور کو اپنی بہن پر بڑا ناز تھا۔ وہ جب بھی اس کا ذکر کرتا۔ فخر سے اس کی گردن تن جاتی تھی۔ وہ بتایا کرتا کہ اس کی بہن کتنی ذہین ہے۔ لاہور کے جس کالج میں وہ پڑھتی ہے اس کالج میں اس کی دھوم مچی رہتی ہے اور اس کا ارادہ آگے چل کر بڑی آفیسر بننے کا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ہم سب اس کی باتیں سن سن کر حیران ہوا کرتے اور اس کی بہن کی قسمت پر رشک کرتے کہ اس کو آگے بڑھنے کا اتنا اچھا ماحول ملا ہے۔

پھر ایک دن منصور نے یہ خبر سنائی کہ لاہور میں اس کی خالہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی بہن چونکہ اپنے خالو کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے وہ کراچی آ رہی ہے۔

پھر اس کی بہن کراچی اپنے والدین کے گھر آ گئی اور میں نے پہلی بار اس لڑکی کو دیکھا۔

وہ خوب صورت لڑکی تھی۔ جیسا صفدر بتایا کرتا۔ اسمارٹ، ماڈرن وہ اس گھر کی لگتی ہی نہیں تھی۔ اس کی ڈریسنگ اس کی چال ڈھال اس علاقے کی تمام لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔

وہ مجھے پہلی ہی نگاہ میں پسند آ گئی تھی ہر وقت اس کا خیال رہنے لگا تھا۔ یہاں آ کر بھی اس نے کالج جوائن کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے تعلیمی سفر کو آگے تک لے جانا چاہتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے شاہدہ کے بارے میں اس کے بھائی صفدر سے بات کی تو وہ ہتھے سے اکھڑ جائے گا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ لوفروں کے گروہ کا کوئی لوفر اس کی بہن کو اپنانے کی خواہش کرے کیونکہ ہم سب بس یوں ہی تھے۔ تعلیم وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ جب کہ شاہدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

اس کے علاوہ وہ خوب صورت، اسمارٹ اور ذہین تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ صرف ایک طریقہ تھا کہ شاہدہ سے کسی طرح دوستی کر لی جائے۔

اس کے لیے پلاننگ کی ضرورت تھی۔ ورنہ تو وہ ایک مضبوط کردار کی لڑکی تھی۔ گلی سے سر جھکا کر گزر جاتی اور اسی طرح واپس آتی۔

پھر میں نے تھوڑی سی ہمت کی اور ایک دن جب وہ کالج سے گھر واپس آ رہی تھی تو میں نے گلی کے کونے میں اس کو روک لیا اور بڑے مہذب انداز میں اس کو سلام کیا تھا۔

وہ حیران ہو کر رک گئی تھی۔

اس وقت دوپہر کی وجہ سے گلی میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سناٹا تھا۔ ''میرا نام نعیم ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔ ''میں صفدر کا دوست ہوں۔''

اس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا تھا۔ ''جی فرمائیں۔'' اس نے پوچھا۔ ''کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟''

''میں نے سنا ہے کہ آپ کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تو میں آپ سے اس سلسلے میں مدد لینا چاہتا تھا۔''

''میں سمجھی نہیں، کیسی مدد؟''

''دیکھیں میرا معاملہ یہ ہے کہ میرا لکھنے پڑھنے کا دل نہیں چاہتا۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا ٹوٹکا ہے کہ جس پر عمل کر کے میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ سکوں۔''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی لیکن اس نے صرف اتنا کہا۔ ''جی نہیں ایسا کوئی ٹوٹکا میرے پاس نہیں ہے۔ آپ صرف پڑھنے کی کوشش کریں۔ آپ کا دل لگ جائے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ پہلی ملاقات میں اتنی باتیں میں نے کر لی تھیں۔ میرے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ میں پوری ہوشیاری اور پلاننگ کے ساتھ اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔

بس ایک خدشہ یہ تھا کہ اب کہیں منصور سے ذکر نہ کر دے۔ خواہ مخواہ اس کے سامنے شرمندگی ہو جاتی اور اگر ذکر بھی کر دیا تو بھی میں نے ایسی کوئی خاص بات تو نہیں کی تھی لیکن شام کو جب صفدر سے ہوٹل میں ملاقات ہوئی تو اس نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یعنی سب خیر تھی۔

ایک دن میں پھر اس طرح راستے میں اس سے ملا جیسے اتفاقاً بھیڑ ہو گئی ہو۔ اس وقت میرے ہاتھ میں کچھ کتابیں تھیں جو میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ رکھ لی تھیں۔

''شاہدہ تم چاہے کوئی ٹوٹکا بتاؤ یا نہ بتاؤ، میں نے اپنی پڑھائی شروع کر دی ہے۔''

''چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر آگے

جانے لگی۔

میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''شاہدہ ایک بات تو سنتی جاؤ۔''

''جی فرمائیں۔'' وہ رک گئی تھی۔

''اگر تم کہو تو میں منصور سے بات کر لوں۔''

''بھائی سے بات؟ کون سی بات؟'' اس کے تیور بدل گئے تھے۔

''یہی کہ مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔'' میں نے فوراً بات بدل دی۔ ''اگر تم مجھے گائیڈ کر دیا کرو تو میں تمہارے پاس آ جایا کروں۔''

''دیکھیں۔'' اب اس کا لہجہ روکھا ہو گیا تھا۔ ''میرے پاس خود اپنی پڑھائی کے لیے فرصت نہیں ہے۔ آپ کے لیے میں کچھ نہیں کر سکوں گی اور ہاں ایک بات اور پلیز آئندہ سے اس طرح راستے میں روک کر مجھے پریشان نہیں کریں گے۔''

وہ پھر تیزی سے آگے چلی گئی اور میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اس کی بات سن کر اور اس کا رویہ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی تھی۔

وہ اپنی کہانی سناتے سناتے خاموش ہو گیا۔ شاید وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اب تک جو کچھ بتایا تھا اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

لڑکے اسی طرح لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں اور ان سے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی اب تک اس کی کہانی میں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی لیکن اس کا لہجہ یہ بتا رہا تھا کہ اس کا پاگل پن یوں ہی نہیں ہے کہانی کچھ اور ہے اور وہ کہانی سامنے آنے والی تھی۔

پھر وہ کہانی سامنے آ گئی۔ جب اس نے بتایا۔ ''وکیل صاحب! میرا دماغ اس وقت پھر گیا جب میں نے شاہدہ کو ایک نوجوان کے ساتھ دیکھ لیا۔ وہ دونوں شہر کے ایک مشہور پارک میں تھے اور میں بھی وہاں اپنے آپ کو بہلانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے شاہدہ کو اور اس نوجوان کو ایک ساتھ ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔''

''کیا تم اس لڑکے کو نہیں جانتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب اس کو پہلی بار دیکھا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس لیے تو میرے بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میرے سامنے اور محلے میں تو بہت ستی ساوتری بنی پھرتی تھی لیکن محلے سے باہر اس کا یہ حال تھا۔ وکیل صاحب وہ دونوں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: شمر عباس فون نمبر: 0301-2454188
سرکولیشن مینجر ..... سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے اور میرے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر ٹوٹ پڑوں اس پر۔ اس وقت مارے غصے اور حسد کے میری آنکھ پر پٹی سی بندھ گئی تھی۔

''یہ تمہاری کہانی میں ایک نیا موڑ ہے۔ یعنی اس مقتولہ لڑکی کا کسی سے تعلق بھی تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ بعد میں بتاؤں گا وکیل صاحب کہ کہانی کیا تھی۔'' وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''اس وقت کی بات تو یہ تھی کہ جو کچھ بھی میں دیکھ رہا تھا۔ وہ میری برداشت سے باہر تھا۔

''اب میرے پاس اس لڑکی کو ننگ کرنے یا بلیک میل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آگیا تھا۔'' اس نے پھر سے بتانا شروع کیا۔ ''ایک بار میں نے اسے پھر راستے میں گھیر لیا۔''

''ہاں جی پارسا بیگم۔'' میں بہت طنز سے بولا۔ ''کیا حال ہیں تمہارے۔''

اس بار وہ بھڑک اٹھی۔ ''کیا بکواس ہے۔ کیا چاہتے ہو تم؟ میں بھائی سے تمہاری شکایت کروں گی۔''

''اور منصور کو یہ بھی بتا دینا کہ نورانی پارک میں اس شام تم کس کے ساتھ موج مستیاں کررہی تھیں۔''

''ذلیل انسان۔'' وہ غصے سے اور تپ گئی۔ ''بلیک میل کرنے آئے ہو۔ جاؤ بول دو بھائی سے۔''

''وکیل صاحب اس نے مجھے اتنا بھڑکا دیا تھا کہ اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ میں منصور کو ہوٹل سے اٹھا کر ایک طرف لے آیا تھا۔ وہ بہت حیران ہو کر میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ ''کیا بات ہوگئی یار! جو کچھ کہنا ہے سب کے سامنے کہہ دو۔''

''نہیں یار! بات ایسی ہے کہ میں سب کے سامنے نہیں بتا سکتا تھا۔'' میں ہمدردانہ لہجہ بنا کر بولا۔

''آخر بات کیا ہے۔''

''یار مجھے معاف کرنا کہ میں یہ سب کہہ رہا ہوں لیکن کیا کروں تمہاری عزت کا معاملہ ہے اور تمہاری عزت میری عزت ہے۔ یار تمہاری بہن پرسوں کسی نوجوان کے ساتھ.....'' میں خاموش ہوگیا۔

اس نعیم کی کہانی اب کسی حد تک سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس نے کیسی آگ لگائی ہوگی۔ اس کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''کیا کہا تھا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔

''وکیل صاحب! میں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کوئی بھی بھائی اپنی بہن کے لیے سننا گوارا نہیں کرتا ہے۔'' اس نے اپنی گردن جھکالی۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟ تم نے اس بے چاری لڑکی کا مرڈر کروادیا۔''

''وکیل صاحب! خدا گواہ ہے کہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کا بھائی اتنی بے دردی سے اس کو مار دے گا۔'' اس نے کہا۔

''لعنت ہو تم پر۔ تم واقعی اس قابل ہو کہ تمہیں پھانسی دے دی جائے۔ اس لڑکی کے اصل قاتل تو تم ہو۔'' میں غصے سے بھڑک اٹھا تھا۔ ''اس لڑکی پر چھریاں اس کے بھائی نے نہیں تم نے چلائی تھیں۔ ہاتھ تو اس کے تھے لیکن ان ہاتھوں کو حرکت دینے والے تم تھے۔''

وہ رونے لگا تھا۔

''وکیل صاحب! مجھے دو صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ پہلا صدمہ تو اس لڑکی کا قتل تھا اور دوسرا صدمہ اس نوجوان کا تھا جس کے ساتھ میں نے شاہدہ کو دیکھا تھا۔''

''کیوں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''وکیل صاحب! وہ اس کا منگیتر تھا۔ دونوں کی منگنی ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس نوجوان کا رونا اور تڑپنا دیکھ کر ہو رہا تھا۔ وہ اس کے جنازے میں شریک ہوا تھا اور جب مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوا تو پھر میں کہیں کا نہیں رہا وکیل صاحب، کہیں کا نہیں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں اصل قاتل تو خود میں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے پھانسی دلوا دیں وکیل صاحب۔ پھانسی دلوادیں۔''

میں نے اسے جھڑک کر بھگا دیا۔ مجھے اس سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس کی کہانی تو ختم ہوگئی تھی لیکن کیا اس قسم کی کہانیاں ہمارے معاشرے سے ختم ہوسکتی ہیں؟

کتنی نصیحتیں ہیں نعیم کی کہانی میں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ کسی کو آگ لگانے کا حق نہیں پہنچتا ایسے کتنے لوگ ہوتے ہوں گے جو اس انداز سے کسی کو بھڑکا کر کسی کی بہن، بیوی یا بیٹی پر بہتان تراشتے ہیں۔

اور ایسے کتنے ہوں گے جو ذرا ذرا سی بات پر بغیر تحقیق کیے اپنی جہالت میں بھڑک جاتے ہیں اور اتنی بے دردی سے کسی کا خون کردیتے ہیں اور سب سے اہم بات ہے کہ اس طرح خون کرنے کا حق انہیں کس نے دیا ہے۔

اکتوبر کی آمد آمد تھی خزاں اپنے پورے جوبن پر تھی جو سبز پتوں کو زردی میں منتقل کررہی تھی۔ اکتوبر کا وسط تھا اس لیے ہوا میں خنکی شامل تھی لیکن ابھی پہاڑ کے باسیوں کا موسم سرما کے استقبال کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ ابھی تو فراغت کے دن تھے جس میں شادی بیاہ کی تقریبات عروج پر ہوتی ہیں۔ ہر رات دور کسی نہ کسی وادی سے ڈھول باجے کی آواز سنائی دے جاتی اور اگر منظر صاف ہوتا تو ٹمٹماتی برقی روشنیاں بھی جگمگ جگمگ کرتی نظر آجاتیں۔

رسمِ بے رحم

جناب مدیر
السلام علیکم
ہم کس طرف جارہے ہیں اس کا مطلق احساس نہیں۔ جھوٹے نام و نمود کی خاطر کیسے کیسے کام کررہے ہیں۔ خونی کھیلوں کو رسم قرار دے کر ہم اپنی تباہی کا سامان کررہے ہیں۔

حماد سکندر عباسی
(مری)

ان پہاڑوں کے باسی جفاکش ہوتے ہیں اس لیے ان کا ذریعہ معاش سیر وسیاحت پر منحصر ہے۔ سبھی سیزن کا انتظار کرتے ہیں کیونکہ سیزن میں سیاح آتے ہیں اور مقامی ہوٹلوں والے، دُکانوں والے، گاڑیوں والے حتیٰ کہ چھابڑی والے بھی سیزن میں خاصی کمائی کر لیتے اور اس کمائی سے سال بھر کا گزارہ ہو جاتا ہے۔

ہر سال کی طرح اس بار بھی اکتوبر کے اوائل میں سیاحوں کا رش کم پڑ گیا اور مقامی لوگوں کی شادیوں اور دیگر تقریبات کا سیزن عروج پکڑ گیا۔ اب کی بار درزیوں، زری ہاؤس والوں، بوتیکس اور جوتوں والوں کا سیزن شروع ہوا تھا۔

اکتوبر کی اکیسویں شب رات ایک بجے دروازے پر دستک ہوئی تو زاہدہ نے بلا تاخیر دروازہ کھول دیا۔ زاہدہ اپنے بیٹے کے انتظار میں نہ جانے کب سے بیٹھی تھی۔ وہ عام طور پر رات گئے ہی گھر لوٹتا تھا اور ہمیشہ زاہدہ کو اپنا منتظر پاتا۔ وہ اسے کھانا کھلانے کے بعد ہی سوتی تھی۔ وہ بارہا اسے اپنا انتظار نہ کرنے کا کہہ چکا تھا لیکن ماں کی آنکھوں میں نیند بیٹے کی دید کے بغیر اترتی ہی نہ تھی۔

ہمیشہ کی طرح عامر نواز آج بھی تھکا ہارا داخل ہوا تھا تو دعائیں دیتے ہوئے اس نے عامر کے ماتھے پر بوسہ دیا اور حال احوال پوچھنے لگی۔

عامر نے جواب دیتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑا شاپر ماں کی طرف بڑھایا۔ زاہدہ کی نظر پھلوں پر پڑی تو چونک گئی۔

"آئے ہائے آج پھر یہ اُٹھا کر لے آئے؟ کتنی بار تجھے منع کیا کہ نہ لایا کر یہ مہنگا پھل، مجھے نہیں اچھا لگتا۔"

زاہدہ دل کی مریضہ تھی۔ اسے چند دن پہلے ہی ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور مرتے مرتے بچی تھی۔ دوا کے ساتھ ساتھ ڈاکٹرز کی ہدایات تھیں کہ خون کو پتلا رکھنے کے لیے زاہدہ کو انار کا جوس اور ثابت انار ضرور لینا چاہیے۔ تین سو روپے کلو انار اور مہنگے جُوس کے ڈبوں کو دیکھ کر اسے اپنے غریب کُنبے جگر پر ترس آتا تھا۔

زاہدہ اپنے بیٹے کے خیال کو فضول خرچی کا نام دیتی اور پھر آخر خود کو اور اپنی بیماری کو کوسنا شروع کر دیتی۔ زاہدہ اکثر کہتی کہ یہ سب مصیبتیں اور تنگی میری وجہ سے ہے۔ عامر نواز نے اپنی ماں کی آنکھوں میں نمی دیکھی تو گویا ہوا۔ "ارے ماں کیوں فکر کرتی ہے۔ تُو بھول گئی۔ آج سستا بازار لگتا تھا اور سارا پھل وہیں سے آدھی قیمت پر لایا ہوں اور آدھے پیسے یہ دیکھ ابھی بھی جیب میں پڑے ہوئے ہیں۔"

عامر نواز ماں کو تسلی دینے کے لیے اپنی جیب سے پرانا پھٹا ہوا بٹوہ کھول کھول کر دکھا رہا تھا جس میں چند لال نوٹ پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ عامر نواز کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی۔ زاہدہ کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر اس نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ "ماں! اب رونا دھونا ہی رہے گا یا کھانے کا بھی پوچھو گی، بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

زاہدہ انتہائی سرعت سے اٹھی اور سالن گرم کرنے لگی۔ سالن میں آج بھی دال بنی تھی جس کو ابھی ختم ہونے میں دو دن مزید باقی تھے۔ عامر نواز ہاتھ دھو کر کرسی پر بیٹھا کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ درحقیقت اسے کھانے کی چاہ نہیں تھی لیکن ماں کو خوش دیکھنے کے لیے وہ اپنی سی سعی کر رہا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کے پیٹ بھرنے سے ماں کے دل کو راحت پہنچے گی۔

"ماں بس تُو ساری فکریں چھوڑ دے میں سب کر لوں گا۔ بس تو وقت پر دوا لیتی رہ اور روز انار کا جوس ضرور پی تاکہ تو جلد صحتیاب ہو جائے۔" دو چار نوالوں کے بعد عامر نواز نے موقع پاتے ہی ماں کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔

اس کی ماں اس کی ہدایات کے جواب میں خاموشی سے ٹکر ٹکر اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ عامر نواز نے ماں کو خاموش دیکھا تو پھر گویا ہوا۔ "ماں آج کل کام دھندا اچھا چل رہا ہے۔ شادیوں کا سیزن ہے۔ ہر روز دو تین شیروانیاں، گھسے اور دلہن کے جوڑے نکل جاتے ہیں۔ بس تو دعا کر ماں! کام اچھا رہے تو بہت جلد لینٹر ڈال دیں گے۔"

اُن کا تین کمروں کا نیا مکان ابھی چھت کے بغیر تین سالوں سے ویسے ہی پڑا تھا۔ تین سال ستونوں کو کھڑے ہوئے ہو چکے تھے، گزشتہ برس دیواریں کھڑی ہوئیں اور اب عامر نواز انتہائی کسمپرسی میں چھت یعنی لینٹر کی تیاری میں تھا لیکن زاہدہ کی بیماری نے اس کے منصوبے کو لٹکا دیا تھا۔

"آئے ہائے کیا کیا کرے گا تُو؟ چل اچھا ہے تیرا کام تو اچھا چل رہا ہے نا! بس ہر وقت تیرے لیے ہی دعائیں کرتی رہتی ہوں، اللہ تمھیں ضرور کامیاب کرے گا۔"

☆.....☆

"میں کب سے کہہ رہی ہوں مجھے جاب کرنے کی اجازت دے دیں لیکن نہیں! اس گھر میں میری کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ اس گھر کے اخراجات کو کم کرنے میں کوئی حصہ ڈال سکوں۔ پلیز مجھے کام کرنے دیں نا

بھائی!" ماں بیٹا باتیں کرتے یک دم چونک کے پیچھے مُڑے تو گُویا پر نظر پڑی وہ نیند سے بیدار ہو کر دروازے میں کھڑی تھی۔

زاہدہ کو اس کی اچانک آمد پر غصہ آیا تھا لیکن عامر نواز نے اس کی بات کو مسکراہٹ میں گم کر دیا۔

گُویا سترہ سال کی لڑکی تھی جس نے تازہ تازہ ایف ایس سی کیا تھا اور اب وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں بطور استانی پڑھانا چاہتی تھی۔ عامر نواز نے آج پھر گُویا کی بات ان سنی کر دی اور ماں کو سلام کر کے اپنے بستر پر جا لیٹا۔ پھر چند ہی لمحوں میں عامر نواز ٹوٹے سپنوں کا بار اُٹھائے تھکن کی لوری سے گہری نیند میں چلا گیا۔

☆.....☆

عامر نواز پینتیس سالہ نوجوان تھا جس کی شادی کے ابھی دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اُس کے ہم عمر تمام دوستوں کے اب دو دو بچے تھے لیکن گھر کی ذمہ داریوں اور ماں کی بیماری نے اس کے مالی حالات کمزور کر دیے تھے۔ اُس کے والد نواز خان دس سال پہلے ایک حادثے میں راہیٔ اجل ہو چکے تھے۔ چھوٹی بہن گُویا جو پڑھی لکھی تھی اس کی ابھی شادی ہونا باقی تھی۔ بڑی بہن رضیہ کو طلاق ہو چکی تھی اور وہ بھی واپس اپنی ماں کی دہلیز پر آ بیٹھی تھی۔ رضیہ کو وقت کے جبر نے دنیا سے کنارہ کش کر دیا تھا وہ کسی بھی معاملے میں بہت کم دلچسپی لیتی تھی۔

عامر نواز کا ایک بڑا بھائی ناصر نواز بھی تھا جو ایک اسپتال میں ملازمت کرتا تھا۔ ناصر نواز کے دو بچے تھے وہ اپنی فیملی کے ساتھ الگ گھر میں رہتا تھا۔ عامر نواز ایک زری سینٹر میں بطور سیلز مین ملازمت کرتا تھا جس میں شادی بیاہ کے کپڑے جوتے اور دیگر سجاوٹ کا سامان بکتا تھا۔ عامر نواز کی کمائی شادی بیاہ کے سیزن میں اچھی ہوتی تھی وہ اسی کمائی کے بل بوتے پر اپنے سارے اخراجات کا نظم سنبھالتا تھا۔ ناصر نواز کے بچے مہنگے اسکول میں پڑھتے تھے اور اس کی بیوی نادیہ کے اپنے منصوبے اس قدر لمبے چوڑے تھے کہ وہ چاہ کر بھی چھوٹے بھائی عامر نواز کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

عامر کی بہن گُویا انتہائی ذہین لڑکی تھی۔ اس نے ہمیشہ اسکول اور کالج میں اچھے نمبر لیے تھے۔ اب وہ پڑھانا چاہتی تھی تاکہ اپنے بھائی کا سہارا بن سکے۔ گُویا صرف نام کی گُویا نہیں تھی بلکہ اسم بامسمّیٰ تھی۔ وہ دودھ جیسی سفید رنگت کی حامل، نازک اندام، بھورے بال، لامبا قد، تیکھے نقوش اور گہری آنکھوں والی ایک خوبرو لڑکی تھی۔ اس کی شادی بھی عامر نواز کے لیے ایک الگ معما تھا۔ اس کے متعدد رشتے آ چکے تھے لیکن وہ شادی کے لیے بالکل انکاری تھی۔ عامر نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھر سے باہر نکلے اور کوئی بری نظر سے اس کی بہن کو دیکھے۔

زری سینٹر جہاں شادی بیاہ کے جوڑے، دلہن کے لہنگے، دولہے کی شیروانی، کھسے، جیسا ہر وہ سامان بکتا تھا جس کی شادی بیاہ والے گھر ضرورت ہوتی تھی۔ سجاوٹ کے لیے مصنوعی پھولوں کی لڑیوں سے لے کر دلہن کے کمرے کی تزئین و آرائش تک ہر سامان اس دکان میں موجود تھا۔ عامر نواز اسی سینٹر میں ملازم تھا اور عرصہ دس سال سے اسی سینٹر نے اس کے گھر کے اخراجات کو سنبھالا دیا ہوا تھا۔ گھر کا خرچ تو جیسے تیسے چل رہا تھا لیکن فی الحال اسے ایک بڑا مسئلہ درپیش تھا اور وہ تھا زیرِ تعمیر مکان کی تکمیل۔

☆.....☆

چند دن بعد عامر نواز نے اپنی پختہ چھت کا میٹیریل خریدنے کا ارادہ کیا اور ریت، سیمنٹ، سریے کا بھاؤ جاننے کے لیے اپنے ایک عزیز خورشید کے ہمراہ نکل پڑا۔

"یار عامر تیرے پاس کتنے پیسے ہیں جو تم نے سامان خریدنے کی تیاری کر لی ہے۔" خورشید نے رستے میں اس سے استفسار کیا۔

"بھاؤ پتا چلے تو دیکھتے ہیں۔" عامر پُرسوچ انداز میں بولا۔

"دیکھ عامر اپنا تجربہ ہے کہ سب سے پہلے سریا لے لو پھر دوسرا سامان لینا کیونکہ وہ مہنگا ہوتا ہے۔ اپنا تجربہ ہے سریا لے لیا تو باقی کام سرجائے گا۔" خورشید نے مطلوبہ سامان کی دکان پر پہنچنے سے پہلے مشورہ دینا ضروری سمجھا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد عامر نواز اور اس کا دوست خورشید ماتھے سے پسینا صاف کرتے ہوئے دکان سے نکلے۔ عامر نواز کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے لرزتی آواز میں بولا۔

"یار مجھے نہیں لگتا کہ اس بار بھی میں چھت ڈال سکوں گا۔ میں تو سارے سامان کا آرڈر دینے آیا تھا لیکن یہاں تو سریا بھی خریدنا بجٹ سے باہر ہے۔ حد ہے یار مہنگائی کی بھی!"

خورشید نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اسے فی الوقت صرف سریا لینے کا مشورہ دہرایا اور باقی کا میٹیریل بعد میں خریدنے کا کہا، تاکہ وہ موجودہ جمع ہوئے پیسوں سے کم از کم سریا تو خرید لے۔ خورشید یہ جانتا تھا کہ اگر

اس نے سریا لینے کا ارادہ ترک کردیا تو یہ پیسے بھی اس کے کسی اور کھاتے میں ضائع جائیں گے۔ عامر نواز کو خورشید کا مشورہ بہتر لگا تھا۔

"ٹھیک ہے یار! دو دن بعد ہفتہ اتوار کو خان صاحب کے بڑے بیٹے کی شادی ہے۔ خان صاحب خود آئے تھے اور ایک لمبا چوڑا آرڈر دے گئے ہیں۔ مالک نے مجھے ہی ان کے گھر کی سجاوٹ اور دیگر سامان تیار کرنے کا کہا ہے۔ اب سریا ان کی شادی کے بعد ہی خریدیں گے کیونکہ بہت کام ہے۔" عامر نواز نے گویا خورشید کو حتمی فیصلہ سنا دیا اور پھر خان صاحب کے بڑے بیٹے سلمان کی شادی والے پروجیکٹ پر مصروف ہو گیا۔

عامر نواز نے اسلام آباد کے معروف زری سینٹر سے سلمان کے لیے شیروانی، اور گھسے کا سیٹ بھی پسند کرلیا تھا جس کی تصاویر سلمان کو ڈسک اپ پر بھیج کر فائنل بھی کروالیا تھا۔

عامر نواز کی شخصیت کا سب سے پرکشش پہلو اس کی حسِ مزاح تھی۔ وہ کسی بھی سنجیدہ محفل کو چند لمحوں میں قہقہوں میں بدلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علاقے کا ہر بوڑھا جوان عامر نواز سے جب بھی ملتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ اس سے ملاقات کا دورانیہ قلیل نہ رہے۔ عامر نواز نے اسی خداداد صلاحیت سے اپنے کسٹمرز کے دل جیتے اور اہلِ علاقہ تو عامر نواز کی زندہ دلی کے برسوں سے قائل تھے۔

اسی شام دولہا میاں سلمان صاحب کی دو بہنیں عامر نواز کے زری سینٹر پر آئیں۔ عامر نواز نے ان دونوں کو مختلف انداز سے ڈیل کیا اور دورانِ گفتگو وقفے وقفے سے ایسے لطیف جملے بولتا کہ وہ ہنسے بنا رہ نہ پاتیں۔

"باجی یہ سینڈل دیکھیں خصوصاً آپ کے لیے چنوکی سے بنوایا ہے۔ ملکہ برطانیہ کا اس پر دل آ گیا تھا بڑی مشکل سے نکال کر لایا ہوں۔"

ہاہاہاہا کی آواز سے گویا پورا زری سینٹر مہک گیا۔

انہی سلیز گرلز میں سے عامر نواز نے ان دونوں لڑکیوں کی توقع اور ارادے سے زیادہ شاپنگ کروادی۔ عامر نواز ایسا سلیز مین تھا جو اپنے حسِ مزاح کے سہارے مٹی کی ڈھیری بھی بیچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ سارا منظر کاؤنٹر پر بیٹھا اس کا مالک زیرِلب مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

دولہا میاں سلمان کا تعلق ایک امیر خاندان سے تھا اور جب ان کی دونوں بہنیں زری سینٹر سے ڈھیر ساری شاپنگ کے بعد رخصت ہوئیں تو مالک نے دور سے انگوٹھے کو اوپر کرکے با آواز بلند "ویلڈن مائے بوائے" کے جملوں سے عامر نواز کو سراہا۔ عامر نواز بھی دل ہی دل میں بہت خوش ہوا تھا۔

☆.....☆

اگلی رات عامر نواز ماں کے لیے پھل خریدنے کے بعد گھر کو روانہ ہوا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ماں کو اس کے لیے پھل لانا بہت اذیت دیتا ہے۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا اور گڑیا کو پہلے ہی میسج کردیا "گڑیا! بات سنو میں پھلوں کا شاپر باہر چھپا دوں گا۔ صبح اُٹھتے ہی باہر باورچی خانے کے اوپر والے خانے سے نکال کر اندر رکھ دینا اور ماں کو نہ بتانا۔ میں پہنچ رہا ہوں۔"

گڑیا اب سونے ہی والی تھی اس کا موبائل اس کے تکیے کے نیچے داہنے کان کے قریب بجا تو اس نے فوراً میسج پڑھا اور جواب دینے سے قبل تھوڑی دیر سوچا پھر زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب ارسال کردیا۔

"ہاں ٹھیک ہے بھائی لیکن ایک شرط پر کہ آپ مجھے اسکول میں پڑھانے کی اجازت دیں گے ورنہ میں ماں کو یہ بولوں گی کہ بھائی ہر رات ایسے ہی بہت ساری چیزیں چھپا چھپا کر لاتے ہیں اور آدھی چیزیں بڑے بھائی کے گھر بھی چھوڑ کر آتے ہیں۔"

عامر نواز چھوٹی بہن کی اس بلیک میلنگ کی بالکل توقع نہیں کر رہا تھا۔ پہلے تو اس جواب پر سخت غصہ آیا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا سخت ردِعمل دکھائے لیکن پھر گڑیا کی اس ننھی سی خواہش میں چھپی حقیقت نے اس کے جذبات کو ٹھنڈا کردیا۔ وہ اس خواہش میں چھپے رازوں سے خوب واقف تھا۔

اس نے جواب میں محض "سوچیں گے" کے ٹیکسٹ کے ساتھ میسج بھیج دیا۔

چند ہی لمحوں میں عامر نواز کی دستک پر گڑیا نے دروازہ کھولا۔ سلام کے جواب میں وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے گال لال پڑ رہے تھے۔ عامر نواز جانتا تھا کہ وہ کون سی خوش فہمی ہے جس نے گڑیا کو جھوٹی خوشی دے رکھی ہے، بہرحال جو بھی تھا وہ کم از کم اس وقت اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ آخر اس کے خفیہ رازوں کی گڑیا محافظ بھی تھی۔ زاہدہ مصلے کو ترتیب دیتے ہوئے دوسرے کمرے سے وارد ہوئی اس کے ہاتھ میں لمبی تسبیح تھی۔ زاہدہ نے مصلے کو ایک جگہ رکھا اور مسکراتے ہوئے عامر نواز کی طرف بڑھی۔ دلاسہ دینے کے بعد زاہدہ تسبیح والا ہاتھ عامر نواز کے سر کے اوپر گول دائرہ نما گھما کر پھونکنے لگی۔

"اللہ تمہاری کمر کبھی نیچے نہ لگنے دے، میرا بچہ! سدا

سکھی رہو، سارے ارمان پُورے ہوں۔ اولڑکی کھانا دیا ہے اس کو؟" دعائیں دینے کے بعد ایک دم گڑیا سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ہاں! ماں ابھی بھائی کھانا کھا کر بیٹھے ہیں اور ماں آج بھائی تیرے لیے کوئی پھل بھی نہیں لائے ہیں" گڑیا اسے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔

اس جواب میں عامر کے لیے واضح دھمکی تھی۔ عامر ایک لمحے میں گڑیا کی طرف پلٹا تاکہ اسے گھور سکے لیکن گڑیا ان جملوں کے بعد بھاگتی ہوئی اپنے بستر پر پہنچ چکی تھی۔

"یقیناً وہ اندر ہی اندر اس سارے منظر سے محظوظ ہو رہی ہوگی۔" عامر نواز نے اپنے دل میں ہی سوچا۔

"اچھا کیا پُتر بہت اچھا کیا جو آج تو کچھ نہیں لایا ابھی کل کے انار ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ ویسے ہی خراب ہو جاتے" عامر نواز کو تسلی ہوئی۔

ہر رات ماں بیٹا ایک دوسرے سے اپنے دکھ سکھ ضرور بیان کیا کرتے تھے عامر نواز کے لیے یہ مکالمہ ہی اس کی زندگی کا حسین لمحہ ہوتا تھا جب وہ ہر رات اپنی ماں کو بہتر مستقبل کی نوید سناتا۔ وہ اپنی ماں کو ہر رات تسلی دیتا اور اس کی امیدوں کو ٹوٹنے سے بچانے کی کوششیں کرتا رہتا تھا۔ "ماں طے ہو گیا، بس! میں نے ٹھان لی ہے۔"

زاہدہ ایک دم متوجہ ہوئی اور سوالیہ نظروں سے عامر نواز کی طرف دیکھنے لگی۔ عامر نواز عمدہ سیلز مین ہونے کی وجہ سے بلا کا "اٹینشن سیکر" تھا۔ اس کو اپنی بات سنوانی آتی تھی وہ اپنی بات کو اہمیت دلوانے کا فن جانتا تھا۔ اس کا یہ ادھورا جملہ سن کے اس کی ماں متفکر ہوگئی۔ وہ مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں ماں کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"اب بول بھی (.....) خدانہ کرے کیا طے کرلیا ہے؟ کیا ٹھان لی ہے؟" اسے خاموش دیکھ کے زاہدہ بیتابی سے بولی۔

عامر نواز ماں کی بے چینی دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اپنی نشست سے اُٹھ کر سیدھا ماں کی چارپائی پر اس کے پاس بیٹھا اور ماں کی نرم آغوش میں اپنا سر رکھ لیا۔

"ماں ایسا ویسا کچھ نہیں میں کسی سے شادی نہیں کرنے والا، جو تیرے یوں کان کھڑے ہو گئے ہیں۔ وہ میں مکان کے سامان کے لیے خورشید کے ساتھ بھاؤ پتا کر آیا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جو چند روپے جمع ہیں ان سے سریا لے لوں۔ سیمنٹ ریت اور بجری کا سامان بعد میں لے لوں گا۔ کل خان صاحب کے بیٹے سلمان صاحب کی مہندی ہے۔ پرسوں ولیمے کے بعد میں تھوڑا فری ہو جاؤں گا تو سریا لے آؤں گا۔ تُو بتا ماں تیری دوا ابھی ہے نا ختم ہوگئی ہو تو بتا کل بھجوا دوں گا۔" عامر نواز نے ایک ہی سانس میں سارا منصوبہ بیان کردیا۔

"ٹھیک ہے سامان میں ابھی سریا ہی منگوا کے رکھ لے باقی بعد میں ہو جائے گا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے سب ہو جاتا ہے پُتر! دیکھ اس گھر میں پہلے ایک ہی کمرا تھا جو تیرے ابا نے بڑی مشکل سے بنایا تھا جس میں ہم بھی رہتے تھے اور ساتھ بھینس اور کٹا بھی کونے میں باندھے ہوتے تھے۔ کافی عرصہ تو ہمارے پاس مہمان کے سونے کی جگہ بھی نہ تھی پھر انہوں نے کئی سالوں بعد ایک کمرا اور بھینس کا الگ کوٹھا بنوایا تھا۔ آہستہ آہستہ سب ہو جاتا ہے۔ تو پریشان نہ ہو اور جلدی نہ کر سب ہو جائے گا۔ اچھا! میری بات سن کیا کہا تُو نے کہ کل بھجوا دوں گا؟ کیا مطلب کل بھجوا دوں گا۔ کیوں کل تو کدھر جا رہا ہے کہ بھجوا دے گا۔ میری دوا آج ختم ہے کل خود لیتے آنا۔" زاہدہ نے انگلی کے اشارے کے ساتھ سخت ہدایت نامہ جاری کردیا تھا۔ ماں کی آغوش میں آ کر گویا عامر نواز کی تھکن ہوا ہو چکی تھی۔

"ماں میں کہیں نہیں جا رہا، بتایا تو تھا کہ سلمان صاحب کی شادی ہے اور ان کے گھر کے سارے کپڑے دلہن کے جوڑے، دولہے کے کپڑے اور مہندی کی رات سیج سجانے تک کی ساری ذمہ داری مجھ پر سونپی گئی ہے۔ اب کل پورا دن مصروف گزرے گا اور شام سے پہلے سلمان صاحب کے گھر پہنچ کر سارے انتظامات کرنے ہیں۔ ان کی شیروانی کا سائز دوبارہ سے چیک کرنا ہوگا، دلہن کا لہنگا بدلوا کر لایا ہوں وہ بھی دکھانا ہے اور پھر اسٹیج سجانا ہے۔ ان سارے کاموں میں رات کے دو بج جائیں گے اور جب تک میں آتا آپ سب جاگتے تھوڑی رہو گے۔ میرا کوئی پتا نہیں رات آؤں یا نہ آؤں۔ سلمان صاحب شاید آنے بھی دیں گے یا نہیں اس لئے آپ، گڑیا اور رضیہ میرا انتظار نہ کرنا بلکہ جلدی سو جانا اگر مجھے آنا ہوا تو میں گڑیا کو کال کرلوں گا پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ویسے بھی شادی کے گھر چار ہا ہوں تو کھانا وہیں سے کھالوں گا۔"

عامر کی ماں تفصیل کی بات کرنے کی عادی تھی اس لیے وہ بھی عموماً اسے ساری بات وضاحت سے سمجھایا کرتا تھا۔ عامر نواز نے ماں کی مزید ہدایتیں سنی جیسے "سیج کے الگ سے پیسے لینا، سلمان صاحب کو خوش رکھنا، اس کی ماں کو میرا اسلام کہنا، اور وہ کوئی پیسے دیں تو انکار نہ کرنا، بلکہ رکھ لینا آخر ہر کام میں

تیری محنت بھی تو شامل ہوتی ہے۔"

عامر نواز ماں کی گود میں سر مست لیٹا ان مقدس لمحوں کے مزے لے رہا تھا۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ اسے ماں کے آرام کا احساس ہوا۔ وہ فوراً اُٹھا اپنی ماں کو بستر پر دراز کیا۔ اُس کے اوپر کمبل پھینکا اور چارپائی کی دوسری طرف بیٹھ کر اپنی ماں کے پاؤں دبانے لگا۔ پاؤں دباتے ہوئے اس نے پیار سے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر سکون کے آثار عیاں تھے۔

زاہدہ ہلکی نیند میں جا چکی تھی۔ زاہدہ کے لب نیند کی حالت میں پھڑ پھڑائے جیسے کہ وہ اپنے بیٹے سے کہہ رہی ہو۔ "بس کر پتر! جا سو جا۔"

عامر نواز نے دیکھا کہ ماں گہری نیند سو چکی ہے تو اس نے اپنی گود سے ماں کے پاؤں سرکائے اور چارپائی پر رکھ کر اوپر کمبل ڈال دیا۔

وہ سونے کے لیے جا رہا تھا کہ اچانک اس کا دل زور سے دھڑکا اور وہ رک گیا۔ وہ بے اختیار قدموں کے ساتھ واپس اپنی ماں کے پیروں کی طرف پلٹا اور کمبل اُٹھا کر ماں کے پیروں پر بوسے دیے۔ یہ سب کچھ بے اختیار ہو رہا تھا فرط جذبات میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو نمودار ہو رہے ہیں۔ قریب تھا کہ اس کی ہچکی بندھ جاتی اور اس کی ماں جاگ جاتی وہ فوراً دوسرے کمرے میں اپنی چارپائی کی طرف چلا گیا۔

وہ کچھ دیر چارپائی پر بیٹھا اپنی اور ماں کی تلخ زندگی کے بارے میں کیا کیا سوچتا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد عامر نواز قمیص اتار کر لیٹنے لگا تو اس نے قمیص کی جیب سے اپنا موبائل نکالا تاکہ صبح کے لیے الارم لگا سکے کیونکہ اگلی صبح اس کو جلدی جانا تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز موبائل پر الارم لگانے کی غرض سے آگے بڑھا۔ موبائل کا کی پیڈ لاک کھولا، تبھی موبائل اسکرین روشن ہوئی، اسکرین کے عین ٹاپ پر ایک خط اُچھل رہا تھا۔

"میسج! ارے اتنی رات کس نے میسج بھیجا ہوگا" وہ زیر لب بولا۔

میسج کھلا تو وہ پیغام کسی اور کا نہیں بلکہ اس کی چھوٹی بہن گڑیا کا تھا۔

"بھائی میں مذاق کر رہی تھی، میں ماں کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ مجھے پتا ہے کہ ماں فکر مند رہتی ہے۔ سارا دن گھر میں فارغ رہتی ہوں۔ مجھے عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں۔ کچھ کرنے کو نہیں ہوتا اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اپنی تعلیم کو ضائع ہونے سے بچالوں اور پڑھانا شروع کر دوں تاکہ میں مصروف ہو جاؤں اور ساتھ آپ کی ہیلپ بھی کر سکوں۔ آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں میں آپ کو کبھی شرمندہ نہیں کروں گی۔ آپ میرے اچھے بھائی ہیں جو بہنوں کی عزت کے لیے فکر مند رہتے ہیں لیکن بھائی میں بھی انشاء اللہ آپ کی ہی بہن ہوں۔ اگر آپ اجازت نہیں بھی دیں گے تو تب بھی ناراض نہیں ہوں۔ گڈ نائٹ بھائی۔"

گڑیا کے اس پیغام نے عامر نواز کی سوچ پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ گڑیا اتنی سمجھدار بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بہت دیر سوچتا رہا، کئی بار اس نے سوچا کہ میسج کا جواب لکھ دوں کہ نہیں کوئی ضرورت نہیں نوکری کرنے کی، آرام سے گھر میں بیٹھو، لیکن آج اس کا ضمیر اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ اسے عادی مجرم ٹھہرا رہا تھا جو نہ جانے کب سے گڑیا کی اس موہوم سی خواہش کو دباتا چلا آیا تھا۔ وہ گڑیا کو اجازت دینے پر آمادہ ہو گیا۔

انہی سوچوں میں آدھی رات گزر چکی تھی۔ بالآخر سونے سے پہلے اس کی انگلیاں کی پیڈ پر ٹِک ٹِک کی آواز کے ساتھ گڑیا کو جواب دے رہی تھی۔ "آئی ایم سوری گڑیا۔ مجھے تمہیں پہلے ہی اجازت دے دینی چاہیے تھی۔ کل سرافتخار کے اسکول جا کر انہیں بتا دینا کہ تم اسکول جوائن کر رہی ہو۔ اور سوموار سے باقاعدگی سے اسکول پڑھانا شروع کر دو۔ رضیہ سے کہہ دو کہ ماں کا خیال رکھا کرے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے اعتماد کو کبھی نہیں توڑو گی۔ اپنا خیال رکھنا۔ گڈ نائٹ۔ تمہارا خیر خواہ بھائی۔"

☆.....☆

اگلی صبح وہ اپنے مقررہ وقت سے کافی پہلے اُٹھ گیا تھا، وہ جانتا تھا کہ آج کے دن اس کے لیے وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔ گڑیا ابھی سوئی ہوئی تھی لیکن رضیہ اور زاہدہ جاگ چکی تھیں۔ گڑیا نے یقیناً ابھی تک میسج نہیں پڑھا تھا اس بات کا ثبوت تھا کہ ابھی تک وہ سو رہی ہے ورنہ میسج پڑھنے کے بعد اسے نیند کہاں آنی تھی۔

عامر نواز کی بڑی بہن رضیہ نے ہی ناشتا بنایا اور تینوں نے مل کر ناشتا کیا۔

"آپی! تم نے تو جیسے زندگی سے منہ ہی موڑ لیا ہے۔ نہ بولتی ہو، نہ ڈھنگ سے کھاتی ہو، اور یہ حالت کیا بنا رکھی ہے اپنی؟ حادثے زندگی میں رونما ہوتے رہتے ہیں، اب ان کو گلے سے لگا کر ساری زندگی کا روگ تو نہیں بنایا جا سکتا نا! اب

کافی وقت گزر چکا ہے اپنی زندگی جیو، ہنسو کھیلو، باتیں کرو، گھر کے کاموں میں دلچسپی لو، آؤ جاؤ، ہم سب سے باتیں کرو، ڈیمانڈز کرو۔ تم مجھ سے بڑی ہو اور تمہیں ہم سب کو رستہ دکھانا چاہیے دیکھو ماں کتنی پریشان ہوتی ہے۔ واپس آ جاؤ، اب، اپنی دنیا میں واپس آ جاؤ۔" عامر نواز نے موقع کی مناسبت سے رضیہ کو بہت ساری باتیں کہہ دی تھیں۔

ناشتے کی میز پر کچھ دیر سناٹا چھایا رہا لیکن چند لمحوں بعد زاہدہ نے یہ سحر توڑا۔ "ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے لڑکی! اب بس بھی کرو، ابھی زندگی پڑی ہے۔ طلاق ہی ہوئی ہے نا ابھی میرا جنازہ تو نہیں اُٹھا جو ہر وقت منہ بسورے کونے میں پڑی رہتی ہو۔" زاہدہ نے تیکھے لہجے میں رضیہ کو سُنا دی اور ساتھ خود کو اور نصیبوں کو بھی کوسنے لگی۔

"اللہ نہ کرے ماں کیسی باتیں کرتی ہو، اللہ تمہیں حیاتی دے" عامر نواز تیزی سے بولا۔

رضیہ اپنے جذبات کو بمشکل سنبھال پائی۔ اُس کی آنکھوں کے کناروں پر پانی کے چشمے اُبلنے کے لیے تیار تھے جیسے کسی بھی وقت وہ تمام بند توڑ کر سارے بدن کو سیراب کر دیں گے۔ عامر نواز نے معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے فوراً اُٹھا اور رضیہ کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

"میری شہزادی بہن! اب بھی تو کتنی پیاری ہے کہ نظریں نہیں ہٹتی، تو بہت اچھی ہے۔ دیکھ میں چاہتا ہوں کہ تُو خوش رہے بلکہ ہم سب یہی چاہتے ہیں۔ اپنی زندگی ہنسی خوشی جی، دیکھ نا! ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔ رب نے چاہا تو سب اچھا ہو جائے گا اور تُو بہت خوش رہے گی۔" عامر نواز کی اس کوشش نے رضیہ کو مکمل ٹوٹنے سے کم وبیش بچا لیا تھا۔ پانیوں کے بند ٹوٹے ضرور تھے لیکن انہوں نے ساری بستی کو سیراب نہیں کیا تھا۔ رضیہ نے اس بار اپنا ردِعمل دکھایا اور اثبات میں سر ہلا کر پیغام دیا کہ "ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی۔" عامر نواز نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

"یہ ہوئی نا بات، اچھا چلو اب گڑیا کو اُٹھائیں آج اس کے لیے خاص دن ہے اور وہ ابھی تک سو رہی ہے۔ ٹھیک ہے ماں مجھے اجازت دو مجھے آج بہت کام ہے جلدی نکلنا ہوگا۔"

زاہدہ اور رضیہ اس خاص دن کے لیے سوچتی رہی لیکن زیادہ دیر توجہ نہ دی کیونکہ عامر نواز اس طرح کا سسپنس تخلیق کرنے کا ماہر تھا۔ رضیہ چہرہ صاف کرتی گڑیا کو بیدار کرنے چلی گئی اب ہر صبح کی طرح عامر نواز ماں سے الوداع ہو رہا تھا۔ عامر نے جھک کر ماں کے پاؤں چھوئے اور دور سے ہاتھوں کے اشاروں سے پاؤں پر بوسہ دیا اور اب سر جھکائے ماں کے ولاسے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا وہ ہر صبح ایسے ہی کام پر جاتا اور ماں سے خوب دعائیں لے کر رُخصت ہوتا تھا۔ زاہدہ نے دم پھونکتے ہوئے اس کو ولاسہ دیا پھر بے اختیار گلے سے لگایا۔

"ستاں خیری پُتر! اگر رات دیر ہو گئی تو بے شک وہیں رُک جانا۔ اندھیرے میں پیدل نہ چلتے رہنا۔ جا میرا پُتر اللہ تیری کنڈ تھلے نہ لاوے" (اللہ تمہاری پیٹھ کبھی نیچے نہ لگائے)۔

عامر نواز ماں سے مل کر رُخصتی کے لیے پلٹا تو اسے پہلے ہی قدم پر پڑے پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بمشکل سنبھلا۔

"او میں بسم اللہ میں قربان، لگی تو نہیں پُتر؟ ٹھیک تو ہے نا تُو؟" زاہدہ بڑی فکر سے بڑھ کر پوچھنے لگی۔ اس اچانک جھٹکے نے ماں اور بیٹے کا دل لرزہ دیا تھا۔

"نہیں ماں! کچھ بھی نہیں ہوا میں بالکل ٹھیک ہوں ویسے ہی یہ پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔" تسلی بھرے ان کلمات کے ساتھ وہ رخصت ہونے کے لیے ایک بار پھر کھڑا ہوا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہوا؟ اسی پریشانی میں اس نے ماں کو الوداعی "خدا حافظ" کہا اور پلٹ گیا۔ وہ دوبارہ راستے کے اس پتھر کو ہٹانا بھی بھول گیا تھا۔ اب وہ اپنے گھر سے اوپر کی طرف پہاڑی چڑھ رہا تھا۔ زاہدہ اپنے گھر کے احاطے میں کھڑی اس کو دیر تک دیکھتی رہی تھی۔ وہ اس غیر متوقع ٹھوکر کی وجہ سے فکر مند تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عامر نواز پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا، اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور ماں کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ کر اشارہ کیا کہ اب اندر جاؤ۔ زاہدہ کی نگاہوں سے عامر نواز پہاڑی کی اوٹ سے اوجھل ہو چکا تھا۔

☆.....☆

صحن میں عجیب شور تھا، چہکتی آواز نے پورے گھر کو گواہ بنا رکھا تھا۔ گڑیا یقیناً بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے رضیہ اور زاہدہ کو ایک جگہ بٹھا کر اپنے بھائی کا میسج اونچی آواز میں بڑی خوشی سے سنایا۔

"میں پڑھاؤں گی مجھے اجازت مل گئی، ہائے اللہ مجھے اجازت مل گئی" کے جملے بار بار اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ اس نے رضیہ کو کہہ دیا کہ آپی آج سارے گھر کا کام میں کروں گی۔ بھائی کے لیے خاص طور پر گجریلا بناؤں گی۔ عامر نواز کو گجریلا بہت پسند تھا۔ زاہدہ اور رضیہ بھی گڑیا کی خوشی میں

بہت خوش تھیں گویا آج عامر نواز کا گھر گاؤں کا سب سے خوشحال گھرانا لگ رہا تھا۔

☆.....☆

مہندی کی رات آئی کہ آئی، عامر نواز بڑی پھرتی سے سلمان صاحب کی شادی کے سامان کی ساری لسٹ مکمل کر چکا تھا۔ وہ بار بار اپنے سامان کو چیک کرتا کہ کوئی شے باقی نہ رہ جائے۔ اس کے مالک نے اسے یقین دلایا کہ ہر چیز پوری ہے لیکن آج وہ اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔ ایک عجیب وہم اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ صبح کی ٹھوکر کے بعد اس کے اندر ایک طلاطم پیدا ہوا جس نے اسے اندر سے بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ آج خلافِ معمول اُس کا مزاج مفقود تھا اس کے مزاحیہ چٹکلے کہیں چھپ گئے تھے۔ شام چار بجے کے قریب سلمان صاحب کے ڈرائیور نے زری سینٹر کے سامنے گاڑی پارک کی اور عامر نواز کو آواز دی۔ عامر نواز نے سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھا اور شادی کے گھر کی طرف چل دیے۔

عامر نواز نے پہنچتے ہی سلمان صاحب کو بلوالیا۔ ڈرائیور سارا سامان گاڑی سے نکال کر اندر لے جا رہا تھا۔ سلام و اکرام کے بعد وہ سامان کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے تھے۔

''یہ دیکھیں سلمان بھائی، آپ کی ٹپ ٹاپ شیروانی، یہ رہا آپ کا کھسا، یہ رہی آپ کی سُرخ پگڑی، چلیں اب ذرا پہن کے دکھائیں'' سلمان نے شیروانی زیب تن کی، پھر پگڑی سر پر رکھی اور پھر کھسے میں پاؤں گھسایا، تینوں چیزیں سلمان پر خوب جچ رہی تھیں۔ سلمان صاحب شیشے کے سامنے اپنا معائنہ کر رہے تھے۔

''واہ، عامر دل خوش کر دیا۔ ہر چیز پورے ناپ پر ہے اور میچنگ بھی بہت ہی اعلیٰ ہے، زبردست یار چھا گئے ہو۔'' سلمان صاحب نے بے اختیار تعریفی جملے بولے۔

عامر نواز نے چائے نوش کی اور مغرب کے فوراً بعد ایک لڑکے کو ساتھ لے کے مہندی کے لیے اسٹیج سجانے لگ گیا۔

عامر نواز کی کاریگری ایسی کمال تھی کہ مہندی پر ہر خاص و عام اس کے بنائے نقش دیکھتا رہ جاتا۔ اس نے اسٹیج کے صوفے کے عقب میں پھولوں کی لڑیوں سے عمدہ ڈیزائن بنائے، پھر مختلف رنگوں کے گلابوں کے پھول مختلف جگہ پیوست کیے پورا اسٹیج پھولوں کے حسین ڈیزائن سے جگمگا اُٹھا تھا۔ آخر میں اس نے پھولوں کی تازہ پتیوں سے انگریزی کا حرف ''ایس'' لکھا اور پھر چپکے سے سلمان صاحب کو بلا کر پوچھا۔

''سلمان بھائی! یہ اپنا! بھابی کا نام کیا ہے؟ ذرا بتایئے گا۔'' سلمان صاحب ہچکچا گئے، لیکن پھر ہنس دیے اور منظر دیکھنے والے سب ہی ہنسنے لگے۔

''ارے نہیں سلمان بھائی آپ کے نام کا ''ایس'' لکھا ہے نا تو ساتھ بھابی کے نام کا حرف بھی ضروری ہے!'' عامر نواز نے تفصیلاً سمجھایا۔ سلمان صاحب نے عامر نواز کے قریب ہوتے ہوئے اس کے کان میں جا کر نام بتایا۔

''نادیہ، نادیہ نام ہے اس کا۔'' منظر دیکھنے والے نوجوان سلمان صاحب کی اس معصومیت پر پھر ہنسنے لگے۔ عامر نواز نام سننے کے بعد مسکرایا اور ''ایس'' کے ساتھ ''این'' لکھنے کے لیے بڑھا تو برجستگی سے بول اُٹھا۔

''اچھا! تو نادیہ نام ہے بھابی کا؟ بہت اچھا ہے سلمان بھائی ایک دم ٹپ ٹاپ'' یہ کہنا تھا کہ سلمان صاحب وہاں سے کھسک گئے اور نوجوان عامر نواز کے اس آخری چٹکلے پر دیر تک ہنستے رہے۔

مہندی کے فنکشن کے لیے اسٹیج سجانے کے بعد عامر نواز نے دلہن کے کمرے کی سیج بھی انتہائی مہارت سے سجائی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے عامر نواز نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ سلمان صاحب نے عامر نواز کو کھانا کھلایا اور اوپر جا کر بیٹھ گئے۔ اوپر خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ عامر اب فارغ تھا۔ وہ گھر جانے کی سوچنے لگا۔

☆.....☆

عامر نواز گھر جانے کے ارادے سے باہر نکلا تو ایک عجیب ہی منظر تھا ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ وہ کسی میوزک پارٹی میں ہے۔ اس قدر اونچی آواز میں اسپیکر بج رہے تھے کہ پاس کھڑے دوسرے بندے کی بات سننا مشکل تھا۔ وہ بے اختیار سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جا پہنچا۔ اس کے گمان کے عین مطابق وہاں محفل سجی تھی۔ جس میں بہت سارے لڑکے ڈانس کر رہے تھے۔ عامر نواز کو کچھ پل کے بعد احساس ہوا۔ کہ لڑکوں کے ساتھ کرائے پر بلائے خواجہ سرا بھی رقص کر رہے ہیں۔ عامر نواز اسٹیج کے مزید قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ موسیقی کے لیے نامور گلوکار آئے ہوئے ہیں جو اپنے موسیقی کا تمام تر ساز و سامان کے ساتھ اپنی گلوکاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

عامر نواز نے ایسی بڑی محفل بڑے عرصے بعد دیکھی تھی۔ وہ ادھر ہی بیٹھ کے محفل سے مستفیض ہونے لگا۔

رات کے دو بج چکے تھے لیکن عامر کو وقت کی تیزی کا احساس تک نہ ہوا اور پھر ایک نئی خرافات منظرِ عام پر آئی جب اونچی گردن والی بوتلیں ایک کارٹن سے نکالی گئیں۔ بادہ خواروں

کی مردہ ہڈیوں میں جیسے بجلی کوند گئی ہو۔ بدمست نوجوان آگے بڑھے اور جام بھر بھر کر کسی گمنام دنیا میں پہنچ گئے۔ کانچ کے گلاس ٹوٹنے لگے۔ رقص کرنے والے بے ترتیب جھومنے لگے اور ایسا منظر ترتیب پایا جیسے کائنات گھومنے لگی ہے۔ نوجوان لڑکے اس سارے منظر کو دیکھ کر شرابیوں کو چھیڑتے اور پھر ان کا تماشا بناتے۔ عامر نواز نے ایسی محفلیں دیکھی ضرور تھیں مگر ان میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے سگریٹ پیتا تھا اور وہ بھی ماں اور بہنوں سے چھپ کر کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں یہ برداشت نہیں کر پائے گی۔ عامر نواز کی طرف ایک شرابی نے گلاس بڑھایا۔

''لے لے یار عامر، دو گھونٹ مار، ایمان سے بالکل سیٹ ہو جائے گا، لے لے یار'' یہ سنتے ہی عامر نواز کچھ کہے بغیر وہ بے پاؤں محفل سے باہر نکل آیا۔

عامر نواز نے اس مست دنیا سے جان چھڑا کر کھلی فضاء میں قدم رکھا تو آسمان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ شادی کے گھر کے چاروں طرف لڑکے پٹاخے اور روشنی کے گولے آسمان کی نذر کر رہے تھے۔ آتش بازی کی اس قدر انتہا تھی کہ گویا کان کے پردے پھٹنے والے تھے۔

''وہ دیکھو سلمان صاحب کے دوست کس قدر بارود لائے ہیں، ایک ٹولا بارودی گولے بجا رہا ہے تو دوسرا آتش بازی کی لڑیاں آسمان کی طرف اُچھال دیتا ہے۔'' پاس کھڑے ایک لڑکے نے عامر نواز سے ساری تفصیل بیان کر دی۔

آتش بازی اور گولا باری کی آواز اس قدر اونچی اور ہیبت زدہ تھی کہ قریب کے دوسرے گاؤں کے لوگ بھی سو نہ پائے۔ عامر نواز گاؤں کے چند لڑکوں کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ لڑکے بڑی مہارت سے گولے کو پھرتی سے آگ لگاتے اور پھٹنے سے ایک منٹ پہلے ہوا میں اُچھال دیتے۔ ان میں سے بعض شریر لڑکے کرسیوں پر بیٹھے مہمانوں اور دوسرے خاموش مہمانوں کی ٹانگوں کے قریب گولا باری کرتے تاکہ ہلچل مچائی جا سکے۔ ایک طرف یہ سارا منظر بڑا لطف اندوز محسوس ہوتا تھا لیکن دوسری طرف انتہائی خطرناک تھا۔

☆.....☆

رات کے دو بج چکے تھے، گویا گجریلا بنا کر رات ایک بجے تک اپنے بھائی کا انتظار کرتی رہی لیکن بھائی نہیں آیا تو پھر نیند میں ڈوب گئی۔ رضیہ تو ویسے بھی دس بجے خوابوں کی دنیا میں چلی جاتی تھی مگر زاہدہ حسبِ معمول کروٹیں بدل رہی تھی۔ حالانکہ عامر نواز تنبیہ کر کے گیا تھا کہ میرا انتظار نہ کیا جائے بلکہ سب وقت پر سو جائیں۔ زاہدہ سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے رُوٹھ چکی تھی۔

عامر نواز اپنے دوستوں کے ساتھ باری باری یہ سب کچھ دیکھتا اور پھر اپنی رائے دیتا تھا۔

''یار ایسی شادی کبھی نہیں دیکھی، سلمان صاحب نے پرتعیش کھانا دیا اور اس کے بعد اتنا سب کچھ؟ قسمے مزہ آ گیا۔ شادی ہو تو ایسی۔'' پاس کھڑے عامر نواز کے دوست خورشید نے یہ حسرت بھرے جملے بولے تھے۔

''ہاں یار، واقعی! دیکھ ٹائم کیا ہوا ہے؟'' عامر نے اثبات میں جواب دیا اور وقت کا استفسار کیا۔

''ابھی تو دو ہی بجے ہیں صبح تک فنکشن چلے گا۔'' عامر نواز کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے خورشید مسکرایا۔

دو بجے کا سُن کر عامر نواز ٹھٹک گیا۔ اسے اندازہ بھی نہ ہوا اور اتنا زیادہ وقت گزر گیا۔ وہ گھر جانے یا رُک جانے کے بارے میں فیصلہ ہی کر رہا تھا کہ اچانک تڑتڑتڑتڑ کی آواز نے پورے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اب کی بار آتش بازی، گولا باری کی آواز نہیں تھی بلکہ انتہائی زوردار اور جُداسی آواز تھی۔ سب اوپر والے کھیت کی طرف دوڑے وہاں پہنچتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ تین نوجوان ہیں جو اسلحے کے ساتھ اندھا دُھند فائرنگ کر رہے ہیں۔ ایک کے پاس رائفل تھی جبکہ دو کے پاس بتیس بور کے پستول تھے۔ بڑے عجیب اور نخریلے انداز

شمارہ دسمبر 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆اول: عشق گزیدہ.....زویا اعجاز (لاہور)

☆دوم: فیکا.....طارق عزیز (اسلام آباد)

☆سوم: بریسلٹ.....عقیل احمد (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

میں وہ چیمبر سے گولیاں خالی کرتے اور پھر ایک دم چیمبر میں نئی گولیاں بھر کر ڈز ڈز ڈز فائر کرنے لگتے۔

وہ تینوں نوجوان کم و بیش بیس بائیس سال کی عمر کے تھے۔ ایک کی تو ابھی پوری طرح داڑھی بھی نہ آئی تھی لیکن سب انہیں پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کی اس حماقت کو دلیری سمجھ کر حیران ہو رہے تھے۔

عامر نواز بھی ان کے قریب گیا کہ لڑکوں کے اس کرتب کو قریب سے دیکھ سکے۔ اس نے قریب پہنچ کر لڑکوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا کیونکہ ان نوجوانوں کو وہ جانتا تھا۔ وہ اکثر اس کے زری سینٹر کے باہر سے گزر کر اس سے علیک سلیک کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا بڑے تپاک سے بولا۔ ”ہم کافی دیر سے بچے آتش بازی جیسے بچوں کے کھیل دیکھ رہے تھے۔ ہم نے سوچا کیوں نہ بچوں کو اصل جشن دکھائی جائے۔“ عامر نواز نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان لڑکوں کی ان حرکات کی نفی کی جائے یا ان کی فنکاری کی داد دی جائے۔

”ابے دیکھ چند سیکنڈز میں کیسے چیمبر خالی کرتے ہیں، تم دونوں تو گھنٹا گھنٹا لگا دیتے ہو“ فائرنگ کرنے والوں نوجوانوں میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں کو جیسے چیلنج کیا تھا۔ دوسرے نوجوانوں نے بھی مقابلے کی ٹھان لی اور پھرتی دکھانے کے لیے تیز تیز فائرنگ کا ہنر دکھانے لگے۔ عامر نواز انتہائی تھک چکا تھا اچانک اسے ماں کا خیال آیا وہ جانتا تھا کہ ابھی تک وہ جاگ رہی ہو گی۔ اس نے اپنے دل میں گھر کی طرف چلنے کا فیصلہ کیا۔

”اچھا یار میں چلتا ہوں گھر جانا ہے ماں راہ دیکھ رہی ہو گی۔“ وہ اپنے دوست خورشید کو مل کر دو قدم آگے گھر کے راستے کی طرف پلٹا ہی تھا اک کہرام مچ گیا۔

”اسے گولی لگی ہے۔“ کسی نے چیختے ہوئے کہا تھا۔ آدھے گھنٹے سے جاری مسلسل فائرنگ کا سلسلہ رُک گیا۔ اندھیرے میں ابھی تک اس زخمی شخص کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔

”مجھے گولی لگی ہے خدارا مجھے اسپتال پہنچا دو۔“ چہرے پر ٹارچ کی روشنی پڑی تو زخمی نے کراہتے ہوئے کہا۔ لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں عامر نواز تھا۔

لوگوں نے خورشید کے ہمراہ اسے چارپائی پر اٹھا کر شہر کی طرف جانے والی مرکزی شاہراہ تک پہنچا دیا۔ جاتے ہوئے چارپائی پر عامر نواز اپنے دوست سے باتیں کرتا گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو یاد کرتا اور اپنے دوست خورشید سے بار بار کہتا۔

”آخر مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ مجھے کس کی گولی لگی ہے؟“

عجیب بے بسی تھی اب عامر نواز کو کیا جواب دیتے کہ اس اندھیرے میں تمہیں گولی مارنے والا کون ہے۔ وہ تینوں لڑکے جن کے پاس اسلحہ تھا وہ بھی عامر نواز کی چارپائی کے ساتھ چلتے چلتے مرکزی شاہراہ تک آئے تھے۔ جب لوگوں نے گولی کے بارے میں سوالات پوچھنے شروع کیے تو وہ لڑکے موقع سے فرار ہو گئے۔

ایمبولینس اسپتال کی طرف فراٹے بھر رہی تھی لیکن عامر کی زبان اب حرکت نہیں کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دقفے دقفے سے تھرتھرائی لیکن وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں کر پا رہا تھا۔

بیس منٹ بعد عامر نواز اسپتال میں پہنچ چکا تھا۔ اس کو فوراً آکسیجن فراہم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن سانس ندارد! عامر نواز اسپتال پہنچنے سے پہلے ایمبولینس میں ہی اپنی سانسیں خالقِ حقیقی کے سپرد کر چکا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق گولی صرف دو فٹ کے فاصلے سے لگی تھی اور خون بھی زیادہ بہہ گیا تھا۔

اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ گولی کتنے فاصلے سے لگی تھی یا کہاں لگی تھی۔ اہم بات تو یہ تھی کہ اب رات دو بجے زاہدہ کا دروازہ کسی نے نہیں کھٹکھٹانا تھا۔ اب گڑیا کالاڈ کسی نے نہیں اٹھانا تھا۔ اب رضیہ کے سر پر ہاتھ کسی نے نہیں رکھنا تھا۔ ایک فضول رسم نے بھرے پرے گھر کو اجاڑ دیا تھا۔

☆.....☆

عامر نواز کی کہانی یہاں ختم ہوتی ہے لیکن آج بھی ہزاروں سوال ادھورے ہیں۔ ان ادھورے سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے بجائے ہم نے اس حادثے کو قدرت کا کھیل سمجھ کر بھلا دیا ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ عامر نواز کا قاتل کون ہے؟ یہ معاشرہ جس نے قانون کی دھجیاں اُڑائیں؟ قانون جو وقت پر حرکت نہیں کرتا؟ قاتل سلمان صاحب تھے جنہوں نے اپنی شادی کو غیر قانونی بنایا یا پھر وہ تین لڑکے جو جیبوں میں پستول لیے گھومتے ہیں؟ یا پھر یہ بے رحم رسمیں جنہوں نے عامر نواز کو موت کی گھاٹ اتار دیا؟ رسم و رواج کے نام پر خرافات نے نہ جانے کتنے عامر نواز چھین لیے لیکن یہ ریت ہر بار دہرائی جاتی ہے ہر شادی میں وہی بے رحم رسمیں کسی آسیب کی طرح موت بن کر انسانی جانوں کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔